سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں

ماہنامہ

سرگزشت

کراچی

مئی 2018

نگران اعلیٰ

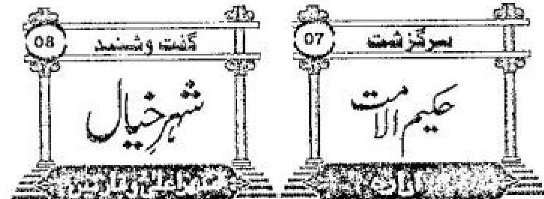
معراج رسول

سفیر احسن: عالمی شہرت یافتہ قلم کار کا احوال زیست

زبان کا زہر: ایک جج کی بے باکی حق بیانی جنہیں صرف تنقید کرنا آتا تھا

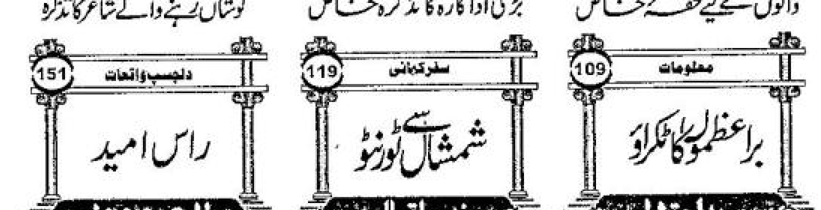
بے تیغ سپاہی: قربانیوں کی ایسی فصیل کھڑی کرنے والے صرف پاکستانی فوجی ہوتے ہیں

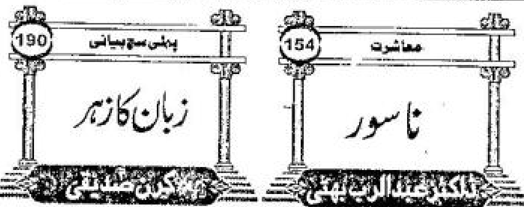


















قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 28 ❖ شمارہ 04 ❖ مئی 2018ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول
مدیر : پرویز بلگرامی
نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◆◆◆

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

◆◆◆

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 70 روپے ❖ زرسالانہ 900 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200
E-mail: jdpgroup@hotmail.com
MEMBER APNS
CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

اس مہینے بھی میں ایک منی کہانی سنانا چاہتا ہوں جو یوں ہے:
میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم کب پیدا ہوئے تھے؟“
اس نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔ ”جب ایوب خان صدر تھے، نہیں یحییٰ خان، نہیں ذوالفقار علی بھٹو۔“
میں حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”کیا تمہیں اپنی پیدائش کا سال بھی یاد نہیں۔“
اس نے جواب دیا۔ ”بچہ تھا نا، دنیا داری، مکر و فریب سے دور۔“
”اب کیا ہو؟“
”ایک انسان ہوں، عیاری، مکاری، حرص طمع سے بھرا ہوا انسان۔“
”مگر انسان ہو؟“
”ہاں۔“
”لیکن کیسے؟ انسانوں کی کون سی صفت ہے تم میں؟“
کچھ دیر تک وہ ہونق بنا مجھے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ”اور تم کیا ہو؟“
اب میں ہونق سا اسے دیکھ رہا تھا اور تب سے ہم دونوں اس سوال کا جواب تلاش کر رہے ہیں کہ ہم میں انسانوں والی کون کون سی صفت بچ گئی ہے تاکہ خود کو انسان کہہ سکیں۔“

کہنے کو یہ ایک کہانی ہے مگر سچ لگ رہی ہے۔ اس لیے کہ اپنا جائزہ لے کر دیکھا ہے، ہم میں انسانوں والی صفت اب پائی نہیں جاتی۔ اس کا سبب کیا ہے؟ صرف اور صرف وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک جزدان میں، احکام شریعت طاق پر رکھ کر مغرب کی تقلید میں خود کو مفاد پرستی کے گرداب میں ڈال چکے ہیں۔ کاش ہم سب خود کو اس گرداب سے نکال لیں تو یقیناً معاشرہ خود بخود سدھر جائے گا۔

معراج رسول

حکیم الامت

سہاج رام سپرو کا گھرانا موضع چسکو پرگنہ اڈوں تحصیل ”کولگام“ کشمیر میں ایک نامور گھرانا تھا۔ اہل ہنود میں لاتعداد ”گوت“ ہیں ان میں سپرو خاندان سب سے معتبر مانا جاتا تھا۔ بھارت کی سیاست میں اس گوت کے بے شمار لوگ اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم گھرانا جواہر لال نہرو کے والد سر تیج بہادر سپرو کا تھا۔ سپرو کے معنی ہیں کم عمری میں بڑوں کی سی ذہانت والا، گویا سپرو گوت کشمیر کا ذہین ترین گوت تھا، اسی گوت کے سہاج رام سپرو کے بیٹے نور محمد نے اسلام قبول کرلیا، ابھی تھوڑے دن ہوئے تھے کہ ڈوگرا راج کے حکمرانوں نے اسے ستانا شروع کردیا، مجبوراً وہ کشمیر سے پنجاب کے شہر سیالکوٹ آگیا۔ یہیں اس کے ہاں ایک بیٹے نے جنم لیا۔ اسی رات نور محمد نے ایک خواب دیکھا تھا کہ میدان میں بہت سارے لوگ جمع ہیں اور آسمان پر ایک نہایت خوب صورت مگر عجیب و غریب پرندہ اڑ رہا ہے، ہر کوئی اسے پکڑنے کی سعی کر رہا ہے لیکن پرندہ کسی کے ہاتھ نہیں آ رہا ہے، تبھی نور محمد اس بھیڑ میں شامل ہوگیا اور اس نے بھی پرندے کو پکڑنے کی کوشش کی تو وہ پرندہ خود بخود اس کی گود میں آگرا۔ رات میں خواب دیکھا اور اسی دن اس کے گھر بیٹا ہوگیا۔ بیٹے کی پیشانی چوڑی تھی جو اس کے خوش بخت ہونے کی دلیل تھی، بچے کو جو بھی دیکھتا یہی کہتا کہ اس کا اقبال بلند رہے گا۔ وہ کچھ بڑا ہوا تو اسے پڑھنے کے لیے نزدیکی مسجد میں بھیج دیا گیا تاکہ وہ قرآن پڑھنا سیکھ لے۔ آہستہ آہستہ تلاوت کرنا اس کا معمول بن گیا۔ ایک دن جب وہ تلاوت کر رہا تھا کہ نور محمد پاس آکر بیٹھ گئے، جیسے ہی اس نے تلاوت ختم کی نور محمد نے کہا۔ ”یاد رکھو، قرآن کی تلاوت اس طرح کرنی چاہیے کہ ایسا لگے جیسے خدا سے باتیں ہو رہی ہیں، اللہ تعالیٰ مخاطب ہے۔“ یہ چھوٹی سی بات اس نے گرہ میں باندھ لی۔ کچھ اور بڑا ہوا تو اسے اسکاچ مشن اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ یہیں سے اس نے 1893ء میں میٹرک کیا اور 1895ء میں انٹر۔ پھر اس نے گورنمنٹ کالج کا رخ کیا جہاں اس نے 1897ء میں بی اے اور 1899ء میں ایم اے کیا۔ اس وقت ولایت سے پڑھ کر آنے والوں کی خوب پذیرائی ہوتی تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج یونیورسٹی چلا گیا اور 1905ء میں اس نے وہاں سے دوبارہ بی اے کیا پھر وہ میونخ یونیورسٹی چلا گیا۔ اس نے پی ایچ ڈی کیا۔ قانون کی ڈگری کے لیے بھی اس نے داخلہ لے لیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ادبی میدان کی بھی شہسواری کر رہا تھا۔ اس کی شاعری سب کو متوجہ کرلیتی تھی۔ اس سے جب بھی وطن کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ کہتا ”ہندوستان میں آیا ہوں کشمیر چھوڑ کر..... بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور“ لوگ سوچ میں پڑ جاتے تو وہ مزید تشریح کرتا ”میرے آباء برہمن تھے۔ انہوں نے اپنی عمریں اس سوچ میں گزار دیں کہ خدا کیا ہے اور میں اس سوچ میں ہوں کہ انسان کیا ہے۔ یعنی کہ ”میں اصل کا خاص سومناتی..... آبا میرے لاتی و مناتی“ اب وہ شہرت کی بلندیوں پر تھا۔ اسے اتنا پسند کیا جانے لگا تھا کہ ماضی کے شعرا بھی بہت پیچھے رہ گئے تھے، وہ ”حکیم الامت“ کہلانے لگا تھا۔ 1923ء میں حکومت انگلشیہ نے اسے شہنشاہ انگلستان جارج پنجم کے ہاتھوں ”سر“ کا خطاب دے دیا۔ وہ لوگ جو اس کی شاعری پر گہری نظر رکھتے تھے اور اسے مسلمانوں کا سب سے بڑا ہمدرد کہتے تھے انہوں نے مشورہ دینا شروع کردیا کہ اسے مسلمانانِ ہند کی سیاسی جماعت مسلم لیگ میں شامل ہو جانا چاہیے۔ وہ قانون و فلسفہ کی تعلیم کے لیے لندن میں مقیم تھا، اس نے مسلم لیگ کی لندن شاخ میں شمولیت اختیار کرلی۔ 1930ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ نے الہ آباد میں کانوشن رکھی تو اس نے ایک معرکۃ الآرا خطبہ دیا جس میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا تصور تھا۔ ہند لوٹنے کے بعد اسے نواب آف بھوپال نے ریاست کا قانونی مشیر مقرر کرلیا تھا، 1933ء میں وہ اسپین کے سفر سے لوٹا تو گلے کے عارضہ نے گھیر لیا، اسی عارضہ میں 21 اپریل 1938ء کو وہ لاہور میں انتقال کر گئے۔ اس حکیم الامت شاعر کو ہم علامہ اقبال کے نام سے پہچانتے ہیں۔

☆☆☆

☆ محمد طفیل طوقی کا گزارش نامہ۔ ''تحریر پیش خدمت ہے۔ میری تمام تحریریں اسلامی تحریروں سے ماخوذ ہوتی ہیں اس تحریر کے ساتھ میرا یہ خط بھی ضرور شائع کرنا باقی میری ایک انمول تحریر لاہور کے ایک ڈائجسٹ میں دوبار شائع ہو چکی ہے۔ اب دنیا بھر سے فون آرہے ہیں وہ تحریر تیسری بار شائع کریں (سرگزشت کا ایک اپنا مزاج ہے اس کے مطابق تحریر ارسال کریں، آپ کی تحریر اخبارات و میگزین میں بہ آسانی جگہ بنا لے گی لیکن سرگزشت میں جگہ نہیں دی جا سکتی ہے)''

☆ آصف علی لہڑی نصیر آباد بلوچستان سے اختصاریہ۔ ''اُمید ہے آپ بالکل ٹھیک ہوں گے۔ معراج رسول انکل میں ایف ایس سی کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ جب بھی فارغ وقت ملتا ہے تو کچھ نہ کچھ ضرور لکھنے بیٹھتا ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں ہر ماہ Parmanetly اپنے ہر دل عزیز رسالہ سرگزشت کے لیے کوئی دلچسپ کہانی ضرور بھیجوں (ضرور بھیجیں لیکن خیال رہے کہ سرگزشت کے مزاج کی ہو)''

☆ محمد ہمایوں تنولی کی آمد مانسہرہ سے۔ ''پہلی بار آپ کو خط لکھ رہا ہوں، اُمید ہے خوش آمدید کہیں گے۔ اس بار سرگزشت اور سسپنس ایک ہی دن 25 مارچ کو بابو بھائی بک اسٹال مانسہرہ سے اکٹھے مل گئے۔ حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ مانسہرہ جانے کی بجائے بھیر کنڈ سے اپنے پسندیدہ ماہنامے مل جایا کریں گے۔ اس دفعہ سرگزشت کا سرورق اتنا خوب صورت تھا کہ میں بتا نہیں سکتا۔ ''اناس کے پھول'' چننے گئے تو میمونہ اختر نے مشورہ دیا کہ بھئی وعدہ کرو کہ ''ہیروئن'' سے عشق نہیں کرو گے تب جا کر ''ادھورا حسن'' دیکھنے کو ملا مگر ''چہرہ'' دیکھا تو ''بدروحیں''، ''زندان سے فرار'' ہو رہی تھیں۔ پھر خیال آیا کہ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کا سفر ''مونا عمیدی'' کے ساتھ کریں تو ''کیو با سے فرار'' کون کرائے گا۔ ادراک سے ''یادِ ماضی'' میں گئے تو ''انمول موتی'' چننے کو ملے۔ ''ٹائیگر'' سید جاذب رضا کی بہترین کوشش تھی۔''

☆ نزابت افشال کا خلوص نامہ گاؤں مہورہ فتح جنگ ضلع اٹک سے۔ ''27 مارچ کو اعوان بک ایجنسی فتح جنگ سے ماہنامہ سرگزشت مل گیا۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح سوئے ہوئے ضمیر کے لیے تازیانے کا کام کر رہا تھا۔ یک شخص سرگزشت اس بار اردو ادب کے عظیم شاعر، شاد عظیم آبادی کے بارے میں تھی۔ ان کی اس مشہور غزل نے ''ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم'' انہیں لازوال بنا دیا۔ شاد کا شمار اپنے عہد کے عظیم شعرا اور اساتذہ میں ہوتا تھا۔ شاد کی وفات پر سید سلیمان ندوی نے ایک بھرپور مضمون لکھا تھا جو کہ اب ان کی کتاب ''یادِ رفتگاں'' میں شامل ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد اس بار ''فاطمہ ثریا بجیا'' کے حالات زیست پر بھرپور تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ بجیا کی بہن زہرا نگاہ اور بھائی انور مقصود بھی مشہور شاعر ہیں۔ زویا اعجاز اس بار ''شاکر شجاع آبادی'' کی داستان حیات سامنے لائیں۔ شاکر کے حالات سے مکمل واقفیت ہوئی اور ساتھ اہلِ اقتدار کی جھوٹی تسلیوں پر بھی غصہ آیا۔ اللہ پاک شاکر صاحب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین)۔ ''ادراک'' اور ''یادِ ماضی'' بھی زبردست تحریریں تھیں۔ شکیل صدیقی اس بار عظیم مزاح نگار ''مجید لاہوری'' کے ساتھ حاضر تھے۔ مجید لاہوری اپنی شاعری سے نشتر کا کام لیتے تھے۔ مجید لاہوری نے اپنے ہم عصر باری علیگ اور منٹو کی طرح کم عمر پائی لیکن اپنی تحریروں کی بدولت زندہ رہیں گے۔ حیران کن بات یہ کہ تینوں کے ذاتی حالات بھی کافی حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' زبردست اور اپنے عروج پر ہے۔ ندیم اقبال صاحب اس بار نسرین سے فرصت پا کر جین کے ساتھ ''مے کدے'' میں جا پہنچے، دیکھئے کیا ہوتا ہے، اللہ خیر کرے کہیں ایسا ہی نہ ہو کہ ''اب تو اتنی بھی میسر نہیں میخانے میں۔ جتنی ہم چھوڑ دیا کرتے تھے پیمانے میں''۔ ''مہذب گالیاں'' پُر اثر تحریر تھی۔ ایسی تحریروں کو شمارے کی زینت بنتی رہنا چاہیے۔ ''اناس کے پھول'' پہلے نمبر پر رہی۔ واقعی غربت و افلاس انسان کو گناہوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ شکر ہے کہ عبدالغفار راہ راست پر آ گیا اور یوں ایک کامیاب آدمی کی طرح زندگی گزارنے لگا۔ ''مشورہ'' بھی سبق آموز کہانی تھی، وسیم نے اپنی دانست میں اچھا مشورہ دیا تھا مگر راشدہ کو چونکہ اس سے سچی محبت تھی سو وہ اس کی دوری کے خیال سے ناراض ہو گئی۔ بہر حال اچھا ہوا کہ وہ ایک دوسرے کو مل گئے۔ ''وعدہ'' بھی بھرپور تحریر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر ثاقب کے صبر کا اجر انہیں اولاد کی شکل میں دیا یوں ریحانہ اور ڈاکٹر ثاقب کی کمی بھی پوری ہو گئی اور ساتھ ہی نجمہ بھی کامیاب ٹھہری کہ اسے اس کا محبوب مل گیا۔ ''ہیروئن'' میں ہمیشہ کی طرح وہی ہوا جو کہ ہوتا رہا ہے ایسے کاموں میں، ناصر نے فارعہ کے ظاہری رویے اور مجلسی تبسم کو محبت سمجھا اور یوں اس کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ ''چہرہ'' سب سے سبق آموز کہانی تھی۔ مکرم صاحب کے ساتھ جو کچھ ہوا بہت اچھا ہوا، رعنا اور ملیحہ کو داد دینی چاہیے کہ انہوں نے کس طرح اس کو سبق سکھایا۔ ''مفید غیر مفید'' زبردست تحریر تھی۔ فیاض کو آخر وقت میں اپنے ماموں کی قدر آ گئی یہ پڑھ کر اچھا لگا، عقل مند اس لیے ہی تو کہہ گئے کہ ''جوان کے زور سے بوڑھے کا تجربہ اچھا ہوتا ہے''۔ ''ادھورا حسن'' بھی سبق آموز کہانی تھی اور زندان بھی اچھی رہی۔ پارچے بھی اس بار زبردست اور معلوماتی تھے ''مہکِ خیال'' میں خود کو پہلے نمبر پر دیکھ کر خوشی

ہوئی۔ مرزا طاہر الدین بیگ، اعجاز حسین سٹھار، عبدالحکیم ثمر، ظفر ندیم وہرہ، آفتاب احمد نصیر اشرفی، سید امتیاز حسین بخاری اور ندیم اقبال امریکا سے بہترین تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ ناصر حسین رند بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔''

☆ ظفر ندیم وہرہ کا تجزیہ حیدر آباد سے۔ ''سرگزشت کا تازہ شمارہ مثل ماہ و مہر اپنے مقررہ وقت پر طلوع ہوا اور علم و نور کی کرنیں بکھیرتا ہوا دل میں اتر گیا۔ اہالیان حیدر آباد اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ہمیں آپ کے پڑوس میں رہنے کا شرف حاصل ہے اور اسی شرف کے طفیل ہمیں دوسرے شہروں کی نسبت شمارہ جلد مل جاتا ہے۔ ''اناس کے پھول'' شکوے، شکایتوں اور معروضات سے بھرپور ایک عبرت اثر کہانی تھی جس میں غم روزگار اور غم حالات کی بھرپور عکاسی کی گئی۔ ''مشورہ'' کی راشدہ اس کے عاشق نامدار نے جو مشورہ دیا وہ الٹا اس کے گلے پڑ گیا۔ انجام اگرچہ معافی تلافی پر ہوا مگر محبت کی عمارت تہہ و بالا ہونے سے بچ گئی۔ ''یادِ ماضی'' غور و فکر کے دریچے وا کرنے کا سبب بنی۔ لمحات تو حساب کتاب سے ماورا ہوتے ہیں۔ وہ بس گزر جاتے ہیں اور ان کے گزرنے کا احساس بعد میں ہوتا ہے۔ ''ادراک'' کی کملا ثریا کا دین اسلام کے فہم و ادراک میں نظریہ واقعی بڑا چست و چالاک تھا۔ ظلم کی اندھیر نگری میں دین حق کا علم بلند کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ انور فرہاد نے ''انمول موتی'' کے عنوان سے فلمی دنیا کے متعلق اچھوتی اور بیش بہا معلومات فراہم کیں، ان کی کاوش کی داد نہ دینا بیداد ہو گا۔ ندیم اقبال کا سفرنامہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ پوری آب و تاب سے رواں دواں ہے۔ انہیں کوزے میں دریا بند کرنے کا فن آتا ہے۔ وہ لفظوں کے پیچھے اپنی سحر کاری سے ایسی فضا پیدا کر دیتے ہیں جس کا اثر براہ راست دل پر ہوتا ہے۔ ''زندان'' با اختیار اور بے اختیار انسانوں کی کہانی ہے۔ یہ انسانی بے حسی اور درندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ مائی رحمتے نے ثابت کر دیا کہ اگر غنڈہ گردی آگے بڑھ کر حملہ کر سکتی ہے تو شرافت اپنی مدافعت میں آگے بڑھ کر وار کیوں نہیں کر سکتی۔ ''ہیروئن'' نے محبت کی کھچڑی تو خوب پکائی مگر اچانک نگاہ مرد مومن نے تقدیریں بدل کر رکھ دیں۔ مجید لاہوری بلا شبہ پیدائشی مزاح نگار تھے۔ وہ قہقہے پیدا کرنے والے کارخانہ دماغ کے مالک تھے۔ وہ الفاظ کی صورت گری سے ایسا سماں باندھ دیتے تھے کہ قارئین ہنسنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ آخر میں اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ ہر لکھنے والا کسی نہ کسی سطح پر اردو ادب کو کچھ نہ کچھ دیتا ہے اور کچھ لوگ ذرا زیادہ دیتے ہیں۔ اس شمارے میں شامل دوسری تحریریں بھی اچھی تھیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کو سراہنے والے بھی بہت ہوں گے۔''

☆ ساگر تلوکر قائم دین، سراج سے لکھتے ہیں۔ ''سرگزشت ہمیشہ کی طرح طویل انتظار کے بعد ملا۔ مئی کہانی نے دل لوٹ لیا تو حق سچ پر مبنی لگی۔ ''مہکِ خیال'' میں شاد عظیم آبادی کا تعارف اچھا لگا۔ محفل میں لکھاری ندیم اقبال کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سید امتیاز، اعجاز حسین اور عبدالحکیم کے تبصرے اچھے لگے۔ ثریا بجیا کے بارے میں پڑھ کر خوشی اور کافی معلومات ملیں مگر ان کے ریڈیو ڈراما ''دکھ سکھ اپنے'' کا کوئی ذکر نہیں تھا، آخر کیوں۔ ''اماوس کے مسافر'' کی وجہ سے سرگزشت کا شدت سے انتظار تھا۔ شاکر کے حالات زندگی پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اتنا بڑا شاعر اتنی مشکل زندگی جی رہا ہے۔ سرائیکی میں شاکر جیسا کوئی شاعر نہیں ہے۔ اماوس کے مسافر میں تشنگی کا احساس ہوا۔ ''مہذب گالیاں'' نواب صاحب کی اتنی مختصر تحریر تھی کہ جھٹکا لگا۔ مختصر ضرور تھی مگر ایک نئی سوچ دے گئی۔ ''ادراک'' کملا ثریا کی ایمان افروز داستان نے خوشی دی۔ ''یادِ ماضی'' ایک خشک سی تحریر تھی جس میں روانی اور دلچسپی کے لوازمات کا فقدان تھا۔ ''نمک لاہوری'' بھی اوسط درجے کی تحریر تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کیا کمال کا سفرنامہ ہے۔ لفظ لفظ میں سحر ہے۔ اس میں کھو سا جاتا ہوں۔ سرگزشت کی جان اور پہچان بنا ہوا ہے۔ نسرین کا کیا بنتا ہے شدت سے انتظار ہے۔ سچ بیانیوں میں اناس کا پھول، مفید غیر مفید اور زندان اچھی لگیں۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔''

☆ عبدالحکیم کا تبصرہ کراچی سے۔ ''آپ رشوت کے خاتمے کی بات کرتے ہیں جب کہ ہمارے رہبروں نے تو اسے ایوان کی زینت بنا کر حیات جاودیاں بخش دی ہیں پھر بھی پوچھتے ہیں قافلہ کیوں لٹا؟ سرگزشت کا اپریل کا شمارہ پوری سج دھج کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا ''تحفۂ آگہی'' بصورت فاطمہ ثریا بجیا کے موجود تھیں۔ ان کی تاریخ ساز شخصیت، بے مثال جدوجہد اور ناقابل یقین کارناموں کو دلچسپ پیرائے میں بیان کر کے چشم کشا معلومات فراہم کی ہیں۔ اب تک بجیا کو میں صرف پہچانتا تھا پر اب ان کو جاننے لگا ہوں۔ ''اماوس کی سیاہ'' اور ''سنسان رات'' میں عزم و استقلال کا شمع شاکر شجاع آبادی، زویا اعجاز کی ایک پُر اثر تحریر تھی۔ طنز و مزاح کے ہیوی ویٹ مجید لاہوری کو دیکھ کر جس طرح رکشا والے اپنی جان کی خیر مناتے تھے میرا خیال ہے شاید قلم کار حضرات بھی ان کی ویٹ سے لرزہ براندام تھے جبھی تو ایک عرصے سے ان کی شخصیت اور فن پر کوئی تحریر نظر سے نہیں گزری۔ ندیم اقبال کے ''شمشال سے ٹورنٹو'' کا ذکر خیر نہ ہو ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ندیم صاحب! پرنس ایڈورڈ کاؤنٹی والے آپ کی شادی پر تلے نہیں وہ تو آپ کی شادی کرا بھی چکے۔ ثبوت نسرین صاحبہ کے چٹخارے دار کمنٹس یا پھر تکمیل آرزو کے لیے صبر آزما حکمت عملی بقول منیر نیازی ''کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ

آہستہ" منزل پر پہنچنے کے لیے دھوکا اور فریب کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے درست اور صحیح طریقے سے منزل پالینے کے لیے دس سال کی قربانی دے دینا قابل ستائش ہے۔ انور فرہاد اپنی معلومات کی تجوری میں محفوظ یادوں کے انمول موتیوں میں سے چند ایک کی رونمائی کررہے ہیں بزمنگیت کے یہ تینوں انمول رتن رفیق غزنوی، فیروز نظامی اور خواجہ خورشید انور کہنے کو تو ابدی نیند سو چکے ہیں لیکن ان کے نغموں کی یادگار رسیلی اور مدھر دھنیں آج بھی ان کی موجودگی کی گواہ ہیں۔ نواب محی الدین مرحوم کی یادگار تحریر "مہذب گالیاں" کے حوالے سے ریاض شاہد کا چبھتا ہوا سوال ویلن کون؟ کیدو یا رانجھا؟ قابل غور ہے۔ اب آتے ہیں چند سچ بیانیوں کی طرف انسانی رشتوں کی بے کسی اور بے بسی کی منہ بولتی تصویر "اناس کے پھول" ایک تہی دست باپ کی اس سے بڑھ کر بدنصیبی کیا ہوسکتی ہے جو اپنے لخت جگر کی ایک معمولی سی خواہش بھی پوری نہیں کرسکتا ہو، میمونہ اختر کا "مشورہ" راشدہ کے لیے بلیک وارنٹ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس سے گلوخلاصی کی امید لے کر جب وسیم سے ملتی ہے تو نتیجہ؟ "جس پہ تکیہ تھا وہ ہی پتے ہوا دینے لگے" کچھ لوگ چاند سا چہرہ اور چمکتی دمکتی عشرت کدہ کی تمنا تو رکھتے ہیں مگر عرش اور فرش کی قدر و قیمت کو فراموش کر بیٹھتے ہیں تب ناصر کی طرح وہ بھی آبنائے خوش فہمی کی تیز و تند لہروں میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں چند ایک لوگوں کا ماننا ہے "زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا" جب کہ کچھ لوگ لڑ جھگڑ کر بغض اور غصے کے جلو میں اپنی شرائط پر جینا چاہتے ہیں جیسے بدروحیں کی عرشی! لیکن یہ زندگی زندگی نہیں ہوتی کامیاب زندگی کی ضمانت کرختگی میں نہیں نرمی میں ہے بالکل ربڑ کی گیند کی طرح نرم و ملائم [illegible] بار بھی پٹخا جائے وہ اچھل کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ کرکٹ کی گیند کی طرح سخت نہیں جو گر جائے تو اٹھنے کی سکت نہیں رکھتی اسی طرح ہر ایک پر اندھا اعتماد اور بھروسا کرنے کے بجائے اس کی نیت اور خلوص کو بھی پرکھنا چاہیے ورنہ اپنے آنسو اپنا ہی دامن ان کا مقدر بن جاتا ہے۔ اس بار "شہر خیال" کی صدارت جناب نزاہت افشال نے سنبھال رکھی تھی مبارک ہو! سیر حاصل تبصروں اہم ٹیم کے ساتھ اپنا فرائض منصبی ادا کر رہے تھے دیگر ساتھیوں کی تحریریں اور تجاویز بھی قابل قدر تھیں بالخصوص اعجاز حسین سٹھا، ندیم اقبال سید امتیاز حسین بخاری، ظفر ندیم دہڑ اور امیر حمزہ، آفتاب نصیر اشرفی، ناصر حسین رند، حنیف ادیب، سدرہ بانو ناگوری صاحبہ، نازلی نازیہ صاحبہ اور بقیہ تمام ساتھی کی تحریر پسند آئی۔ اپنی حوصلہ افزائی پر نزاہت افشال، ندیم اقبال اور نازلی نازیہ کا مشکور ہوں۔"

☆ مشعل جہاں کا مختصر تبصرہ جو گزشتہ شمارے پر ہے لیکن اب ملا ہے۔ "فروری 2018ء میں اس سال کے دوسرے شمارے پر تبصرہ حاضر ہے۔ "معلم ثانی" تمام مضامین میں سے بہترین مضمون تھا۔ "شعلہ صفت" میں بھی ایک یادگار شخصیت کو موضوع بنایا گیا، بہت اچھا لگا۔ سچ بیانیوں میں "دیالی" سب سے بہترین کہانی رہی جس نے ہمارے پراسرار کہانیوں کے آتش شوق پر تھوڑا پانی ڈال دیا۔ اس شوق کی مزید تسکین کے لیے ہر مہینا ایک پراسراریت سے بھرپور کہانی ضرور ضرور شائع کریں۔ "کاش" میں ایک حساس مسئلے کے بارے میں آگاہی ہوئی۔ "سبق" اتنی بور کہانی تھی کہ آدھی بھی نہ پڑھ سکے۔ "فین" نے بس حیران کیا اور "گناہ" میں عورت کی ایک ناجائز خواہش نے بچے کی زندگی برباد کردی، بہت افسوس ہوا۔ بری عورت، ندامت اور پسند کی شادی بھی بس اچھی تھیں۔"

☆ اعجاز حسین لدھیانہ کی حاضری مگر تاخیر سے۔ پرانے تبصرہ نگار ہیں اس وجہ سے چند سطریں شامل کرنی پڑیں۔ "السلام علیکم! مرگ ناگہاں کے بعد کے شمارے کا بے چینی سے انتظار تھا اس لیے ہر روز بک اسٹال کا چکر لگتا۔ جیسے ہی فروری کا شمارہ ہاتھ میں پہنچا تو دل کو قرار آیا۔ سب سے پہلے جناب محترم معراج رسول صاحب کے پاس حاضری دی۔ آپ کی بات بالکل درست ہے کہ جب تک معاشرے میں انصاف کا قتل عام ہوتا رہے گا چور اچکے اور ڈکیت پیدا ہوتے رہیں گے۔ یہاں کا تو آوے کا آوہ ہی بگڑا ہوا ہے اور حکمران اپنے ذاتی مقاصد کے لیے سرکاری ذرائع کا جو بے دریغ استعمال کرتے ہیں بس اللہ پاک کی ذات ہی انہیں ہدایت دے سکتی ہے۔ نہیں تو شاہ زیب قتل جیسے واقعات ہوتے رہیں گے اور غرباء ایسے ہی مظالم کی چکی میں پستے رہیں گے۔ یک صفحی سرگزشت میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے بارے میں پڑھا، اچھا لگا۔ اس کے بعد شہر خیال کی محفل میں حاضری دی اور خود کو کرسی صدارت پر براجمان دیکھ کر خوشگواریت کا جھٹکا لگا اور ڈانس کرنے کا دل چاہا اور ساتھ ہی خالد شیخ طاہر صاحب اور نزاہت افشال تشریف فرما تھے دونوں کے تبصرے شاندار تھے۔ ساتھ ساتھ جناب سید ذیشان حیدر کاظمی، قیصر خان، ظفر ندیم دہڑ، عمران جونانی صاحب، اویسہ صاحبہ احمد خان تو حیدی امیر حمزہ اشرف اور رضا احمد اعوان بھی اپنے مختصر مگر جاندار تبصروں کے ساتھ موجود تھے۔ اعجاز حسین سٹھا را اپنے دل میں اتر جانے والے تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ اس کے علاوہ ظاہر الدین صاحب، عبدالجبار رومی، منشی عزیز مئے بھی موجود تھے۔ باقی سب لوگوں کے تبصرے بھی شاندار تھے جب کہ خصوصاً میرے خیال میں سیف خان کوئٹہ سے عمدہ تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت کے حقدار تھے۔ بہر حال یہ تو انتظامیہ بہتر جانتی ہے۔ "معلم ثانی" میں ابونصیر انصار ابی کے بارے میں انتہائی عمدہ تحریر تھی وہ واقعی اسلام کے مشاہیر میں سورج کی طرح نظر آتے ہیں۔ "شعلہ

صفت" کمال کی تحریر تھی۔ بروس لی شاندار ایکشن ہیرو کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ مارشل آرٹس کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ شہر نامہ میں کراچی شہر کے شاندار ماضی کے بارے میں پڑھا مگر اب کراچی کو دیکھ کر رونا آتا ہے ان حکمرانوں نے اس عظیم شہر سے روشنیوں کے شہر کا لقب چھین کر کچرا کنڈی میں بدل دیا ہے اللہ انہیں ہدایت دے۔ "باغی" میں لارڈ بائرن کے بارے میں پڑھا بے شک وہ اچھا شاعر تھا لیکن اپنی فطرت اور حرکتوں کی وجہ سے قابل نفرت بھی لگتا ہے۔ "سپر رائٹر" میں زخمی کانپوری جیسے بے لوث و بے غرض لکھاری کے بارے میں پڑھا، ایسے لوگ شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں اور قابل تقلید ہوتے ہیں۔ "شمشال سے ٹورنٹو" میں ندیم اقبال اچھے جا رہے ہیں۔ ایک الگ انداز کی تحریر لیے انتہائی عمدہ سفرنامہ، ہم ندیم اقبال صاحب کو پُرخلوص سلام پیش کرتے ہیں اللہ انہیں خوش اور آباد رکھے، آمین۔ اور زور قلم یونہی خوب صورت تحریر بکھیرتا رہے۔"

☆ سدرہ بانو ناگوری کا بھرپور تجزیہ ملیر کراچی سے۔ "ٹھیک فرمایا انکل آپ نے کہ کچھ کہانیاں دل کو چھو لیتی ہیں جیسے کہ یہ کہانی جس نے واقعی دل کو چھو لیا اور پڑھ کر دلی خوشی ہوئی کہ کسی کہانی کا اختتام تو بھروسے، امید اور یقین پر ہوا، کاش یہ امید، یہ یقین اور یہ بھروسا ہمارے وطن کے ہر ہر باسی کا مقدر بن جائے۔ نزاہت افشال بھرپور تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ شعروں کی تصحیح بھی بخوبی کر جاتے ہیں۔ آپ نے یاد نہ کرنے کا شکوہ بھی کر ڈالا اور صدارت کی کرسی بھی لے اڑے۔ بہت اچھے۔ ویلڈن۔ مرزا طاہر الدین بیگ میرے پہلے تبصرے سے میرے اس تبصرے تک ہمیشہ آپ مجھے پُرخلوص دعاؤں سے نوازتے رہے، آپ کا بے حد شکریہ رب تعالیٰ آپ کو بھی ہمیشہ خوش و خرم اور شاد و آباد رکھے۔ امیر حمزہ مجھے بھلا آپ کی انٹری کیوں بری لگے گی؟ "شہر خیال" کے سبھی ساتھی میرے لیے بے حد محترم ہیں۔ "بجیا" پر تحریر پڑھنے کی خواہش تو ایک عرصے سے تھی مگر اب ان کی داستان زیست پڑھ کر تشنگی برقرار رہی نہ بجیا کی شادی نہ کرنے کا تذکرہ ہوا نہ ان کی موجودہ فیملی کا ذکر، یوں لگ رہا ہے جیسے بس جلدی جلدی اس مضمون کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہو میرے خیال میں اتنی بڑی قلم کار کے لیے بہت کچھ مع تفصیل لکھا جانا چاہیے تھا۔ "شمشال سے ٹورنٹو" میں ندیم بھائی، نسرین کے ساتھ خوشگوار اور پُرسکون وقت گزار کر اپنے شور شرابے والے اپارٹمنٹ میں واپس آئے ہیں جہاں سرجی کی ادائیں، شہباز کی خطائیں اور مطیع اللہ کی صدائیں پھر سے ندیم بھائی کو گھیرنے والی ہیں۔ انکل یہ "شمشال سے ٹورنٹو" کے صفحے پر کس شخصیت کا عکس ہے۔ ہمیں تو یہ ملبلے والے محمود صاحب لگتے [illegible] (انصوہر ندیم اقبال کی ہے۔ محمود صاحب کا ذکر پڑھ کر مسکرانا پڑا)۔ ہنستا مسکراتا اور مسکراہٹیں بکھیرتا یہ دلچسپ تذکرے سرشار کر گیا، [illegible] ایسا عمدہ فنکار تھا جس نے بے پروائی، سستی اور کاہلی کے باوجود بھی اپنے فن سے خوب داد سمیٹی۔ "یاد ماضی" [illegible] کا [illegible] یادوں [illegible] خوب صورت تحفہ اور اتنا خوب صورت کہ بار بار پڑھنے کو دل چاہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر یادیں اتنی ہی مسحور کن ہوتی ہیں تو چچا غالب غلط کہہ گئے کہ "یاد ماضی عذاب ہے یارب، چھین لے مجھ سے حافظہ میرا" یادیں ایسی ہوں اور اتنی دلکش ہوں تو پھر یہی کہہ سکتے ہیں "کتنی سنہری باب ہیں یارب، سنبھالوں میں کیسے حافظہ میرا"۔ نواب محی الدین مرحوم کا سادہ مگر مختصر انداز تحریر قابل تحسین رہا۔ "ناسور" میں نت نئے انکشافات کا سلسلہ جاری ہے۔ "اناس کے پھول" عنوان جتنا منفرد تھا تحریر اتنی ہی دل دکھا دینے والی تھی۔ اولاد کتنی بڑی آزمائش ہے کہ اچھے بھلے آدمی کو چوروڈا کو بننے پر مجبور کردیتی ہے۔ ہمیں بھی اپنا احتساب کرنا ضروری ہے کہ دین سے دوری پریشانی، فکر، تکلیف اور بیماریوں کو جنم دیتی ہے۔ "ادھورا حسن" بے وقوفانہ سی تحریر ہے جس داغ سے چھٹکارا پانا انتہائی آسان تھا۔ اس داغ کو عمر بھر کا روگ بنالینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ "زندان" کا انجام جو ہوا سو ہوا لیکن جس طرح بے رحم وڈیروں نے انسانیت پر بے رحمی کی انتہا کردی ان کے لیے اتنی آسان موت ہرگز نہیں ہونی چاہیے تھی۔ تڑپا تڑپا کر مارنا تھا ان ظالموں کو۔ "بدروحیں" غرور و تکبر عیش و نشاط کی خواہش نے آپ کو کہیں کا نہیں چھوڑا عرشی جی، اپنی زندگی میں ویرانی اور سناٹوں کی ذمہ دار تو آپ خود ہیں۔ جوانی کے پُرشباب لمحات میں ایک بار تو سوچ لیتیں کہ کبھی کبھی آسمان کو چھو لینے کی خواہش کرنے والوں کے لیے زمین بھی تنگ پڑ جاتی ہے۔ ماہ صیام کے مقدس مہینے کی آمد آمد ہے تمام پڑھنے والوں کو ایڈوانس میں رمضان مبارک۔"

☆ امیر حمزہ اشرف کوٹ رب نواز ملتان سے لکھتے ہیں۔ "سرورق پر نشیلی آنکھوں والی دوشیزہ اچھی لگی۔ اداریہ میں انکل نے بجا فرمایا جب معاشرے میں انصاف اور مساوات کا قتل ہوگا تو ڈاکوؤں کا ہی اضافہ ہوگا لیکن ہمارے حکمرانوں کو اس چیز کی فکر نہیں ہے فی الحال وہ اپنی جائدادیں بنانے میں مصروف ہیں۔ "شہر خیال" میں چھلانگ لگائی تو بہت سے نئے نئے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ میرے پیارے بہن بھائیوں ویلکم۔ اعجاز حسین لدھیانہ کرسی صدارت مبارک ہو۔ شبینہ گل اور ایمانے زارا شاہ کے تبصرے قابل تعریف ہیں۔ احمد خان توحیدی "ناسور" سے کچھ خفا خفا سے نظر آئے۔ اعجاز حسین اور نزاہت افشال نے بھی اچھا لکھا ہے۔ ہمارے پیارے بھائی احمد رضا اور احسان سحر کافی دنوں سے غائب ہیں۔ بھائیوں پلیز اپنی خیریت سے آگاہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی "شہر خیال" کے دوستوں سے گزارش ہے کہ پلیز خط لکھتے وقت دھیان رکھا کریں کہ خط زیادہ طویل نہ ہوں۔ تیس تیس، پینتیس پینتیس سطروں پر مشتمل

خطوط کوفت و بیزاری کا باعث بنتے ہیں۔"

☆ اعجاز حسین سٹھار کا نور پور تھل سے تجزیہ۔ "محفل میں میرے محترم سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا سے بڑے اہتمام سے آئے ہیں۔ نازلی ناز یہ ملتان نے مجھے اچھے لفظوں میں یاد کیا۔ شکریہ قبول کیجیے۔ بلال شیخ نے چھپی ہوئی کہانی بھیج کر ہر لکھنے والے کو شرمندہ کر دیا۔ "اماوس کا مسافر" میں شاکر شجاع آبادی سے متعلق معلومات پڑھ کر جہاں مزہ آیا وہاں ان کی مالی پریشانیوں، محرومیوں اور بیماریوں کے دکھ نے رلا دیا ہے۔ میں نے ضلع بھکر کے گاؤں "گوہروالا" کے سالانہ مشاعرہ میں انہیں کئی بار سامنے بیٹھ کر سنا لیکن ان کے کلام میں بندہ جیسے مدہوش ہو جاتا ہے وہ بات ان کی خود بیتی میں ناپید ہے بھلا اردو بولنے، پڑھنے والے سرائیکی کلام کی روح تک کیسے پہنچ سکتے ہیں بلکہ زویا اعجاز کی ہمت ہے کہ اس موضوع پر کام کیا اور تسلسل و روانی کے ساتھ ایک شاہکار قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا ہے لیکن باوجود کوشش کے وہ مشاعروں کا کھلا، داد دینا اور مکرر مکرر کے نعرے لگانے والا ماحول نہیں بن سکا۔ شاید سرگزشت کے معیار اور پالیسی کے مطابق تحریر کو ترتیب دیا گیا ہے۔ جس میں وہ صد فی صد کامیاب ٹھہری ہیں جس کے لیے سرائیکی سمجھنے والے ان کے شکر گزار ہیں۔ محی الدین نواب کی برسی پر ہمارے ذوق مطالعہ کے لیے جو مواد آپ نے پیش کیا، وہ ہم نے دل کی آنکھوں سے پڑھا ہے لیکن یادیں تازہ ہونے سے دل اداس ہو کر احتساب کا عمل شروع کر دیتا ہے۔ جب نواب صاحب کی پرانی کہانی ہاتھ آ جائے تو کسی پیراگراف میں ان کے انوکھے خیالات، استعارے اور جذبات کی بندش دیکھ کر حیران ہو کر ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ لگا کر دیر تک سوچوں اور حیرت میں ڈوبا رہتا ہوں کہ وہ کیا کمال شخص تھا جو ہم سے جدا ہو گیا ہے، سراہے جانے، داد سمیٹنے اور محفلوں میں نشست و برخاست کی عادت نہ تھی، گوشہ نشینی کا خوب لطف لیا البتہ ڈھیروں ڈھیر محبتیں سمیٹیں اور لاکھوں قارئین کو غم زدہ چھوڑ کر کوچ کر گئے، گویا سارے درویشانہ اوصاف رکھتے تھے، اللہ ان کی خطائیں معاف فرمائے، آمین۔ "ناسور" میں حالات، خیالات اور واقعات کروٹ پر کروٹ بدل رہے ہیں، مناسب اوقات میں نئے کردار شامل ہوئے ہیں جو جاندار ہیں۔ سچ بیانیوں میں "اناس کا پھول" سوچنے، عمل، احتساب اور سبق حاصل کرنے کے کئی در کھول رہی ہے لیکن خوش قسمت ہے جو پہلی ٹھوکر پر سنبھل جائے، نصیحت پر عمل کرے اور بتائے گئے سیدھے راستے پر چلنا شروع کر دے ورنہ رزق میں بے برکتی، گھریلو ناچاقی اور انہونے حالات سے سامنا رہتا ہے۔ غربت بذات خود المیہ ہے جو ہر طرح کی محرومیاں لے کر آتی ہے، لاکھوں میں تولے جانے والے ساتھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ عزت، بھرم اور شہرت مذاق بن جاتی ہے اور جنہیں ہم کوئی وقعت نہیں دیتے وہ لوگ سینہ تان کر فاتح بن کر سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسی بے بسی کہ زندگی بے مقصد بن جاتی ہے لیکن صبر، شکر اور نیک نیتی سے تمام قوتوں کو شکست دی جا سکتی ہے جب حوصلہ مضبوط ہو تو اللہ کی مدد شامل ہو کر سارے دلدر دور کر دیتی ہے اس کے لیے شرعی احکامات کی پابندی پر کاربند رہنے کا اٹل فیصلہ ضروری ہے، واقعات کو مکمل جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس میں لکھاری کی محنت کو داد دینا ہو گا۔ "مشورہ" میں جو راہ وسیم نے دکھائی یہ احمقانہ بلکہ بچگانہ سوچ تھی اگر راشدہ سنجیدہ مزاج ہوتی، اسے وسیم سے انس ہوتا نہ قریبی رشتہ داری ہوتی اور مالی حالات تسلی بخش ہوتے تو وہ کبھی بھول کر بھی ملاقات پر آمادہ نہ ہوتی۔ یہاں کچھ سابقہ دل لگی نے معاملات سلجھائے اور رہی سہی کسر والدہ کی ترغیب دلانے نے پوری کر دی، یوں دونوں فریقین کا پردہ رہ گیا۔ سچی بات ہے جب دل ایک لے پر دھڑکنے لگے تو دریا، ٹیلے، پہاڑ اور سرحدیں قدموں کی دسترس میں آ جاتے ہیں۔ "وعدہ" میں حالات نے ایسی کروٹ لی تھی کہ مکینوں کی خوشیاں داؤ پر لگ گئی تھیں، بچوں کی آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے چھوٹی موٹی ہیرا پھیری کرنے جیسی صورت حال تھی، ثاقب کی دونوں بیویوں سے بے لوث محبت، کھرے مزاج اور نیک نیتی دیکھ کر قدرت کو ترس آ گیا اور گزرتی بہاریں دوبارہ لوٹ آئیں، ریحانہ اور نجمہ بدمزگی اور کڑے امتحان سے بچ گئیں اگر کسی نے حقیقی مسکراہٹیں بکھیرتے چہرے اور پیار کے رنگ دیکھنے ہوں تو ثاقب کی چار دیواری کے اندر جھانک لے۔ "ہیروئن" میں سارا قصور ناصر کا ہے، فارعہ خوش مزاج اور امیر غریب میں فرق نہ رکھنے والی لڑکی تھی اس کی تربیت اچھے والدین نے کی تھی، ناصر اپنی محدود دنیا کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا رہا، پھر وہ محنتی اور خوش لباس تھا اس لیے سب اس کی عزت کرتے اور دل کی بات کہہ لیتے تھے، جب دنیاوی مقام و مرتبہ میں زمین آسمان کا فرق ہو تو پوری عمر کے تعلق کون بناتا ہے، کم حیثیت لوگ دھوکا کھا کر اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں، شروع سے ہی حقیقت حال کا خیال رکھا جائے تو نہ مالی خسارہ ہو نہ ذہنی صدمہ۔ "چہرہ" میں جیسے ایک خبیث، بدفطرت، ہرجائی اور بھنورا صفت شخص کو چوٹ لگائی گئی ہے وہ پوری زندگی ٹیس محسوس کرتا رہے گا۔ "مفید، غیر مفید" میں بزرگوں سے ایسا غیر ذمہ دارانہ رویہ اور بیزاری گناہوں میں اضافے والی بات ہے۔ ان کی دعائیں زبان سے ادا ضرور ہوتی ہیں لیکن دل سے نکلتی ہیں جن کے مول تول کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ "ادھورا حسن" میں واقعی سچے جذبے اور والہانہ خواہشیں جیت گئیں، حقیقی حسن کو پوجنے والے کو بے داغ چاند کی رفاقت حاصل ہو گئی، کہانی کے شروع کے واقعات میں ٹھہراؤ اور بوریت کا گمان ہونے لگا تھا لیکن آخر کے ڈیڑھ صفحہ میں انکشافات کا دھماکا خیز مواد بھرا ہوا تھا جس نے قارئین کا تناؤ دور کر دیا ہوگا اور چہرے پر طمانیت کے سارے رنگ بکھر گئے ہیں۔ "بدروحیں" کی عرشی اپنی بدزبانی

کو بگاڑ کا سبب سمجھ رہی ہے۔ دراصل ان کا بھائی غیر ذمہ دار اور خود غرض تھا۔ اپنی خوشیوں میں ایسا مگن ہوا کہ بہنوں سے نگاہیں پھیر لیں جو جوان اور کنواری تھیں، انہیں مخلص سرپرست کی ضرورت تھی، نرگس نے اپنی محرومیوں کا انتقام بھی عرشی سے لیا اور حالات کو ایسے اسٹیج پر لے گئی جہاں رشتوں کی بے حسی اور چاروں بہنوں کی بربادی باقاعدگی سے شروع ہو گئی۔ اگر بھائی کی نیت آج بھی سیدھی ہو جائے تو ڈوبتی کشتی کو سہارا مل سکتا ہے بس ذہنی طور پر تبدیل شدہ حقیقی حالات کو قبول کرنا ہوگا۔"

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے لکھتے ہیں۔ "اپریل کا شمارہ گہری سوچ میں ڈوبی ماڈل اور ایک معصوم و پیاری سی بچی کی پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ ملا۔ معراج رسول صاحب اپنے اداریے میں ایک چھوٹی سی کہانی میں معاشرے کے ایک ناسور یعنی رشوت کے حوالے سے لکھ رہے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم عہد کر لیں کہ نہ رشوت دیں گے اور نہ لیں گے تو نہ صرف ہماری زندگیوں میں سکون و برکت آ جائے گی بلکہ ہماری آنے والی نسلیں بھی آسودہ زندگی پائیں گی۔ بانو قدسیہ نے کہا تھا "حرام مت کھاؤ، ورنہ تمہاری آنے والی نسلیں دیوانی ہو جائیں گی۔" اس دفعہ "شعور خیال" کی صدارت نزاہت افشاں کے پاس تھی۔ ان کا تبصرہ بہترین تھا اور اردو ادب پر ان کی تحقیق لائق تحسین ہے۔ حنیف ادیب کو ہم بھی یہی سمجھے کہ ڈاکٹر اور ادیب ہیں۔ آپ نے وضاحت کر دی، تبصرہ اچھا تھا۔ سدرہ بانو ناگوری بھی خوب لکھتی ہیں۔ حاجی عبدالرحمٰن کی تجویز سے اتفاق کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی زندگی و طرز حکمرانی کے حوالے سے ایک تفصیلی و تحقیقی مضمون ہونا چاہیے۔ آفتاب احمد نصیر بھی چند ماہ بعد نظر آئے، اللہ کے ولی کی محبت میں انہوں نے مختصر مگر بہترین لکھا۔ سید امتیاز حسین بخاری کا تبصرہ بھی دلچسپی سے پڑھا۔ خط کے شروع میں انہوں نے لکھا، اپنے پسندیدہ چیدہ چیدہ صفحات پر نظر ڈالی اور پھر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ ان سے پوچھنا ہے کہ انہوں نے سارا تبصرہ پھر نیند کی آغوش میں ہی لکھا؟ ناصر حسین رند! ماؤں کا نعم البدل دنیا میں نہیں ہوتا، ان کی باتیں اور یادیں دل کا سہارا ہیں۔ بوعلی سینا کی کہی بات یاد آ گئی۔ "اپنی زندگی میں محبت کی سب سے اعلیٰ مثال تب دیکھی جب سیب چار تھے اور ہم پانچ تب ماں نے کہا مجھے سیب پسند ہی نہیں۔" خوشی ہوئی کہ آپ پھر سے سرگزشت میں باقاعدہ شامل ہو گئے ہیں۔ نازلی ناز تبصرے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ، آپ کا انداز بیاں بھی اچھا ہے۔ اس دفعہ ڈاکٹر ساجد امجد معروف ادیبہ و ڈراما نگار فاطمہ ثریا بجیا کی زندگی کے بہت سے گوشوں سے پردہ اٹھا رہے تھے۔ فاطمہ ثریا بجیا نے ادب کی دنیا میں یقیناً ایک عالم کو مسخر کیا۔ پی ٹی وی کے دنوں میں پوری فیملی جس طرح ان کے ڈرامے عروسہ کا انتظار کرتی تھی، وہ آج بھی یاد ہے۔ عروسہ کی آخری قسط دیکھنے کے بعد یوں لگتا تھا جیسے ہمارا کوئی اپنا ہم سے بچھڑ گیا ہے جس سے اب ہر ہفتے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ انہوں نے بہت زبردست ڈرامے لکھے زندگی بھر ادب کی خدمت کی، وہ حقیقی [illegible] مسلسل کی عملی تصویر تھیں۔ زویا اعجاز اس دفعہ وسیب کے ایک بڑے سرائیکی شاعر شاکر شجاع آبادی کی زندگی کے تلخ حقائق پر لکھ رہی تھیں۔ ان کی زندگی جتنی دردناک ہے اس سے زیادہ دردناک وہ سلوک ہے جو وسیب نے اس بڑے شاعر کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہم واقعی مردہ پرست ہیں، زندگی میں انسان کو اچھی صحت اور اچھی خوراک نہیں دے سکتے۔ مرنے کے بعد اسے مراعات اور ایوارڈز سے نوازا جاتا ہے۔ کاش کہ ہم اپنے زندہ لیجنڈز کو ان کا حق انہیں دے سکیں۔ سرائیکی پٹی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں آنکھ کھولنے والے اس بڑے شاعر کے دکھوں اور اذیتوں کو نہ جانے کب راحت ملے گی۔ زریں قمر نے بھارت کی ایک بڑی شاعرہ کی زندگی کا عکس دکھایا۔ کملا داس سے اپنا سفر شروع کرنے والی پیاسی روح بالآخر کملا ثریا پر آ کر سیراب ہو گئی۔ اس بڑی شاعرہ نے جس جرأت و بہادری سے ایک انتہا پسند معاشرے میں اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا یہ جرأت و بہادری بھی اسے قدرت نے ہی عطا کی تھی جس نے اسے سکون و اطمینان بخشا تھا۔ ڈاکٹر اقبال ہاشمانی کراچی کے ماضی کو بڑے ہی دلنشین انداز میں یاد کر رہے تھے۔ تحریر دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ معلوماتی بھی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جو لوگ اپنے ماضی اور اپنے اسلاف کی بنائی عمارات و دیگر چیزوں کو بھلا دیتے ہیں۔ تاریخ بھی بالآخر انہیں بھلا دیتی ہے۔ شکیل صدیقی نے اردو ادب کے ایک منفرد شاعر مجید لاہوری پر منفرد تحریر لکھی۔ مجید لاہوری کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی میں بھی مزاح کا عنصر نمایاں تھا۔ نمکین شاعری اور اپنے رسالے "نمکدان" کی وجہ سے شاید وہ نمک لاہوری کہلائے۔ ندیم اقبال کا سفرنامہ دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ واقعی نفیس احساس پھولوں کی پتیاں بھی پاؤں تلے آنے سے ڈر جاتا ہے کہ پھولوں کو بھی مسکرا کر دیکھتے ہیں، کہیں وہ روٹھ نہ جائیں، خوب ندیم بھائی۔ ولید چیمہ کی "کیوبا ہے فراز" انوکھے انداز کی دلچسپ تحریر تھی۔ سلمٰی اعوان نے شام کی شاعرہ مونا عمیدی پر بہت عمدہ لکھا۔ مونا عمیدی نے شام کے دکھ اور اذیت کو جس انداز میں دنیا کے سامنے آشکار کیا وہ منفرد بھی اور انوکھی بھی ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ عرب ممالک اپنے عرب مسلمان بھائیوں کا ساتھ نہیں دے رہے۔"

تاخیر سے موصول خطوط: اشرف علی ترمذی، ملتان۔ ثاقب احمد، جہلم۔ اعجاز احمد، مظفر گڑھ۔ عباس بٹ، لاہور۔ سہیل احمد، حیدرآباد۔ یٰسین ناصر، چنیوٹ۔ زاہد علی زاہد۔ کراچی۔



سفیر امن

ڈاکٹر ساجد امجد

اس نے ایک معمولی گھرانے میں جنم لیا اور اپنی صلاحیتوں سے، قلم کی قوت سے شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ اس کی شاعری پوری دنیا میں پسند کی جانے لگی تھی۔ اسے نوبل انعام بھی ملا مگر وہ اپنے ہی ملک میں غدار کہلاتا تھا۔ اسے ملک بھر کی پولیس تلاش کرتی رہتی تھی۔ وہ اربابِ اقتدار کے لیے بھیانک خواب کی مانند تھا۔

ایک بہت بڑے قلم کار کا زندگی نامہ

ڈونجوس اینجل ریز بڑھاپے کی دہلیز سے بھی بہت آگے نکل آیا تھا لیکن بڑے خاندان کی بڑی ضرورتیں۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اسے دن رات کام کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے پاس تھوڑی سی زمین تھی اور بہت سے بچے تھے یہ سب بڑے ہو گئے تھے لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ اگر میں کام نہ کروں تو فصلوں کی دیکھ بھال ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ دن بھر اپنے فارم میں کام کرتا اور رات کو بستر پر لیٹ کر کھانستا۔

جنوبی امریکا کے ملک "چلی" کا یہ دور افتادہ علاقہ "پرال" بارشوں اور انگور کی فصل کے لیے مشہور تھا۔ یہی وہ علاقہ تھا جہاں اینجل ریز اپنے چھوٹے سے فارم پر دن رات ایک کر رہا تھا۔ اس آمدنی میں اضافے کے لیے اس کے بیٹے شراب کشید کیا کرتے تھے۔ پرال میں یہ کاروبار خوب ترقی کر رہا تھا۔

اس کے تمام بیٹے باپ کا ہاتھ بٹا رہے تھے لیکن ایک بیٹا جوز ڈیل کارمین حالانکہ چھوٹا تھا لیکن بغاوت پر تلا ہوا تھا۔ بالآخر اس نے باپ کے فارم کو چھوڑ دیا اور ایک مزدور کی حیثیت سے ٹل شوانو کی بندرگاہ پر کام کرنے لگا۔ اس کے باپ کو اس کی یہ حرکت قطعی پسند نہیں آئی تھی لیکن کچھ دن کے بعد بحث و تمحیص کے بعد حالات پھر سے اپنی ڈگر پر چلے آئے۔ فارم میں انگوروں کی فصل پروان چڑھتی رہی، گھر میں شراب کشید ہوتی رہی۔ ڈیل کارمین بندرگاہ پر سامان اٹھاتا رہا۔ اس کا تنومند جسم اسے دوسرے مزدوروں پر فوقیت دیتا رہا۔

ملک کے وسطی حصوں میں چھوٹے کاشت کاروں کے لیے زندگی بہت دشوار تھی۔ غربت کی چکی میں پستے رہنے کے باوجود بہرحال زندگی کے ناز نخرے تو اٹھانے ہی پڑتے ہیں۔ یہاں بھی فقیری میں شاہی ہو رہی تھی۔ جوز ڈیل کارمین کے باپ نے بھی گھر کے رنگوں میں اضافہ کرنے کے لیے سوچا کہ اس کی شادی کر دی جائے شاید یہ سوچتے ہوئے اس نے یہ بھی سوچا ہو کہ اس طرح وہ مزدوری کی بجائے کھیتی باڑی میں دلچسپی لینے لگے۔ اس کی عقابی آنکھوں نے اِدھر اُدھر جائزہ لیا۔ اپنے ہی جیسے دوسرے کسانوں سے ذکر بھی کیا اور بالآخر ایک لڑکی پسند کر لی۔ اس کا نام ڈونا روزا باسالٹو تھا۔

سوچتی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں والی یہ لڑکی گھر میں آئی تو واقعی کچھ دنوں کے لیے رنگ سے بکھر گئے۔ ڈیل کارمین پورے ایک مہینے تک بندرگاہ کی گودی پر کام کرنے نہیں گیا۔ اس کے باپ نے سمجھا کہ وہ اب زمین کی دیکھ بھال پر لگ جائے گا لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا جب ایک صبح اس نے دیکھا کہ وہ بندرگاہ جانے کے لیے گھر سے نکل رہا ہے۔

اب اس نے کچھ بھی کہنا چھوڑ دیا تھا۔

دونوں میاں بیوی خوش تھے لیکن پھر اچانک ڈونا کی صحت خراب رہنے لگی۔ اس کے چہرے کی سرخی زرد ہوگئی۔ بڑی بڑی آنکھوں کی رونق کم ہوگئی۔ وہ حاملہ بھی تھی اس لیے یہی سمجھا گیا کہ ان دنوں میں عورتیں کمزور ہو ہی جاتی ہیں لیکن جب کمزوری بہت بڑھ گئی تو ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں کے انکشاف کے بعد ساری بات سمجھ میں آگئی۔ اسے تپ دق تھی۔ ڈیل کارمین کو اب یہ فکر ہوئی کہ اس کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ زندہ پیدا ہوتا ہے یا مردہ۔ بہت سے لوگ تو دبے لفظوں میں یہ کہہ رہے تھے کہ مردہ نہ ہو لیکن معذور تو یقیناً ہوگا۔ بہرحال یہ دن تو پورے کرنے ہی تھے۔ علاج بھی ہوتا رہا اور بچے کی پیدائش کا انتظار بھی۔

12 جولائی 1904ء کو جوز ڈیل کارمین اور ڈونا روزا باسالٹو کے وہ بچہ پیدا ہوگیا جس کا انتظار ہو رہا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ بچہ بھی زندہ تھا اور زچہ بھی۔

پرال کی گلیوں میں اس پیدائش کو خوش آیند قرار دیا جا رہا تھا۔

اس بچے کا نام نیفتال ریز رکھا گیا۔

جوز ڈیل کارمین نے اپنی بیوی سے وعدہ کیا۔ ”تم اب زچگی سے فارغ ہو چکی ہو۔ نیفتال بھی بالکل نارمل پیدا ہوا ہے البتہ تمہاری طرف سے مجھے اب بھی فکر ہے، میں بڑے قصبے میں لے جاکر تمہارا علاج کراؤں گا۔“

”اب شاید اس کی ضرورت نہ پڑے۔“

”کیوں؟“ جوز ڈیل نے تشویش سے کہا۔

”اس لیے کہ نیفتال کے آنے کے بعد تم مجھ سے یقیناً اتنا پیار کرنے لگو گے کہ میں خود بخود ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

”اب تک کیا پیار نہیں کرتا تھا۔“

”نہیں نہیں میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔ تم ضرور میرا علاج کرنا۔ مجھے نیفتال کے لیے زندہ رہنا ہے۔“

اسے واقعی اپنے بیٹے نیفتال کے لیے زندہ رہنا تھا لیکن موت کے ہاتھ زندہ رہنے دیتے تب نا۔ وہ صرف ایک ماہ بعد مرگئی۔ موت نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس کا بچہ ابھی صرف ایک ماہ کا ہے، صرف ایک ماہ کا۔ جوز ڈیل اسے دفنا کر آیا، نیفتال پڑوس کی ایک عورت کی گود میں تھا۔ تو کیا میرا بیٹا پڑوس کی عورتوں کی گود میں رہنے کے لیے پیدا ہوا ہے؟ اس نے سوچا ضرور لیکن اس کے سوا اب اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔

ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا تھا اور ہو کے رہا۔ اس نے دوسری شادی کرلی۔ اس کی دوسری بیوی کا نام ڈونا ٹری نیڈاڈ تھا۔

اب یہ ننھے نیفتال کی خوش قسمتی کہ اسے سوتیلی ماں سگی سے بڑھ کر ملی۔ اس نے اس سے سوتیلے بیٹے کے بڑے ہونے تک سرپرستی کا حق ادا کردیا۔

☆......☆

جوز ڈیل کارمین بندرگاہ کے قریب جہاں وہ مزدوری کرتا تھا ایک چھوٹے سے شراب خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس شراب خانے کا رخ کم ہی کیا کرتا تھا لیکن اس روز اس کا ایک دوست وسطی چلی کے قصبے ٹی میو کو سے اس کے پاس ملنے آیا ہوا تھا۔ وہ اسے لے کر اسی شراب خانے میں بیٹھ گیا اور وہی باتیں ہونے لگیں جو پرال کے رہنے والے اکثر آنے جانے والوں سے کیا کرتے تھے۔

”بھائی چھوٹے کاشت کاروں کے لیے تو یہاں زندگی بہت دشوار ہے اور پھر مجھ جیسے آدمی کے لیے جس کا کنبہ بڑا ہو۔“

”مزدوری سے تمہیں کیا مل جاتا ہوگا۔“

”کچھ بھی نہیں۔ کچھ ایسا خاص نہیں البتہ یہ اطمینان رہتا ہے کہ اگر بارش زیادہ ہوگئی تو بھی دہاڑی ماری نہیں جائے گی کیونکہ فصل خراب ہو جائے تو آمدنی ضرور ماری جاتی ہے۔“

”تم میرے ساتھ ٹی میو کو چلو۔ دوگنی آمدنی ہو جائے گی تمہاری۔“

”وہاں میں کیا کروں گا۔“

”میں وہاں کے محکمہ ریلوے میں ملازم ہوں۔ تمہیں بھی وہاں نوکر کرادوں گا۔ تنخواہ بھی اچھی ہوگی اور محنت بھی کم۔ سیر سپاٹے کے مواقع الگ ملیں گے۔ ریل پر سوار ہوئے اور دھواں اڑاتے ہوئے چلے گئے۔“

”معلوم نہیں میری بیوی جانے پر تیار ہو یا نہ ہو۔“

”میں عورتوں کو خوب جانتا ہوں۔ یہ مخلوق ہی ایسی ہے کہ نئی نئی جگہوں پر رہنا پسند کرتی ہے۔ تم کہہ کر تو دیکھو۔“

”میں پوچھ کر دیکھوں گا۔“

”اگر آنے کا ارادہ ہو تو خط لکھ دینا تاکہ میں نوکری اور رہائش کا انتظام کرسکوں۔“

جوز ڈیل کارمین کا دوست رخصت ہوگیا لیکن ایک راہ سجھا گیا۔ جوز ڈیل نے پکا ارادہ کرلیا کہ وہ پہلی فرصت میں ٹی میو کو جائے گا۔ اس کا بیٹا نیفتال بھی اتنا بڑا تو ہو ہی گیا تھا کہ نئی جگہ کی سیر کا لطف اٹھا سکتا تھا۔

وہ ٹی میو کی ریلوے میں ملازم ہوگیا۔ اسے تجرباتی ریل گاڑی میں کنڈیکٹری کی پیشکش ہوئی تو وہ یہ پوچھنے پر مجبور ہوگیا۔

”یہ تجرباتی ریل گاڑی کیا ہے؟“

”یہ علاقہ جہاں تم بیٹھے ہوئے ہو یہاں طوفانی ہوائیں چلتی ہیں۔ ریل کی پٹڑیوں کو اگر ان کے درمیانی حصوں کو پتھروں سے صحیح طور پر نہ بھرا جائے تو بہا کر لے جاسکتی ہیں۔ تجرباتی ریل گاڑی کو پتھر کی کانوں سے نکالا جاتا ہے اور ٹوٹا ہوا پتھر کھلے ڈبوں میں لادا جاتا ہے۔ اس قسم کی ریل گاڑی پر کام کرنے والے عملے کو آہنی تن و توش کا ہونا پڑتا ہے۔ تمہاری عمدہ صحت کو دیکھتے ہوئے ہی تمہیں اس تجرباتی ریل کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔“

آتش فشاں پہاڑوں کے دامن میں برف پوش چوٹیوں کے قریب قریب وسیع و عریض جھیلوں کے درمیان مہکتا ہوا چلی کا پُرسکون جنگل اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ یہاں کی بے تحاشا بارشیں بھی اسے اپنی طرف کھینچتی تھیں لیکن بارش کے بعد گلی میں پھیلا ہوا کیچڑ کا سمندر اسے ہرگز پسند نہیں تھا۔ یہ تو اسے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ سیلاب بھی آتے ہیں اور دریا کے کناروں پر غریبوں کی بسی ہوئی آبادیاں بہالے جاتے ہیں۔

ٹی میو ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ ایک ایسا قصبہ جس کا کوئی ماضی نہیں تھا۔ لوہے کے کاروبار کی دکانیں جابجا تھیں۔ قبائلی انڈین پڑھ نہیں سکتے تھے لہٰذا دکانوں کے باہر پُرکشش نشانات لٹکے نظر آتے تھے۔ ایک بہت بڑی آری، بہت بڑی دیگچی، دیوقامت چمچہ، آگے چلتے ہوئے جوتوں کی دکان پر ایک بہت بڑا جوتا۔

ٹی میو چلی کی جنوبی سرحدوں پر انتہائی آخری چوکی تھی۔ اس کے پیچھے ایک طویل خونچکاں تاریخ موجود تھی۔ جب تین سو سال کی لڑائیوں کے بعد اسپین کے فاتحین نے انہیں پیچھے دھکیل دیا اور آراکینیا کے انڈین ان سرد علاقوں میں چلے گئے لیکن چلی کے لوگوں نے آگ اور خون کی ان جنگوں کو جنہیں وہ آراکینیا کی صلح کی کوششوں سے تعبیر کرتے رہے تھے جاری رکھا۔

جب نیفتال ریز ذرا اور بڑا ہوگیا تو اس کا باپ اسے اپنے ہمراہ لے جانے لگا۔ وہ کان سے پتھر لادتے اور ہسپانویوں اور آراکینیا کے عوام کے درمیان ہونے والی خونی جنگوں کے مشہور سرحدی علاقے کے قلب میں واقع جگہ بوردا تک لے جاتے۔ اسے کوئلوں سے تو کوئی غرض نہیں تھی لیکن پرندے، بھنورے اور تیتروں کے انڈے اسے بہت اچھے لگتے۔ یہ پہلی مرتبہ تھا جب فطری مناظر سے وہ متعارف ہو رہا تھا۔

اس کی دلچسپی کو جب دیگر مزدوروں نے دیکھا تو وہ بھی اسے خوش کرنے کے لیے جنگل میں چلے جاتے اور اس کے لیے حیران کن خزانے تلاش کرکے لاتے۔ ان میں ایک شخص مونگے تھا جو اس کے لیے سب سے زیادہ چیزیں لے کر آتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اس کے لیے انتہائی چمکدار بھنورا پکڑ کر لایا۔ قوس قزح کے رنگوں میں ملبوس چمکتا ہوا ایسا بھنورا اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ بجلی کے کوندے کے مانند اس کے ہاتھ سے نکل کر دوبارہ جنگل میں غائب ہوگیا۔ مونگے جا چکا تھا۔ ورنہ وہ اس سے کہتا کہ یہ بھنورا دوبارہ پکڑ کر لادے۔ چند روز بعد ہی معلوم ہوا کہ مونگے چلتی ہوئی گاڑی سے گرا اور چٹان سے لڑھکتا ہوا نیچے جا پڑا۔ جب تک گاڑی رکتی وہ ہڈیوں کا ڈھیر بن چکا تھا۔ اسے مونگے کی موت سے زیادہ یہ افسوس تھا کہ وہ بھنورا اسے دوبارہ نہیں مل سکے گا۔ اس کی سوتیلی ماں نے اس کا صدمہ کم کرنے کے لیے اسے ایک بڑے صندوق کے سامنے لے جاکر کھڑا کردیا۔ ”اس میں تمہاری دلچسپی کی بہت سی چیزیں ہیں۔“

اس صندوق میں سب سے پہلے جس چیز پر اس کی نظر پڑی وہ ایک تصویر تھی۔ یہ تصویر سیاہ لباس میں ملبوس ایک نازک اندام خوابناک خاتون نظر آتی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں نے کمال عجلت سے اس تصویر کو چھپانا چاہا لیکن چھپا نہ سکی اور اسے بتانا پڑا۔

”یہ تمہاری ماں کی تصویر ہے۔ یہ بڑی اچھی عورت تھی۔ نظمیں بھی لکھتی تھی۔“

”میری ماں نظمیں بھی لکھتی تھیں؟“

”ہاں۔“

”کہاں ہیں وہ نظمیں۔“

"وہ تو ڈھونڈنی پڑیں گی اور پھر تم ابھی چھوٹے بھی ہو۔ جب بڑے ہو جاؤ تو ان نظموں کو ضرور پڑھنا۔"

"میں اپنی ماں کو تو دوبارہ نہیں لا سکتا لیکن اس جیسی نظمیں لکھ کر اس کی روح کو بتاؤں گا کہ ماں، میں تمہارا بیٹا ہوں اسی لیے نظمیں لکھتا ہوں۔" اس نے کہا اور مزید کچھ دیکھے بغیر صندوق کے سامنے سے ہٹ گیا۔

وہ بہت دن تک اس تصویر اور گم شدہ نظموں کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے تو ابھی یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ نظمیں لکھی کیسے جاتی ہیں ورنہ وہ لکھ بھی لیتا۔

اب وہ اتنا بڑا ضرور ہو گیا تھا کہ اکیلا ہی جنگل میں نکل جاتا۔ اس کے پاؤں سوکھے پتوں میں دھنستے، کوئی نازک ٹہنی ٹوٹتی، ایک پرندہ سرد جنگل سے ہوتا ہوا اوپر سے گزرتا، اپنے پروں کو پھڑپھڑاتا اور سورج سے محروم شاخوں میں ٹھہر جاتا اور پھر اپنی مدھر آواز میں گاتا جیسے سکوت میں بانسری نے شور مچایا ہو۔

اسی طرح مدھر موسیقی کی تانوں پر اس کا بچپن رقص کرتا رہا۔

اچانک کسی نے اس سے اس کی یہ موسیقی چھین لی۔ اس کے باپ نے حکم سنایا کہ اب تم اسکول جایا کرو گے۔ اسے جنگل چھن جانے کا ذرا بھی دکھ نہیں ہوا۔ وہ خوشی خوشی تیار ہوا اور اسکول کی طرف چل دیا۔ اس کی عمر اس وقت چھ سال تھی۔ وہ اسکول پہنچا تو یہ بھی اسے کسی جنگل سے کم معلوم نہ ہوا۔ یہ ایک شکستہ عمارت تھی جس کے کمروں میں برائے نام فرنیچر تھا۔ اسکول کے بچے اسے جنگل کے پرندے معلوم ہوتے تھے۔ وہ جلد ہی ان پرندوں میں گھل مل گیا۔

تعلیم کے اس جنگل میں بھی اس نے اپنی دلچسپی کا سامان ڈھونڈ ہی لیا۔ وہ اسکول سے خوب صورت دریائے کاؤ تین کو دیکھا رہتا جو نیچے وادی میں بل کھاتے ہوئے رستہ بناتا چلا جاتا تھا۔ دریا کے کنارے جنگل میں سیبوں کے درخت تھے۔ رفتہ رفتہ اس نے چند شرارتی ہم خیال بنا لیے۔ یہ سب موقع پاتے ہی کلاس سے غائب ہو جاتے اور نیچے سفید پتھروں پر دوڑتے ہوئے دریا کے سرد پانی میں اپنے پیروں کو ڈبویا کرتے۔

چھ سالہ نیفتال ریز کے مزاج میں اسرار پسندی تھی۔ وہ ان چیزوں کی طرف دوڑتا تھا جس میں اسے پُراسراریت نظر آتی۔ فزکس کی لیبارٹری جس میں اسے داخلے کی اجازت نہیں تھی، اس کے لیے پُراسرار تھی۔ باہر سے نظر آنے والے چمکدار آلات اسے پُراسرار معلوم ہوتے تھے۔ لائبریری ہمیشہ بند رہتی پھر ایک دن اس نے ایک پُراسرار دنیا فتح کر لی۔ وہ اسکول میں بنے ہوئے تہہ خانے میں اتر گیا۔ گہری خاموشی اور گہری تاریکی نے اس کے اندر چھپی ہوئی پراسراریت کو بیدار کر دیا۔ اگر یہاں خاطر خواہ روشنی ہو جائے تو اسکول میں اس سے اچھی جگہ کوئی اور نہیں۔ وہ الٹے قدموں لوٹ آیا۔ دوسرے دن وہ چند موم بتیاں لے آیا۔ ہم خیال لڑکوں کو ساتھ لیا اور تہہ خانے میں اتر گیا۔ موم بتیاں روشن کیں اور کھیلنا شروع کر دیا۔ ان بچوں نے آنکھ کھولتے ہی جنگیں ہوتی دیکھی تھیں لہٰذا دو پارٹیاں بن گئیں اور جھوٹ موٹ کی جنگ شروع ہو گئی۔

روز یہی کھیل ہوتا۔ فاتح اپنے قیدیوں کو بڑے بڑے ستونوں سے باندھ دیا کرتے۔

ذرا اور بڑا ہوا تو اسے کتابیں اچھی لگنے لگیں۔ سفر نامے پڑھنا اسے اچھے لگتے تھے۔ ان سفر ناموں کے ذریعے وہ دور دراز کی دنیاؤں کی سیر کر لیا کرتا تھا۔ اس میں بھی اس کی اسرار پسندی پوشیدہ تھی۔ وہ خود تو کہیں جا نہیں سکتا تھا، ان سفر ناموں کے ذریعے ملکوں ملکوں گھوم رہا تھا۔

اسے بارشیں اچھی لگتی تھیں۔ بارشوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی خوب مل رہا تھا کیونکہ یہاں بارشیں بہت ہوتی تھیں لیکن سمندر دیکھنا اس کی سب سے بڑی خواہش تھی کیونکہ وہ یہاں نہیں تھا۔ یہاں تو بارش تھی، کیچڑ تھی اور کیچڑ میں پھنسی ہوئی بیل گاڑیاں تھیں۔

"ہم سمندر دیکھنے چلیں گے۔" ایک دن اس کے باپ نے گھر میں داخل ہوتے ہی یہ خوش خبری سنا دی۔

"ہم کہاں جائیں گے؟"

"صوبہ کراہیو تک گاڑی میں جائیں گے اور پھر کشتی کا سفر ہوگا اور پھر سمندر جس کی تمہیں بڑی آرزو ہے۔"

اس کی بیوی نے اتنے طویل سفر کی داستان سن کر پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔ "اس میں تو بہت وقت لگ جائے گا۔"

"ہاں ہم ایک ماہ کی چھٹیوں پر جا رہے ہیں۔ تم فکر مت کرو ہمارا زیادہ خرچا نہیں ہوگا۔ ریل کا سفر میرے لیے مفت ہے۔"

"ایک مہینا ہم ٹھہریں گے کہاں، کیا اس پر خرچ نہیں ہوگا۔"

"بالکل بھی نہیں۔ میرے ایک دوست نے اپنا گھر

ادھار دے دیا ہے۔"

"چلو پھر ٹھیک ہے۔ ہم یہاں سے صبح ہی صبح روانہ ہو جائیں گے۔"

نیفتال ریز یہ باتیں سن رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ اتنا خوش کہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ جب نیند آنے لگتی سمندر کا خیال اسے بیدار کر دیتا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ابھی کیا ہونے والا ہے۔

ابھی ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا کہ اس کے باپ کی کنڈیکٹروں والی سیٹی گونجی۔ اس نے سیٹی بجا بجا کر پورے گھر کو اٹھا دیا۔

"ابھی تو رات ہے۔" وہ بڑی مشکل سے منمنایا۔

"رات کے بچے، صبح ہو گئی ہے صبح کے چار بج رہے ہیں۔"

اس کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آیا کہ رات کے چار بجے کو صبح کے چار بجے کیوں کہتے ہیں۔ اس نے آنکھ کھول کر دیکھا تو سامان باندھا جا رہا تھا اور سامان بھی اتنا کہ لگتا تھا ہمیشہ کے لیے جا رہے ہیں۔ اس کا باپ جلدی کر رہا تھا۔ بار بار یاد دلا رہا تھا کہ باہر بیل گاڑی کھڑی ہے۔ جلدی کرو۔

جب سامان بندھ چکا تو بیل گاڑی پر لاد دیا گیا پھر وہاں ریلوے اسٹیشن۔

ریل گاڑی کا سفر ٹی میو اور کراہیو کے درمیان پھیلا ہوا تھا۔ سفر شروع ہوا۔ ریل گاڑی وسیع و عریض پھیلی ہوئی زمینوں سے ہوتی ہوئی جنگلوں میں داخل ہوئی، پلوں اور سرنگوں سے چیختی چنگھاڑتی گزرتی رہی۔

یہ ہسپانوی فاتحین اور چلی کے بیٹوں کے درمیان لڑی جانے والی خونریز جنگوں کا علاقہ تھا۔

نیفتال ریز ان مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور اسٹیشنوں کے نام پڑھتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ریل ان جنگلوں سے گزر آئی اور پھر وہ دریا کے کنارے آباد شہر آ گیا۔

یہ آخری اسٹیشن تھا۔ اس کے بعد کشتی کا سفر درپیش تھا۔ سامان ایک مرتبہ پھر ایک بیل گاڑی پر لاد دیا گیا۔ اس بیل گاڑی نے سامان کو کشتی تک پہنچا دیا۔ اس سامان کو بدقت کشتی میں ٹھونسا گیا۔ یہ ٹھونسنے میں پریشانی بہت تھی لیکن یہ خوشی تھی کہ یہ کشتی اسے سمندر تک پہنچا دے گی بلکہ اس سے پہلے اس گھر تک جہاں ہمیں عارضی طور پر ٹھہرنا تھا۔

کشتی کے پہیوں نے پیڈلوں کی مدد سے دریا کی لہروں کو کاٹنا شروع کیا۔ انجنوں نے شور مچایا اور کشتی دریا کے سینے پر آگے بڑھنے لگی۔

یہ سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا جب کہ نیفتال تو یہی چاہتا تھا کہ دریا کبھی ختم نہ ہو، سفر کبھی نہ تھمے۔ کشتی کنارے لگی اور سامان اتارا گیا۔

ایک بیل گاڑی نے اسے اس مکان تک پہنچا دیا جہاں اس خاندان کو قیام کرنا تھا۔ مکان کے دروازے پر ایک دیوقامت کسان تھا۔ اس کے جسم بھوسے اور گندم کی خاک سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے خوش آمدید کے الفاظ کہے تو یہ معلوم ہوا جیسے بہت سے لوگ ایک ساتھ بول رہے ہوں۔

"یہ ڈان ہورنیکیو ہے۔ اس مکان کا مالک۔"

نیفتال کو تو یہ آدمی بھی پُراسرار لگا۔

اس کے چلے جانے کے بعد نیفتال اس گھر کا جائزہ لینے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ مکان کی دیواروں پر انگوروں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں جو بتا رہی تھیں کہ سینکڑوں برساتیں ان دیواروں کا منہ چومتے ہوئے گزر چکی ہیں۔ اس گھر میں ایک بہت بڑا باغ بھی تھا جو انسانی بے توجہی کا ثبوت دے رہا تھا۔ ناتراشیدہ پودے پیاسے بھی تھے اور غم زدہ بھی۔ ہر طرف گلاب کے پھول اگے ہوئے تھے لیکن ان کے چہرے ایسے اداس تھے کہ انہیں توڑنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

اس گھر میں اسے ہر چیز پراسرار لگی۔ اجاڑ گلیاں، اجنبی زندگیاں اور دور سمندر کی اچھال کی غراہٹ۔

اس کے بعد پورا خاندان مل کر سمندر پر گیا۔

پہلی بار جب وہ سمندر کے سامنے کھڑا ہوا تو جیسے مدہوش ہو گیا۔ عظیم سمندر نے اپنے غیظ و غضب کو وہاں بڑی دو پہاڑیوں کے درمیان آزاد کر رکھا تھا۔ ہمارے سروں سے خاصے فاصلے پر یہ صرف بے پناہ برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں ہی نہیں تھیں بلکہ ایک بہت بڑے دیوقامت دل کی بلند آواز دھڑکن بھی تھی اور یہ تھی کائنات کے دل کی دھڑکن۔

اس نے ہر طرف سے بے پروا ہو کر نہانا شروع کر دیا۔ وہ اور اس کی بہن لاراخ پانی کی لہر سے بھیگ چکے تھے۔ اتنا نہائے کہ دانت بجنا شروع ہو گئے۔ پسلیاں نیلی پڑ گئیں۔ پانی سے نکلنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اگر اس کا باپ ریلوے کی وسل بجا کر اسے باہر نکلنے کو نہ کہتا تو سمندر انہی پہاڑوں میں سے کسی ایک پر اسے اگل دیتا۔

سمندر کے کنارے آباد اس شہر میں اس نے ایک مہینا گزارا۔ یہاں کی ہر شے میں وہ پُراسراریت تھی جو اسے عشق

اور شاعری کی طرف لے جارہی تھی لیکن ابھی اسے اس کا شعور نہیں تھا۔

اس شعور نے اس وقت آنکھ کھولی جب وہ ٹی میو کو واپس آیا اور اسکول جانے لگا۔ اس نے اس وقت تک بہ مشکل لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔ اس میں ایک شدید جذبہ پیدا ہوا۔ کچھ بے ترتیب سے لفظ اس کے ذہن میں ابھرے لیکن اس کا جی چاہا کہ اسے کاغذ پر اتار لے۔ پُراسرار چیزوں سے اسے ہمیشہ سے پیار تھا اور یہ پُراسرار لفظ تھے۔ اس زبان سے مختلف جو وہ بولتا تھا۔ اسے تجسس ہوا کہ اسے کاغذ پر اتارے۔ اس کے خیال میں یہ شاعری تھی اور یقیناً یہ شاعری تھی۔ تو کیا میں نے اپنی مری ہوئی ماں سے کیا ہوا وعدہ پورا کرلیا۔ میں نے کہا تھا میں اپنی ماں کی طرح نظمیں لکھا کروں گا۔ اس نے اپنی زندگی کی پہلی نظم لکھ لی تھی۔

کوئی شے میری روح میں حرکت میں آتی ہے
بخار یا بھلا دیے گئے پَر
اور میں نے اس آگ میں بڑھتے ہوئے
خود اپنا راستہ تلاش کیا
اور پہلی مبہم سطر رقم کی
مبہم۔ کسی مواد کے بغیر مگر خالص
اصلی دانائی کسی ایسے شخص کی
جو کسی بات سے واقف نہیں
اور اچانک میں نے دیکھا
کہ آسمانوں کے در مجھ پر کھل گئے تھے

اس کا جی چاہا کہ اس نظم کو وہ کسی کو دکھائے۔ اس میں ابھی فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کی تخلیق پر کوئی اور فیصلہ دے۔ کوئی اور کون ہوسکتا تھا۔ بچے کے لیے اس کے والدین۔

اس وقت اس کے والدین کھانے کے کمرے میں باتوں میں مصروف تھے کہ وہ دخل درمعقولات کی طرح کمرے میں داخل ہوگیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا جس پر نظم لکھی ہوئی تھی۔

اس کے باپ نے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ بے دلی سے پڑھا اور اسی بے دلی سے واپس کردیا۔

''یہ تم نے کہاں سے نقل کی ہے۔'' اس کے باپ نے کہا اور اس کی ماں سے باتوں میں مصروف ہوگیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو جیسے کچھ پڑھا ہی نہ ہو۔

کاغذ کا پرزہ نیفتالی کے ہاتھوں میں تھا اور آنکھوں میں نظر نہ آنے والے آنسو تھے۔ وہ فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس طرح اس کی پہلی نظم نے جنم لیا اور اس طرح پہلی بار اس نے غیر ذمہ دار ادبی تنقید کا نمونہ دیکھا۔ مگر یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ شاید یہ نظم اسی قابل تھی کہ اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا۔ مجھے اب اپنی نظموں کو اس قابل بنانا ہے جس پر سب کی توجہ مبذول ہو۔ کوئی نہیں تھا جس سے وہ اپنی راہ متعین کرنے کے لیے مشورہ کرتا۔ دراصل وہ اتنا کم عمر تھا کہ کسی بڑے سے اس کی دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تجسس کی دنیا میں کتابوں کے جوشیلے دریاؤں میں تنہا ملاح کی طرح پھرتا رہا۔ مطالعہ کا شوق ایسا بڑھا کہ دن رات کتابیں ہاتھ میں رہتیں۔

اسکول کی جماعتیں بھی آگے بڑھتی جارہی تھیں۔

اس کا یہ شوق مطالعہ جاری تھا کہ لڑکیوں کے اسکول میں ایک نئی پرنسپل آئی۔ طویل القامت اور ڈھیلے ڈھالے لمبے لباس والی۔ یہ خاتون ٹی میو کی نہیں تھی بلکہ اس کا تعلق برفباریوں کے علاقے کے انتہائی جنوبی شہر میگیلان سے تھا۔ خود اس کا نام گیبریلا مسترال تھا۔

نیفتالی ریز کو اسے دیکھ کر وحشت سی ہوتی تھی بلکہ اسے دیکھ کر ڈر جاتا تھا لیکن اسکول ہی کی کسی ٹیچر کے ذریعے جب وہ اس سے ملا تو خوف دور ہوگیا۔ اسے تو وہ نہایت پروقار خاتون معلوم ہوئی۔ وہ اس سے دوستی کے لیے بہت چھوٹا تھا اور مستزاد یہ کہ شرمیلا تھا۔ سر جھکائے، آنکھیں نیچے کیے کھڑا رہا۔ غالباً پرنسپل خاتون کو اس کے ذوق مطالعہ کے بارے میں معلوم ہوچکا تھا لہٰذا اس نے سوالات پوچھنے شروع کردیے کہ کن موضوعات پر پڑھتے ہو۔ کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ وہ اٹک اٹک کر جواب دیتا رہا۔

''میں پڑھنے کے لیے تمہیں کتابیں دیا کروں گی۔ اس شرط پر کہ پڑھ کر واپس کردیا کرو گے۔''

''جی بہتر۔''

وہ اسے کتابیں دیتی رہی۔ یہ کتابیں کم و بیش روسی ناول ہوتے جنہیں وہ دنیائے ادب میں غیر معمولی کتابیں کہتی تھی۔ اس طرح اس نے نیفتالے ریز کو روس کے گہرے اور خوفناک تصور والے ناول نگاروں سے متعارف کرایا اور اس طرح ٹالسٹائی، دوستوفسکی اور چیخوف اس کی ذات کا حصہ بنے۔

چھوٹے سے ساحلی قصبے پیورٹو ساوا ڈیرا میں اسے ایک پبلک لائبریری مل گئی۔ وہ اب گھوڑے پر سوار ہونے لگا تھا

لہٰذا وہ اس لائبریری میں جا کر بیٹھ جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آدھی لائبریری خالی کر ڈالی۔ یہاں اس نے شاعری کے مجموعے بھی کھنگال ڈالے۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ شاعر کیا سوچ رہے ہیں۔ سامراجیت اور جمہوریت میں کیا فرق ہے۔ کہاں کہاں انقلاب دستک دے رہا ہے۔ پہلی جنگ عظیم نے کس طرح انسانوں اور انسانیت کو قتل کیا ہے ان سب سے واقفیت ہوگئی۔

ایک روز وہ لائبریری میں بیٹھا تھا کہ ایک بوڑھا شخص اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ''میرا نام ڈان آگسٹو ہے اور تمہارا؟''

''نیفتالے ریز۔''

''میں تمہیں روز یہاں کتابیں پڑھتے ہوئے دیکھتا ہوں۔''

''میں دنیا کا پہلا آدمی نہیں جو ایسا کرتا ہوں۔''

''تمہاری عمر کے لڑکے بہت کم ایسا کرتے ہیں۔ میں تمہارے ادبی جذبے سے بہت متاثر ہوں۔''

''میری ماں نظمیں لکھتی تھی۔ کم از کم مجھے یہی بتایا گیا ہے۔''

''بتایا گیا ہے؟ کیا مطلب؟''

''میں صرف ایک مہینے کا تھا کہ وہ مرگئی۔ میں نے اس کی کوئی نظم نہیں دیکھی۔''

''اوہ! میرے معصوم بچے تو کیا تم بھی نظمیں لکھتے ہو۔''

''ایک نظم لکھی تھی جو میرے باپ نے ٹھکرا دی۔ شاید وہ اس قابل نہیں تھی۔ اب میں کتابیں پڑھوں گا اور ایسی نظمیں لکھوں گا جنہیں میرا باپ کیا دنیا بھی رد نہ کرسکے۔''

''تمہارے باپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا تم وہ نظم مجھے سناؤ گے۔''

نیفتالی کو وہ نظم زبانی یاد تھی۔ اس نے وہ نظم سنا دی۔ بوڑھے نے جو خود بھی شاعر تھا اس نظم کو بہت پسند کیا اور اصرار کیا کہ وہ نظمیں لکھا کرے۔

اس نے بھی وعدہ کرلیا اور باپ کی نظروں سے چھپ چھپ کر نظمیں لکھنے لگا۔ اس کے باپ کو بھی کہیں سے سن گن لگ گئی تھی کہ اس کی ادبی سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں۔ وہ اس کے اسکول بھی گئے جہاں بہت سے لڑکوں سے معلوم ہوا کہ وہ شاعر ہوگیا ہے۔ اس کے والد نے اس پر نظر رکھنی شروع کردی۔ ایک آدھ مرتبہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کی۔ ان کو یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی کہ ان کا بیٹا شاعر بنے۔ اسی اثناء میں دوستوں کی طرف سے یہ تقاضا ہونے لگا کہ وہ اپنی نظموں کو شائع کروائے۔ وہ اب تک پانچ نظمیں کہہ چکا تھا۔ وہ چاہتا بھی تھا کہ نظمیں شائع ہوں لیکن نہیں چاہتا تھا کہ باپ کی نظروں سے گزریں۔ یہ اسی وقت ہوسکتا تھا جب یہ نظمیں اس کے نام سے شائع نہ ہوں۔ اس نے کسی ایسے نام کو ڈھونڈنا شروع کیا جو اس کے باپ کو گمراہ کرسکے۔ اس نے ایک رسالے سے ایک چیک نام کا انتخاب کرلیا۔ یہ جانے بغیر کہ یہ وقت کے بڑے ادیب کا نام تھا۔ وہ نیفتالے ریز سے پابلو نرودا بن گیا جو چیکوسلواکیہ کا بہت بڑا ادیب تھا۔ نرودا کے نام کو اپنانا پابلو نرودا کا خود کو محض اپنے ملک کا شاعر کہلوانے کے بجائے بین الاقوامی شاعر بننے کا اشتیاق ظاہر کرتا ہے۔

اسکول میں کئی سال کی تعلیم کے بعد سولہ سال کی عمر میں وہ اس قابل ہوگیا تھا کہ بظاہر سانتیاگو کی یونیورسٹی میں داخلے کے قابل ہے۔ اس کے دل و دماغ پر کتابیں اور شاعری سوار تھی اور اسے سانتیاگو بھیجا جارہا تھا۔

اس نے سانتیاگو میں ماروی اسٹریٹ کے ایک ہوسٹل کے لیے تعارفی خط لیا اور رات کی گاڑی کے تیسرے درجے کے ڈبے میں سوار ہوگیا۔ یہ ٹرین ایک دن اور ایک رات کے سفر کے بعد سانتیاگو پہنچتی تھی۔

پکی اینٹوں سے بنے ہوئے مکانات مکڑی کے جالوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ ٹرین سے اترنے کے بعد اس نے ڈرتے ڈرتے شہر میں قدم رکھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ کبھی بھی اس ہوسٹل کو ڈھونڈ نہیں پائے گا۔ بہرحال ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ ہاسٹل اسے مل گیا۔

طالب علموں کے لیے اس ہاسٹل میں رہنا فاقوں مرنے والی بات تھی البتہ گھر کی طرح پابندیاں نہیں تھیں۔ یہاں مکمل آزادی تھی۔ وہ کھل کر نظمیں لکھ سکتا تھا۔ بلند آواز میں انہیں دہرا سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات کہ یہاں ایک اور شاعر بھی تھا، اسی کا ہم عمر اس کا نام رومیو مورا گا تھا۔ دونوں اپنی اپنی نظموں پر تبادلہ خیال کرتے۔ ایک ساتھ مختلف جلسوں میں نظمیں پڑھنے جاتے۔

ہاسٹل کی بالکونی میں بیٹھ کر ختم ہوتی ہوئی سہ پہر میں شہر کے کناروں پر مکان کی چھتوں پر تنہائی کو دیکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

اس نے اس ہاسٹل میں رہتے ہوئے بے تحاشا لکھا اور بہت کم کھایا۔ جب کم خوراکی کا اثر اس کی صحت کو متاثر کرنے

لگا تو اس نے یہاں سے نکلنے کی ٹھانی اور ایک روز نکل گیا۔

اب گلیوں کا سمندر اس کے سامنے تھا اور اسے کرائے پر ایک کمرے کی تلاش تھی۔ اسے ایک کھڑکی پر کرائے کا کمرا لکھا ہوا نظر آیا۔ معلوم کرنے پر معلوم ہوا خود مالک مکان سامنے کے کمروں میں رہتا ہے یعنی ایک ہی گھر کے کمروں میں سے ایک کمرے میں رہتا ہے۔ اپنی روزی عورتوں کے ہیئر ڈریسر کے طور پر کماتا تھا مگر اب اس پیشے کو چھوڑ چکا ہے۔

اس نے کرایہ وغیرہ طے کیا اور خوب اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد کمرا کرائے پر لے لیا۔

اس نے اپنی کتابیں، کپڑے اور لکھنے پڑھنے کا سامان اس ٹرنک سے نکالا جو اب تک اس کے ساتھ سفر کرتا چلا آرہا تھا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ اس گھر کو اچھی طرح دیکھ بھال لے لیکن اس وقت تھکن بہت تھی لہٰذا وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ بستر بھی معقول تھا جلد ہی نیند آگئی۔

صبح سو کر اٹھا اور اس گھر کے کونے کھدروں کو دریافت کیا تو حیرت اور خوف سے اس کا بدن ساکت ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ تمام دیواریں بشمول غسل خانے کی دیوار پر جگہ جگہ ایک ہی تحریر لکھی ہوئی تھی۔

”خود چھوڑ دو۔ تم ہم سے نہیں مل سکتے۔ تم مردہ ہو۔“

یہ سانتیا گون کی سخت ترین سردیوں کا موسم تھا لیکن اس کا بدن پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ چونکا دینے والے یہ اعلانات اسے خوفزدہ کر رہے تھے۔ وہ فوراً مالک مکان کے پاس پہنچا اور اس سے ان اعلانات کی وضاحت چاہی۔ مالک مکان اسے دیکھتا رہا پھر ہنسنے لگا۔ پابلو نرودا کو شک ہوا کہ شاید وہ پاگل ہے لیکن جلد ہی مالک مکان کی ہنسی سنجیدگی میں بدل گئی اس نے تشریح کی۔

”ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ دراصل چار ماہ پہلے میری بیوی مر گئی تھی۔ مرے ہوئے لوگوں کی روحیں اکثر وہاں آجاتی ہیں جہاں وہ مرنے سے پہلے رہی ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ یہاں آئے۔ میں نے یہ تحریریں اپنی بیوی کی روح کے لیے لکھ رکھی ہیں۔ ”خود کو چھوڑ دو، تم ہم سے نہیں مل سکتے، تم مردہ ہو۔“

اس کے بعد کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کا خوف دور ہو گیا تھا بلکہ ایک طرح سے مطمئن تھا کہ یہاں رہا جا سکتا ہے۔ یہاں آزادی ہی آزادی ہے۔ کوئی خاتون بھی گھر میں نہ تھی جس کی وجہ سے مسائل پیدا ہوں۔ مالک مکان بظاہر بے ضرر معلوم ہوتا ہے۔ بے چارہ اپنی بیوی سے ڈرا ہوا لیکن اس کا یہ خیال جلد ہی غلط ثابت ہو گیا۔ وہ بوڑھا مالک مکان نہایت وہمی اور خبطی ثابت ہو رہا تھا۔

اس نے پہلے تو پابلو نرودا کی خواتین مہمانوں کے آنے پر پابندی لگائی پھر اس کے خطوط کی جاسوسی شروع کر دی۔ چھپ چھپ کر اس کی کتابوں کا جائزہ لیتا کہ وہ کس قسم کی کتابیں پڑھتا ہے۔ کسی ملک کا جاسوس تو نہیں۔ اس کے کن کن سے تعلقات ہیں کن سے ملتا ہے۔ بغیر اطلاع دیے کمرے میں داخل ہو جاتا کہ کہیں وہ کمرے میں موجود فرنیچر کو نقصان تو نہیں پہنچا رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔

نرودا ان پابندیوں کے درمیان نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک آزادی ہی تو تھی جس کی وہ حفاظت کرتا پھر رہا تھا۔ وہ کرایہ بھی دے اور آزادانہ رہ بھی نہ سکے۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ رہنے کے لیے کوئی نئی جگہ تلاش کرنی ہوگی۔ سخت سردیوں کے باوجود اس نے مکان کی تلاش میں گلیوں کے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ ایک ایسے مکان کی تلاش میں جہاں وہ آزادی سے رہ سکے۔ اس تلاش میں اس کی تعلیم سب سے زیادہ متاثر ہو رہی تھی لیکن یہ بھی ضروری تھا۔ تلاش بسیار کے بعد ایک لانڈری کی پشت پر موجود کمرے میں اسے رہنے کے لیے جگہ مل گئی۔ یہ مکان ایک عورت کی ملکیت تھا جس کا ایک کمرا اسے مل گیا۔

وہ اس کمرے میں اکیلا رہ رہا تھا۔ یہی اس کی آزادی تھی۔ روزانہ کئی کئی نظمیں لکھتا اور چائے بنا بنا کر پیتا رہتا۔

اس کا کمرا ہی تو کل کائنات یا پورا شہر نہیں تھا یا جو دوست اس سے ملنے آتے وہی تو سب کچھ نہیں تھے۔ ادیب و شاعر چائے خانوں کی بجائے شراب خانوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ اس نے بھی ان شراب خانوں کا رخ کیا جہاں نظمیں سنائی جاتیں، بحث مباحثہ صبح ہونے تک جاری رہتا۔

ان سرگرمیوں سے اس کی تعلیم زیادہ متاثر ہو رہی تھی۔ پڑھنے کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ رات بھر جاگنے کے بعد یا تو یونیورسٹی جانے کے قابل ہی نہ رہتا اور اگر چلا بھی جاتا تو وہاں بھی شاعر دوستوں میں گھرا رہتا۔ اب تو اس کے پرستار بھی پیدا ہو گئے تھے جو اسے گھیرے رہتے۔

اس کے باپ کو ریلوے نے ایک مخصوص کپڑے کا سرمئی رنگ کا لباس دیا تھا۔ اس نے اس لباس میں کانٹ چھانٹ کر کے ایک خاص انداز کا بنا لیا جو دور سے پہچانا جاتا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ شاعروں کا لباس ہے ہم شاعر اس

لباس میں دور سے پہچانے جائیں گے۔ اس کے دیکھا دیکھی تین چار اور شاعروں نے بھی اس قسم کا لباس بنوالیا اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔

اس کا یہ ڈھیلا ڈھالا لباس ہرگز اس پر نہیں جچتا تھا لیکن انوکھا ضرور تھا۔

کون سمجھ سکتا تھا کہ اس کا یہ دلچسپ لباس غربت کے باعث بنایا گیا تھا ورنہ سولہ سالہ لڑکے کو تو نت نئے فیشنوں سے غرض ہوتی ہے۔

اس بے ہنگم لباس کے باوجود جن دو امیر ترین لوگوں نے اس کی صحبت کو پسند کیا شہر کے معزز افراد تھے۔ پیلویانیز اور اس کی بیوی بینا۔

ان کا گھر کیا تھا زندگی کی ایک مکمل مادی شکل تھا۔ گرم مدھم روشنیوں، خوب صورت فرنیچر اور شیلف میں سجی کتابیں۔ کتابیں بھی ایسی جو اب تک اس کی پہنچ سے دور تھیں۔ یہ دونوں میاں بیوی اکثر اسے اپنے گھر بلایا کرتے اور دوبارہ آنے کی دعوت دیتے۔ پیلویانیز کا شفقت آمیز رویہ اس کی ترقی کا خواہاں تھا اور چاہتا تھا کہ وہ ایک مرتبہ اس کے باپ سے مل لے۔

”میرا باپ ایک نامور سینیٹر ہے اور نہایت اہم آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں یورپ کا چکر لگوا دے گا۔ تم پیرس میں جا کر رہو۔ وہاں تمہاری شاعری کی خوب قدر ہو گی۔“

”وہ کس طرح مجھے یورپ کا چکر لگوا دے گا۔“

”اس لیے کہ وہ سینیٹر ہے۔“

”اوہ! پھر تو وہ میرے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔“

”بس تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔ اپنا یہ لباس اتار دو تاکہ تم نارمل نظر آؤ۔“

”میں تیار ہوں۔“

اس کا سینیٹر باپ، صدارتی محل کے قریب ایک بڑے گھر میں رہتا تھا۔ وہ نرودا کو لے کر اس محل نما گھر میں چلا گیا اور سینیٹر کے مطالعے کے کمرے میں دھکیل دیا۔ وہ سینیٹر نرودا کو ایک آرام کرسی میں بڑے پیڈسٹل لیمپ کے نیچے بیٹھا نظر آیا۔ اس کا منہ اخبار کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ فرش اتنا چکنا تھا کہ گھبرایا ہوا نرودا پاؤں رکھتے ہی پھسل گیا۔ وہ اٹھا اور سنبھلنے کی کوشش میں ایک مرتبہ پھر پھسل گیا۔ کئی بار گرا اور سنبھلا اور آخری بار سینیٹر کے قدموں میں جا گرا۔ سینیٹر نے اخبار سے نظریں ہٹائیں اور سرد آنکھوں سے نرودا کو دیکھنے لگا۔ نرودا قریب پڑی ایک چھوٹی کرسی پر بیٹھ گیا مگر اس طرح کہ جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ جائے گا۔ اس کے شرمانے کی عادت اب پوری طرح اس پر حاوی ہو چکی تھی۔ بولنا کچھ چاہتا تھا کہتا کچھ تھا۔ سینیٹر نے اس کے منصوبوں کے بارے میں کچھ سوالات کیے۔ نرودا نے اسے کیا بتلایا اسے خود بھی کچھ معلوم نہ ہوا۔ تقریباً بیس منٹ بعد سینیٹر نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اس کا مطلب یہ تھا کہ ملاقات ختم ہوئی۔ نرودا صرف یہ سن سکا کہ سینیٹر اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ دوبارہ اس سے ملے گا۔

وہ پھسلنے سے بچنے کے لیے نہایت احتیاط کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔

وہ اس سے دوبارہ کبھی نہ مل سکا کیونکہ ایک فوجی بغاوت نے سینیٹر کو اس کی کرسی سے اچھال دیا۔ یورپ کا چکر لگانے کا خواب ادھورا رہ گیا۔

☆......☆

سانتیا گو سیاست اور ادبی سیاست کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ہر جگہ کے انقلابی یہاں جمع ہو رہے تھے۔ خاص طور پر ٹی میوکو سے، ٹی میوکو میں طلبا کی تنظیم کے رسالے ”کلیری ڈاڈ“ کا وہ (نرودا) نامہ نگار رہ چکا تھا۔ حکومت کو اس انقلابی تنظیم سے اختلاف تھا لہٰذا اس پر حملہ کرا کر طلبہ تنظیم کے ہیڈ کوارٹر کو تباہ کر دیا گیا۔ ارباب اقتدار نے حملہ آوروں کی بجائے ان کو گرفتار کیا جو بچ گئے تھے اور انہیں سانتیا گو پہنچا دیا گیا۔ یہاں پابلو نرودا بھی ان کے ساتھ مل گیا۔

اس وقت سے لے کر تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد سیاست اس شاعر کی زندگی کا جزو بن گئی۔

نئی نئی ادبی تحریکیں سانتیا گو پر منڈلا رہی تھیں۔ اس نے بھی شاعری میں پناہ لی۔ دن رات نظمیں لکھیں اور اتنا مواد جمع ہو گیا کہ ایک مجموعہ کلام شائع ہو سکتا تھا۔ وہ ابھی کوئی ایسا نامور شاعر نہیں تھا کہ پبلشر اس کے پیچھے پھرتے۔ اس نے اس وعدے پر کتاب ایک پبلشر کے حوالے کر دی کہ اشاعت کی رقم ادا کرنے کے بعد وہ اس کتاب کو اٹھا لے گا۔

یہ وعدہ اس نے اس لیے کر لیا تھا کہ چند دوستوں کے ساتھ مل کر اس نے ایک کاروبار شروع کر دیا تھا۔

شاعر تو تصوراتی لوگ ہوتے ہیں، وہ بھی تصور میں لکھ پتی بن چکا تھا لیکن افسوس کاروبار شروع ہوتے ہی ختم ہو گیا۔ اس کا خیالی قلعہ زمین بوس ہو گیا۔ کتاب کی اشاعت مکمل ہو چکی تھی۔ ناشر نہایت سخت دل واقع ہوا تھا۔ اس نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔

”تم کوئی کتاب لے کر نہیں جا سکتے جب تک اس کے لیے مجھے پورا معاوضہ نہ دے دو۔“

اس کے پاس فرنیچر کی کچھ چیزیں تھیں وہ فروخت کر دیں۔ وہ گھڑی جو اس کو اس کے باپ نے دی تھی وہ بیچنی پڑی۔ کپڑے تک بک گئے۔ تب جا کر نظموں کا پہلا مجموعہ جس پر 1923ء کا سال درج تھا اس کے ہاتھ میں آیا۔

وہ اپنی کتابیں کندھے پر اٹھائے سوراخ شدہ جوتے پہنے خوشی سے سرشار سڑک پر تھا۔

اگلے دن وہ اس کتاب کا ایک نسخہ ہاتھ میں لیے ایک سستے سے شراب خانے میں بیٹھا تھا اور ان سے مخاطب تھا۔

”شاعری سے نزدیک ترین شے روئی کا ایک ٹکڑا یا خوب صورت چینی کی ایک پلیٹ یا پھر لکڑی کا ایک خوب صورت انداز میں کندہ کیا ہوا ٹکڑا ہے جو بے شک بے ڈھب ہاتھوں سے بنا ہو۔ اس کے باوجود میں شاعر کے سوا کسی بھی صناع کو نہیں مانتا جو اپنے خوابوں کی الجھن سے لرزہ براندام ہوتا ہے۔“

”بہت سے ایڈیشن زیادہ فصیح، بہت خوب صورت ہوں گے لیکن وہ لمحہ جب پہلی کتاب تازہ روشنائی اور کڑکڑاتے ہوئے کاغذ کے ساتھ منظر عام پر آتی ہے مسرت اور سرور کا وہ لمحہ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز کے ہمراہ یا مفتوح بلندی پر پہلا کھلتا ہوا پھول شاعر کی زندگی میں وہ لمحہ محض ایک بار آتا ہے۔“

زندگی تو سنگ میل کو چھوڑ کر آگے بڑھنے کا نام ہے۔

اس نے بھی بہت جلد اپنی پہلی کتاب کو پیچھے چھوڑ دیا۔

وہ سانتیا گو سے ٹی میوکو اپنے گھر واپس آیا ہوا تھا۔ کچھ خوشی کچھ سرشاری میں اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکیوں کو کھول دیا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ تمام آسمان ہزاروں ستاروں سے جگمگا رہا تھا۔ اتنے ستاروں کو ایک ساتھ دیکھ کر وہ مدہوش ہو گیا۔ وہ کوئی تخلیقی لمحہ تھا کہ بے تحاشا اپنی میز کی طرف دوڑا اور جیسے املا لکھ رہا ہو نئی کتاب کی پہلی نظم لکھنی شروع کر دی۔ اس کتاب کے لیے نظم جس کا ابھی نام بھی نہیں رکھا گیا تھا۔

وہ جس شاعرانہ شناخت کو لے کر چلی سے سانتیا گو آیا تھا اس کی پہلی کتاب نے اس شناخت کو شہرت میں بدل دیا۔ اس کے چاہنے والوں میں اقتدار کے طبقے سے تعلق رکھنے والے مصنفین بھی تھے جو اس کی نظمیں سن سن کر کہا کرتے تھے۔ ”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ تمہیں تو فوراً پیرس چلے جانا چاہیے۔“

ایک دوست نے وزارت خارجہ کے ایک افسر اعلیٰ سے اس کے لیے بات کی۔ یہ افسر اس کی نظموں کے بارے میں جانتا تھا اس لیے ملاقات کے لیے فوراً تیار ہو گیا۔ چند گھنٹوں کی گفتگو کے بعد اس نے الوداع کہتے ہوئے اسے یہ خوش خبری سنائی۔

”اب تم خود کو بیرونِ ملک ملازمت کے لیے منتخب سمجھو۔“

نوجوان پابلو نے خود کو ایک سفارت کار محسوس کیا اور اس کے دفتر سے نکل آیا۔ غیر ارادی طور پر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ابھی کل ہی ایک رسالے کی طرف سے کچھ رقم ہاتھ آئی تھی۔ وہ راستے میں پڑنے والے ایک ریستوران میں چلا گیا۔ ”بس اے نوجوان شاعر کچھ ہی دن کی بات اور ہے فرانس چلا جاؤں گا یا کسی بھی ملک کے سفارت خانے میں افسری کروں گا۔“

یہ رقم ختم ہوئی تو وزارت خارجہ کا وہ افسر اسے پھر یاد آیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔ بھئی بڑے لوگوں کی دس مصروفیات ہوں گی۔ یاد بھی نہیں رہا ہوگا۔ میں ہی چل کر یاد دہانی کرا دوں۔

وہ افسر نہایت چاپلوسی کے ساتھ ملا۔ اپنے سیکریٹری کو بھی بلا لیا۔ ”بھئی کیا یہ ہمارے دفتر کی خوش نصیبی نہیں کہ اس نوجوان شاعر کا یہاں آنا جانا ہے۔ یہ ملاقاتیں، تاریخ ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔“

اس قسم کی خوشامدانہ باتیں کرنے کے بعد وہ کلام سنانے کی فرمائش کرتا پھر غیر متوقع طور پر اعلیٰ نسل کے کتوں کا ذکر چھیڑ دیتا اور بات کہیں سے کہیں نکل جاتی۔ پھر الوداع کہتا اور سرگوشی کرتا۔ ”اب تم خود کو بیرونِ ملک ملازمت کے لیے منتخب سمجھو۔“

پابلو دو سال تک اس کے دفتر کے چکر لگاتا رہا اور وہ ہر مرتبہ کسی خفیہ خبر کی طرح کہتا۔ ”اب تم خود کو بیرونِ ملک ملازمت کے لیے منتخب سمجھو۔ تمہاری ملازمت قطعی ہے۔“ یہ سلسلہ نہ جانے کب تک چلتا رہتا کہ اس کی ملاقات اپنے دوست بیانکی سے ہوئی۔

”کیا کر رہے ہو۔“

”اپنے یورپ کے دورے کے بارے میں سرگرم عمل ہوں۔“

”کیا مطلب؟ سال بھر پہلے بھی تم نے یہی کہا تھا۔ کیا

ابھی تک تمہاری ملازمت کی تقرری نہیں آئی۔"

"کسی بھی لمحے وہ مجھے مل جائے گی کیونکہ وزارت ثقافت کے سربراہ نے مجھے اس کا یقین دلایا ہے۔"

بیانکی خود بھی وزیر رہ چکا تھا اور وزارتوں کے اندرونی و بیرونی طریق کار سے واقف تھا۔ نرودا کی بات سن کر ہنسنے لگا۔ ایسے تو مل چکی تمہیں ملازمت۔

"چلو وزیر سے چل کر ملتے ہیں۔" اس نے پابلو نرودا کو بازو سے پکڑا اور سنگ مرمر کے زینے پر چڑھتے ہوئے اوپر چلا گیا۔ پابلو نرودا پر گھبراہٹ سی طاری تھی کیونکہ وہ کچھ ہی دیر میں وزیر خارجہ سے ملنے والا تھا۔ ایک طالب علم اور شرمیلے شاعر کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی۔ وہ ایک پستہ قد آدمی تھا جو اپنی اس کمی کو چھپانے کے لیے ڈیسک پر بیٹھا تھا۔

نرودا کے دوست بیانکی نے نرودا کا تعارف کرایا۔ اس کی شاعری کی بے حد تعریف کی اور بتایا کہ وہ چلی چھوڑنے کے لیے کس قدر بے چین ہے۔

وزیر نے بہت سی گھنٹیوں میں سے ایک گھنٹی بجائی اور نرودا کی حیرت میں اس وقت کئی گنا اضافہ ہو گیا جب وہی افسر اعلیٰ کمرے میں داخل ہوا جو دو سال سے اسے ٹہلا رہا تھا۔ اس افسر نے دنیا میں پھیلے ہوئے مختلف ممالک کی ایک فہرست سنا دی۔

"پابلو تم کہاں جانا چاہتے ہو۔" وزیر نے پوچھا۔

اس فہرست میں ایک ہی نام ایسا تھا جو اس سے پہلے نرودا نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا لہٰذا اس نے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر اسی ملک کا نام لے دیا۔

"رنگون۔"

"اسے فوراً تقرری کا پروانہ دو۔" وزیر نے حکم دیا۔

حکم سنتے ہی افسر اعلیٰ کمرے سے باہر چلا گیا اور کچھ ہی دیر میں تقرری کے احکامات کے ساتھ واپس آ گیا۔ وزیر کے دفتر میں ایک گلوب رکھا ہوا تھا۔ بیانکی اور نرودا اس گلوب پر رنگون کو ڈھونڈتے رہے۔ ایشیا کے نقشے میں ایک گہرا گڑھا پڑا ہوا تھا۔ یہی گڑھا رنگون تھا۔

"یہ رنگون ہے۔"

وہ اپنے شاعر دوستوں سے ملا تو اپنی عادت کے مطابق یہ تک بھول چکا تھا کہ اس کی تعیناتی کہاں ہوئی ہے۔ وہ صرف یہ بتا سکا کہ شاندار مشرق میں کہیں تعینات کیا گیا ہے۔ جہاں مجھے بھیجا گیا ہے وہاں نقشے میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہے۔

اب اسے بحری جہاز میں سفر کرتے ہوئے سنگاپور پہنچنا تھا۔

اس کا جہاز اس کے خیال میں اسے لے کر سنگاپور کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن یہ دو چار دن کا سفر نہیں تھا۔ اس کا جہاز مختلف بندرگاہوں پر رکتا رہا جہاں مسافروں کو اجازت تھی کہ شہر میں گھوم پھر سکتے تھے اور جس دن جہاز کی روانگی مقرر تھی اس دن دوبارہ جہاز پر سوار ہو سکتے تھے۔

وہ مارسلیز پہنچ گیا۔

اب وہ بحیرہ روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ 1927ء کا سال تھا۔

"وہ جہاز بذات خود سمندر میں چھوٹا سا فرانس تھا۔ اپنے بوڑھا مسافروں کو لیے ہوئے جو دور دراز کی بندرگاہوں میں آباد کالونیوں میں مختلف سرکاری نوکریوں پر فائز تھے۔"

طویل ترین سفر طے کرنے کے بعد اس کے جہاز نے اسے چھوڑ دیا تھا اور اب اسے رنگون لے جانے والے جہاز میں سوار ہونا تھا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ رنگون کے نزدیک پہنچ گیا ہے لیکن معلوم کرنے پر معلوم ہوا کہ ابھی جہاز کا کئی روز کا سفر باقی ہے اس کے علاوہ جو جہاز باقاعدہ طور پر رنگون جاتا تھا وہ گزشتہ روز جا چکا تھا۔ اس کے پاس مزید ٹھہرنے کے لیے ہوٹل کا کرایہ تک نہیں تھا۔ اسے رنگون پہنچ کر ہی مزید پیسے مل سکتے تھے۔

اجنبی ملک بے سروسامانی کی حالت، کسی سے مانگنا بھی تو کیسے زبان تک نہ آتی تھی۔ وہ نظمیں لکھتا رہا تھا لیکن نظموں سے ہوٹل کا کرایہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔

اتفاق سے چلی کا قونصل وہاں آیا ہوا تھا۔ اس کا نام سنیور منسیلا تھا۔ پابلو نے اس سے ملاقات کی۔

قونصل نے پوری طرح اس کی بات سنی بھی نہیں اور اسے اپنے درشت لہجے سے مایوس کر دیا۔

"میں تم لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہیں وزارت سے رابطہ کرنا ہو گا۔"

"میں اسے آپ کا آخری جواب سمجھوں حالانکہ ہم تو قونصلروں کو آپس میں اتفاق رکھنا چاہیے۔"

"مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا۔ یہ میرا آخری جواب ہے۔"

"تو پھر میرا جواب بھی سن لو۔" پابلو نے اسے دھمکاتے ہوئے کہا۔ "میں پیسے کی خاطر اپنے وطن کے

بارے میں کچھ لیکچر دینے پر مجبور ہوں گا تاکہ اس طرح جو رقم ملے اس سے اپنا سفر جاری رکھ سکوں۔ ازراہ کرم مجھے ایک ہال، ترجمان اور ضروری اجازت نامہ دے دیں۔"

یہ سنتے ہی قونصل کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"سنگاپور میں چلی کے بارے میں لیکچر! میں اس کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا۔ میرے علاوہ چلی کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں کوئی ایسی بات نہیں کہوں گا جو چلی کے مفاد میں نہ ہو۔"

"آپ یہ بھی نہیں کر سکتے۔"

"مجھے یہ تو کرنا پڑے گا کیونکہ اپنا سفر جاری رکھنا ہے، رنگون میرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

یہ بحث بلیک میلنگ کی حد تک پہنچ گئی۔ قونصل نے رسیدوں پر دستخط کرائے اور رقم اس کے حوالے کر دی۔

سفر پھر شروع ہو گیا۔

عرشے سے جوں جوں جہاز رنگون کے نزدیک ہوتا گیا اسے سنہری مینار نظر آنے لگے۔

جیٹی پر اجنبی لباس کی ایک کثیر تعداد کے ہیجان خیز رنگوں کا اجتماع تھا۔ وہیں ایک بڑے کثیف دریا کا دہانہ ہلکورے مارتا وہاں کی خلیج میں خالی ہوتا تھا۔ اس دریا کا نام دنیا کے تمام دریاؤں سے خوب صورت تھا۔ دریائے آراوری اور اس کے پانیوں کے نزدیک اس کی زندگی شروع ہوا چاہتی تھی۔

☆......☆

اسے تمام دنیاوی نعمتیں مل گئی تھیں لیکن اس کی گھریلو زندگی تکلیف دہ تھی۔ اس کی بیوی جوسے بلیس شروع ہی سے اس پر حاوی ہونے کی کوششیں کرتی رہتی تھی لیکن اس اجنبی ملک میں آنے کے بعد تو اس کے ارادے بالکل ہی برہنہ ہو کر سامنے آ گئے۔ اتنی شکی واقع ہوئی تھی کہ اس کے نام آنے والے خطوط اگر اس کے ہاتھ لگ جاتے تو انہیں کھولے بغیر ہی چھپا دیتی۔ اس کے باوجود بھی وہ اندر ہی اندر سلگتی رہتی۔ یہ سوچ کر جلتی رہتی کہ ایسے کتنے ہی خطوط ہوں گے جو اس تک نہیں پہنچ سکے ہوں گے۔ اس کا یہ شک وحشی ارادوں میں بدلنے لگا تھا۔ اپنے ہاتھ میں لمبے پھل والا چاقو تھامے دو گھنٹوں اس کے بستر کے گرد گھومتی رہتی تھی۔

پابلو جو کبھی اس سے عشق کرتا تھا، اب اس کا حال یہ ہو گیا تھا کہ مچھر دانی میں لیٹی ہوئی جوسے بلیس اسے متحرک بھوت نظر آتی تھی جو اسے کسی وقت بھی قتل کر سکتی تھی۔

گھر میں ہر وقت جھگڑے سر اٹھائے رہتے تھے۔ ایسے جھگڑے جن کا کوئی سر پیر نہ ہوتا۔ پابلو اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ اور بھڑک جاتی۔

"آخر تم میری طرف سے اتنے خدشات کیوں رکھتی ہو۔"

"یہ خدشات تمہاری زندگی تک میرے ساتھ ہیں۔" وہ کہتی۔ "جب تم مرو گے تو میرے خدشات دور ہو جائیں گے۔"

اس نے کہیں سے کچھ جادو سیکھ لیے تھے۔ وہ اسے قتل کر کے سزا کی حق دار بننا نہیں چاہتی تھی بلکہ جادو سے ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ پراسرار رسومات دہراتی رہتی کہ کسی طرح اسے راستے سے ہٹائے۔ اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد شاید کسی دن وہ اسے مار ہی ڈالتی کہ خوش قسمتی سے پابلو کا تبادلہ ہو گیا۔ اسے سرکاری طور پر سیلون کی منتقلی کا خط مل گیا۔

پابلو نے اپنی بیوی کو کچھ نہیں بتایا اور خفیہ طور پر روانگی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ایک روز اپنے کپڑے اور کتابیں وہیں چھوڑ کر گھر سے اس طرح روانہ ہوا جس طرح روز دفتر کے لیے جاتا تھا اور اس بحری جہاز پر روانہ ہو گیا جو اسے یہاں سے دور لے جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

وہ جوسے بلیس کو دکھی دل کے ساتھ چھوڑ رہا تھا۔

بحری جہاز بہ مشکل خلیج بنگال میں داخل ہوا ہو گا کہ اس نے ایک دکھ بھری نظم کہنا شروع کی جو ایک ایسی عورت کے نام تھی جو اس سے بچھڑ گئی تھی۔ یہ نظم طوفانی رات اور زمین کی تنہائی کے گرد گھوم رہی تھی۔

اس کے جہاز نے اسے سیلون پہنچا دیا۔

☆......☆

1929ء کا سیلون دنیا کے سب سے بڑے اور خوب صورت جزیروں میں سے ایک تھا جو برما اور ہندوستان ہی کی طرح نوآبادیاتی صورت حال کا حامل تھا۔ انگریزوں نے خود کو اپنے کلبوں تک محدود کر رکھا تھا۔

سیلون پہنچ کر پابلو کے پاس تنہائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ سمندر کے نزدیک ایک بنگلے میں رہنے لگا۔ اس جگہ آبادی بہت کم تھی۔ سر پٹختی لہروں کی آوازیں تھیں یا پابلو کی نظموں کی گنگناہٹ۔ یہی وہ چاہتا بھی تھا۔

کتا اور نیولا اس کے واحد ساتھی تھے۔ کتا جنگلی تھا

لیکن مادہ نیولا اس کے پاس رہ کر ہی بڑی ہوئی تھی۔ یہ مادہ نیولا اس کے روزمرہ کے کاموں سے واقف تھی۔ وہ اس کے کاغذوں پر کودتی اور سارا دن اس کے پیچھے دوڑتی۔ دوپہر کو کھانے کے بعد اس کے سر اور شانے کے درمیان سمٹ کر سو جاتی۔ بعد میں ایک مقامی لڑکا ملازم رکھ لیا۔ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا کیونکہ وہ مشرقی تھا جو گونگوں کی طرح رہ رہا تھا۔ دانتوں کو نکال کر مسکرانے کے سوا اسے کچھ نہیں آتا تھا۔

یہاں کی تنہائی اسے قید خانہ معلوم ہو رہی تھی بالآخر اس نے اس برف کو پگھلایا اور کچھ دوست بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ یہاں کی نوجوان نسل نوآبادیاتی نظام میں اس بری طرح جکڑی ہوئی ہے کہ وہ محض انگلستان میں چھپنے والی کتابوں کا ذکر کرتی ہے۔

اس کی دوستی ایک شخص لیونل وینڈٹ سے ہوئی جس کی ذاتی لائبریری بہت بڑی تھی۔ وہ لندن سے تازہ ترین کتابیں وصول کرتا اور اسے فیاضانہ طور پر ہر ہفتے سائیکل کے ذریعے کتابوں کا تھیلا بھجوا دیا کرتا۔ اس دیارِ غیر میں وہ انگریزی ناولوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ یہ ناول اس کی شاعری کے لیے تحریک کا باعث بن رہے تھے۔

کچھ وقت گزرا تو وہ وہاں کی ثقافتی زندگی میں بھی شامل ہوتا گیا۔ اس نے دیکھا کہ ہزاروں انسان پانی کے قریب گاتے ہوئے کام کرتے ہیں۔ آگ کو روشن کرتے ہیں۔ گھڑوں کو ڈھالتے ہیں اور جذباتی عورتیں پتلی چٹائیوں پر بے پناہ ستاروں کی روشنی میں برہنہ سوتی ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ جزیرے کی زندگی سے مانوس ہو گیا اور ایک رات دعوت میں شمولیت کی خاطر کولمبو کے سارے تاریک مضافات کو عبور کر گیا۔

کولمبو میں انقلاب کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ یہاں کی سیاسی فضا ہندوستان سے بالکل مختلف تھی۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ پورا ملک تین حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ وسیع باغوں والے انگریز۔ یہ باغات چائے پیدا کرتے تھے۔ زیریں حصے میں سیلون کی بدھ اور مسلمان آبادی تھی۔ اس سے بہت پیچھے مزدور پیشہ قلیل آمدنی والے لوگ آباد تھے جو تامل زبان بولتے تھے اور ہندو مذہب کے پیروکار تھے۔

وہ ابھی پوری طرح لطف اندوز بھی نہیں ہو سکا تھا کہ اسے اس کے مقدر کے سیاہ بادلوں نے بری طرح گھیر لیا۔ کسی انتباہ کے بغیر اس کی بیوی جوسے بلیس جس سے وہ بھاگ کر آیا تھا کولمبو پہنچ گئی اور اس کے گھر کے عین سامنے خیمہ تان دیا اور اس طرح تن کر بیٹھ گئی جیسے اس کی نگرانی پر مامور ہو۔ سارے وقت سامنے والے دروازے پر موجود رہتی اور دیکھتی رہتی کہ کون کون پابلو نرودا سے ملنے آتا ہے۔ وہ صرف نگرانی نہیں کر رہی تھی بلکہ کبھی کبھار تو ان پر حملے بھی کر دیتی تھی۔ اس کی جلن اور حسد اسے آپے سے باہر کیے دے رہی تھی۔ ایک بار تو اس نے حد ہی کر دی۔ ایک یوریشین لڑکی پابلو سے ملنے اس کے گھر آئی تھی جوسے بلیس سے یہ برداشت نہیں ہوا۔ اٹھی اور اس لڑکی کو بری طرح مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بے چاری بوکھلا کر بھاگ کھڑی ہوئی اور پولیس میں رپورٹ درج کرا دی۔ پابلو بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ پولیس نے صرف اتنا کہا کہ پابلو کو مطلع کیا۔

”اگر آپ نے اس عورت کو پناہ نہ دی تو وہ اسے اٹھا کر پھینک دیں گے۔ دوسرے گھر والوں کو اس مصیبت سے نجات دلائیے۔ یہ آپ کی بیوی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اسے اپنے گھر میں رکھیے۔“

پابلو اس مصیبت کو اپنے گھر میں کیسے جگہ دے سکتا تھا۔ اس نے گھر کے اندر قدم تک نہ رکھنے دیا۔ تنگ آ کر اس نے واپس جانے کا ارادہ کر لیا اور پابلو سے التجا کی کہ میں اسے اس کے جہاز تک چھوڑ آؤں۔ وہ تیار ہو گیا یہ سوچ کر کہ یہ آخری مہربانی ہے جو وہ اس کے ساتھ کر رہا ہے۔ جب جہاز کے لنگر اٹھانے اور اس کے جہاز سے اترنے کا وقت آیا تو اس نے وہاں موجود لوگوں کی پروا کیے بغیر پابلو کو اپنے بازوؤں میں کھینچ لیا اور بوسوں کی بارش کر ڈالی اور جھک کر اس کے جوتوں کو چوم ڈالا۔ وہ محبت کی ماری دیوانی سی ہو گئی تھی لیکن اس کے سابقہ جرائم نے پابلو کو اس پر رحم کھانے سے روک دیا۔ اسے یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ اسے جہاز سے اتار کر اپنے ساتھ لے جاتا۔

اس وقت پابلو کے دل پر جو گھاؤ لگا وہ شاید زندگی بھر اسے بھلا نہ سکا ہوگا۔

وہ اس سانحے کو بھلانے کے لیے اپنی نئی کتاب کو مکمل کرنے میں مشغول ہو گیا۔ پہلا حصہ ختم ہو چکا تھا لیکن یہ کام بہت سست روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے وہ اپنی اداسی اور تنہائی کو موسیقی کی دھنوں سے دور کرتا رہا۔ یہ موسیقی اس کی نظموں میں بھی در آئی۔ اس کی شاعری نہ خوشبودار تھی نہ آسمانی لیکن ہاں زمین سے مربوط ضرور ہو گئی۔ یہی اس کی کامیابی تھی۔ یہ کولمبو کی تنہائی کی دین تھی۔ کولمبو کی یہ تنہائی اداس کر دینے والی تھی۔ جس گلی میں وہ رہائش پذیر تھا

اس میں اس کے محض چند ہی دوست تھے۔ اس تنہائی میں اس وقت ایک ستارہ سا چمکا۔ اس نے ایک لڑکی کو دیکھا جو بیت الخلاء صاف کرنے کا کام کرتی تھی لیکن اس قدر حسین تھی کہ اتنے حقیر کام کی نوعیت کے باوجود وہ اسے فراموش نہ کر سکا۔ اس کے بعد وہ کئی بار نظر آئی۔ پابلو نے ایک دن موقع دیکھ کر اس کی کلائی کو مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ اس وقت بھی مسکرائے بغیر اس کے ساتھ چل دی جیسے زندہ نہ ہو۔ پابلو ایک بے جان مجسمے کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہو۔ جذبات سے عاری وہ اس کے بستر تک آ گئی۔

ممکن ہے وہ کسی اور ملاقات میں کھل جاتی پابلو کی قسمت یہاں بھی آڑے آ گئی۔ اسی روز اسے ایک تار ملا۔ وزارت خارجہ کی طرف سے اسے نئی تقرری کی اطلاع ملی تھی۔ اب اسے سنگاپور اور باتاویا میں فرائض سرانجام دینے تھے۔

اس کے دل پر ایک زخم اور لگا۔ وہ اس حسین دوست کو چھوڑ کر جانے پر مجبور تھا جس نے ابھی ابھی اس کی تنہائی میں قدم رکھا تھا۔

مجبوریوں کا راز اب اس کی سمجھ میں آیا۔ ایک اور سوال اس کے سامنے آیا۔ اس مادہ نیولے کا کیا کرے جس کا نام اس نے ”کریا“ رکھا تھا اور جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ کسی ہمسائے کو دے جائے۔ جنگل میں چھوڑ دے یا کیا کرے۔ آخر یہی طے کیا کہ اپنے ساتھ اپنے نوکر لڑکے کو بھی لے جائے۔ مادہ نیولا اس کے ہمراہ ٹوکری میں عرشے پر سفر کر سکتی تھی۔

وہ سنگاپور کے ساحل پر اپنے نوکر اور اس اعتماد کے ساتھ اتر گیا کہ سنگاپور میں قونصل خانہ موجود ہوگا۔ وہ سیدھا ایک ہوٹل میں پہنچا۔ وہاں اپنے کپڑے جو خاصی تعداد میں جمع ہو چکے تھے دھلنے کے لیے بھیجے اور خود برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا اور ٹیلی فون ڈائریکٹری میں اپنے قونصل کے مرکزی دفتر کو دیکھنا شروع کیا مگر ڈائریکٹری میں نام و نشان تک نہیں تھا۔ فوراً اس نے برطانوی سرکاری حکام کے حوالے سے ایک فوری کال بک کرائی۔ وہاں سے جواب ملا کہ چلی کے قونصل خانے کا وہاں وجود تک نہیں۔ اس نے قونصل سینور مین سیلا کے بارے میں پوچھا جس نے ٹوکیو میں اس سے کہا تھا کہ وہ چلی کی طرف سے سنگاپور میں قونصل ہے۔ کوئی اس کے نام تک سے واقف نہیں تھا۔ اسے خیال آیا کہ برقی تار میں باتاویا کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ مجھے دونوں جگہوں پر فرائض انجام دینے تھے۔ ہو سکتا ہے مرکزی دفتر باتاویا میں ہو۔ خوش قسمتی سے وہ جہاز جس سے وہ آیا تھا بندرگاہ میں لنگر انداز تھا۔ اس نے ملازم لڑکے کو ساتھ لیا اور بندرگاہ کی طرف دوڑ پڑا۔

اس کے پاس ہوٹل کے محض ایک دن کے پیسے تھے ورنہ وہ اور ٹھہر جاتا مگر ٹھہر کے بھی کیا کرتا۔

دو ماہ کا طویل سفر اسے 1932ء میں چلی لے آیا۔ یہاں پہنچ کر اسے ان دو کتابوں کی تلاش ہوئی جو اس نے پچھلے سفر میں مرتب کی تھیں اور اب ان کے مسودے کا غذات میں اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ تلاشِ بسیار کے بعد وہ مسودے اسے مل گئے۔ اس نے انہیں شائع کرایا۔

1933ء میں اسے بیونس آئرز میں چلی کا قونصل مقرر کر دیا گیا۔

وہ اس قونصل خانے میں زیادہ عرصہ نہ رہا اور اس کے ایک سال بعد ہی اسے بارسلونا بھیج دیا گیا۔ چلی کا قونصل جنرل ٹیولا میکورا اس کا افسر تھا۔ اس پر مہربان تو بہت تھا لیکن پابلو کی حساب نافہمی سے وہ بہت تنگ تھا۔ پابلو حساب میں اتنا کمزور تھا کہ جمع تفریق تک نہیں کر سکتا تھا۔ آخر ایک دن ٹیولا میکورا نے نہایت شفقت سے کہہ ہی دیا۔ ”پابلو تمہیں میڈرڈ میں جا کر رہنا چاہیے۔ وہ ایسی جگہ ہے جہاں شاعری ہے۔ یہاں بارسلونا میں ہمارے لیے محض جمع تفریق اور تقسیم ہی ہے جس کے لیے تمہاری ضرورت نہیں۔ یہ میں خود کر سکتا ہوں۔“

بات یہیں ختم ہو گئی تھی مگر دوسری رات جیسے کسی جادو کے اثر سے وہ اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ میں بہ حیثیت قونصل پہنچ گیا یا پہنچا دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا تبادلہ ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر اس کی ملاقات لورکا اور البرتی کے دوستوں سے ہوئی۔ یہ بہت سے لوگ تھے۔

ایک شخص مینوئیل آلٹولیگوری جس کا اپنا چھاپہ خانہ تھا ایک دن اس کے پاس آیا اور اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ ”میں اسپین کی اعلیٰ ترین شاعری پر تبصرہ کرنے کے لیے ایک رسالے کا اجراء کرنے والا ہوں۔ اس رسالے میں اسپین کا شاندار تخلیقی سرمایہ شامل ہوگا اور اس کی ادارت صرف ایک شخص کر سکتا ہے اور وہ شخص ہو تم۔“

اس نے اتنی قطعیت سے یہ بات کہی تھی کہ پابلو نرودا کو اس رسالے کی ادارت قبول کرنی پڑی۔ یہ رسالہ نہایت آب و تاب سے شائع ہوا لیکن صحیح طرح سے پیدا بھی نہیں ہوا

تھا کہ مر گیا۔ صرف پانچ شمارے شائع ہوئے تھے کہ اسپین کی گلیاں گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھیں۔ ایک غیر معروف جنرل فرانسسکو فرانکو جمہوریہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

وہ اس وقت غرناطہ میں تھا جب اسپین میں سرکاری طور پر کامیاب انقلاب کا جشن منایا جا رہا تھا۔ سپریم کمانڈر نے اپنی فوج کا معائنہ کیا اور کامیاب انقلاب برپا کرنے پر مبارک باد دی۔

رسالے کا اجراء تو نہ ہو سکا لیکن مینویل آلٹولیگوائر نے اپنے چھاپے خانے کو جاری رکھا۔ اس کی کتاب اسی چھاپے خانے سے شائع ہوئی۔ جن لوگوں نے یہ کتاب چھاپی تھی ان کے لیے یہ سرمایۂ افتخار تھی ان میں سے بہت لوگوں نے اس کتاب کی کاپیوں کو اپنے تھیلوں میں خوراک یا کپڑوں کی بجائے رکھا تھا۔ ان کتابوں کو ان تھیلوں میں اٹھائے ہوئے وہ فرانس کی جانب ایک طویل مسافت کے مرحلے میں تھے۔ ملک بدر ہونے والے ان پیادہ قافلوں پر سینکڑوں بار بمباری کی گئی۔ بچنے والوں نے اپنی نہ رکنے والی مسافت کو جاری رکھا۔ شاہراہ سے کتابیں اٹھائیں اور چلتے رہے۔ سرحد کے دوسری طرف ہسپانوی جو ملک بدر ہوئے انہیں وحشیانہ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

پابلو کو اس کی سزا یہ ملی کہ اسے اس کے منصب سے ہٹا دیا گیا۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے ہسپانوی جمہوریہ کے دفاع میں حصہ لیا تھا۔

وہ پیرس پہنچ گیا اور ایک پُرسکون علاقے میں گھر لے کر رہنے لگا۔ یہ گھر ایک ایسی جگہ پر تھا جہاں سے وہ دریائے سین کے کنارے بیٹھے ہوئے مچھیروں کو دیکھ سکتا تھا۔ ایک فرانسیسی ادیب الیجو کارپینٹر بھی وہیں رہتا تھا۔ ہمیشہ خاموش اور غیر جانب دار رہتا اور کسی بات پر بھی اپنی رائے دینے سے باز رہتا تھا حتیٰ کہ نازیوں پر بھی بات نہیں کرتا تھا جو جلد ہی پیرس پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح حملہ کرنے والے تھے۔ اس نے ایک خاتون نینسی کیونارڈ کے ساتھ مل کر شاعری پر تبصرہ شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کا نام اس نے ''دنیا بھر کے شاعر جو ہسپانوی عوام کا دفاع کرتے ہیں'' رکھا۔

نینسی کا چھاپہ خانہ فرانس کے ایک صوبائی گاؤں والے گھر میں تھا جو پیرس سے خاصے فاصلے پر تھا۔ گاؤں کیا تھا جنت کا نمونہ تھا۔ وہ جب پہلی مرتبہ اس کے گاؤں پہنچا تو رات کا وقت تھا اور چاند نکلا ہوا تھا۔ برف اور چاندنی سارے علاقے کو گھیرے ہوئی تھی۔ وہ جنگل کی سیر کو نکل گیا۔ برف کے گالوں میں نہاتا ہوا وہ ایسا مست ہوا کہ راستہ ہی بھول گیا بہ وقت تمام راستہ ڈھونڈتا ہوا واپس آیا۔

تبصروں کا یہ رسالہ شائع ہو گیا۔ ہسپانوی شاعروں کے ساتھ ساتھ اس نے کچھ فرانسیسی شاعروں کو بھی شامل کیا۔ ہسپانوی خانہ جنگی کا موضوع اس رسالے کا خاص موضوع رہا۔

اسپین میں بہنے والا خون رائیگاں نہیں گیا تھا ایک مدت کے لیے شاعری کو لرزا کے رکھ دیا۔

یہ وہ وقت تھا جب دوسری جنگ عظیم کی ہیبت ناک ابتداء کا آغاز ہو رہا تھا۔

وہ قونصل خانے سے نکالا جا چکا تھا اور اب پیرس میں تھا۔ اس وقت سب سے بڑا کام ایک فاشسٹ نظام کے خلاف دنیا بھر کے ادیبوں کا ایک جگہ جمع کرنا تھا۔

یہ اجتماع میڈرڈ میں ہوا۔ آخر کار وہ میڈرڈ پہنچ گیا۔ اس نے سب سے پہلے اس گھر کو دیکھنے کا فیصلہ کیا جسے وہ ایک سال پہلے چھوڑ چکا تھا۔ اس کی تمام کتابیں، تمام اشیاء جنہیں وہاں چھوڑ آیا تھا یونیورسٹی کیمپس کے نزدیک ایک فلیٹ میں تھیں۔ ہرنانڈیز نے جو ملیشیا کی وردی میں ملبوس تھا ایک گاڑی لے کر آ گیا تاکہ اس کی کتابوں کو پہنچانے کا فرض نبھا سکے۔ توپوں کے گولوں نے دروازوں، کھڑکیوں کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ کتابیں زمین پر بکھری پڑی تھیں۔ ہزاروں چیزیں حملہ آور سپاہی اپنے ساتھ لے جا چکے تھے۔ اس کباڑ خانے میں کچھ مسودے مل گئے۔ وہ ایسا بددل ہوا تھا کہ ایک کتاب تک وہاں سے نہیں ہٹائی۔ صرف مسودے لے کر چلا آیا۔

یہ فلیٹ دو طرف سے جنگ کی زد میں آیا تھا۔ ایک طرف اطالویوں نے چڑھائی کی تھی دوسری طرف میڈرڈ کے دفاع کرنے والے تھے۔ توپ خانے نے دیواروں کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ کھڑکیاں چیتھڑوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔

دنیا بھر کے ادیب جمع ہوئے اجتماع ہوا لیکن پابلو کے نزدیک اسپین مر چکا تھا۔

وہ ایک مرتبہ پھر اپنے ملک واپس آ گیا تھا۔ لاطینی امریکا میں اندرا پاؤنڈ جیسے بڑے ادیب نہیں تھے جنہیں فاشزم کی خدمت کے صلے میں باغی قرار دیا گیا لیکن ہٹلرازم کے باعث کسی مالی امداد کے بغیر فاشسٹ تحریک خوب پھلی پھولی جن کے کارکن طوفانی سپاہیوں کے لباس میں ملبوس نظر

آتے اور جو فاشسٹ انداز میں اپنا بازو اٹھا کر سیلیوٹ کرتے۔ پابلو کو دھمکی آمیز خطوط مل رہے تھے۔

اس نے اپنی طویل نظموں پر کام شروع کر دیا تھا۔ اس کے لیے کام کرنے کی خاطر کوئی جگہ چاہیے تھی۔ سمندر کے کنارے اس نے پتھروں سے بنا ہوا ایک گھر تلاش کر لیا۔ گھر مل گیا تھا لیکن اسے خریدنے کی اس میں سکت کہاں تھی۔ اس نے اپنا مسودہ ایک پبلشر کو دیا جسے اس نے رد کر دیا۔ 1930ء میں ایک دوسرے پبلشر نے یہ رقم اسے فراہم کر دی اور اس نے مکان خرید لیا اور سمندر کی لہروں نے اسے لکھنے پر مجبور کر دیا۔

خبریں برابر آ رہی تھیں کہ بڑی تعداد میں ہسپانوی ہجرت کر رہے ہیں۔ پھر یہ خبر آئی کہ ان ہسپانوی شہریوں اور سپاہیوں نے فرانسیسیوں کی سرحد کو عبور کر لیا لیکن ان کے ساتھ برا ہوا۔ حکومت نے ان سب کو بیگار کیمپوں میں دھکیل دیا جہاں سے انہیں قلعوں، جیلوں اور افریقہ میں صحرا کے نزدیک بعض علاقوں میں منتقل کر دیا۔

چلی میں حکومت بدلی اور ترقی پسند حکومت آئی تو پابلو کو فرانس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا گیا تاکہ وہ فرانسیسی جیلوں سے ہسپانیوں کو آزاد کرا کے اپنے ملک بھیج سکے۔

اس نیک کام کے لیے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ڈان پیڈرو صدر جمہوریہ چلی سے ملنے چلا گیا۔ صدر اس سے گرمجوشی سے ملا۔

''میرے لیے ہزاروں ہسپانوی لے آؤ۔ ہمارے پاس ان سب کے لیے کام ہے۔ مجھے مزدور لا کر دو، مچھیرے لا کر دو۔ مجھے عوام لا کر دو۔'' وہ جذبات کی رو میں بہتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

چند روز بعد وہ ہسپانوی عوام کو چلی لانے کے لیے فرانس چلا گیا۔ اسے ''ہسپانیوں کی نقل مکانی کے قونصل انچارج'' کی حیثیت دی گئی تھی۔ اس نے پیرس میں چلی کے سفارت خانے میں جا کر اپنی تقرری کے کاغذات پیش کیے لیکن سفارت کار اس منصوبے سے قطعی ناخوش تھے کہ ہسپانویوں کو چلی بھیجے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان سفارت کاروں نے پہلے تو پابلو کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی اور اس کے بعد اس کا دفتر چوتھی منزل پر بنا دیا جس کی لفٹ کاٹ دی گئی۔ جو ہسپانوی جنگ کے زخموں سے چور تھے اور بیگار کیمپوں سے بچ نکلے تھے چوتھی منزل تک آتے آتے بے حال ہو جاتے تھے۔

پابلو یہ سب دیکھ رہا تھا مگر بے بس تھا اور ٹوٹے دل سے اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ نقل مکانی کا کام مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔

یہ کام جیسے تیسے چل ہی رہا تھا کہ ایک صبح جب وہ سفارت خانے پہنچا تو حکام نے ایک طویل برقیہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ ہر شخص خوش دکھائی دے رہا تھا۔ ان لوگوں نے کبھی اسے خوش آمدید بھی نہیں کہا تھا اس وقت نہایت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ یہ برقیہ چلی سے آیا تھا اور چلی کے صدر کے دستخط موجود تھے۔ اس کے لیے یہ حیران کن تحریر تھی۔ صدر ڈان پیڈرو نے پابلو کو لکھا تھا کہ وہ اس خبر سے منحرف ہو جائے گا کہ وہ تارکین وطن کو چلی لے جانے کا بندوبست کر رہا تھا۔

صدر کا یہ برقیہ اس کی تمام محنت پر پانی پھیرنے کے مترادف تھا۔ کچھ سیاسی معاملات ایسے تھے جنہیں پابلو سمجھ نہیں پا رہا تھا کیونکہ چند روز بعد ہی ایک نیا ٹیلی گرام مل گیا جس میں سفر شروع کرنے کے احکام تھے۔ پابلو نے تارکین وطن کو ونی پیگ نامی جہاز پر سوار کرایا۔

پابلو کی شاعری ان تارکین وطن کو اپنے وطن لانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

یہی وہ دن تھا جب دوسری جنگ عظیم نے رن کا آغاز کر دیا تھا۔ پیرس میں اپنے گھر کی کھڑکی سے اس نے فوجی دستوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ امن کا خواہاں پابلو ان نوجوانوں کو موت کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا تو انسانیت کا ماتم کر رہا تھا۔

رات ہوئی تو دارالحکومت تاریکی میں ڈوب گیا۔ ستر لاکھ لوگ روشنیوں کو چھوڑ کر اندھیرے سے لپٹ گئے۔

اس کی حکومت نے اسے میکسیکو بھیج دیا۔

یورپ میں ہٹلر کی فوجیں ڈنکے بجا رہی تھیں۔ فرانس اور اٹلی پہلے ہی ہٹلر کے قبضے میں آ چکے تھے۔ ہر قومیت کے جلاوطن ادیب میکسیکو کی آزادی کے لیے قائم کیے گئے کیمپ میں پہنچ گئے تھے۔

نازی فوجوں نے لینن گراڈ کا محاصرہ کر رکھا تھا اور ان کی فوجیں روسی علاقے میں داخل ہو رہی تھیں۔ افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ ممکن ہے جرمنی جنگ جیت جائے اور جاپانیوں کو مال غنیمت میں حصہ نہ ملے۔ خفیف سا بھی شبہ نہ تھا کہ جاپانی ایک اچانک حملے سے سب کو حیران کر دیں گے۔

ایک ہفتے بعد ساری دنیا نے پرل ہاربر پر بمباری کی

خبر کو سن لیا۔

اسے اب اپنے وطن کی یاد آرہی تھی۔ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اب وہ آزاد تھا۔ کسی روک ٹوک کے بغیر چلی واپس جا سکتا تھا۔ وہ چلی جانے سے پہلے ''پیرو'' میں رک گیا۔ یہاں سے وہ ''ماشو پیشو'' کے کھنڈرات دیکھنے گیا۔ یہ سفر اسے گھوڑوں کی پشت پر طے کرنا تھا اور وہ بھی اس حال میں کہ سڑک موجود نہیں تھی۔ نہایت بلندی پر قدیم تعمیرات تھیں۔ صدیوں پرانے قلعے کے راستے میں طوفانی چشمے بہہ رہے تھے۔

ان مناظر نے اس کی شاعری کی نشوونما میں ایک اور پرت کا اضافہ کر دیا۔ اس کی مشہور زمانہ نظم ''دی ہائٹس آف میکو پکو'' نے یہیں جنم لیا۔ اسی ماحول نے اسے حوصلہ دیا کہ اسے شاعری کو جاری رکھنا چاہیے۔

وہ اب سانتیاگو میں تھا۔ اسی شہر میں جہاں اس نے تعلیمی دن گزارے تھے۔ وہ ایک بار پھر اپنے ملک کی خوب صورتی کو دیکھ سکتا تھا۔ کھیت، خوابیدہ دیہات اور حوصلہ شکن غربت۔ ایسی غربت کہ اس وقت جو بھی چلی کا شاعر ہوتا پابلو کی طرح اشتراکی ہو جاتا۔

وہ اسی غربت اور امن کی خواہش کو اپنی شاعری میں سموتا رہا اور بالآخر 45ء کو چلی کی اشتراکی پارٹی کا ممبر بن گیا۔ اس سے پہلے اسی سال اس ملک کے عوام نے اسے سینیٹر منتخب کر لیا تھا۔

اب اس کے پاس گھوڑا بھی تھا اور میدان بھی۔ غریبوں نے اسے زبان دی تھی اور بولنے کے لیے سینیٹ کا اسٹیج تھا۔ اس کی تقریروں میں شدت بڑھتی گئی۔ سینیٹ ہمیشہ اسے سننے کے لیے بھری رہتی تھی۔ اسے نکالنے کی کوشش کی گئی جو پوری ہو گئی اور پولیس کو اس کی حراست کے احکام جاری ہو گئے۔

وہ اس گرفتاری سے بچنے کے لیے ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہوتا رہا۔ ہر جگہ کھلے دروازوں نے اس کا استقبال کیا۔ یہ لوگ اجنبی تھے لیکن اس کی شاعری کے پرستار تھے۔ ان میں سے ہر ایک اسے اپنے گھر چند دن رکھنے کی خواہش کر رہا تھا بلکہ ہفتوں تک سیاسی پناہ دینے پر آمادہ تھے۔ کمیونسٹ پارٹی زیر زمین چلی گئی تھی۔ اور وہ چھپتا پھر رہا تھا۔

☆......☆

ریکارڈو فونیسکا کمیونسٹ پارٹی کا سیکریٹری جنرل تھا۔ پابلو کی زیر زمین زندگی، خفیہ دورے، پمفلٹوں کی اشاعت، اس کی نظموں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا یہ سب اسی کی ذمے داری تھی۔ اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی اور اس کی جگہ گونزالیز نے لے لی۔ وہ ایک بہادر لڑنے والا سپاہی تھا اور ایک مفرور بدمعاش کی سی زندگی گزار رہا تھا۔

اسے پابلو کی اگلی منزل تک روانگی کی ہدایات ملیں تو اس نے پابلو سے ملاقات کی۔ اس خط کے مطابق اسے پابلو کو دارالحکومت سے ایک ہزار کلومیٹر دور کہیں لے جانا تھا۔ یہ پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ ارجنٹینا کے سپاہی راستے میں ان کے منتظر ہوں گے۔

سورج غروب ہونے پر ایک کار کے ذریعے سفر کا آغاز ہوا۔ اس کار سے وہ سانتیاگو تک آگیا یہاں ایک دوسری کار اس کی منتظر تھی۔ سفر پھر شروع ہو گیا تھا۔ پابلو نے بھیس بدل لیا تھا۔ بڑھی ہوئی داڑھی اور چشمے کی موجودگی میں وہ پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ عجیب اتفاق تھا بلکہ مجبوری تھی کہ اس کو ٹیموکو سے گزرنا تھا جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ ایک ایک منظر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اسی قصبے میں بڑا ہوا تھا۔ یہیں اس کی شاعری نے جنم لیا تھا۔ آزادی کے گیت گائے تھے اور اب شاہراہ آزادی پر رواں دواں تھا۔ وہ یہاں ایک لمحے کو رکا۔ اس چشمے کو دیکھا جہاں وہ نظمیں گنگناتا تھا۔ پانی کی آواز کو سنا جو اسے الوداع کہہ رہا تھا۔ ذرا آگے بڑھے تو ایک پولیس افسر نے گاڑی کو روک لیا۔ پابلو خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو کمبل میں اچھی طرح لپیٹ لیا لیکن اس کا خوف بے بنیاد نکلا۔ اس نے لفٹ مانگی تھی۔ اس کے باوجود پابلو نے یہ ظاہر کیا جیسے وہ سو رہا ہے۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا کہ کہیں آواز ہی نہ پہچان لی جائے۔ تقریباً سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ کار سے اتر گیا۔

اس کے بعد کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا اور وہ منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ یہاں سے گھوڑے کی پشت پر ایک نئے سفر کا آغاز ہونا تھا لیکن اس سے پہلے اسی جنگل میں ٹھہرنا تھا۔ پابلو حیران تھا کہ اس ویرانے میں جہاں درختوں کے سوا کچھ بھی نہیں وہ کہاں ٹھہرے گا۔ اتنی دیر میں ایک شخص سامنے آیا۔ پابلو اسے نہیں جانتا تھا لیکن گونزالیس اس سے واقف تھا۔ اس نے دوستانہ انداز میں مصافحہ کیا۔ ''یہ جارج بیلٹ ہے۔ تم جب تک چاہو اس کے مہمان رہ سکتے ہو۔''

پابلو نے ایک مرتبہ پھر ادھر دیکھا کہ یہ مجھے مہمان بنا کر رکھے گا کہاں۔ اس شخص نے پابلو کو ویلکم کہا اور ایک طرف لے کر چل دیا۔

''آؤ میں تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔''

یہ گھر پہاڑی دیہات کے گھنے درختوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا اور بہ مشکل نظر آتا تھا۔ جب ان درختوں میں داخل ہوئے تو اس گھر کا دیدار ہوا۔ علاقے میں دوسری تمام چیزوں کی طرح ایک عارضی سا گھر تھا، یہ گھر واقعی ایسا تھا جس میں برسوں چھپا جا سکتا تھا۔ بہترین پناہ گاہ تھی۔ پابلو ایک ڈیڑھ سال سے چھپتا پھر رہا تھا۔ اب اسے کسی پناہ گاہ سے خوشی نہیں ہو رہی تھی لیکن مجبوری تھی اسے یہاں رہنا تھا۔

بلند و بالا درختوں کے تنوں کو کاٹنے والے آرے سارا دن شور مچاتے رہتے تھے۔ درختوں کے گرنے کی آوازیں دھماکے پیدا کرتیں تو وہ لرز اٹھتا لیکن کچھ دن میں عادی بھی ہو گیا۔ شدید بارش کھڑکیوں پر شور مچاتی رہتی۔ سردیوں کے دن آئے تو یخ ہواؤں نے اس کی ہڈیوں تک کو ٹھٹھرا دیا۔

اس نے یہاں دو موسم گزار دیے تھے لیکن اب گرمیوں کی آمد کے ساتھ ہی جنگل کے مالک کی آمد کا خوف طاری ہو گیا۔ پولیس سے تو اسے خوف نہیں تھا کیونکہ وہ یہاں آ نہیں سکتی تھی لیکن جنگل کے مالک کی نظروں سے بچ نہیں سکتا تھا اس لیے اب اسے یہاں سے روانہ ہونا تھا۔

مالک کا پیغام آیا کہ وہ چل پڑا ہے اور دو روز تک یہاں پہنچ جائے گا۔ پابلو پریشان ہو گیا کیونکہ تیاری ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ پابلو کے سر کی قیمت لگ چکی تھی لہٰذا جنگل کے مالک کے دل میں اسے دیکھ کر لالچ آسکتا تھا۔ پابلو کے دوست اسے تسلیاں دے رہے تھے کہ جنگل کا مالک اچھا انسان ہے اور اسے کبھی حکومت کے حوالے نہیں کرے گا لیکن پابلو کی دور اندیشی نے ان کی بات نہیں مانی۔ اس نے ایک اور کیبن کے گھر منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ دوستوں سمیت جنگل کے دامن میں ایک چھوٹے سے کیبن میں منتقل ہو گیا۔

اس کیبن میں اس کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ اس نے جنگل کے مالک روڈری گاز سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تا کہ اس سے مل کر کوئی غیر جانب دار حل نکالا جائے۔ ابھی وہ اس فیصلے پر عمل نہیں کر سکا تھا کہ روڈری گاز (جنگل کا مالک) کو کہیں سے اس کی بھنک پڑ گئی اور وہ خود اس سے ملنے چلا آیا۔

غروب آفتاب کے وقت ایک جیپ اس کے کیبن کے سامنے آکر رکی۔ اس میں ایک پختہ عمر کا آدمی جس کے بال سفید تھے لیکن صحت بہت اچھی تھی بیٹھا تھا۔ پابلو کو یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور ڈھارس بھی بندھی کہ پابلو کا دوست جارج بھی اس کے ساتھ جیپ میں بیٹھا ہے۔ دونوں ایک ساتھ جیپ سے اترے۔ وہ دونوں کیبن کے اندر آگئے اور بات چیت کا سلسلہ جاری ہو گیا اور مکمل رازداری کا فیصلہ ہو گیا اور یہ اس لیے ہوا کہ وہ پابلو کی شاعری کا عاشق تھا اور پوری پوری نظمیں اسے یاد تھیں۔

چند روز بعد روڈری گاز اپنے کاروبار کے سلسلے میں دارالحکومت واپس جانے لگا۔ اس نے اپنے تمام کام کرنے والوں کو اکٹھا کیا اور حکم جاری کیا۔ ''اگر آئندہ ہفتے محترم لیگا ریٹا (پابلو اسی نام سے یہاں رہ رہا تھا) کو ارجنٹینا جاتے ہوئے اسمگلروں کے رویے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش آئے تو تم لوگ فوراً دوسری سڑک جنگل کا سارا کام روک کر کھول دینا۔ یہ میرے احکامات ہیں۔''

ایک ہفتے بعد پابلو نے یہ جنگل چھوڑ دیا۔ اس مہم کی سربراہی پابلو کے ساتھی جارج کے ذمے تھی پانچ گھڑسوار محافظوں کے طور پر ساتھ تھے۔ جس راستے سے وہ گزر رہے تھے جنگل ایسا گھنا تھا کہ آسمان نظر نہ آتا تھا۔ زمین اتنی دبیز تھی کہ گھوڑوں کے سم اس میں دھنس رہے تھے۔ نہ کوئی رستہ تھا نہ پگڈنڈی۔

ہر شخص اس تنہائی میں گم سر جھکائے آگے بڑھتا گیا۔

اب ایک تالاب تھا جسے عبور کرنا تھا۔ اس کی گہرائی کا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ گھوڑے اس میں اتر گئے ان کے قدم گم ہو گئے۔ وہ سروں کو اونچا اٹھانے کی جستجو کرتے اور تیرتے رہے۔ حفاظت کے ساتھ دوسرے کنارے تک پہنچ گئے۔ ایک قدرتی سرنگ نظر آئی جو چٹانوں میں بنی ہوئی تھی۔ اب اس سرنگ سے گزرنا تھا۔ اس میں داخل ہوئے تھوڑا آگے چلے تو پتھر گرنے لگے۔ ان پتھروں نے گھوڑوں کو زخمی کر دیا لیکن وفادار گھوڑے پھر بھی آگے بڑھتے رہے۔ اس سرنگ سے باہر نکلے تو آنکھوں کی جنت انتظار کر رہی تھی۔ ساری تھکن پل میں دور ہو گئی۔ یہ ایک مختصر سی چراگاہ تھی۔ ناقابل یقین منظر۔ پہاڑوں کی گود میں سمٹا ہوا نقرئی پانی، سبز گھاس، جنگلی پھول، سر پر نیلا آسمان۔ وہ دیر تک آسمان کو تکتا رہا۔ اس نے بہت دن بعد آسمان دیکھا تھا۔

چرواہے جو اپنے گھوڑوں سے اتر گئے تھے انہوں نے اپنی کوئی قدیم رسم ادا کی۔ پابلو کے لیے یہ رسم بھی کسی پراسراریت سے کم نہیں تھی۔ انہوں نے ایک بیل کی کھوپڑی کو ایک گڑھے میں رکھا۔ کچھ دیر خاموشی سے کھڑے رہے اور پھر کھوپڑی میں کچھ سکے اور کھانے پینے کی اشیاء ڈالیں

اور پھر اپنے ہیٹ اتار کر کھوپڑی کے گرد رقص کے انداز میں اچھلنے لگے۔ پابلو کو بھی یہی کرنا پڑا۔

اب سفر اس منزل پر آ گیا تھا جب وہ سرحد عبور کی جانی تھی جو پابلو کو اس کے ملک سے جدا کرنے والی تھی۔ آخری پہاڑیوں کی گھاٹیوں کے نزدیک اچانک وہ روشنی نظر آئی جو انسانی زندگی کی علامت تھی۔ نزدیک پہنچنے پر جھونپڑیوں کی وضع کے سائبان نظر آئے جو خالی تھے۔ پابلو اور اس کے ساتھی ایک سائبان میں داخل ہوئے، دیکھا کہ وسط میں بڑے بڑے تنے جل رہے تھے۔ وہیں ایک طرف پنیر کے ڈھیر تھے۔ بہت سے لوگ بوریوں کی طرح آگ کے نزدیک پڑے ہوئے تھے۔ اچانک گٹار کی آواز سنی اور پھر ایک انسانی آواز میں محبت کا گیت۔ تمام لوگ اس آواز کے تعاقب میں سائبان سے نکل کر چل دیے اس آواز نے انہیں ایک ہوٹل تک پہنچا دیا۔ یہ طے ہوا کہ اس ہوٹل میں ٹھہرا جائے لیکن ان میں سے کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہ ملی۔ ان کی حالت ہی ایسی ہو رہی تھی۔ گھوڑے تھکے ہوئے اور مٹی سے اٹے، کندھوں پر بوریوں اور گرد آلود داڑھیوں والے چہروں سے کوئی بھی خائف ہو سکتا تھا۔ اس ہوٹل میں اسکاٹ لینڈ کے سیاح ٹھہرے ہوئے تھے جو ارجنٹینا میں سالمن مچھلی کے شکار کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ہوٹل کا منیجر ایسے نفیس لوگوں کی موجودگی میں انہیں کیسے اندر جانے دیتا۔ اس نے بہانہ کر دیا کہ آخری کمرا بھی کرائے پر دے دیا گیا ہے۔ اب کوئی کمرا خالی نہیں۔ اسی وقت ایک شخص نمودار ہوا جو فوجی افسر معلوم ہوتا تھا۔ بعد میں یہ اندازہ صحیح نکلا۔ وہ شخص مقامی چھاؤنی کا کمانڈر تھا۔

”رک جاؤ انہیں آنے دو۔ چلی کے باشندوں کو کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ یہیں رہیں گے۔“

کمانڈر کی مداخلت پر انہیں آنے دیا گیا اور کمرے بھی مل گئے۔ ان لوگوں نے خود کو لکڑی کا تاجر ظاہر کیا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو اور واقعی کمانڈر سمیت سب مطمئن ہو گئے تھے۔

چند روز قیام کے بعد انہیں آگے بڑھنا تھا۔

ارجنٹینا کی سرحد عبور کرنے کے بعد اس کے ساتھیوں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ بیونس آئرز میں تھا اور اب اسے پیرس تک پہنچنا تھا۔ اس نے اب تک جعلی کاغذات پر سفر کیا تھا لیکن یہ جعلی کاغذات یورپ میں داخلے کے لیے کسی بھی طرح کارآمد نہیں ہو سکتے تھے۔ ارجنٹینا کی پولیس ہر طرف اس کی تلاش میں تھی۔ اسے اپنا دوست ناول نگار میگوئیل اینجل یاد آیا جو اپنے ملک گوئٹے مالا کی طرف سے سفارتی مشن پر بیونس آئرز آیا ہوا تھا۔ یہ شخص اس لیے اسے یاد آیا کہ دونوں کے چہروں میں خفیف سی مشابہت تھی۔ اس کا پاسپورٹ پابلو کے کام آ سکتا تھا۔ اگر وہ اس خطرناک کام کے لیے تیار ہو جاتا۔ پابلو نے اس سے ملاقات کی۔

”دوست! مجھے اپنا پاسپورٹ ادھار دے دو اور خوشی کے ساتھ یورپ میں میگوئیل اینجل کے طور پر پہنچنے دو۔“

اس نے کچھ بھی نہ سوچا اور دوست کے کام آ گیا اور پاسپورٹ اس کے حوالے کر دیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح پولیس چوکیوں سے بچتا بچاتا فرانس پہنچ گیا۔ اب اسے دوبارہ پابلو نرودا بننا تھا لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ پابلو نرودا تو فرانس پہنچا ہی نہیں۔ میگوئیل اینجل پہنچا تھا۔ اس سے پوچھا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے کاغذات دکھائے۔ اس کو کسی نے مشورہ دیا کہ وہ جارج پنجم ہوٹل پہنچ جائے۔ وہاں بین الاقوامی شہرت یافتہ اہم لوگوں کی موجودگی میں کوئی بھی تم سے کاغذات طلب نہیں کرے گا۔ وہ جارج پنجم ہوٹل میں ٹھہر گیا۔

کسی کو معلوم نہ تھا کہ پابلو نرودا فرانس پہنچ چکا۔

پیرس میں امن کے لیے ایک کانگریس کا انعقاد ہونے والا تھا۔ وہ اپنی نظم پڑھنے اس کانگریس میں پہنچ گیا۔ جب اس نے اپنی نظمیں سنائیں تو لوگوں نے اسے پہچانا۔ لوگ تو اسے مردہ تصور کر چکے تھے اور اب اسے زندہ دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین نہ آتا تھا کہ چلی کی پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ شخص کیسے یہاں تک پہنچ گیا۔

اخبار نویس نے اسے گھیر لیا۔

”چلی کی حکومت تو کہہ رہی ہے کہ نرودا چلی میں کہیں چھپا ہوا ہے اور جلد ہی گرفتار کر لیا جائے گا کیا...... آپ ہی نرودا ہیں یا آپ کا کوئی ہم شکل پیرس آ پہنچا ہے۔“

پابلو نرودا کی ذہانت اس کے کام آ گئی بلکہ صحافیوں نے خود ہی اس کا جواب آسان بنا دیا تھا۔

”آپ لوگوں نے ٹھیک کہا، چلی کی حکومت سے کہو میں نرودا نہیں ہوں بلکہ چلی کا ایک اور باشندہ ہوں جو نظمیں لکھتا ہے، آزادی کے لیے لڑتا ہے اور جس کا نام بھی پابلو نرودا ہے۔“ اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

ابھی کاغذات کی درستی کا معاملہ اٹکا ہوا تھا لہٰذا ابھی اسے نیم مخفی زندگی گزارنی تھی۔ وہ جلدی جلدی گھر بدلنے لگا پھر ایک نہایت غریب بستی میں گھر لے لیا۔ یہاں کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ نرودا یہاں ہوگا۔ اسے فرانس والوں سے اتنا ڈر نہیں تھا جتنا چلی کی حکومت سے۔ چلی کی حکومت دوسری حکومتوں سے برابر رابطے میں تھی اور ان پر دباؤ ڈالتی تھی کہ نرودا اگر ہے تو اسے ہمارے حوالے کرو۔ وہ مفرور ہے اور ہمیں مطلوب ہے۔

یہ گھر محفوظ نظر آیا تو اس کے کچھ دوست جو تقریباً سب ہی چلی کے تھے گھر کی پہلی منزل میں منتقل ہو گئے۔

ایک روز اسی گھر میں جیولس سیز ویلی نام کا شاعر جو بہت کم کہیں باہر جاتا تھا اس سے ملنے آیا۔ اس وقت تک چلی کا اصل پاسپورٹ پابلو کے ذاتی نام کے ساتھ اسے مل چکا تھا۔

”میں تمہارے لیے ایک ضروری پیغام لایا ہوں۔“ جیولیس سیز ویلی نے کہا۔ ”میر ادا ماد بیراڈاکس تم سے ملنا چاہتا ہے کس سلسلے میں یہ نہیں کہہ سکتا البتہ اتنا جانتا ہوں کہ وہ پولیس کا افسر اعلیٰ ہے۔“

پابلو یہ جانے بغیر کہ وہاں کیا باتیں ہو سکتی ہیں۔ اس کے حق میں ہوں گی یا اس کے خلاف لیکن وہاں جا کر اس کی ڈھارس بندھ گئی۔ پولیس کا یہ اعلیٰ افسر اس کا اور اس کی شاعری کا مداح نکلا۔ اس نے پابلو کی تقریباً تمام کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ گفتگو سے پہلے اس نے پابلو کی کئی نظمیں سنائیں جو اسے ازبر تھیں۔ اس کے بعد اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”مجھے چلی کے سفیر کی طرف سے درخواست موصول ہوئی ہے کہ میں تمہارا پاسپورٹ حاصل کر لوں۔ اس درخواست میں لکھا ہے کہ تم سفارتی پاسپورٹ استعمال کر رہے ہو۔ کیا یہ درست ہے۔“

”میرے پاس سفارتی پاسپورٹ نہیں ہے مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ محض سرکاری پاسپورٹ ہے۔ میں اپنے ملک میں سینیٹر ہوں اور اس طرح اس پر میرا حق ہے۔ یہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ اسے دیکھ سکتے ہیں لیکن آپ اسے واپس نہیں لے سکتے کیونکہ یہ میری ذاتی ملکیت ہے۔“

”کیا اس کی تاریخ درست ہے؟ کس نے اسے ٹھیک کیا ہے۔“ افسر اعلیٰ نے اس کا پاسپورٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

”یہ بالکل درست ہے۔“ پابلو نے اسے بتایا۔

”جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ کس نے اس کی تجدید کی تو یہ میں نہیں بتا سکتا کیونکہ چلی کی حکومت اس افسر کو ہٹا دے گی۔“

افسر اعلیٰ نے وضاحت سنی اور چلی کے سفیر کو فون ملایا۔

گفتگو کے دوران اس نے سفیر سے صاف کہہ دیا کہ وہ پاسپورٹ نہیں لے سکتا کیونکہ اس کا پاسپورٹ بالکل درست ہے۔ ٹیلی فون رکھنے کے بعد افسر اعلیٰ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''تم جب تک چاہو فرانس میں رہ سکتے ہو۔''

☆......☆

1949ء میں اس کی جلاوطنی ختم ہوگئی۔ اسے سوویت یونین میں پشکن کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں مدعو کیا گیا تھا۔ وہ لینن گراڈ پہنچ گیا۔ پشکن ایک شاعر جو ایک صدی پہلے مر چکا تھا۔ اس کی صد سالہ تقریبات کو منانے کی خاطر روسیوں نے زار کے محلات کی از سرِ نو تعمیر کی تھی۔ محل کی ہر دیوار کو اس طرح دوبارہ بنایا گیا تھا جیسے یہ زمانہ قدیم میں ہو گی۔ یہاں پہنچتے ہی جس چیز نے اسے سب سے پہلے متاثر کیا وہ وسعت کا ایک احساس اور اس بڑے ملک کی آبادی کا اتحاد تھا۔ اسے پہلی ہی نظر میں سوویت سرزمین سے عشق ہو گیا۔ وہ تقریبات میں شریک ہوا۔ یہاں کے عوامی شاعروں سے ملا۔ ایک ترک شاعر ناظم حکمت سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ وہ شاعر تھا جسے اس کے ملک کی حکومت نے اٹھارہ برس تک جیل میں رکھا۔ اسے ترک بحریہ میں انقلاب لانے کے الزام میں جہنم کی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناظم حکمت سے ملاقات کے بعد پابلو کو نیا حوصلہ ملا۔ ناظم حکمت نے جس اذیت کا سامنا کیا تھا پابلو کی مصیبت اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔

1950ء میں اسے ہندوستان بھیجا گیا۔ اسے دو خط لے کر ہندوستان جانا تھا۔ ایک بمبئی میں کسی سائنس دان کے نام تھا دوسرا وزیر اعظم پنڈت نہرو کے نام۔ اسے یہ عجیب سی بات لگی تھی کہ اتنے معمولی کام کے لیے اس کا انتخاب کیوں کیا گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے جوانی کے کچھ سال گزارے تھے یا پھر اس لیے کہ اسی سال اسے امن کا انعام ملا تھا۔

وہ بمبئی جانے کے لیے جہاز میں سوار ہو گیا جہاں اسے ایک سائنس داں کو خط پہنچانا تھا اور اس کے بعد اسے دہلی جانا تھا۔

جہاز نے اسے بمبئی کے ایئر پورٹ پر اتار دیا۔ یہاں سے اسے کسی ہوٹل میں جانا تھا اور ماہر طبیعات رامن کو خط پہنچانا تھا اور پھر نئی دہلی جانا تھا لیکن اس سے پہلے اسے کسٹم کے مرحلے سے گزرنا تھا لیکن وہ فکرمند نہیں تھا۔ اوّل تو یہ کہ اس کے پاس سامان کم تھا۔ بس ایک درمیانہ سا سوٹ کیس، دوسرے اس لیے بھی مطمئن تھا کہ وہ دو اہم لوگوں سے ملاقات کے لیے آیا تھا لیکن یہی وجہ اس کے لیے مصیبت بن گئی۔ غالباً اسے جاسوس وغیرہ سمجھ لیا گیا۔ اسے چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ پتلونوں کی جیبوں کی تلاشی لی گئی حتیٰ کہ سلائی تک کا جائزہ لیا گیا۔ اس اخبار تک کو ضبط کرلیا جس میں اس نے جوتے لپیٹ رکھے تھے۔ جوتوں کا بھی اندر باہر سے معائنہ کیا گیا۔ اس کا پاسپورٹ، نوٹ بک اور وہ خط جو اسے وزیر اعظم کو دینا تھا ایک کاغذ کے بنڈل میں بند کر کے سربمہر کردیا اور اس کے بعد کہا گیا۔ ''اب آپ جاسکتے ہیں جس ہوٹل میں بھی جانا چاہیں۔''

''جناب سب کچھ تو آپ نے چھین لیا۔ میرے شناختی کاغذات کے بغیر کوئی بھی ہوٹل اپنے رجسٹر میں میرا اندراج نہیں کرے گا۔ وزیر اعظم کو خط بھی نہیں پہنچا سکوں گا کیونکہ وہ بھی آپ نے ضبط کرلیا ہے۔''

''ہم ہوٹل سے بات کرلیں گے۔ تمہیں کمرا مل جائے گا۔ تمہاری باقی چیزیں تمہیں وقت پر مل جائیں گی۔'' کسٹم والوں نے کہا اور واقعی ایسا ہوا۔ ہوٹل کے منیجر نے کسٹم والوں سے بات کی اور اسے کمرا مل گیا۔

جس سائنس دان کے لیے وہ خط لے کر آیا تھا، ہندوستان میں نیوکلیئر فزکس کے شعبے کا ڈائریکٹر تھا۔ اس نے پابلو کو اپنی تنصیبات دکھانے کے لیے مدعو کیا تھا۔ وہ اس سے بھی ملا اور نہرو کی بہن سے بھی ملاقات کی۔ اسی سہ پہر کو ہوٹل میں اسے اپنے کاغذات کا بنڈل مل گیا۔ اس کی ڈور ڈھیلی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ تمام کاغذات کی تصاویر بنا لی گئی ہوں گی۔ بہرحال وہ دہلی کے لیے عازم سفر ہو گیا۔

پنڈت نہرو نے اسے اگلے دن صبح اپنے دفتر میں وقت دیا تھا۔ پابلو اس سے ملنے گیا تو اسے دیکھ کر پابلو کو کوفت سی ہوئی۔ اس کے چہرے پر نامعلوم کیوں ناپسندیدگی کے آثار تھے حالانکہ تیس برس پہلے آزادی کی ایک بڑی ریلی کے موقع پر وہ اس سے مل چکا تھا۔

پابلو نے اس کے نام جو خط تھا اسے دیا۔ پنڈت نہرو نے اس کے سامنے خط کو پڑھا اور جیب میں رکھ لیا۔

''میں پیرس واپس جا کر آپ کے جواب سے کس طرح آگاہ کروں۔''

''میں اس خط کا جواب دے دوں گا۔''

نہرو نے ایسی بیزاری سے کہا جیسے کہہ رہا ہو... اب آپ جاسکتے ہیں۔ کچھ دیر بعد پابلو کو خود ہی احساس ہوا کہ وہ

ایک اہم آدمی کا وقت ضائع کر رہا ہے۔ وہ اٹھا اور اپنا ہاتھ الوداع کے لیے اٹھا دیا۔ نہرو نے بھی خاموشی سے مصافحہ کیا۔

''کیا میں تمہارے لیے کچھ کرسکتا ہوں تم کسی چیز کی خواہش کرو گے؟''

''میں ایک بار ہندوستان میں رہ چکا ہوں لیکن تاج محل دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا جو نئی دہلی سے اتنا قریب ہے۔ یہ اچھا موقع تھا کہ میں اس شاندار یادگار کو دیکھ لیتا لیکن اب کل واپس جا رہا ہوں کیونکہ پولیس کو میرا ہندوستان میں رہنا گوارا نہیں ہے۔'' پابلو نے خدا حافظ کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نہرو نے امن تحریک کے ایک اہم رکن پابلو نرودا کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے۔

وہ ہوٹل پہنچا تو ایک پیغام اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''مجھے حکومتی دفتر کی طرف سے بتایا گیا ہے کہ آپ چاہیں تو تاج محل دیکھنے جاسکتے ہیں۔'' ہوٹل منیجر نے اسے نوید سنائی۔

''مجھے میرا بل بنا دو۔'' پابلو نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے میں تاج محل دیکھنے نہیں جاسکتا۔ میں پہلی پرواز سے پیرس جا رہا ہوں۔''

اگست 1952ء سے اپریل 1952ء تک کا وقت اس نے اپنے ملک چلی میں گزارا۔ دربدری کے بہت برسوں بعد فرصت کے لمحات ملے تھے۔ اس نے لکھنے پڑھنے کے بہت سے ادھورے کام مکمل کیے، کئی ادھوری کتابیں مکمل کیں اور انہیں شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ سانتیا گو ہی میں اپنی پچاسویں سالگرہ منائی جس میں دنیا بھر کے ممتاز ادیبوں نے شرکت کی۔

اپنی لائبریری اور بہت سی دوسری چیزیں چلی یونیورسٹی کو دے دیں۔ چلی ہی سے ایک رسالہ جاری کیا اور اس کے کئی شماروں کی ادارت کی۔

زیادہ تر وقت کمیونسٹ پارٹی کی انتخابی مہمات اور دوسری مصروفیات میں صرف کیا۔ اپنا گھر بھی تعمیر کرایا اور اپنی بیوی میٹلڈی کے ساتھ اس گھر میں منتقل ہو گیا۔

1957ء میں وہ ارجنٹینا میں تھا۔ اسے امن کی کانگریس میں مدعو کیا گیا تھا جسے سیلون کے دارالحکومت کولمبو میں منعقد ہونا تھا۔

وہ بستر میں لیٹا تھا اور سونے ہی والا تھا کہ بہت سے پولیس والے گھر میں گھس آئے۔ انہوں نے سارے گھر کو الٹ پلٹ دیا۔ جب انہوں نے پابلو کو گھر کے پچھواڑے اس کے کمرے میں تلاش کرلیا تو پوچھا یہ کون ہے۔ میرا نام پابلو نرودا ہے۔ اس نے خود ہی بتایا۔

''کیا یہ بیمار ہے۔'' پولیس والوں نے اس کی بیوی سے پوچھا۔

''ہاں یہ بیمار ہے اور سفر کے باعث تھکا ہوا بھی ہے۔ یہ آج ہی یہاں پہنچے ہیں اور کل یورپ کے لیے ہماری پرواز ہے۔''

''اچھا اچھا۔'' انہوں نے کہا اور کمرے سے نکل گئے۔

ایک گھنٹے بعد وہ پھر واپس آگئے۔ اس مرتبہ ایک ایمبولینس بھی ان کے ساتھ تھی۔ ان کے پاس احکامات تھے اور وہ پابلو کو لینے آئے تھے۔ اس کی بیوی نے احتجاج کیا لیکن اس کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے پابلو کو اسٹریچر پر ڈالا اور لے جانے لگے۔ پھر ایمبولینس میں ڈالا اور جیل پہنچا دیا۔ اسٹریچر آہنی دروازوں اور صحنوں میں سے گزرتا ہوا ایک صحن میں پہنچ گیا۔ یہاں قیدیوں کا ایک ہجوم جمع تھا۔ یہ سب قیدی تھے۔ اسے ایسے رکھا گیا تھا کہ کوئی اس کے نزدیک نہ آسکے۔ اس کے باوجود کمبلوں میں سے رینگتے ہوئے ہاتھ اس سے مصافحہ کرتے رہے۔ کچھ لوگوں نے آٹو گراف لینے کے لیے کاغذ آگے بڑھا دیئے تھے۔ بالآخر اسے اوپر والی منزل کے آخری کمرے میں منتقل کردیا گیا۔ اس نے سونا چاہا لیکن سو نہ سکا۔ دن طلوع ہوا تو نیچے قیدیوں کے شور نے جیل خانے کو سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اس شور سے بھی محظوظ ہوتا رہا کہ چلو زندگی کے آثار تو ہیں۔

چند گھنٹے اور گزر گئے اس اثناء میں چلی اور بہت سے دوسرے ممالک کے ادیبوں کا ایک حلقہ سرگرم ہو چکا تھا اور بالآخر انہوں نے اسے آزاد کرالیا۔ اب اسے ایٹمی موت کے خلاف ہونے والی امن کانگریس میں شرکت کے لیے کولمبو جانا تھا۔ اس کے طیارے نے سوویت یونین کو عبور کیا جو اس کے وفد کو ہمراہ لے کر پرواز میں تھا۔

یہ طیارہ دس ہزار میٹر کی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ ہمالیہ کو عبور کرنے کے لیے یہ دیو قامت مزید اوپر کی طرف تقریباً پندرہ ہزار میٹر پر پہنچ گیا۔ وہ اپنی یادوں میں کھو گیا۔ وہ بائیس برس کی عمر میں سیلون میں تنہا رہا تھا۔ یہیں اس نے تلخ ترین نظمیں لکھی تھیں، امن کی خاطر، ان نظموں کا ہی صلہ ہے کہ اب وہ اس کانفرنس کے لیے منتخب ہوا ہے۔ وہ تجدید ملاقات کے

لیے دوبارہ اسی خوب صورت جنت کی طرف جا رہا تھا۔

امن کانگریس میں شرکت کے بعد وہ تنگ گلیوں میں اس نگر کو ڈھونڈنے نکلا جہاں وہ کبھی رہ چکا تھا۔ جہاں اس نے بہت سی دردناک نظمیں لکھی تھیں۔ گھر ڈھونڈنے میں بڑی دقت ہوئی لیکن بالآخر مل گیا مگر اس حالت میں کہ دروازوں کو دیمک لگ چکی تھی۔ اس شکستگی کے باوجود شاید اس لیے کھڑا تھا کہ پابلو اسے ایک مرتبہ اور دیکھ لے۔ پرانے دوستوں میں سے اسے کوئی بھی نہ ملا۔

اس امن کانگریس کے بعد اسے چین جانا تھا۔ اپنے دوست جارج اور اس کی بیوی کے ہمراہ اس نے کولمبو سے ہندوستان کو ہوائی سفر میں عبور کیا۔

موسم بہت خراب تھا۔ ہر لمحہ یہ خیال آتا تھا کہ کوئی حادثہ رونما ہو جائے گا۔ کبھی جہاز میں گھپ اندھیرا ہو جاتا کبھی روشنی نمودار ہو جاتی۔ کبھی بجلی کڑکتی اور جہاز ہچکولے کھاتا۔

کسی حادثے کے بغیر وہ رنگون تک پہنچ گیا۔ یہ وہی رنگون تھا جہاں وہ قونصل بن کر آیا تھا اور محض 23 سال کا تھا۔ یہیں اس نے ایک انجان شخص کی حیثیت سے نظمیں لکھی تھیں۔ اسے یہاں پہنچ کر اسے چاہنے والی محبوبہ جوسی بلیس یاد آئی لیکن اس کا کچھ پتا نہ چلا۔ کوئی بھی اس کی زندگی یا موت کے بارے میں معلومات فراہم نہ کرسکا۔ اس علاقے کا نام و نشان تک نہ تھا جہاں وہ اس کے ساتھ رہتی تھی۔

وہ یہاں سے بھی اڑا اور ان چوٹیوں کو عبور کرنے لگا جو برما کو چین سے الگ کرتی ہیں۔ یہ جہاز برما کی جنگی حالت سے گزر کے چین کے خاموش اور پُرسکون منظر پر سے گزرا۔ سرحد کی دوسری طرف چین کے پہلے شہر میں ایک پرانا شاعر دوست اس کا منتظر تھا۔ اس کا نام آئی چنگ تھا۔

وہ صرف پانچ سال پہلے چین آیا تھا لیکن اس وقت چین کی صنعتی ترقی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

چین کی ہر گلی میں چینی انداز کے مطابق رنگوں کی قوس قزح بکھری ہوئی تھی۔

اسی آئی چنگ شاعر کی رہنمائی میں اس نے چین کے بہت سے شہروں کا دورہ کیا۔ فیکٹریاں، چھاپہ خانے میوزیم اور پگوڈا دیکھے۔ انتہائی منفرد ریستوران میں کھانا کھایا۔

چین کی ترقی کے سمندر میں غوطے کھاتا ہوا وہ سوویت یونین واپس آگیا۔ یہاں پہنچتے ہی اسے جنوب کے دورے کی دعوت دی گئی۔ وہ پہلے سوویت جمہوریہ سوکھولی گیا پھر آرمینیا کی طرف پرواز کرگیا۔ دور جنوب میں کوہ ارارات کی برف پوش چوٹیاں آرمینیا کی تاریخ پر سایہ فگن ہیں۔ بائبل کے مطابق یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ازسرنو زمین کو آباد کرنے کے لیے رکی تھی۔

آرمینیا میں اس نے دھاگا بنانے کے کارخانے دیکھے جہاں پانچ ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے کارخانے بھی دیکھنے کو ملے۔ شہروں سے دیہات تک کا علاقہ دیکھ ڈالا مگر ہر جگہ آرمنی مرد اور عورتوں ہی کو کام کرتے ہوئے پایا۔ خوب گھوم پھر چکا تو صرف ایک روسی انجینئر ملا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا وہ قوم کتنی محنتی ہے۔ اس نے وہ شہر بھی دیکھا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ آتش فشانی مادے سے تعمیر ہوا ہے۔ فلکیات کی رسدگاہ کا دورہ بھی کیا۔ وہ جہاں جاتا تھا چڑیا گھر ضرور دیکھتا تھا۔ یہاں کا چڑیا گھر بھی دیکھا۔

واپس جاتے ہوئے وہ ماسکو میں رکا جواب سوشلسٹ انقلاب کی جنت تھا۔ وہ تحریک جس کے لیے وہ جدوجہد کررہا تھا کامیاب ہوچکی تھی۔

اس روز اس نے وہاں لوگوں کی پریڈ دیکھی۔ اس میں موجود کھلاڑی اور دمکتے ہوئے سوویت جوان سب نپے تلے قدموں کے ساتھ ریڈ اسکوائر میں چل رہے تھے۔ پابلو کو یوں لگا جیسے آنجہانی لینن اپنی کامیابی پر خنداں انہیں دیکھ رہا ہے۔ یہ ایٹمی بربادی کا جشن نہیں تھا بلکہ اس روز روسی خلا بازوں کو جو آسمانوں سے واپس لوٹے تھے انعامات سے نوازا جاتا تھا۔

ریڈ اسکوائر میں خروشیف نے سوویت یونین کے نام پر ان کا استقبال کیا تھا۔

☆......☆

ایک فعال شاعر کی حیثیت سے اس نے اپنی شاعری کو اپنی ذات تک محدود نہیں رہنے دیا۔ حقیقی دنیا میں جو کچھ ہو رہا تھا اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ابتدا میں اسے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن آہستہ آہستہ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے لوگوں کو شاعری اور شاعری کو بطور پیشہ عزت کرنا سکھایا۔ اس نے جب لکھنا شروع کیا تو شاعروں کی دو قسمیں تھیں۔ ان میں سے کچھ تو وہ تھے جو اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور پیسے کے بل بوتے پر اپنی عزت کرواتے تھے۔ شاعروں کا دوسرا گروپ وہ تھا جو شراب خانوں میں پرورش پا رہا تھا یا حکومتی دفاتر میں چھوٹے اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ پابلو نے زندگی کو برہنہ حالت میں بیان کیا۔ بہت دن تک تو لوگ اس برہنگی کو برداشت نہ کرسکے مگر پھر قائل ہوگئے۔

اس کی مقبولیت نے رقص گاہوں تک میں جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ اسے اپنی اہمیت اور مقبولیت کا احساس اس دن ہوا جب ایک دن وہ ایک رقص گاہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ دو نامی گرامی بدمعاش آپس میں الجھ گئے۔ رقص گاہ اکھاڑا بن گئی ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ اسی وقت پابلو سوچے سمجھے بغیر آگے بڑھا اور ان پر برس پڑا۔

"کم بخت غنڈو! تمہیں شرم نہیں آتی، لوگ رقص دیکھنے آئے ہیں اور تم انہیں تنگ کررہے ہو، دفع ہو جاؤ۔"

دونوں غنڈوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی انہیں للکار بھی سکتا ہے۔ ان میں سے ایک نے پابلو کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اس کے ارادے ایسے تھے کہ جیسے وہ پابلو کی ہڈی پسلی ایک کردے گا۔ یہ حرکت کرتے ہوئے وہ اپنے حریف کی طرف سے غافل ہوگیا۔ دوسرے بدمعاش کو موقع مل گیا۔ اس نے اپنے حریف کو ایک زوردار مکا رسید کیا۔ وہ بدمعاش اس مکے کی تاب نہ لا سکا اور زمین بوس ہوگیا۔ فاتح بدمعاش خوشی سے ناچنے لگا۔ پابلو نے اسے بھی للکارا۔

"تم بھی یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ تم دونوں ایک سے ہو۔" پابلو نے کہا اور رقص گاہ سے نکلنے کے لیے ایک تنگ برآمدے سے گزرنے لگا۔ اسی وقت وہ فاتح بدمعاش پابلو اور اس کے دوستوں کے سامنے آگیا۔

"میں تمہارا ہی انتظار کررہا تھا۔" غنڈے نے کہا۔ "بہت سورما بنتے ہو۔ میں ابھی تمہیں دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے پابلو کو ایک زوردار دھکا دیا۔

یہ دیکھتے ہی پابلو کے دوست بھاگ کھڑے ہوئے۔ کسی نے بھاگتے بھاگتے آواز لگائی۔ "پابلو نرودا۔ اپنی جان بچاؤ، بھاگو۔"

خلاف توقع اس غنڈے کے جارحانہ انداز نے دم توڑ دیا۔ وہ نرم پڑ گیا۔

"کیا تم پابلو نرودا ہو۔ شاعر پابلو نرودا۔"

"ہاں میں وہی ہوں۔"

"میں بھی کتنا نابکار ہوں۔" غنڈے نے اپنا سر جھکا دیا۔ "میں ہمیشہ پابلو نرودا کا پرستار رہا ہوں اور جب وہ سامنے آیا تو میں اس کی جان لینے پر تل گیا۔ معاف کرنا میرے دوست، تم تو وہ ہو جس نے انسانیت کا راستہ دکھایا۔ جمہور کی بہبود کے لیے دن رات ایک کردیے۔ مزدوروں کے محسن، انسانی جانوں کے محافظ میں تم سے لڑ رہا ہوں۔"

"جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا۔" پابلو نے کہا اور آگے بڑھنے لگا۔

"ایسے نہیں۔" اس نے کہا اور اپنی جیب سے ایک لڑکی کی تصویر نکالی۔ "یہ میری محبوبہ کی تصویر ہے اسے دیکھو۔ اسے اپنے ہاتھ میں لو۔ میں بھی اسے بتاؤں گا کہ تم نے اس کی تصویر کو اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ یہ بات اسے بے حد خوش کرے گی کیونکہ وہ تمہاری پرستار ہے۔ پابلو نرودا کی پرستار اور جانتے ہو یہ لڑکی تمہاری وجہ سے مجھ سے محبت کرتی ہے۔ تمہاری نظموں کی وجہ سے۔" اس غنڈے نے پابلو کی ایک نظم پڑھنی شروع کردی۔ اسی وقت دروازہ کھلا۔ پابلو کے دوست اسلحہ لے کر آگئے تھے مگر یہاں تو موسم ہی دوسرا تھا۔ وہ سب واپس پلٹ گئے۔ پابلو نرودا بھی اس غنڈے کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

اسی طرح ایک اور واقعے نے اس کی نظموں کی طاقت کا ثبوت دیا تھا۔ کسی بڑے طاقت کا ہوائی جہاز جو سوویت یونین پر جاسوسی مقصد کے لیے اڑ رہا تھا۔ دو زبردست میزائلوں نے اسے نشانہ بنا کر زمین بوس کردیا۔ یہ ناقابل یقین واقعہ کیسے پیش آیا۔ یہ دیکھنے کے لیے صحافی وہاں پہنچے۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ تھا جہاں سے راکٹوں کو چھوڑا گیا تھا۔ نشانہ باز دو تنہا لڑکے تھے۔ صحافیوں نے ان پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

"تم کس قسم کی خوراک کھاتے ہو۔"

"تمہارے والدین کون ہیں۔"

"تم کون سی کتابیں پڑھتے ہو۔"

اس آخری سوال کے جواب میں دونوں نوجوانوں نے ایک ساتھ ہی جواب دیا۔ "ہم نظمیں پڑھتے ہیں اور ہمارے پسندیدہ شاعروں میں کلاسیکی روسی شاعر پشکن اور چلی کا نرودا شامل ہیں۔"

یہ تھی اس کی نظموں کی طاقت۔ اسی طاقت کا سبب تھا کہ ہر سال یہ خبر عام ہو جاتی تھی کہ اسے نوبل انعام کے لیے منتخب کرلیا گیا ہے اور ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی رکاوٹ سامنے آجاتی تھی۔ ہر سال اپنے امیدوار بنائے جانے اور انعام حاصل کرنے کے سلسلے سے تنگ آچکا تھا۔ اسے تو اب یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ ریس میں شامل کوئی گھوڑا ہے۔ لوگ اس پر رقمیں لگاتے ہیں اور وہ ہمیشہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ ایک مرتبہ تو یہ تک ہوا کہ ریڈیو سے اعلان تک ہوگیا کہ اسٹاک ہوم میں اس کا نام لیا جارہا ہے۔ اس مرتبہ وہ ضرور نوبل انعام کا حق

دار ہوگا۔ اس نے اور اس کی بیوی نے صحافیوں کی یورش سے بچنے کے لیے اپنے گھر کو باہر سے تالا لگا دیا۔ گھر میں سرخ شراب کی بڑی مقدار جمع کر لی تاکہ باہر نہ جانا پڑے۔ خبر اتنے یقین سے نشر کی گئی تھی کہ اخباری نمائندوں نے واقعی اس کے مکان کو گھیر لیا لیکن مضبوط تالا دیکھ کر شیروں کی طرح غرانے کے سوا کچھ نہ کر سکے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ پابلو نرودا اندر موجود ہے۔

سوئیڈش اکادمی کے ممبران کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے اور بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ پابلو نرودا اس انعام سے محروم رہ گیا۔

ریڈیو نے کسی یونانی شاعر کے نوبل انعام کو حاصل کرنے کا اعلان کیا۔ خطرہ ٹل گیا تھا۔ اخباری نمائندے جا چکے تھے اس نے دروازے پر پڑا تالا ہٹا دیا۔ اب کوئی بھی ہوا کے جھونکے کی طرح اندر آ سکتا تھا۔ وہی ہوا سہ پہر کے وقت سوئیڈن کے سفیر اپنی بیگم کے ہمراہ اس سے ملنے آئے۔

''یہ یونانی شاعر سیفارس کون ہے جسے نوبل انعام ملا ہے۔'' سفیر نے اس سے پوچھا۔

''میں بھی اس کے بارے میں نہیں جانتا۔''

''کمال ہے! جسے نوبل انعام ملا ہے اسے اتنا تو مشہور ہونا چاہیے تھا کہ کم از کم تم جانتے۔''

''ہوسکتا ہے وہ کوئی گوشہ نشیں شاعر ہو مگر اس کا کام مجھ سے زیادہ اہم ہو۔''

''میں پھر بھی یہ کہوں گا کہ اس کے حق دار تم تھے مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔ جیوری کا یہی فیصلہ ہے۔''

''مجھے افسوس نہیں حالانکہ ہر ادیب کی یہ خواہش ہوگی کہ کبھی وہ نوبل انعام حاصل کرے۔''

ہر سال انعام پانے والوں کی فہرست میں اپنا نام دیکھنے اور انعام نہ ملنے کی خبریں سنتے سنتے 1971ء کا سال آ گیا اس وقت وہ پیرس میں تھا جہاں اسے چلی کے سفیر کا عہدہ دیا گیا تھا کہ ایک مرتبہ پھر اس کا نام اخبارات میں ظاہر ہونا شروع ہوا جس پر اسے اور اس کی بیوی مٹیلڈ کو سخت غصہ آ گیا۔

''یہ کیا ہر سال کا مذاق بنا رکھا ہے۔''

''اس مرتبہ معاملہ کچھ سنجیدہ لگتا ہے۔''

''میں بھی دیکھتی ہوں کیا سنجیدگی ہے۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سفارت خانے کا قونصلر جو خود بھی مصنف تھا۔ اس کے گھر پہنچا۔ باتوں کا سلسلہ وہیں سے شروع ہو گیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ جارج شرطیں لگانے کا عادی تھا اس نے پوری بات سننے کے بعد شرط لگائی۔

''پابلو اگر تمہیں نوبل انعام مل گیا تو تم مجھے اور میری بیوی کو پیرس کے سب سے عمدہ ریستوران میں کھانا کھلاؤ گے۔''

''اگر ایسا نہ ہوا جیسا کہ نہیں ہوگا۔''

''اگر ایسا نہ ہوا تو میں تمہیں اور تمہاری بیوی کو کھانا کھلاؤں گا۔''

''تو پھر تیاری کر لو ہمیں کھانا کھلانے کی کیونکہ تم شرط ہار جاؤ گے۔''

''اب جو بھی ہو۔'' جارج نے کہا۔

''جارج! ویسے ایک بات بتاؤ تمہیں کیوں یقین ہے کہ انعام مجھے مل جائے گا۔''

''سچی بات تو یہ ہے کہ میری ایک دوست اسٹاک ہوم میں صحافی اور ادیب ہے۔ اس نے مجھے فون پر بتایا ہے کہ اس مرتبہ پابلو نرودا کے نوبل انعام پا لینے کے تمام مواقع ہیں۔

دونوں نے اس خوش خبری کے جشن کے طور پر جام ٹکرائے۔ جارج نے ایک مرتبہ پھر اپنی شرط یاد دلائی اور رخصت ہو گیا۔

رات کے کھانے پر اس کا سوئیڈش دوست آرتھر آ گیا جو ایک ادیب تھا اور سوئیڈش اکادمی میں تین چار سال رہ چکا تھا۔ وہ ان دنوں سوئیڈن سے جنوبی فرانس کے دورے پر آیا ہوا تھا۔

کھانے کے بعد اس گفتگو کا ذکر نکل آیا جو اس کے اور جارج کے درمیان ہوئی تھی۔ آرتھر نے بھی اس خبر کی دبے لفظوں میں تصدیق کی۔

''آرتھر، میں تم سے اتنی مدد چاہوں گا کہ اگر یہ خبر درست ہے تو اخبارات میں شائع ہونے سے قبل مجھے بتا دو تاکہ میں اخباری نمائندوں کا سامنا کر سکوں۔''

''میں اس بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔'' آرتھر نے اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس میں صداقت ہے تو سوئیڈن کا بادشاہ تمہیں اس کی اطلاع دے گا یا پھر پیرس میں سوئیڈن کا سفیر تمہیں یہ خبر پہنچائے گا۔ چند روز انتظار کر لو۔''

اکیس اکتوبر کی صبح کو سفارت خانے کے بیرونی کمرے اخباری نمائندوں سے بھرنے شروع ہو گئے۔

سوئیڈن سفیر کا فون آیا اس نے وجہ بتائے بغیر کہا کہ میں اس کا استقبال کروں گا۔

پیرس کے ایک ریڈیو اسٹیشن نے خبر سنائی جس کے مطابق 1971ء کا نوبل انعام چلی کے شاعر پابلو نرودا کو دیا گیا تھا۔

اب ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اخباری نمائندوں سے ملاقات کرے۔ وہ نیچے اترا جہاں اخباری نمائندے اس کے منتظر تھے۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ نمائندے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔ ان کی تعداد اتنی تھی کہ اس کے لیے جواب دینا مشکل ہو رہا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کے کچھ شاعر دوست بھی وہاں پہنچ گئے تھے جنہوں نے مل جل کر اسے اس امتحان سے نکالا۔

اب اسے نوبل انعام کی تقریب میں شریک ہونے کے لیے اسٹاک ہوم جانا تھا۔

نومبر میں اس نے اپنی بیوی مٹیلڈی کے ساتھ اسٹاک ہوم کا سفر کیا۔ کچھ پرانے دوست بھی اس کے ہمراہ تھے۔ انہیں بڑا آسائش گرینڈ ہوٹل میں قیام کے لیے ٹھہرایا گیا۔ اسی ہوٹل میں وہ لوگ بھی تھے جنہیں فزکس، کیمسٹری اور میڈیسن وغیرہ میں نوبل انعام دیا جانا تھا۔

اس عظیم تقریب سے پہلے ریہرسل ضروری تھی۔ یہ ریہرسل اسی مقام پر کی گئی جہاں انعام کی تقسیم کا مرحلہ طے ہونا تھا۔ وقت مقررہ پر تمام انعام یافتگان کو بیدار کر دیا گیا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد انہیں اس عمارت میں پہنچا دیا گیا۔ ہدایات دی گئیں۔ ان ہدایات کے مطابق تمام معزز انعام یافتگان نے بہت سی سیڑھیاں کسی قدم پر رکے بغیر چڑھیں۔ دائیں ہاتھ کی طرف مارچ کرتے ہوئے اسٹیج پر موجود کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تقریب کے روز انہی کرسیوں پر بیٹھنا تھا۔ شاہی خاندان اور بادشاہ کی نشستیں خالی تھیں۔

ایسی ریہرسلیں کئی مرتبہ دہرائی گئیں۔ یہاں تک کہ تقریب کا روز سعید آ گیا۔ ہوٹل کی راہداریوں میں نقرئی قہقہوں کے شور نے اسے وقت سے پہلے بیدار کر دیا تھا۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ سنہرے بالوں والی خوب صورت، خادمائیں سروں پر پھول سجائے اس کے لیے ناشتا لے کر آ گئیں۔ ناشتا کرنے کے بعد ہوٹل کے کمروں میں گھنٹیاں گونجنے لگیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تقریب میں شرکت کے لیے نیچے جانا ہے۔ وہ مٹیلڈی کے ہمراہ نیچے اترا اور تقریب کے ہال میں پہنچ گیا۔

نوبل انعام کی رسم میں سارا مجمع بے حد منظم اور پُرسکون تھا۔ مناسب موقعوں پر تالیوں سے ہال گونجنے لگتا تھا۔ اس کا نام پکارا گیا۔ اس کے ملک چلی کو اچھے لفظوں میں یاد کیا گیا۔ وہ ریہرسل کے مطابق نپے تلے قدموں کے ساتھ بادشاہ کے حضور پہنچا۔ بوڑھے بادشاہ نے مصافحہ کیا۔ سند، تمغا اور انعام کی رقم کا چیک عطا کیا اور وہ اسٹیج پر اپنی مخصوص نشست پر آ بیٹھا۔ غرض ایک بے حد شاندار تقریب تھی جو پابلو نرودا کی شاعری کا اعتراف تھی۔

انعام حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے وطن چلی واپس آ گیا اور ایک بیمار آدمی کی حیثیت سے اپنے گھر ازلانیگرا میں رہنے لگا جہاں لکھتے رہنے کے سوا اسے کوئی کام نہیں تھا۔

چلی میں انتخابات ہونے والے تھے۔ وہاں کی کمیونسٹ پارٹی اسے جمہوریہ کے صدر کے امیدوار کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتی تھی۔ ایک صبح پارٹی کا جنرل سیکریٹری اور دوسرے ساتھی اس کے گھر پہنچ گئے۔ یہ اس کے لیے جمہوریہ کے صدر کے امیدوار کی حیثیت سے مشروط پیش کش لے کر آئے تھے۔ ایک ایسا امیدوار جسے وہ پاپولر فرنٹ کی چھ سات پارٹیوں کے لیے پیش کریں گے۔ اس نے حامی بھر لی۔ اشتراکیوں کے بارے میں صورت حال واضح ہو گئی تھی لیکن پھر حالات نے کروٹ بدلی سلواڈور آلاندے تمام پاپولر یونٹی کے واحد امیدوار کی حیثیت سے سامنے آیا۔ پابلو اس کے حق میں دست بردار ہو گیا اور اپنی پارٹی کی مرضی کے مطابق فوراً ہی ایک بڑے مجمع کے سامنے استعفیٰ دے دیا۔ اس حکمت عملی نے کام دکھایا اور آلاندے جمہوریہ چلی کا صدر بن گیا۔

آلاندے نے اس کی حب الوطنی کی قدر کی۔ اس طرح کی کہ اسے فرانس میں چلی کا سفیر بنا کر بھیج دیا۔ اس نے یہ عہدہ سوچے سمجھے بغیر قبول کر لیا تاکہ ایک مرتبہ پھر زندگی کی لہر میں بہہ جائے۔ وہ پہلی بار مقبول فاتح حکومت کی نمائندگی کرنے پر بے حد خوش تھا۔ جب وہ پیرس کے سفارت خانے میں اختیارات کی منتقلی کے لیے پہنچا تو آزاد حکومت کے نمائندے کے طور پر چلی کے سفارت خانے میں ایک شان و شوکت کے ساتھ داخل ہونا اچھا لگا۔

چلی میں انقلاب آ چکا تھا مگر دشمن اندر اور باہر سے اسے تباہ کرنے کے لیے اپنے دانت تیز کر رہے تھے۔ ایک سو اسی سال سے ایک ہی قسم کے حکمران مختلف لیبلوں کے تحت

اس ملک میں ایک دوسرے کے بعد آ چکے تھے۔ یہ صورت حال اب بھی کم ہی بدلی تھی۔ چلی میں سفارتی تقرریاں ایوان بالا کی منظوری سے ہوتی تھیں۔ اس کی تقرری بھی محض اس لیے ہوگئی تھی کہ چلی کے دائیں بازو نے ہمیشہ بہ حیثیت شاعر اس کی تعریف کی تھی۔ اس کے باوجود اس تقرری کے لیے وہ محض تین ووٹوں سے جیت سکا تھا۔

سابقہ سفیر نے پیرس میں چلی کے سفارت خانے کو اپنے معتقدین کی تصویروں سے سجا رکھا تھا۔ پابلو نرودا نے ان تصاویر کو ہٹا کر ان کی جگہ چلی کے پانچ سورماؤں کی تصاویر لگانے کا حکم دیا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے چلی کے جھنڈے کو بلند رکھا۔ اسے آزادی دی۔ ان میں چلی کی کمیونسٹ پارٹی کے بانی کی تصویر بھی تھی۔

کسی دربان تک کا تقرر بھی اس وقت تک نہیں ہوتا تھا جب تک وہ قدامت پسند نہ ہو۔ تمام عہدے ابھی تک ان لوگوں کے ہاتھ میں تھے جو دائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے۔ اس صورتِ حال میں پابلو نے درخواست کی کہ پیرس کے سفارت خانے میں ممتاز ادیب جارج ایڈورڈز کو قونصلر مقرر کردیا جائے جو بائیں بازو سے تعلق رکھتا تھا اس کی یہ درخواست منظور ہوگئی۔ ایڈورڈ اس وقت کیوبا میں تھا۔ وہ پیرس منتقل ہوگیا۔

دو سال بعد بیمار پابلو چلی واپس لوٹ آیا۔ اس کی تجربہ کار آنکھوں نے یہاں ملا جلا موسم دیکھا۔ ایک طرف محبتوں کا آزادی کا برابری کا موسم تھا تو دوسری طرف اس نے یہ بھی دیکھا کہ نفرتوں کی بیلیں دیواروں پر چڑھ رہی ہیں۔ اس نے اشتراکیوں کے خلاف جھوٹ اور بہتان پر مبنی اشتہارات، سوویت یونین کے خلاف اشتہارات کسی خانہ جنگی کی پیش گوئی کر رہے تھے۔

ان اشتہارات کو دیکھ کر وہ سر سے لے کر پاؤں تک کانپ اٹھا۔ وہ ہٹلر سے پہلے کے یورپ میں رہ چکا تھا اور ہٹلر کے چاہنے والوں کے پروپیگنڈے کی یہی روح تھی، جھوٹ کا بے جا استعمال۔

اس کے خیال میں جب رجعت پسندوں کو تخریب کاری پر انحصار کرنا پڑا تو وہ اسے بلا سوچے سمجھے استعمال کرتا تھا۔

آلاندے کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازشوں کا آغاز ہوگیا۔ یہ سازشیں آرمی چیف آف اسٹاف کے دروازے تک پہنچ گئیں۔ اسے مجبور کیا گیا کہ وہ آلاندے کا تختہ الٹ دے لیکن اس نے انکار کردیا۔ اب وہ بھی خطرہ بن گیا تھا۔ کسی بھی وقت اس راز سے پردہ اٹھا سکتا تھا یا سازش کرنے والوں کو قتل کرا سکتا تھا۔

چلی کے ایک علاقے میں یہ کھیل کھیلا گیا۔ جنرل شنائیڈر، چیف آف آرمی اسٹاف اپنے گھر سے نکلا ہی تھا کہ کچھ لوگوں نے جو کہیں چھپے بیٹھے تھے مشین گنوں سے اسے بھون ڈالا۔ فوجی عدالت نے تفتیش کی تو معلوم ہوا یہ آپریشن ایک سابق جنرل کے کہنے پر ہوا تھا جو فوج سے نکالا جا چکا تھا۔ الزام ثابت ہونے پر فوجی عدالت نے اس شخص کو 32 سال کے لیے جیل میں ڈال دیا۔ سپریم کورٹ نے یہ مدت کم کر کے دو سال کردی۔ اگر کوئی غریب انسانی بھوک سے مجبور ہو کر مرغی چرا لیتا تو اس سے دگنی سزا کا حقدار ہوتا اور آرمی چیف کے قاتل کو صرف دو سال کی قید ہوئی۔ یہ تھا وہ طبقاتی فرق جو چلی میں پروان چڑھ رہا تھا اور آلاندے اس کی راہ میں رکاوٹ بن رہا تھا۔

یہ تو بہت بعد میں معلوم ہوا تھا کہ سابق صدر فیری بھی اس ہلچل میں شریک تھا۔

آلاندے ایک مرتبہ بچ گیا تھا لیکن دوبارہ نہ بچ سکا۔ چلی کی بحریہ نے آلاندے کی حکومت کے خلاف بغاوت کردی جس میں فوج بھی شریک ہوگئی۔ صدارتی محل پر بمباری کی گئی جس کے نتیجے میں آلاندے مارا گیا۔

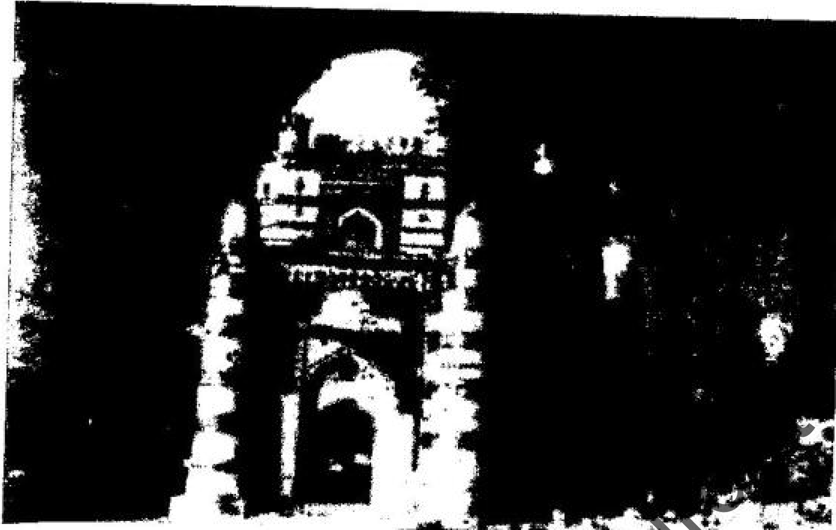
اس وقت پابلو نرودا بستر علالت پر تھا اور اپنی نصف صدی کی جدوجہد کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

آلاندے کا قتل 11 ستمبر 1973ء کو ہوا اور 23 ستمبر 1973ء کو پابلو نرودا بھی اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

یہ کس کا تابوت ہے
پابلو نرودا کا
کیا
اس شاعر نے سچ ہی تو کہا تھا
دھوکے باز جنرل
میرے مردہ گھر کو دیکھتے ہیں
اور ٹوٹے ہوئے اسپین پر نظر ڈالتے ہیں
ہر گھر سے پھولوں کی بجائے
جلتا ہوا لوہا بہتا ہے

ماخذ

پابلو نرودا..... مترجم، انور زاہدی



خورشید روحانیت

وسیم بن اشرف

برصغیر جہاں بت پرستی عام تھی، بتوں کو پوجا جاتا تھا ایسی سرزمین پر خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت عام کرنا معمولی بات نہ تھی، کفر کے اندھیرے کو ایمان کی روشنی سے جگمگانے والے اولیاء اللہ کا تذکرہ باعث ثواب بھی ہے۔

ایک ولی کامل کا مختصر سا تذکرہ

مدینہ منورہ میں ایک شور سا تھا۔ لوگ حیرت سے اس عمر رسیدہ شخص کو دیکھ رہے تھے جس کے سر اور داڑھی کے بال پریشان تھے، چہرہ سیاہی مائل ہوگیا تھا اور آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ یہ دیوانہ، یہ مجذوب کہاں سے آیا تھا، لوگوں کو اس بات کی خبر نہ تھی۔ مقامی باشندوں نے تو بس ایک خبر سنی تھی اور وہ اس نیم پاگل شخص کو دیکھنے کے لیے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی رہی اور عوام الناس کی بھیڑ جمع ہوتی گئی۔ ایک بے ضرر سا آدمی مدینۂ رسولؐ میں تماشا

بن کر رہ گیا تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور وہ غریب الدیار حیرت زدہ سا لوگوں کو دیکھ رہا تھا کہ آخر اس سے دنیا کے مقدس ترین شہر میں ایسا کون سا گناہ سرزد ہو گیا ہے جس کی خبر سن کر مخلوق خدا میرے ارد گرد سمٹ آئی ہے۔ وہ حیران ہوتا رہا اور اللہ کے بندے اس کے گرد حصار قائم کرتے رہے۔

بس ایک عام سی بات تھی مگر لوگوں نے اسے افسانہ بنا دیا تھا۔ یہ مجذوب سا شخص جو شریعت محمدیؐ سے پوری طرح باخبر تھا، روضۂ رسول پاکؐ کی زیارت کے لیے ہندوستان سے آیا تھا اور آقائے کائناتؐ کے مزار مقدس کے اندر جا کر حاضری دینا چاہتا تھا۔ جب اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار دربان سے کیا تو وہ چند لمحوں تک بڑی حیرت سے اس شخص کو دیکھتا رہا اور پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”روضۂ رسول کریمؐ کا دروازہ صرف سیدوں کے لیے کھلتا ہے۔“

”میں بھی صحیح النسب سید ہوں۔ تم مجھے نہیں پہچانتے مگر ہندوستان کا ایک ایک فرد جانتا ہے کہ رسول کریمؐ سے میرا کیا رشتہ ہے؟“

عمر رسیدہ شخص کو یقین تھا کہ اس وضاحت کے بعد بارگاہ رسالت کا دربان بہت زیادہ متاثر ہوگا اور اس کی حاضری کے لیے در مقدس کھول دے گا لیکن اس وقت اجنبی شخص کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب دربان نے اسے مذاق اڑانے والی نظروں سے دیکھا اور بڑے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ تم سید ہو تو دربار رسول کریمؐ کی یہ روایت رہی ہے کہ سیدوں کے لیے بارگاہ اقدس کا دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے۔“ دربان نے ایک مرتبہ پھر اس اجنبی کی طرف دیکھا جو سید ہونے کا دعویدار تھا اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم مجھے شکل و صورت کے اعتبار سے سید نظر نہیں آتے کیونکہ سید کے چہرے پر تابانی ہوتی ہے اور ایک تم ہو کہ جس کے چہرے پر نہ خاندانی وجاہت ہے اور نہ سیدوں کا سا جلال و نور؟“

دربان کی بات سن کر اجنبی مسکرایا اور بہت نرم و شیریں لہجے میں بولا۔ ”میرے عزیز! میں ہوا میں اڑتا ہوا ہندوستان سے آ رہا ہوں۔ سورج کی تمازت اور گرد و غبار کے سبب یقیناً میرے چہرے پر خاندانی جلال و نور باقی نہ رہا ہوگا لیکن مجھے دنیا کا کوئی آدمی سیدوں کی فہرست سے خارج نہیں کر سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ لوگوں نے اپنے نسب نامے بدل ڈالے ہیں، پھر بھی اس دور خرابی میں میرا نسب نامہ معتبر ہے۔“ مجذوب نما شخص کے لہجے میں بڑی حلاوت تھی۔ انہوں نے دربان کی باتوں کا برا نہیں مانا تھا۔ لیکن دربان......؟ اس کی نشتر زنی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اس نے پھر ایک بار مجذوب کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا اور طنزیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”اے خدا کے بندے! کیا یہ کم مضحکہ خیز بات ہے کہ تو بہت دیر سے سید ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے لیکن روضۂ اقدس کا دروازہ اب تک نہیں کھلا۔ کیا تو نے اپنی اس شکست پر ندامت محسوس نہیں کی؟ اور پھر ستم یہ کہ تو سید ہونے کے ساتھ ہوا میں اڑنے کا بھی دعویدار ہے۔ کیا یہ پاگل پن کی علامت نہیں۔“ دربان یہ کہہ کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور فوراً ہی مجذوب سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”شاید ہندوستان میں لوگ ہوا کے دوش پر اڑ کر شعبدے دکھاتے ہوں گے لیکن یہاں اس قسم کی حرکتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ خدا کے لیے اپنے حال پر رحم کھا اور دیار مقدس میں خود کو تماشا نہ بنا۔ تو نہیں جانتا کہ یہ کیا مقام ہے؟“

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

(آسمان کے نیچے یہ وہ مقام ادب ہے جو عرش سے بھی زیادہ نازک تر ہے اور اسی جگہ جنید بغدادیؒ اور بایزید بسطامیؒ (جیسے بزرگوں) نے اپنے ہوش و حواس کھوئے ہیں۔

دربان نے اس شخص کے جذبہ عقیدت پر شدید طنز کیا مگر وہ پھر بھی خفا نہیں ہوئے۔ ان کے ہونٹوں پر ایک لطیف سی مسکراہٹ تھی جو انتہائی ناگوار بات سننے کے بعد بھی ایک مسلمان کے ہونٹوں پر ابھر آتی ہے۔ دربان مجذوب کے چہرے کی شگفتگی دیکھ کر جھنجھلاہٹ کا شکار ہو گیا۔

”اب کیوں خاموش ہو؟ حضور رسالت مآبؐ پر بصد ادب و احترام درود و سلام بھیجو اور چپ چاپ واپس چلے جاؤ۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم اپنی نادانیوں کے سبب قہر خداوندی کا شکار نہ ہو جاؤ۔“

دربان مجذوب کی محبت کو گستاخی سمجھ کر عذاب آسمانی کے نازل ہونے کی خبر دے رہا تھا۔ اور مجذوب کے چہرے پر وہی سکون و اطمینان تھا جو اکثر اہل قناعت کے چہرے پر نظر آتا ہے۔ مجذوب نے محبت آمیز نظروں سے دربان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے دلکش انداز میں کہا۔

”بھائی! میں تمہیں کچھ نہیں کہتا کہ تم محبوب خدا کے آستانے کے دربان ہو۔ تمہارے قدموں کی خاک بھی میری آنکھوں کا سرمہ ہے۔ تمہارے جوتے بھی میرے سر کی رونق ہیں مگر یہ تو سوچو کہ میں اپنے آقاؐ کے دربار میں حاضری دینے کے لیے کتنی دور سے آیا ہوں؟ اس طرح خالی ہاتھ کیسے چلا جاؤں؟“

مجذوب کا لہجہ اس قدر شیریں اور اثر انگیز تھا کہ دربان کو پگھل جانا چاہیے تھا مگر اس نے اپنے فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ شاید اس کی وجہ مجذوب کی زبان سے نکلا ہوا یہ جملہ ہو کہ ”میں ہوا میں اڑتا ہوا ہندوستان سے آ رہا ہوں۔“ بظاہر یہ ایک غیر عقلی بات تھی جسے سننے کے بعد دربان نے آنے والے شخص کے بارے میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پاگل ہے اور اسی دیوانگی نے روضۂ رسول پاکؐ کے دربان کو مجذوب کی بات ماننے سے باز رکھا۔ یہاں تک کہ اس نے آخری بار مجذوب سے صاف صاف کہہ دیا۔ ”میں تمہارے لیے دربار رسالت مآبؐ کا دروازہ نہیں کھولوں گا۔ اگر تم واقعتاً سید ہو تو پھر تمہیں میرے تعاون کی ضرورت نہیں۔ دروازہ خود بخود کھل جائے گا۔“ یہ کہہ کر دربان دوسری طرف متوجہ ہو گیا جیسے اس نے مجذوب کی موجودگی کو یکسر نظر انداز کر دیا ہو۔

مجذوب نے بڑی اداس نظروں سے دربان کو دیکھا اور پھر اس سے ایک لفظ کہے بغیر سر جھکا کر، دربار رسالت مآب کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

مجذوب کو کئی گھنٹے اسی عالم سکوت میں گزر گئے۔ وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر دیار رسولؐ کی خاک پر سرنگوں بیٹھا تھا۔ اہل نظر مجذوب کے اس عمل پر خاموش تھے اور جن لوگوں کو صرف ظاہری آنکھ کی روشنی بخشی گئی تھی، وہ اسے ایک دلچسپ تماشا سمجھ رہے تھے۔ پہلے چند کانوں تک یہ خبر پہنچی اور پھر اس طرح عام ہوئی کہ لوگ بے اختیار کھنچے چلے آئے۔ وہ اپنی آنکھوں سے اس شخص کی دیوانگی کا انجام دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ صحیح النسب سید ہونے کے ساتھ ہوا میں اڑنے کا بھی دعویدار تھا۔ ممکن تھا کہ کچھ لوگ اس کے دعوے پر دھیان نہیں دیتے مگر ہوا میں اڑنے کا دعویٰ اس قدر مضحکہ خیز تھا کہ سنجیدہ لوگ بھی مجذوب کا مذاق اڑا رہے تھے۔

صبح سے شام ہوئی لیکن دربار رسالت مآب کا دروازہ نہیں کھلا۔ مجذوب کا خیال تھا کہ اسے بہت جلد اندر آنے کی اجازت مل جائے گی مگر جب ایسا نہیں ہوا تو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ہجوم انسانی کی آنکھوں میں تمسخر کا گہرا رنگ، اور ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ مجذوب نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں پھر اسی کرب کے عالم میں دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن عصر کی نماز کے بعد جب مجذوب سے برداشت نہیں ہوا تو وہ بچوں کی طرح رو پڑا۔

کہا جاتا ہے کہ مخدوم جہاں گشت کی والدہ بخارا کے مغل بادشاہ محمد خدا بندہ کی بیٹی تھیں۔ یہ بخارا سے ہجرت کر کے برصغیر ہندو پاک تشریف لائے اور بہاولپور میں اوچ کے مقام پر مقیم ہوئے اور خانقاہ جلالیہ کی بنیاد ڈالی۔ بخارا سے اوچ (ہندوستان) ہجرت کے حوالے سے بہت سے واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن میں سے ایک اس طرح سے ہے کہ بخارا کا مغل حکمران محمد خدا بندہ، اہل بیتؓ کا عقیدت مند تھا، یہ ہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی تینوں بیٹیوں کی شادیاں خاندان سادات سے کی جب محمد خدا بندہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا لڑکا تخت نشین ہوا تو عوام کی اکثریت جلال اعظم گل سرخ کی معتقد ہونے کے باعث ان کی تعظیم کرنے لگی جو کہ نئے حکمرانوں کے لیے باعث پریشانی تھا مگر اس واقعہ میں سچائی اس لیے نہیں ہے کہ محمد خدا بندہ کی تاریخ وفات اور جلال اعظم گل سرخ کی تاریخ پیدائش میں بہت فرق ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اوچ اس وقت کے پاکستان کا بہت ہی اہم ترین شہر تھا۔ موجودہ پاکستان کا جغرافیہ کے اعتبار سے اس وقت بھی جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ اس وقت بھی اوچ شہر پنجاب، سندھ، بلوچستان، اور سرحد کے عین مرکز پہ واقع ہے جب کہ اس شہر کی نوعیت اس طرح کی ہے کہ اس کے دو اطراف میں اس وقت بھی دریا بہہ رہے ہیں جن کی وجہ سے یہ علاقہ ہمیشہ ہی سرسبز و شاداب رہا ہے یہ ہی وجہ ہے کہ جب سکندر اعظم راجا پورس کو شکست دے کر اس علاقے سے گزرا تو اس علاقہ میں ایک نیا شہر آباد کیا جس کا نام اپنے نام پہ سکندریہ رکھا جس کو بعد میں اوچ کے نام سے جانا گیا۔

حضرت جلال اعظم گل سرخ بخارا سے اوچ تشریف اس لیے لائے اس علاقے سے مشرکانہ اور غیر اسلامی عقائد کا خاتمہ کیا جائے اور یہاں پہ اسلام کی صحیح تعلیمات کی تبلیغ کی جائے حضرت جلال اعظم گل سرخ کی آمد کا یہ مقصد بھرپور انداز میں پورا ہوا پنجاب اور سندھ کے اکثر قبائل راجپوت۔ کھرل، کھر بھٹی، اور دیگر قبائل کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ان کی اکثریت نے حضرت جلال اعظم گل سرخ اور ان کی اولاد ہی کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔

"آقا! اب تک میں خود کو سید سمجھتا رہا مگر آج مجھ پر یہ راز فاش ہوا کہ میرا نسب نامہ مجہول ہے۔ میرے ماں باپ نے مجھے غلط بتایا۔ میں سید نہیں ہوں۔ اگر نسبی طور پر آپ سے میرا کوئی رشتہ ہوتا تو اس طرح آپ ہی کے دربار میں تماشا نہ بنتا۔ سید لولاکؐ! ایک نظر دیکھیے، کتنے لوگ مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں۔"

ابھی مجذوب کی فریاد کی لے زیادہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ شہنشاہ کونینؐ کے دربار اقدس کا دروازہ کھلا اور مجذوب جلال رسالت سے لرزتا ہوا روضۂ اطہر کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ مجذوب سرنگوں اور اشکبار تھا۔

"اچانک ایک غیبی آواز سنائی دی۔ "فرزند! تمہارا نسب نامہ مجہول نہیں۔ تم صحیح النسب سید ہو۔ تمہیں کسی سند کی ضرورت نہیں۔"

"مگر میرے آقا! میں تین دن تک شرف باریابی کے لیے ترستا رہا ہوں۔ کیا مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے؟" مجذوب کا لہجہ اس قدر رقت آمیز تھا کہ صحیح لفظ زبان سے ادا نہیں ہو رہے تھے۔

"تم سے ایک وقت کی نماز میں ایک مستحب ترک ہوا ہے اور تمہیں اس کا احساس بھی نہیں۔ مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور تارکِ سنت بھی ہو۔ یہ کیسا رشتہ ہے؟ یہ کیسا عشق ہے؟"

اس کے بعد مجذوب اپنی زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ روضۂ اقدس کی دیواروں سے لپٹا ہوا روتا رہا۔ اشک ندامت سے جب گناہ کا داغ دھل گیا تو سرور کونینؐ پر درود و سلام بھیجنے کے بعد بارگاہ رسالت مآب سے باہر نکل آیا۔

"میں آپ سے شرمندہ ہوں۔" دربان نے مجذوب سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ "یہاں بہت سے لوگ سید ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ میں کس کس کی بات پر دھیان دوں؟"

"بھائی! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ میرے ہی چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اس لیے تم مجھے پاگل سمجھنے میں حق بجانب تھے۔ بہرحال تم اگر اسے غلطی سمجھتے ہو تو میں نے تمہیں معاف کیا۔ خدا تم پر اپنی برکتیں نازل کرے۔" یہ کہہ کر مجذوب نے شہنشاہ لولاکؐ کے دربان سے مصافحہ کیا اور مخلوق خدا کے ہجوم سے گزرتا ہوا ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ لوگوں کی بھیڑ مجذوب کو بڑی حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ پہلے ہر ایک کی آنکھ میں تمسخر کی گہری پرچھائیاں لرز رہی تھیں، اب انہی آنکھوں میں عقیدت کا عکس تھا لیکن مجذوب ان تمام باتوں سے بے نیاز آگے بڑھتا رہا اور پھر وہ انسانی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب وہ ہوا کے دوش پر سفر کر رہا تھا اور اس کا رخ ہندوستان کی طرف تھا۔

"ہم نے انسان کے لیے شمس و قمر، ہواؤں، بادلوں اور دنیا کی ہر شے کو مسخر کر دیا ہے۔"

مجذوب بھی تسخیر کے اسی فارمولے کے مطابق ہوا میں اڑ رہا تھا۔

جو شخص مدینۃ الرسولؐ میں مجذوب قرار پایا اور دیار خاتم الانبیاءؐ میں تماشا بنا، اس کا تعارف کراتا چلوں وہ کوئی اور نہیں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ تھے۔ جن کا خاندانی نام میر سید جلال الدین تھا۔ اگر ان کی روداد بیان کرنا شروع کروں تو طوالت اتنی ہو جائے گی کہ اسے کئی نشست میں پڑھنا پڑے گا۔ اس لیے مختصر سا تعارف پیش کرنا پڑ رہا ہے۔ آپ بمطابق 707 ہجری اوچ شریف (ریاست بہاول پور) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سید احمد کبیرؒ تھا۔ آپ نسلی اعتبار سے صحیح النسب سید تھے۔ آپ کے چہرۂ مبارک سے خاندانی وجاہت کی تمام نشانیاں ظاہر تھیں۔ آپ کا بچپن بھی دوسرے بچوں سے مختلف اور اس قدر عجیب انداز سے گزرا کہ بڑے بڑے اہل دانش اور صاحب ہوش مہر بہ لب رہ گئے۔ ہر آنکھ جو اپنے اندر باطن کی روشنی رکھتی تھی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ حضرت جلال الدینؒ جوان ہو کر معرفت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوں گے۔ اس لیے بہت چھوٹی سی عمر میں ان میں ایسی صفات ظاہر ہونے لگیں کہ لوگ آپ کا ادب کرنے پر مجبور ہو گئے۔

جب آپ کی عمر سات سال کی ہوئی تو ایک روز حضرت مخدومؒ کے والد آپ کو حضرت شیخ جمال الدین خنداں روؒ کی خدمت میں لے گئے۔ حضرت شیخ جمال الدینؒ ایک صاحب کمال بزرگ تھے۔ آپ کے سامنے جب مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کو لایا گیا تو وہ بھی اس بچے کو دیکھ کر چونک اٹھے مگر زبان سے کچھ نہ کہا، صرف محبت سے بھرپور نظر ڈالی اور پھر دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد حضرت شیخ جمال الدینؒ نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کھجوروں کے طباق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک خادم سے کہا۔ "اسے حاضرین محفل میں تقسیم کر دو۔"

ایک عارف کے دربار کا تبرک تھا۔ حاضرین نے بصد شوق کھانا شروع کر دیا۔ حضرت مخدومؒ بھی بڑی عقیدت کے ساتھ کھجوریں کھا رہے تھے۔ جب کھجوریں ختم ہو گئیں تو آپ نے گٹھلیاں کھانی شروع کر دیں۔ حضرت جلال الدین خنداں

روؒ کچھ دیر تک خاموشی سے آپ کے اس عمل کو دیکھتے رہے پھر آپ نے فرمایا۔ "بچے! یہ گٹھلیاں پھینک دینے کی چیز ہیں، تم انہیں کیوں کھا رہے ہو؟"

ایک عارف وقت کے یہ الفاظ سن کر تمام حاضرین محفل حضرت مخدومؒ کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ یہ کم سن بچہ ایک مرد کامل کی بات کا کیا جواب دیتا ہے؟

حضرت مخدومؒ چند لمحوں تک سر جھکائے بیٹھے رہے اور پھر آپ نے حضرت خنداں روؒ کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کھجوریں مجھے آپ کے ہاتھ سے نصیب ہوئی ہیں اس لیے ان کی گٹھلیاں بھی فیض سے خالی نہیں۔"

حضرت مخدومؒ کا یہ جواب سن کر پوری محفل پر سناٹا طاری ہو گیا۔ موجود لوگوں میں سے کوئی بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ ایک سات سالہ بچہ اتنے پتے کی بات کہہ سکتا ہے۔ حضرت خنداں روؒ حضرت مخدوم کا جواب سن کر مسکرائے اور پھر بڑی محبت سے فرمانے لگے۔ "صاحبزادے! خدا کا شکر ہے کہ میری آنکھوں نے دھوکا نہیں دیا۔ خدا تمہیں اپنی پناہ میں رکھے اور جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، ان ہی رحمتوں کو آسمان سے تم پر نازل فرمائے۔" یہ اپنے وقت کے مشہور بزرگ حضرت جلال الدین خنداں روؒ کی پیش گوئی تھی جو روز و شب کے الٹ پھیر میں حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔

اس واقعے کے بعد آپ ظاہری علوم حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے دو سال تک شیخ الاسلام امام المحدثین حضرت شیخ عفیف الدین عبداللہؒ کی شب و روز خدمت کی جس سے متاثر ہو کر اس مرد کامل نے حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کو علوم ظاہر و باطنی کے رموز سے آشنا کرایا اور خرقہ بھی عطا کیا۔ مگر ابھی آپ تشنہ لب تھے اور علم کی پیاس دم بہ دم بڑھ رہی تھی۔ اپنے اس کرب کو ظاہر کرنے کے لیے حضرت مخدوم نے شیخ عفیف الدینؒ سے عرض کیا۔

"حضرت! ابھی میں پیاسا ہوں، ابھی تو میرے ہونٹ ہی تر ہوئے ہیں۔ ابھی مجھے اپنی چشم کرم سے دور نہ فرمایئے۔"

حضرت شیخ عفیف الدینؒ نے ایک طالب علم کی تڑپ دیکھی مگر زبان سے کچھ نہیں کہا اور جب حضرت مخدومؒ نے بہت ضد کی تو آپ نے فرمایا۔ "جلال الدین! میرے پاس تمہارا جو کچھ حصہ تھا میں دے چکا۔ باقی تمہیں کازرون میں ملے گا۔"

یہ ایک واضح اشارہ تھا جسے حضرت مخدومؒ فوراً سمجھ گئے۔ ان کا سلسلہ علم ابھی منقطع نہیں ہوا تھا مگر چشمہ معرفت سے

حضرت جلال الدینؒ بخاری

المعروف بمخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا شجرہ

حضرت جلال الدینؒ بخاری المعروف بمخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ (پوتے جلال اعظم گل سرخ) بن احمدؒ بن احمد کبیرؒ۔ بن علی موید بن جعفر یہ مدینہ سعودی عرب سے بخارا ہجرت کرکے آئے تھے۔ بن احمدؒ بن محمدؒ بن عبداللہؒ بن علی اشقرؒ بن جعفر زکیؒ بن علی نقیؒ (امام نقی ان کی اولاد نقوی کہلاتی ہے۔ تمام اصل بخاری سادات و نقوی سادات ان ہی کی اولاد ہیں) بن محمد تقی (امام تقی ان کی اولاد تقوی کہلاتی ہے) بن علی رضا (امام علی رضا ان کی اولاد رضوی کہلاتی ہے) بن موسیٰ کاظم (امام موسیٰ کاظم ان کی اولاد کاظمی کہلاتی ہے) بن جعفر صادق (امام جعفر صادق ان کی اولاد جعفری کہلاتی ہے) بن محمد باقر (امام باقر ان کی اولاد باقری کہلاتی ہے) بن زین العابدین (امام زین العابدین ان کی اولاد عابدی کہلاتی ہے) بن حسین سبط فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم۔

☆☆☆

اساتذہ کرام اور شیوخ

حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشت رحمتہ اللہ علیہ نے بے شمار مشہور زمانہ اساتذہ کرام سے اکتساب علم کیا جن میں سے چند یہ ہیں:-

۱۔ حضرت علامہ گنج علم شیخ جمال الدین درویش خنداں رو اوچی ۲۔ بہاول حلم علامہ قاضی الدین اوچی۔ ۳۔ حضرت علامہ رضی الدین اوچی۔ ۴۔ حضرت علامہ مولانا شیخ موسیٰ ملتانی۔ ۵۔ حضرت علامہ مولانا مجد والدین ملتانی۔ ۶۔ شیخ مکہ حضرت علامہ مولانا عبداللہ یافعی سہروردی ۷۔ شیخ مدینہ حضرت مولانا عبداللہ مطری ۸۔ حضرت علامہ شرف الدین محمود تستری ۹۔ حضرت مولانا علامہ نور الدین ملتانی۔

پیاس بجھانے کے لیے ابھی انہیں آزمائشوں کے لق ودق صحرا سے گزرنا تھا۔ چنانچہ آپ حضرت شیخ کی دعاؤں کے سائے میں مکہ معظمہ ہوتے ہوئے گارزون پہنچے۔

لیکن یہاں قسمت نے عجیب وغریب رنگ دکھایا۔ آپ جس کی تلاش میں راستے کی بے شمار تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے گارزون پہنچے تھے وہ شخص دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ جب حضرت مخدوم نے گارزون پہنچ کر دوبارہ یہ روح فرسا خبر سنی تو آپ کا روشن چہرہ بجھ کر رہ گیا اور دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے حضرت مخدومؒ کے چہرے سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے ہیں۔ آپ کی افسردگی دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کا کوئی قریبی عزیز مرگیا ہے جس کے صدمے سے آپ نڈھال ہو گئے ہیں۔ حضرت مخدومؒ اس جاں گداز حادثے سے یہاں تک متاثر ہوئے کہ آپ بار بار فرماتے تھے۔

”افسوس! میں ابھی پہنچا بھی نہیں تھا کہ علم کا سمندر خشک ہوگیا۔ اے امین! مجھے بتا کہ میں کدھر جاؤں؟“

یہاں امین سے مراد شیخ امین الدین مرحومؒ تھے جن کی تلاش میں حضرت مخدومؒ یہاں تک پہنچے تھے اور آپ کی آمد سے پہلے ہی جن کا انتقال ہو گیا تھا۔ جب آپ کی بے قراری حد سے بڑھی تو شیخ امین الدین مرحومؒ کے بھائی شیخ امام الدینؒ نے آپ کو تسلی دی اور کہا۔ ”مرنے سے پہلے حضرت شیخ امین الدین نے مجھ سے فرمایا تھا کہ سید جلال الدینؒ ملتان کے راستے سے گارزون آرہے تھے کہ راستے میں انہیں ایک شخص ملا جس نے کہا کہ شیخ امین الدینؒ مرچکے ہیں اس لیے وہ دلبرداشتہ ہو کر مکہ معظمہ چلے گئے ہیں لیکن واپسی میں وہ گارزون ضرور آئیں گے۔ وہ اجنبی شخص جس نے سید جلال الدینؒ کو فریب دیا تھا، وہ شیطان تھا۔ ہر چند وہ فریب کھا گئے لیکن میری محبت انہیں ایک نہ ایک دن یہاں کھینچ لائے گی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے مہمان کا استقبال نہ کرسکوں گا کیونکہ مرضی مولا یہی ہے مگر جب وہ یہاں تشریف لے آئیں تو انہیں میری جائے نماز اور قینچی دے کر میرا خلیفہ بنا دینا۔“ یہ کہہ کر حضرت امین الدینؒ مرحوم کے بھائی نے دونوں چیزیں حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کی خدمت میں پیش کر دیں۔

امین الدین کے بھائی کے الفاظ سن کر وہ عقیدت بھرے انداز میں جھک گئے اور آپ نے ان دونوں عطیات کو بے اختیار سینے سے لگالیا اور پھر ان کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات ابھرے جیسے حضرت مخدومؒ کی نگاہوں کے سامنے ایک عجیب و غریب دنیا روشن ہوگئی ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے ان بزرگ سے زبردست فیض روحانی حاصل کیا۔ واپسی میں حضرت سید رکن الدینؒ سے بھی آپ کو خرقۂ تبرک ملا اور پھر سلطان محمد تغلق کے زمانے میں شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز ہوئے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا کہ آپ نے حج وزیارت کا ارادہ کرلیا۔ وہ حج کے بعد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جالی سے اپنی آنکھوں کو لگانا چاہتے تھے۔ زیارت سے فیض یاب ہونے کا قصد کرکے وہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ اس راہ میں آپ کی ملاقات مشہور بزرگ امام عبداللہ یافعیؒ سے ہوئی تھی۔ رخصت کے وقت آپ سے حضرت امامؒ نے فرمایا تھا۔ ”جلال الدین! دہلی جا کر نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دو کہ اس وقت ہندوستان میں بزم معرفت کے چراغ وہی ہیں“ چنانچہ حضرت مخدومؒ بصد ادب و احترام آفتاب چشتیہ کے روبرو حاضر ہوئے اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے نور معرفت سے یہاں تک فیض حاصل کیا کہ دل و دماغ کے جو گوشے باقی رہ گئے تھے وہ بھی روشن ہوگئے۔

حج سے واپسی کے بعد آپ نے ہند کے کئی شہروں میں قیام کیا۔ اسی سفر میں آپ حضرت شیخ ابوالفتح ملتانیؒ سے بھی ملنے پہنچے تو دیکھا شیخ ابوالفتح ملتانی زینے سے اتر رہے تھے، حضرت مخدومؒ دوڑ کر راستے میں لیٹ گئے تاکہ ایک مرد کامل کا مبارک قدم آپ کے سینے پر پڑ جائے مگر حضرت شیخ ابوالفتح آگے بڑھنے کی بجائے ٹھہر گئے اور فرمایا! ”سید! تمہیں اس کی ضرورت نہیں۔ تم اپنے مرتبہ ولایت کو پہنچ چکے ہو۔ اٹھو کہ تم خود مخدوم جہانیاں ہو“ یہ کہہ کر آپ نے حضرت مخدومؒ کو اپنے سینے سے لگایا۔ اسی روز سے آپ ”مخدوم جہانیاں“ کے لقب سے مشہور ہوگئے۔

اسی دور کا ذکر ہے کہ ایک بار عید آئی تو مخدومؒ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہوئے اور گردن جھکا کر بصد ادب پکارا۔

”سرکار! آج عید کا دن ہے۔ رسم کے مطابق تمام اہل دنیا اپنے عزیزوں کو عیدی دے رہے ہیں۔ میں بھی تو آپ کا غلام ہوں، مجھے بھی عیدی دیجیے۔“

”خداوند عالم نے تجھے مخدوم جہانیاں بنا دیا۔ یہی تیری عیدی ہے“ مزار مبارک سے جواب آیا۔

حضرت مخدومؒ اپنی آنکھوں میں عقیدت کے آنسو لیے

ہوئے واپس چلے آئے۔ اب آپ اہل ہند میں مقبول ہو چکے تھے۔ ان کا خطاب ”مخدوم جہانیاں“ اس قدر مشہور ہوا کہ پورے ہندوستان میں اس کی گونج سنائی دینے لگی۔

حضرت جلال الدینؒ پہلے ”مخدوم جہانیاں“ کہلائے اور پھر آپ کو ”جہاں گشت“ کا لقب بھی عطا ہوگیا۔ جہاں گشت کے ظاہری اور لفظی معنی ہیں ”دنیا کی سیاحت کرنے والا۔“ اس اعتبار سے بھی حضرت جلال الدینؒ امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ نے بیشتر ممالک کا سفر کیا۔ اللہ کی زمین کے بے شمار ٹکڑوں کو اپنی آنکھ سے دیکھا۔ خالق کائنات کے لاتعداد بندوں سے ملے۔ اس لیے ”جہاں گشتؒ“ کہلائے مگر بعض روایتیں یوں بھی ہیں کہ خداوند عالم نے آپ کے لیے ہواؤں کو مسخر کردیا تھا۔ زمین کے طویل فاصلوں کو اتنا مختصر کر دیا تھا کہ آپ دور دراز علاقوں میں اس طرح نظر آتے تھے جیسے اپنے شہر یا گھر میں چہل قدمی فرما رہے ہوں۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کی نظر میں ان روایتوں کی اہمیت کسی کہانی سے زیادہ نہ ہو مگر تاریخ میں چند مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ آپ نے چند گھنٹوں میں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کیا اور پھر کام سے فارغ ہو کر اپنے شہر لوٹ آئے۔ سائنسی ترقی کے دور میں آج بھی بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں انسانی عقل مجبور سی نظر آتی ہے مگر وہ بے مایہ فقیر جس کے قدموں کے نیچے زمین سمٹ کر رہ گئی تھی، مجبور نظر نہیں آتا۔ ہواؤں پر اس کی حکومت تھی۔ اگر اس نے اوچ شریف (بہاول پور) سے دہلی جانا چاہا تو وہ عام لوگوں کی طرح کسی سواری کا محتاج نہیں ہوا۔

نہ صرف جہاں گشتی بلکہ کچھ اور بھی کرامات کا ذکر مختلف کتابوں میں نظر آتا ہے۔ ایک اور واقعہ سن لیں۔ برسات کا زمانہ تھا اور خدا کے ایک برگزیدہ بندے کے آستانے پر مخلوق خدا کا ہجوم تھا۔ وہ بندہ خدا دنیا سے رخصت ہو رہا تھا۔ چند مریدان خاص جمع تھے جو نزع کے وقت اپنے پیر و مرشد کی جدائی کے تصور سے آنسو بہا رہے تھے۔ یہ بنگال کے مشہور بزرگ حضرت شیخ علاؤ الدین چشتیؒ تھے جن پر موت کی غشی طاری تھی۔ اچانک آپ کو ہوش آیا اور مریدوں کی طرف دیکھتے ہوئے فرمانے لگے۔

”قطرہ موت کے بے پایاں سمندر میں ملنے والا ہے۔ رخصت ہونے سے پہلے تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ میری نماز جنازہ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ پڑھائیں گے۔ کوئی دوسرا شخص اس نیت اور ارادے سے میرے جنازے کے قریب نہ جائے۔“ یہ کہہ کر آپ نے تمام مریدوں اور عام مسلمانوں کے

حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کی اولاد اور خاندان

حضرت جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشتؒ کے صاحبزادگان کا ذکر جن سے مندرجہ ذیل خاندان یا شاخیں پھوٹیں:

مخدوم سید ناصر الدین محمود۔ حضرت جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشتؒ کے فرزند اکبر اور خلیفہ مجاز تھے سید ناصر الدین محمود کثیر الاولاد تھے نواب صدیق حسن خان ان ہی کی اولاد تھے اور ان ہی کی اولاد کو قنوج بطور جاگیر دہلی کے حکمرانوں نے دیا تھا۔ سید علم الدین شاہؒ۔ لاہور کے مشہور بزرگ سید میراں شاہ المعروف بہ موج دریا بخاری جن کا مزار لاہور میں ہے ان کی پشت سے تھے۔ سید اسماعیل بخاریؒ۔ شکار پور کے سادات بخاریہ کے مورث اعلیٰ قطب العالم شہاب الدین ان ہی کی اولاد میں سے ہیں۔ قطب العالم سید برہان الدینؒ، آپ کا مزار احمد آباد، گجرات (بھارت) کے قریب باتنوا میں ہے باتنوا میمنوں کی اکثریت قطب العالم سید برہان الدین، کی مرید اور معتقد ہے آپ کی اولاد گجرات حیدر آباد دکن، گلبرگہ، اور مدراس میں موجود ہے۔ سید علاؤ الدین بخاریؒ، کشمیر کے مشہور بزرگ سید حاجی مراد، سید علاؤ الدین سید فخر الدین کے فرزند تھے کشمیر میں ان کی اولاد کثرت سے موجود ہے۔ سید شرف الدین بخاریؒ۔ سید پیر کمال بخاری نقویؒ کا سلسلہ نسب ان ہی سے ملتا ہے سید کمال کی اولاد گوجرانوالہ، سیالکوٹ، گجرات وغیرہ میں کثرت سے آباد ہے۔

لاہور کا بخاری فقیر خاندان جس کے چند مشہور افراد میں سے فقیر سید وحید الدین جو پنجاب کے مشہور عالموں میں سے شمار کیے جاتے تھے اور علامہ اقبال کے ساتھیوں میں شمار کیے جاتے تھے اور فقیر سید حفیظ الدین خان بہادر فقیر سید قمر الدین، اور موجودہ صنعت کار سید شبیر الدین جو کئی فیکٹریوں کے مالک ہیں ان کا بھی اسی خاندان سے تعلق ہے اسی طرح سید مراتب علی جن کی نسلے کمپنی اور بہت سی کمپنیاں ہیں اسی خاندان سے تعلق ہے۔ جھنگ کے مشہور شاہ جیونہ خاندان جس کے سپوت سابق وفاقی وزیر اور سیاسی رہنما عابدہ بیگم اور موجودہ وفاقی وزیر و سابق وفاقی وزیر داخلہ فیصل صالح حیات ہیں حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ اس کے علاوہ بنگال کے مشہور و معروف صوفی بزرگ حضرت جلال الدین سلہٹیؒ حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کے سگے بھانجے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حضرت جہانیاں جہاں گشت کی سرپرستی و رہنمائی میں بنگال کے اس وقت کے کمزور مسلمانوں کی امداد کے لیے اوچ سے بنگال تشریف لے گئے تھے۔

حق میں دعائے خیر کی اور ہمیشہ کے لیے دنیا سے منہ موڑ لیا۔

مریدوں پر عجیب عالم گزر رہا تھا۔ ایک طرف پیر و مرشد کی موت کا جاں گداز غم تھا اور دوسری طرف یہ فکر لاحق تھی کہ تجہیز و تکفین کس طرح ہو گی؟ حضرت علاؤ الدین چشتیؒ کی وصیت کے مطابق آپ کی نماز جنازہ صرف حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ ہی پڑھا سکتے تھے اور حضرت مخدومؒ اس وقت اوچ شریف میں قیام فرما تھے۔ مریدوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ پنجاب اور بنگال میں ایک ہزار میل سے زیادہ کا فاصلہ حضرت مخدومؒ کس طرح طے کر سکیں گے؟ غرض عجیب کشمکش کا عالم تھا۔ پیر و مرشد کی وصیت سے روگردانی نہیں کی جا سکتی تھی اور حضرت مخدوم جہانیاں کی آمد بھی ناممکن نظر آ رہی تھی آخر حضرت علاؤ الدینؒ کے ایک خلیفہ نے اس کشمکش کو ختم کرتے ہوئے کہا کہ ”حضرت کے جسم مبارک کو غسل دے کر جنازہ تیار کر دیا جائے۔ آگے پردہ غیب سے جو کچھ ظاہر ہو گا سامنے آ جائے گا“

مریدوں نے حضرت کے خلیفہ کی ہدایت کے مطابق جسم مبارک کو غسل دیا اور نماز پڑھانے والے کا انتظار کرنے لگے۔ ہر دماغ میں وسوسے اور اندیشے سر ابھار رہے تھے۔ آخر کچھ دیر بعد شبہات کا پردہ چاک ہوا اور حضرت علاؤ الدین چشتیؒ کے مریدوں نے چشم حیرت سے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو آتے ہوئے دیکھا۔ نظریں فرط ادب سے جھک گئیں۔ جلال معرفت سے دل دھڑکنے لگے۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے قریب آ کر حاضرین کو سلام کیا اور نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

تدفین کے بعد آپ نے حضرت شیخ علاؤ الدین چشتیؒ کے اوصاف بیان کیے اور پھر مرنے والے کے حق میں دعائے خیر فرما کر رخصت ہو گئے۔ جنازے میں شریک ہونے والے ہزاروں انسانوں میں سے کسی نے یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کی کہ حضرت مخدومؒ بنگال کس طرح تشریف لائے؟

کس میں یہ طاقت تھی کہ حضرت کے روبرو نظر اٹھا سکتا۔ اور کس میں اتنی صلاحیت گفتار تھی کہ مخدوم جہانیاںؒ کے سامنے ہونٹوں کو جنبش دے سکتا؟ وہ جس کے قدموں کے نیچے زمین سمٹ گئی تھی، وہ جس کے لیے ہوائیں مسخر کر دی گئی تھیں، خاموشی سے آیا اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

اس زندہ مثال سے ثابت ہے کہ حضرت کو ”جہاں گشت“ کا خطاب صرف دنیا کی سیاحت کرنے کی وجہ سے نہیں دیا گیا تھا اس خطاب کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت مخدومؒ کسی مادی وسیلے کے بغیر دنیا کے ہر گوشے میں پہنچ سکتے تھے۔ غالباً یہی آپ کی سب سے بڑی کرامت تھی۔

حضرت مخدومؒ کے مشہور خلیفہ سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ فرماتے ہیں کہ ”جس قدر کرامتیں آپ سے ظاہر ہوئیں، اولیائے متاخرین میں سے کسی ایک کو بھی حاصل نہیں۔“

اور آخر ایسا کیوں نہ ہوتا؟ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ جس بزرگ سے معانقہ کرتے اور گلے ملتے اس سے اس کی کرامتیں چھین لیتے۔ یہ بات شہرت پا گئی ہے لیکن چھیننے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بزرگوں کی کرامتیں حضرت مخدومؒ سلب کر لیتے تھے۔ چھیننے سے مراد صرف یہ ہے کہ آپ جس بزرگ سے بھی ملتے، اس کی روحانیت پر اتنی گہری توجہ کرتے کہ وہ صلاحیتیں آپ کی ذات میں منتقل ہو جاتیں، یا پھر اتنی خدمت کرتے کہ وہ بزرگ حاصل کی ہوئی تمام نعمتیں آپ کو دے دیتا۔

”انوار عاظمیہ“ میں تحریر ہے کہ ایک روز حضرت مخدومؒ اپنی خانقاہ میں بیٹھے تھے کہ ایک گوشے میں رکھی ہوئی گھاس کی گٹھڑی میں آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلے بھڑکنے لگے۔ آپ نے ایک چٹکی خاک اٹھائی اور با آواز بلند ”یا اللہ“ پڑھ کر اس طرف پھینکی۔ آگ فوراً بجھ گئی۔

اس طرح حضرت مخدومؒ نے بہت سے بزرگوں سے فیض روحانی حاصل کیا اور پھر جب آپ کی ذات سے نور کی شعاعیں پھوٹیں تو اہل دنیا دیکھتے رہ گئے۔ آپ معرفت کی ایک برہنہ شمشیر تھے جسے دنیا کی کوئی مصلحت کند نہیں کر سکی تھی۔ آپ نے عالم جذب میں روحانیت کا طویل سفر طے کیا مگر اس کے باوجود آپ ہمہ وقت ہوش میں رہتے تھے۔

یہ اسی ہوش کا نتیجہ تھا کہ آپ کبھی شریعت کی حدود سے باہر نہیں نکلے۔ آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ سماع (قوالی وغیرہ) سے بہت پرہیز کرتے تھے۔ جب کچھ لوگ آپ سے محفل سماع میں شریک ہونے کو کہتے تو آپ فرماتے کہ سماع میں اختلاف ہے مگر اس شخص کے لیے جائز ہے جو اس کی اہلیت رکھتا ہو۔

آپ کو احکام خداوندی اور سنت رسول کریمؐ سے والہانہ عشق تھا۔ آپ شریعت مصطفویؐ کی حدود سے نکل جانے والے شخص کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ آپ اس کی بزرگی اور ولایت کو بھی تسلیم نہیں کرتے تھے جس میں جناب رسالت مآبؐ کی مکمل سنت کا عکس موجود نہ ہو۔ آپ نے حتی المقدور زندگی بھر پیغمبر اسلامؐ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ حضرت مخدوم

جہانیاںؒ کو جہاں بھی سرور کائناتؐ کے آئین مقدس پر عمل کرنے والا نظر آ جاتا تھا آپ اس کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ نے حافظ قرآن کی فضیلت و عظمت کے بارے میں رسول مقبولؐ کی کئی احادیث مبارکہ پڑھی تھیں۔ اس لیے آپ اس شخص کا بے حد ادب کرتے تھے جس کے سینے میں کلام خداوندی محفوظ ہو۔ یہاں تک کہ حضرت مخدومؒ اپنے ایک مرید شیخ سراج الدینؒ کو امام بنانے پر مجبور ہو گئے۔ شیخ سراج الدینؒ حافظ قرآن تھے۔ اسی امتیازی علامت کے باعث حضرت مخدومؒ نے کئی سال تک شیخ سراج الدین کے پیچھے نماز ادا کی۔ زمانہ جس کی امامت میں نماز ادا کرنے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ اسے جب لوگوں نے نماز پڑھتے دیکھا تو وہ اپنے ایک مرید کے پیچھے اللہ کے حضور ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اور یہ سب کچھ ان آیات مقدسہ کے سبب تھا جنہیں عرش اعلیٰ سے لے کر جبریل امینؑ حضور اکرمؐ کے پاس آتے تھے۔

ایک بار آپ سفر میں تھے۔ مریدوں کی ایک جماعت ساتھ تھی۔ چلتے چلتے ایک چھوٹے سے قصباتی علاقے میں پہنچے تو ان کے قدم رک گئے۔ آپ نے مریدوں سے سوال کیا۔

”کیا تمہیں یہاں کوئی عجیب بات محسوس ہوئی؟“

”پیر و مرشد! ہمیں تو کچھ بھی احساس نہیں ہوا؟“

مریدوں نے بصد ادب کہا۔ ”اس چھوٹے سے دیہات نما شہر میں کوئی عجیب شے نظر بھی کس طرح آ سکتی ہے؟“

”کیا یہاں کی زمین نے تمہارے قدم نہیں روکے؟“

آپ نے مریدوں کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

مرید گردنیں خم کیے ہوئے خاموش کھڑے رہے۔ ان کا سکوت اس بات کا مظہر تھا کہ انہوں نے سرہند شریف کی زمین میں کوئی کشش محسوس نہیں کی۔

”کیا تم معطر ہواؤں کی خوشبو نہیں سونگھ رہے ہو؟“

حضرت مخدومؒ نے مریدوں سے تیسرا سوال کیا۔

تمام مرید اس مرتبہ بھی خاموش رہے۔ وہ اپنے پیر و مرشد کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھے۔

”افسوس! تم بے خبر ہو۔“ حضرت مخدومؒ نے جذباتی انداز میں فرمایا۔ ”یہاں کی خاک مقدس ہے کہ اس پر سنت رسولؐ کی تجدید کرنے والے کے قدم پڑیں گے، یہاں کی ہوائیں جانفزا ہیں کہ ان میں خدا کے دوست کے پیرہن کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ آنے والے کے روشن چہرے کو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ اس پر خدا کی بے شمار رحمتیں نازل ہوں کہ وہ کروڑوں بندگان خدا کو فتنہ عظیم سے نجات دلائے گا۔“ یہ کہہ کر آپ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے اور مرید سوچتے ہی رہ گئے کہ حضرت کا اشارہ کس کی طرف تھا؟ کون آئے گا؟ فتنہ عظیم کیا ہے؟ غرض اسی قسم کے بہت سے سوالات مریدوں کے ذہن میں گردش کرتے رہے مگر کوئی بھی ان اسرار سے پردہ نہ ہٹا سکا...... یہاں تک کہ آنے والے کے انتظار میں صدیاں گزر گئیں اور جب تقریباً تین سو سال بعد سرہند شریف میں حضرت مجدد الف ثانیؒ پیدا ہوئے اور آپ نے مغل شہنشاہ اکبر کے دین الٰہی کے فتنے کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا تو حضرت مخدومؒ کی پیش گوئی لوگوں کی سمجھ میں آئی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے تمام بزرگوں میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے سب سے زیادہ حضور اکرمؐ کی سنت مبارک پر عمل کیا۔ چونکہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کو بھی سنت رسولؐ سے عشق تھا اسی لیے آپ سرہند شریف پہنچ کر بیقرار ہو گئے اور بے اختیار آپ کی زبان سے وہ راز فاش ہو گیا جس پر آنے والی کئی صدیوں کا پردہ پڑا ہوا تھا۔

حضرت مخدومؒ کے عجز و انکسار کا یہ عالم تھا کہ آپ اپنی تعریف پسند نہ فرماتے تھے۔ ایک مرید نے جسے آپ سے انتہائی عقیدت تھی۔ آپ کی شان میں ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں مرید نے آپ کو سید السادات تحریر کیا تھا۔ جب مرید نے آپ کے لیے یہ لفظ تحریر کیا اس وقت اس کے ذہن میں یہی خیال تھا کہ حضرت اس تعریف سے خوش ہو کر اس پر زیادہ توجہ فرمائیں گے۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے پوری نظم خاموشی سے سنی۔ اس کے بعد فرمایا۔ ”سید السادات نہیں، گدائے عالم کہو۔ میں اس در پاک کا بھکاری ہوں۔ ایک گدا گر سردار کس طرح ہو سکتا ہے۔“

مرید پر سکتہ طاری تھا۔ پر آپ نے اس کی دلجوئی کے لیے فرمایا ”میاں! اس تکلف کی ضرورت نہیں میری محبت ہر حال میں تمہارے ساتھ ہے۔“

حضرت مخدومؒ نے اراداتاً کبھی کوئی کرامت ظاہر نہیں کی۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ معرفت کا سورج تھے اور سورج کی روشنی کسی طرح بھی چھپ نہیں سکتی مگر جہاں تک نیت اور ارادے کو دخل تھا، آپ ان لوگوں کو بھی ناپسند کرتے تھے جو آپ سے کسی کرامت کے ظہور کی توقع رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ میر سید علی ہمدانی آپ سے ملاقات کے لیے آئے اور خانقاہ کے دروازے پر یہ سوچ کر بیٹھ گئے کہ حضرت مخدومؒ اپنے کشف سے تمام حال جان لیں گے اور پھر خود ہی انہیں اندر بلا لیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ میر سید علی بہت دیر تک دروازے پر بیٹھے

رہے، یہاں تک کہ حضرت مخدومؒ کا ایک خادم کسی کام سے باہر آیا اور پھر اس نے واپس جا کر حضرت کو میر سید علی کے آنے کی خبر دی۔

''جب آئے تھے تو مجھے اطلاع کیوں نہیں بھیجی؟'' حضرت مخدومؒ نے قدرے تلخ لہجے میں فرمایا۔ ''کیا وہ مجھے عالم الغیب سمجھتے ہیں کہ بغیر اطلاع کے میں ان کی آمد سے باخبر ہو جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر حضرت مخدومؒ خاموش ہو گئے اور آپ کے چہرہ مبارک پر شدید غصے کی علامتیں صاف نظر آنے لگیں۔ میر سید علی ہمدانی بہت دیر تک دروازے پر بیٹھے رہے لیکن حضرت مخدومؒ نے انہیں اندر نہیں بلایا یہاں تک کہ سید صاحب آپ سے ناراض ہو کر چلے گئے اور پھر انہوں نے ایک رسالہ ''ہمہ دان'' تصنیف کیا جس میں حضرت کے بارے میں ایسی باتیں لکھیں جو مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ جیسے بزرگ کے شایان شان نہیں تھیں۔

آخر ایک روز جب آپ نے سید علی کے رسالے کے بارے میں سنا تو بے ساختہ فرمایا۔ ''خدا کی قسم وہ کچھ بھی لکھے مگر میں عالم الغیب نہیں ہوں۔ میں نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کسی کے دل میں کیا ہے اور پس دیوار کون بیٹھا ہے؟''

حضرت مخدومؒ دنیا کے جاہ و حشم سے کبھی متاثر نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ آپ کی محفل میں حاکم و محکوم سب برابر تھے۔ ایک بار حضرتؒ جامع مسجد اوچ میں چند علماء اور درویشوں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ حاکم اوچ آپ کی زیارت کے لیے آیا۔ اپنے مرتبے کے لحاظ سے اسے امید تھی کہ حاضرین احتراماً کھڑے ہو جائیں گے مگر تمام لوگ حضرت مخدومؒ کی باتوں میں اس قدر محو تھے کہ کسی نے اس کی طرف دھیان بھی نہیں دیا۔ حاکم کو یہ بات سخت ناگوار گزری کہ بوسیدہ لباس پہنے ہوئے فاقہ زدہ درویش اس کے عہدے سے متاثر نہیں ہوئے۔ آخر اسی جھنجلاہٹ میں حاکم نے کئی درویشوں کو برا بھلا کہہ کر مسجد سے باہر نکال دیا۔ حاکم کی اس حرکت پر حضرتؒ نے غضبناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ''اے بدنصیب! دیوانہ ہوا ہے کہ فقیروں کی دل آزاری کرتا ہے۔''

آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہی حاکم دیوانہ ہو گیا اور کپڑے پھاڑتا ہوا مسجد سے نکلا۔ دوسرے دن اس کی حالت اتنی بگڑ گئی کہ سڑکوں پر لوگوں کو پتھر مارنے لگا۔ آخر بڑی مشکل سے اسے پابہ زنجیر کیا گیا اور پھر حاکم کا بوڑھا باپ اپنے پاگل بیٹے کو لے کر حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بہت دیر تک رو رو کر معافی مانگتا رہا۔ حضرتؒ کو اس کی بے چارگی پر رحم آ گیا۔ آپ نے حاکم کے باپ سے فرمایا۔

''اسے غسل دے کر نئے کپڑے پہناؤ اور حضرت شیخ جمال الدین خنداں روؒ کے مزار مبارک کی زیارت کرا کے میرے پاس لاؤ۔''

جب حاکم اوچ اس مرحلے سے گزر کر واپس آیا اور جیسے ہی اس کی نظر حضرت مخدومؒ کے چہرہ مبارک پر پڑی، دیوانگی کے تمام اثرات زائل ہو گئے۔ ہوش میں آتے ہی وہ آگے بڑھا اور حضرتؒ کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔

''مخدومؒ! اس غلام کو اپنی محبت سے محروم نہ کیجئے''

حضرت مخدومؒ جو سرتاپا محبت ہی محبت تھے ایک شفیق باپ کی طرح مسکرانے لگے اور پھر اسے حلقہ ارادت میں اس طرح شامل کیا کہ کچھ عرصے بعد وہ روحانیت کے بلند مقام تک پہنچا۔

غرض 78 سال تک اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ معرفت کا یہ سورج اس شان سے چمکتا رہا کہ اس کی روشنی ہر خاص و عام میں تقسیم ہوتی رہی اور پھر موت کے ازلی قانون کے مطابق 785 ہجری میں خورشید روحانیت غروب ہو گیا۔

آپ کی پیدائش و موت کے ایام بھی عجیب و غریب ہیں۔ آپ شب برأت میں پیدا ہوئے اور عید الاضحیٰ کے دن انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار مبارک اوچ شریف میں ہے۔ یہ مقام ریاست بہاولپور میں ملتان سے ستر میل کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع ہے۔

☆☆☆

ماخذ

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، سوانح حیات حضرت مخدوم جلال الدین جہاں گشت سہروردی المعروف مخدوم جہانیاں۔ مؤلف پروفیسر محمد ایوب قادری۔ نواب محمد صدیق حسن خان (خودنوشت سوانح حیات) مولانا محمد خالد سیف۔ خطہ پاک اوچ مسعود حسن شہاب۔ تاریخ فیروز شاہی مؤلف ضیاء الدین برنی مترجم ڈاکٹر سید معین الحق۔ سندھ میں اردو شاعری ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ۔ اسلامک انسائیکلو پیڈیا سید قاسم محمود۔ تاریخ سندھ۔ تاریخ لاہور مصنف، کنہیا لال ہندی مرتبہ کلب علی خاں فائق ......
حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت پروفیسر ایوب قادری۔ تذکرہ مودودی (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی) ادارہ معارف الاسلامی۔ چچ نامہ۔ تاریخ فرشتہ۔ ماہنامہ میرے محسن لاہور۔

''اور اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں...... لیکن تم اس زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔''

ماسٹر صاحب کی آواز اور دلنشین لہجہ جماعت میں بیٹھے بچوں کے دل و دماغ میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ کلاس نائن کے ان لڑکوں کے ذہنوں میں یکا یک بہت سے سوال جنم لینے لگے۔

''شہادت کیا ہوتی ہے جناب؟'' ایک کم عمر معصوم صورت بچے نے سوال کیا۔

ارضِ وطن کی تاریخ میں ایسی قربانی کی مثال نہیں ملتی

بے تیغ سپاہی

زویا اعجاز

بڑے بڑے بنگلوں میں بیٹھے، دولت کا انبار جمع کرنے والے کیا جانیں کہ وہ جس وطن میں عیش کررہے ہیں اس کی حفاظت کے لیے، اپنے خون سے حصار بنانے والے، عوام کے ''آج'' پر اپنا آنے والا ''کل'' قربان کر کے قربانیوں کی فصیل تعمیر کرنے والے، قابلِ فخر ماؤں کے سپوت کیسی کیسی قربانیاں دیا کرتے ہیں اس مجاہدِ وطن کی خاطر اتنی ایذائیں سہیں کہ سن کر دل کانپ اٹھے، کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اس پر کیسی کیسی افتاد ٹوٹی مگر اس نے پاکستان کا سر جھکنے نہیں دیا۔ یہ ثابت کیا کہ پاک فوج کے سپاہی ایسے ہوتے ہیں جو وطن کی آن پر بلا جھجک قربان ہو جاتے ہیں۔



''اللہ کی راہ میں محض اس کی خوشنودی کی خاطر اپنی جان قربان کردینا۔'' استاد نے شفقت سے جواب دیا۔ ''یہ انتہائی افضل عمل ہے۔''

''کتنا افضل جناب؟''

''روزِ قیامت جب شہید بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوگا تو اس کے زخم مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ معطر ہوں گے۔''

''واللہ! کیا خوبصورت جذبہ ہے یہ۔'' ایک بچہ حسرت زدہ لہجے میں بولا۔

''بے شک بچو! ملک وملت کے لیے جان قربان کردینا ایک سعادت ہے اور یہ سعادت خوش قسمت لوگوں کو نصیب ہوا کرتی ہے۔ شہدا کے لیے دائمی زندگی کی نوید ہے' جنت کے میوے ہیں' دودھ کی نہریں ہیں اور ایسی ایسی نعمتیں ہیں جو عام انسانی سوچ کے تصور سے بھی بعید ہیں۔''

''میں بھی بڑا ہوکر شہید بننا چاہوں گا ماسٹر جی!'' اسی بچے نے ایک عزم سے کہا۔

''ضرور بیٹا! اللہ پاک تمہاری یہ دعا قبول فرمائے اور تمہیں بلند ترین دنیاوی واخروی درجات عطا فرمائے۔'' ماسٹر صاحب نے خلوص دل سے کہا۔ انہیں مقبول نامی یہ بچہ اپنی سنجیدہ فطرت اور قدرے مختلف سوچ کی بدولت بہت پسند تھا۔ ان کا وجدان گواہی دیتا تھا کہ وہ ایک خاص بچہ ہے۔ اس کی ذہانت' صبروتحمل' استقلال اور دلیری تو اسی روز ثابت ہوگئی تھی جب وہ ایک دوست سے الجھ بیٹھا تھا۔ اس دن استاد صاحب کے بھی اندازوں پر تصدیقی مہر ثبت ہونے کے ساتھ مقبول حسین کا کردار بھی مزید نکھر کر سامنے آگیا تھا۔

مقبول کا ایک دوست چند دنوں سے بہت افسردہ اور بیزار دکھائی دیتا تھا۔

''کیا بات ہے؟ تم اتنے اداس کیوں رہنے لگے ہو؟'' اس نے بہت خلوص سے دریافت کیا۔

''میں زندگی سے بیزار ہوچکا ہوں۔''

''ایسا کیوں بھلا؟''

''یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کے لیے بھی ترسنا پڑتا ہے۔''

''ناامید کیوں ہوتے ہو؟ اگر آج سختی ہے تو کل آسانی بھی آئے گی۔'' وہ سمجھ گیا تھا کہ عسرت وتنگدستی سے اس کا دوست دل برداشتہ ہے اسی لیے اس نے حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔

''خدا جانے کب آئے گی؟ میں نے تو ہمیشہ یہی تنگی برداشت کی ہے۔ اچھا خاصا ہندوستان میں نوابوں کی سی شان وشوکت سے رہتے تھے۔''

''وہ وقت گزر چکا ہے یار! تب ہم غلام تھے۔ اب تو اللہ کے کرم سے آزاد ملک کے رہائشی ہیں۔''

''کیا ملا اس آزادی سے ہمیں؟ یہ تقسیم ہونی ہی نہیں چاہیے تھی۔'' ساتھی کی یہ بات سن کر مقبول کے چہرے پر طیش کی سرخی دوڑ گئی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار گھوما اور اس کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا۔

''شرم آنی چاہیے تمہیں! ذرا سے فائدے کے لیے تم وہ سب قربانیاں بھول گئے۔ وہ سب ظلم وستم بھول گئے جو ہندوراج میں ہم لوگوں پر روا رکھے جاتے تھے۔''

اسی اثنا میں چند طلبہ نے دیگر اساتذہ کو اس قضیے کی اطلاع دے دی۔

''یہ جھگڑا کیوں ہورہا ہے لڑکو؟'' انہوں نے سختی سے کہا۔

''ماسٹر جی! میں پاکستان کے خلاف کوئی بھی بات برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ ملک میری شناخت ہے۔ میری ماں ہے' میرا باپ ہے۔ یہی میرا سائبان' گھر' عزت اور لباس ہے۔ یہ میری بہنوں کے سر کا چادر ہے۔ کوئی اسے برا کہے گا تو میں اس سے یونہی جھگڑوں گا۔'' اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔

''ملک کے خلاف تو کوئی بھی غیرت مند شخص برے الفاظ برداشت نہیں کرسکتا مقبول...... لیکن اپنوں کو یوں نہیں سمجھایا جاتا۔ انہیں محبت اور اعتماد سے قائل کیا جاتا ہے۔ ہاں! دشمن کے لیے بالکل کوئی معافی نہیں ہونی چاہیے۔''

معلم کی اس بات پر مقبول نے اطاعت میں سرِ تسلیم خم کردیا۔ وہ بے حد صابر' جوشیلا' ذہین اور محنتی لڑکا تھا۔ پڑھائی لکھائی کا اسے بہت شوق تھا اس لیے ہمیشہ اچھے نتائج سے کامیابی حاصل کرتا۔ اس کا تعلق آزاد کشمیر کے ایک گاؤں سے تھا۔ والد ایک فوجی تھے لہٰذا رگوں میں جوش ایمانی پارے کی طرح مچلتا۔ جذبۂ شہادت اس وقت مزید شدت اختیار کرگیا جب اس کے والد نے بھی شہادت کا رتبہ حاصل کیا۔

☆......☆

شب وروز کی اسی آنکھ مچولی میں وہ بچپن کی سرحد پار کرکے نوجوانی کی دہلیز پر آن کھڑا ہوا۔ اس کی کاٹھی مضبوط' اعصاب آہنی اور آنکھیں چمکدار تھیں۔ گاؤں بھر میں اس کی جوانی' ذہانت' خوبصورتی اور شرافت کی مثالیں دی جاتی

تھیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہونا تو جاگتی آنکھوں کا خواب تھا جسے اس نے نہایت اہتمام سے سینچ کر رکھا ہوا تھا۔

فوج میں بطور سپاہی بھرتی ہونا اس کے خوابوں کی پہلی تعبیر تھی جسے حاصل کرکے وہ بہت خوش تھا۔ ٹریننگ' جسمانی مشقتوں اور دیگر سخت ترین مراحل سے گزرنا بھی مقبول کے لیے دشوار ثابت نہ ہوا۔ وہ والی بال کا بہترین کھلاڑی تھا۔ طلائی تمغوں کی صورت میں کامیابی ہمیشہ اس کے قدم چومتی۔ اہل خانہ ان کامیابیوں پر جھوم اٹھتے' والدہ کے چہرے پر ممتا نور بن کر چھلکنے لگتی' بھائیوں کا سینہ فخر سے چوڑا ہوجاتا اور بہنوں کا مان کئی گنا مزید بڑھ جاتا۔

مقبول بھی ان محبتوں کا قرار واقعی جواب دیتا تھا۔ اسے رشتوں میں توازن رکھنے کا سلیقہ بخوبی آتا تھا۔ اپنے اہل خانہ پر وہ بھی اسی طرح جان چھڑکتا تھا۔ ایک فوجی کی سی روایتی آن بان لیے مقبول حسین جانے کتنے دلوں کی چاہت بننے لگا تھا لیکن خود اس کے دل کی دھڑکن تو ایک ہی ذات سے منسوب ہوچکی تھی۔ اس سپاہی کے چٹانی دل میں محبت نے کب سیندھ لگائی، یہ اسے خود بھی علم نہ ہوا۔ ''نصیراں'' کے نام سے اس کے لبوں پر ایک بے اختیار مسکراہٹ دوڑ جاتی۔ اس کے لیے تحائف لینا اور آئندہ زندگی کے خواب بننا مقبول کو بے حد اچھا لگنے لگا تھا۔ گھر والوں سے بھی اس کی یہ کیفیت پوشیدہ نہ رہ سکی اس لیے باہمی صلاح مشورے سے انہیں ایک باضابطہ تقریب میں ''منگنی'' کے رشتے میں باندھ دیا گیا۔ شادی کے لیے البتہ یہی فیصلہ کیا گیا کہ عید کے بعد یہ فریضہ سرانجام دیا جائے گا۔

مقبول حسین بہت خوش تھا۔ ابن آدم کے وجود کی کاملیت کا یہ احساس بے حد خوش کن تھا لیکن اس دوران ایک ایسا واقعہ پیش آگیا کہ بنت حوا کی محبت یکا یک پس پشت چلی گئی اور فرض کی ادائیگی نے دیگر تمام جذبات فراموش کروا دیے۔

☆......☆

مملکت پاکستان کی نوزائیدگی کے وقت سے ہی اس کی بقاء کے خلاف نت نئے حربے استعمال کیے جاتے رہے تھے۔ ''ریڈکلف ایوارڈ'' کی پیشہ وارانہ بددیانتی نے سرحدوں کی حدبندی میں مجرمانہ جانبداری سے کام لیا تو دوسری جانب اسلحہ اور معاشی مسائل کھڑے کرکے پاکستان کو اس کے ممکنہ حقوق سے محروم کردیا گیا۔ لاکھوں مہاجرین کی لاشوں سے اٹی ٹرینیں جب منزل مقصود پر پہنچتیں تو اپنے پیاروں کی راہ میں آنکھیں بچھائے افراد کی بصارت ان خونچکاں مناظر کی تاب نہ لاتے ہوئے پتھرا جاتیں۔ کشمیری ریاست پر غاصبانہ قبضے کے لیے لڑی جانے والی جنگ میں یقینی مات ہوتی نظر آئی تو اقوام متحدہ کا در کھٹکھٹا کر استصواب رائے کے لیے ہامی بھرلی۔ ڈیڑھ دہائی گزر جانے کے باوجود رائے شماری کا عمل تو ممکن نہ ہوسکا البتہ مسلمانوں سے ازلی نفرت کی چنگاریوں نے ہندوؤں کو ایک بار پھر جنگی جنون میں مبتلا کردیا۔ سرحدوں پر کشیدگی بڑھنے لگی تو اعلیٰ فوجی سطح پر ہلچل پیدا ہوگئی۔ تمام تر فوجی اہلکاروں کو مکمل چوکنا کردیا گیا۔ چھٹیوں پر اپنے گھروں میں موجود اہلکاروں کو بھی بذریعہ تار فوری واپسی کا حکم ملا۔ مقبول حسین نے بلا تامل وطن کی اس پکار پر لبیک کہا۔ اس کی والدہ' چچا اور دیگر بہن بھائی بھی بہت تشفی آمیز خوشی محسوس کررہے تھے۔

''شہادت تو ایک عظیم رتبہ ہے بیٹا! تو بہت خوش قسمت ہے کہ قدرت تجھے اس کے لیے ایک موقع فراہم کررہی ہے۔'' چچا نے اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں چاچا جی! یہ تمنا تو جانے کب سے دل میں پرورش پارہی ہے۔'' اس نے جوش سے جواب دیا۔

''تیرے والد بھی بہت بہادر فوجی تھے۔ تم بھی انہی کی طرح میدانِ جنگ میں گولی اپنے سینے پر کھانا۔''

''انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔ اگر کبھی ایسا وقت آیا تو میں پیٹھ ہرگز نہیں دکھاؤں گا۔ آج تک میں نے بہت سے میڈل جیتے ہیں۔ اب تو یہی آرزو ہے کہ زندگی کا سب سے بڑا میڈل حاصل کروں، نشانِ حیدر۔ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جب موت کو گلے لگاؤں تو اردگرد درجن بھر دشمنوں کی لاشیں بکھری ہوں۔ ان کی نظروں میں میرے وطن پر میلی نظر سے دیکھنے کا پچھتاوا اور اپنے انجام کا خوف واضح ہو۔''

''جیتا رہ میرے شیر! اللہ پاک تجھے کامیابیاں نصیب فرمائے۔'' ماں نے جی بھر کر اس کا چہرہ نہارتے ہوئے کہا۔

''آمین، اس معرکے سے سرخرو واپسی پر ہم عید کے بعد مقبول کی شادی بھی کردیں گے۔'' اس کے بڑے بھائی مکھن خان نے محبت سے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''میں نصیراں سے ملی تھی۔ وہ بہت اداس تھی اور رو بھی رہی تھی۔'' بہن نے چپکے سے اسے بتایا۔

''وہ تو بے وقوف ہے۔ میں نے اسے ایک بار پہلے بھی سمجھایا تھا کہ سپاہی کے دل میں اولین محبت اپنے ملک کی ہوتی

ہے۔ دنیاوی محبتیں تو بس یونہی ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔“

”ہوسکے تو جانے سے قبل اس سے ایک ملاقات کرلینا۔“ بہن کی تجویز پر مقبول نے نیم رضامندی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ نصیراں اس وقت اسے کہاں ملے گی۔ دریا کا سرسبز و شاداب کنارہ ان کی محبت، خلوص اور چاہتوں کی شدت کا ازلی امین تھا اور وہی آج بھی اس جوڑے کے چہروں پر بکھرے مختلف رنگ دیکھ رہا تھا۔

قبل ازیں نصیراں کے چہرے پر حیا، چاہت اور وصل کی تمنا کے رنگ بکھرے نظر آتے۔ تبھی تو مقبول یقین کی پختگی اور اعتماد کے جگنوؤں سے تھام کر معتبر کردیا کرتا تھا لیکن اس روز کچھ انوکھا تھا۔ اس روز نصیراں کی آنکھیں حیا کے بارے نہیں بلکہ اپنے آنسو چھپانے کی غرض سے جھکی ہوئی تھیں۔

”یہ کیا ماجرا ہے بھئی؟ آج محبت اتنی افسردہ اور گم صم کیوں ہے؟“ لہروں نے مدھم صوتی آہنگ میں ایک دوسرے سے استفسار کیا اور پھر مقبول کی صورت میں یہ جواب بھی جلد ہی مل گیا۔

”روتی کیوں ہے پگلی؟ مجھے ہنسی خوشی الوداع نہیں کرے گی کیا؟“

”میں تجھے الوداع ہی تو نہیں کہہ سکتی۔ اتنا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔“

”دیکھ نصیراں! ایسا کیسے چلے گا بھلا؟ تو ایک سپاہی کی منگیتر ہے اور سپاہی پر سب سے پہلا حق اس کے وطن کا ہوتا ہے۔“

”میں جانتی ہوں لیکن کیا کروں؟ اپنے جذبات سے مجبور ہوجاتی ہوں۔“

”میرے والد کی شہادت کے بعد میری والدہ نے بھی تو زندگی بسر کی ہے! ایک سپاہی کی بیوی کو ایسے ہی ہونا چاہیے۔ مضبوط، گہرا، زیرک اور باشعور۔“

”ان کے پاس زادِ راہ تھا۔ میرے پاس تو صرف یہی ایک نشانی ہے۔“ اس نے اپنی انگلی میں پڑی انگوٹھی گھماتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تو فکر نہ کر! میں کبھی بھی تیری راہ میں رکاوٹ یا کوئی کمزوری نہیں بنوں گی۔ بقاء اور سالمیت کے اس رستے میں میری دعائیں ہر قدم پر تیرے ساتھ ہوں گی۔“ نصیراں نے اپنے آنسوؤں پر قابو پالیا تھا۔

اعتماد، دعاؤں اور بھروسے کی اس لہر نے مقبول کے اعصاب میں ایک نئی برق دوڑا دی۔ اس کے چہرے پر سنسنی اور جوش کا جو سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اس کے سامنے تو لہروں کو اپنی روانی ہیچ محسوس ہو رہی تھی۔ پربت اور درختوں نے بھی چپکے سے اپنی نیک تمنائیں اس سپاہی کے ہمراہ کردیں۔ مقبول حسین اسی روز اپنی منزل پر روانہ ہوگیا۔

☆......☆

جنگ کے شعلوں نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

بری، بحری اور فضائی افواج کے سپاہی ملکی دفاع کے لیے سر پر کفن باندھے دشمن سے برسرپیکار تھے۔ ان کے علاوہ عام شہریوں نے بھی رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کردیں۔ غلامی کی بیڑیوں سے آزاد ہوئے ابھی زیادہ عرصہ تو نہیں بیتا تھا۔ اقبال کے خواب، جناح کے خونِ جگر سے سینچی گئی کونپل اور لاکھوں مسلمانوں کے لہو سے جلائے گئے اس چراغ کو بجھنے بھی کیونکر دیا جا سکتا تھا؟ آزادی کی سحر برقرار رکھنے کے لیے وہ ہر قیمت ادا کرنے پر تیار تھے۔ قربانیوں اور عزم کی یہ داستانیں سرحدوں پر تعینات افراد تک پہنچتیں تو ان کے جذبے مزید توانا ہوجاتے۔ ملک کے ہر ایک کونے سے انہیں قرآنی آیات، ورد کیے گئے خشک چنے اور راشن نئی تقویت بن کر ملتے۔ انہی حوصلوں اور دعاؤں کے زیر سایہ مقبول حسین بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کے دانت کھٹے کرنے میں مشغول تھا۔

اس روز اعلیٰ انتظامیہ نے چند نئے احکامات جاری کیے تھے جس کی بابت گروپ کمانڈر کیپٹن شیر نے بریفنگ دینے کے لیے انہیں طلب کیا تھا۔ ممکنہ مشن کے متعلق وہ سبھی بہت پرجوش اور ہمہ تن گوش تھے۔

”ہمیں بھی کچھ کرنا ہوگا۔ ہماری سرحدوں پر میلی نظر ڈالنے والوں کو سبق سکھانا ہوگا۔ بھارتی جاحیت پر بند باندھنے کے لیے جواب دینا ہے۔“ نوجوان کیپٹن شیر نے طائرانہ نظریں اپنے ساتھیوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔

تمام اہلکار یکدم جوش و مسرت کی نئی سنسنی آمیز کیفیت میں گھر گئے۔ دشمن پر اپنی بہادری اور اہلیت و بہادری ثابت کرنے کا یہ موقع تو ہر فوجی کے لیے کسی خواب سے ہرگز کم نہیں تھا۔ ان کی تمام تر حسیات کیپٹن کی جانب متوجہ تھیں۔ اس مشن کے پانچ مختلف گروپس تشکیل دیے گئے۔

”ہمیں دشمن کو اس کی جرأت کا مزہ چکھانا ہے جوانو! تاکہ آئندہ وہ کبھی ہماری دھرتی کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کے قابل نہ رہ سکے۔“

”ان شاء اللہ سر!“ انہوں نے یک زبان ہوکر کہا۔

”سپاہی مقبول حسین! تمہاری تعلیمی قابلیت، ذہانت اور سابقہ کارناموں کی بدولت تمہیں ایک اہم ذمے داری تفویض کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔“

”میں اپنی ہر ذمے داری کو موت کی قیمت پر بھی نبھانے کے لیے تیار ہوں سر!“ اس نے عزم سے جواب دیا۔

”گڈ! تم وائرلیس سیٹ سنبھالو گے۔“ اس کے اعتماد سے مطمئن ہوکر کیپٹن نے بتایا اور پھر دیگر ارکان کو جزئیات کے بارے میں آگاہ کرنا شروع کردیا۔

تھکاوٹ، بے خوابی اور دیگر تمام عوامل پس پشت ڈالے وہ سب جی جان سے اس نئی منزل کی جانب گامزن ہوگئے۔

☆......☆

دوسری جانب عسکری طاقت کے نشے میں چور ہندوستانی فوج نے پاکستان کو غافل سمجھتے ہوئے حملہ تو کردیا تھا لیکن انہیں ہر جانب سے ہی بھرپور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ لاہور ”بی۔ آر۔ بی“ نہر میں میجر عزیز بھٹی نے پیش قدمی روکے رکھی تو سیالکوٹ کے چونڈہ سیکٹر میں ٹینکوں کی تباہی نے انہیں اپنے زخم چاٹنے پر مجبور کیا۔ ان مختلف محاذوں پر لڑنے والے بھارتی فوجیوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پاکستانی فوج جوابی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے ان کے علاقوں میں آ گھسے گی۔ اقتدار کے گھمنڈ میں مبتلا ان فوجیوں کو قدرت نے ایک اہم سبق سکھانا تھا کہ دینی حمیت اور شوقِ شہادت کے جذبات سے سرشار اکلوتا سپاہی بھی ہزاروں فوجیوں پر بھاری ہوتا ہے۔ پھر ”تین سو تیرہ“ مجاہدین ہزاروں کی تعداد اور ان گنت ہتھیاروں سے لیس ”قریش مکہ“ سے بھڑ جاتے ہیں تو ”بہتر“ افراد یزیدی قوتوں کے سامنے سرنگوں ہونے سے انکاری ہوکر مزاحمت کا حق ادا کردیا کرتے ہیں۔

تاریخ نے ایک بار پھر خود کو دہرانے کا عزم کرلیا تھا اور سولہ افراد ضروری ساز و سامان سے لیس جذبۂ ایمانی کو اصل ہتھیار بنائے سری نگر کے علاقے کی سرحد پار کرچکے تھے۔ گھنے جنگل اور رات کی تاریکی میں خطرات بانہیں کھولے ان کے منتظر تھے۔ قدموں تلے دشمن سرزمین کا احساس اور انہیں متوقع چار چوٹ لگانے کا احساس ہی رگوں میں پارہ دوڑا رہا تھا۔

وہ سب اپنے مخصوص منصوبے اور حکمت عملی کے تحت دھیرے دھیرے رینگتے آگے بڑھتے رہے۔ ہلکی سی آہٹ یا سرسراہٹ بھی ان کے لیے بہت جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی۔ اپنے چہروں پر سیاہ رنگ پھیرے اور وجود کو گہرے سبز پتوں سے کیموفلاج کیے وہ اسی ماحول کا ایک حصہ معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے دل نہایت تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک ایسے موڑ پر آن پہنچے تھے جہاں برسوں پرانی تمنا پوری ہونے والی تھی۔ مقبول حسین بھی جوش و ولولے سے سرشار تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنا رخ موڑا اور چند گز دور نظر آتی اپنے ملک کی سرحد کی جانب دیکھنے لگا۔

”مقبول حسین! کیا بات ہے؟ میدان جنگ میں سپاہی پیچھے مڑ کر دیکھے تو جانتے ہو ناں کہ اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“ کیپٹن نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”یس سر! میں جانتا ہوں۔“ اس نے مؤدبانہ جواب دیا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں گھر کی یاد ستانے لگی ہے؟“

”بالکل نہیں سر! ملک و قوم کی خدمت کے لیے وقف سپاہی ایک لمحہ بھی کسی یاد میں غافل نہیں ہوسکتا۔“

”تو پھر اس جانب کیا تلاش رہے ہو؟“

”میں یہ دیکھ رہا ہوں سر کہ ہندوستان سے میرے وطن کی سرزمین کیسی دِکھتی ہے۔“

”تو کیا نظر آیا؟“

”تقدس...... پاکیزگی...... نور اور لطافت...... ہم اپنے وطن کی یہ پاک سرزمین کبھی ان غاصبوں کے ارادوں سے میلی نہیں ہونے دیں گے۔“

”ان شاء اللہ جوان! ان شاء اللہ...... ہم یہاں سے سرخرو واپس لوٹیں گے۔ ہم نے اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق بٹالین ہیڈکوارٹرز، اسلحہ ڈپو اور پل تباہ کرنے ہیں۔ ہمارے پاس صرف دو روز ہیں اور ان دو دنوں میں دشمن کو اتنا نقصان پہنچانا ہے کہ اگلے دو سو سال تک وہ اپنے زخم چاٹنے پر مجبور رہے۔“ کیپٹن نے آہنی عزم سے کہا تو دیگر افراد نے بھی جذبوں کی بھرپور صداقت سے زیرلب آمین کہہ کر اپنے ارادے واضح کردیے اور ایک بار پھر رینگتے ہوئے جنگل کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگے۔

تھوڑی دور جاتے ہی ان کا سامنا اپنے پہلے ٹارگٹ سے ہوگیا۔ اس چیک پوسٹ کو کسی بھی اہلکار کی نظر میں آئے بغیر عبور کرنا بہت ضروری تھا۔ یہ انتہائی خطرناک لمحے تھے لیکن بیرونی سمت تعینات پہریداروں کی ایک مجرمانہ کوتاہی نے ان کی تباہی و موت اور پاکستانی گروپ کی کامیابی یقینی

بنادی۔ اسے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی یا اپنی طاقت کا بے جا گھمنڈ۔ پہریدار رات کے اس پہر ریڈیو پر موسیقی سے لطف اندوز ہونے میں مگن تھے۔ ان کے ذہنوں میں آقاؤں کی جانب سے یہ بات راسخ ہوچکی تھی کہ خواب غفلت میں مبتلا پاکستانی فوج چٹکی سے مسل دی جائے گی۔

جنگل میں ہوا کی مدھم سرسراہٹ کے علاوہ جھینگروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ پاکستانی سپاہی دم سادھے احتیاط سے آگے بڑھتے رہے۔ مزید چند گز طے کرتے ہوئے بھارتی اہلکاروں کی حسیات یکدم چوکنا ہوگئیں۔ غالباً انہیں آس پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوگیا تھا۔ دو اہلکاروں نے لپک کر آسمان کی جانب مخصوص فائر کیا۔ فضا میں یکدم روشنی کا سیلاب اُمڈ آیا۔ وہ عقابی نظروں سے قرب وجوار کا جائزہ لینے لگے لیکن پھر کسی کو موجود نہ پاکر اطمینان سے اپنے سابقہ مشغلے میں مصروف ہوگئے۔

ان کے لیے اتنی مہلت ہی بہت تھی۔ انہوں نے بجلی کی سی تیزی اور عقاب کی سی پھرتی سے وہ چیک پوسٹ ہینڈ گرینڈ سے اڑائی اور اسی جوش وجذبے سے اپنی اگلی منزل "محراب نما پل" کی جانب بڑھ گئے۔ اس پل پر بھی اِکّا دُکّا مقامات پر پہریدار تعینات تھے اور نیند سے مغلوب ہوچکے تھے۔ کیپٹن کے اشارے پر دو اہلکار پیٹ کے بل رینگتے ہوئے مختلف مقامات پر بم نصب کرنے لگے۔ ان کی حسیات ایک پل کے لیے بھی گردوپیش سے غافل نہیں ہوئی تھیں۔ مزاحمت کرنے والے پہریداروں کو فولادی ہاتھوں سے گردن کا منکا توڑنے کے بعد جہنم واصل کردیا جاتا۔ ہندوستان کی سرزمین پر دندناتے ان رات کے شکاریوں نے اپنی آمد کا حق ادا کردیا تھا۔ دھماکے سے کسی کھلونے کی طرح اڑتا ہوا پل اور آسمان کی جانب لپکتے شعلوں نے کائنات کے ہر ایک منظر کو ساکت کردیا۔

☆......☆

اگلی رات اس سے بھی زیادہ ہولناک تباہی لے کر آئی۔ زیرزمین اسلحہ ڈپو کی بربادی نے ہندوستانی افواج کی صفوں میں کھلبلی مچادی۔ اعلیٰ سطح پر اس نقصان نے حقیقی معنوں میں صف ماتم بچھادی۔ محکمۂ دفاع کی جانب سے متعلقہ افسران کو الرٹ جاری کردیا گیا۔ ایسے ہی ایک ہنگامی اجلاس میں انڈین کرنل اپنے ماتحتوں پر بری طرح برس اٹھا۔

"یہ سب کیا ہورہا ہے آفیسرز؟ آخر یہ کون لوگ ہیں جو اتنی دیدہ دلیری سے ہمارے حساس فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بنارہے ہیں؟"

"سر! یہ کسی گوریلا گروپ کی کارروائی لگتی ہے۔" ایک ماتحت نے کہا۔

"لگتی ہے...... کیا میں اوپر والوں کو یہ جواب دوں کہ میری سینا ابھی تک یہ جانکاری حاصل ہی نہیں کرپائی کہ کارروائیوں کے پیچھے اصل میں کس کا ہاتھ ہے؟" کرنل غرّایا۔

"سر! ہم اپنی پوری کوشش کررہے ہیں کہ اس گروپ کو ٹریس کرلیں۔"

"اور تم لوگوں کی یہ کوشش کس جنم میں سپھل ہوگی؟ سب سے پہلے تو اپنی ناکامی سویکار کرو۔"

"سر! آپ چنتا نہ کریں۔ ہم نے تلاشی کا عمل تیز کردیا ہے۔ ان لوگوں کو اوشیہ مقامی آبادی کی سہائتا بھی حاصل ہے۔ آپ کو علم ہے کہ کشمیری مُسلے ہمیشہ پاکستانی سینا کا ہی ساتھ دیا کرتے ہیں۔ ہم نے اس سلسلے میں پانچ سو آتنک وادیوں کو گرفتار بھی کیا ہے۔"

"مجھے کیول اتنا علم ہے کہ ہمیں دو دن میں "بی۔ آر۔ بی نہر" پر اتنا نقصان نہیں ہوا جتنا یہاں ہوچکا ہے۔ دو دن میں دو بار وہ سے زیادہ بلاسٹ میں ستّر سے زیادہ فوجی اور بیس افسر مارے جاچکے ہیں اور میرے یہ قابل سینک ابھی تک یہی اندازہ نہیں لگا پارہے کہ انہیں کس دیش دروہی کا ساتھ حاصل ہے۔ کیا وہ جادو کی کوئی چھڑی گھما کر یہ سب کارروائیاں کرتے ہیں؟ ہوش کے ناخن لو آفیسرز! مجھے چھ گھنٹوں میں کسی کامیابی کی اطلاع چاہیے ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔"

"یس سر! آگیا کا پالن ہوگا۔" ماتحتوں نے مستعدی سے کہا اور سیلیوٹ جھاڑ کر روانہ ہوگئے۔

اس کے بعد علاقے میں فوجی جیپوں اور خصوصی گاڑیوں کا گشت بڑھا دیا گیا۔ چھلاوے کی مانند تباہی پھیلا کر غائب ہوجانے والے پاکستانی فوجیوں کی تلاش کے لیے خصوصی تربیت یافتہ کتوں کی مدد لی جانے لگی۔ ہندوستانی فوج اس نقصان پر حقیقتاً باولی ہورہی تھی اور ان سب کی تلملاہٹ، طیش اور کوششوں کے خوف سے بے نیاز پاکستانی فوجی جنگل کے گھنے اور اندرونی حصے میں ستا رہے تھے۔ "آپریشن جبرالٹر" میں انہیں توقعات سے کہیں زیادہ کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ تمام گروپ کمانڈرز کیپٹن شیر کے ساتھ مستقبل کی حکمت عملی طے کرنے میں مصروف تھے۔

"ہمارا یہ مشن بے حد کامیاب رہا ہے سر!"

"ہاں! ہندوستانی سرزمین کو ہماری آمد ہمیشہ یاد رہے گی۔ آخر انہیں بھی تو اندازہ ہو کہ انہوں نے شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کی غلطی کی ہے۔"

اسی اثناء میں مقبول حسین نے وائرلیس ریسیور کیپٹن کو تھما دیا۔ دوسری جانب اپنا ہی ایک ساتھی موجود تھا جسے مشن میں کامیابی اور اپنی واپسی کی اطلاع دینی تھی۔

"ہمارا ٹور ختم ہوگیا ہے سندر! یہاں کا موسم تو بہت ہی خوبصورت ہے۔ سبھی ساتھیوں نے اس یاترا سے بھرپور لطف اٹھایا ہے۔"

"سب ساتھیوں کی طبیعت اور مزاج کیسے ہیں؟" دوسری جانب سے بھی مخصوص انداز اور کوڈ ورڈز میں پوچھا گیا۔

"سب بالکل ٹھیک ہیں۔ کوئی بھی بیمار نہیں ہوا۔ ہم جلد ہی واپس آکر باقی تفصیل بتائیں گے۔" کیپٹن نے مسکراتے ہوئے رابطہ منقطع کیا اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ شکم کی آگ بجھانے میں مصروف ہوگیا۔

یہاں آمد کے بعد انہوں نے اپنے ساتھ لائے ہوئے راشن اور سازوسامان پر ہی اکتفا کیا تھا۔ رستے میں کسی بھی گاؤں یا علاقے میں نظر آنے والی تازہ خوراک کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا گیا۔ انہیں دشمن کے علاقے کی مرغن غذاؤں سے زیادہ اپنے وطن کے باسی کھانے کی مہک ذائقہ اور توانائی سے بھرپور لگتی تھی۔ وہ سب رات گہری ہونے کے منتظر تھے تاکہ محفوظ واپسی کا سفر یقینی بنایا جاسکے۔ ابھی ان کامیابیوں اور مقامی فوج کی وقتی غفلت نے انہیں کسی بھی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ واپسی بالکل بھی سہل ثابت نہیں ہوگی۔ شکست اور ذلت کے زخموں سے چور بھارتی فوجیوں نے ان کے استقبال کے لیے کڑے انتظامات کررکھے ہوں گے۔

اور ہوا بھی یہی۔

☆......☆

سرحدی علاقے میں بندوق بردار افراد نے ان کی موجودگی محسوس کرتے ہی پوری قوت سے دھاوا بول دیا۔ مدھم چاندنی میں بندوق کی نال سے نکلتے شعلوں اور بارودی گھن گرج نے وہاں ایک قیامت برپا کردی۔ پاکستانی فوجیوں نے بھی مزاحمت کا پورا حق ادا کیا لیکن دشمن کو بہرحال جغرافیائی اور عددی برتری بھی حاصل تھی۔ ان کے چند اہلکار گولیوں کی زد میں آکر زخمی ہوئے تو فائرنگ میں وحشیانہ تیزی پیدا ہوگئی۔ اسی دوران اچٹتی ہوئی ایک گولی مقبول حسین کی بائیں ٹانگ میں پیوست ہوگئی۔ اس کے منہ سے بے اختیار کراہ برآمد ہوئی۔

"یااللہ! مدد فرمانا۔"

کیپٹن شیر نے اس کی بھنچی ہوئی آواز سے صورتِ حال کا فوری اندازہ لگالیا اور ایک ماتحت کو حکم دیا۔

"ارشاد! مقبول حسین کی فوری مدد کرو۔ وہ ہٹ ہوگیا ہے۔ اسے کور دو۔"

ارشاد نامی اس پھرتیلے جوان نے لپک کر اسے کندھوں پر اٹھایا اور ایک محفوظ آڑ میں لے جاکر زخم کا جائزہ لینے لگا۔

"سر! گولی جسم کے اندر ہی ہے۔ اسے نکالا نہ گیا تو خون بند نہیں ہوگا۔" ارشاد کے جواب پر کیپٹن کا دل دکھ سے بھر گیا۔

دشمن کی جانب سے فائرنگ بلاتوقف جاری تھی۔ انہیں بھی مقابل کی اس لمحاتی کمزوری کا اندازہ ہوگیا تھا اور اب وہ کسی بھی طرح موقع سے مکمل فائدہ اٹھانے کی تاک میں تھے۔

"ہمت کرو جوان! ہم تمہیں ساتھ لیے بنا یہاں سے ہرگز حرکت نہیں کریں گے۔" کیپٹن نے اسے دلاسا دیا۔

"سر! یہ صورتِ حال ایسی بالکل نہیں ہے کہ آپ میری خاطر اتنا بڑا رسک لیں۔ دشمن بالکل سر پر آچکا ہے۔ اسے مزید پیش قدمی کا موقع نہ دیجیے پلیز!"

"نہیں مقبول حسین! میرے لیے اپنا ہر ساتھی انمول ہے۔ میں تمہیں ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔" کیپٹن نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنایا اور ذرا رخ موڑ کر دوسرے اہلکار سے مخاطب ہوکر کہا۔ "مقبول حسین کو لے کر فوراً بارڈر کی طرف چلو۔ ہم زیادہ دیر یہاں مزاحمت نہیں کرسکتے۔ ان کے پاس بارود اور اسلحہ ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ہمارے گرد گھیرا مزید تنگ کرتے گئے تو کوئی بھی بچ نہ پائے گا۔"

مقبول یہ حکمت عملی جان کر ایک بار پھر تڑپ اٹھا۔ اس کی زخمی ٹانگ سے خون بھل بھل بہہ رہا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ بارڈر اتنا بھی نزدیک نہیں کہ ساتھی اہلکار اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کا وجود بھی ڈھوتے پھریں۔ منطقی انداز سے سوچا جاتا تو عسکری نقطۂ نظر سے وہ ناکارہ ہوچکا تھا۔ وہ اپنے زخمی وجود کی خاطر کسی بھی صحت مند اور چست ساتھی کی زندگی بھلا کیونکر خطرے میں ڈال سکتا تھا؟

اس ساری صورتِ حال پر تیزی سے سوچنے کے بعد اس نے کیپٹن سے ایک بار پھر التجا کی۔ ”سر! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن پلیز! میری بات بھی تو سمجھنے کی کوشش کریں۔ بارڈر ابھی بہت دور ہے۔ میری وجہ سے آپ سب کی زندگیاں بھی داؤ پر لگ جائیں گی۔ آپ مجھے یہیں چھوڑ دیں۔ ہمارے وطن کو ابھی آپ سب کے صحتمند وجود اور توانائی کی بہت ضرورت ہے۔“

”ہم ایک ایسے دشمن کے علاقے میں ہیں جو اپنی کم ظرفی اور غیر اخلاقی روایات کی بدولت لاشوں کی بے حرمتی کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ میں اپنے کسی ساتھی کی لاش تک یہاں چھوڑ کر جانے کے حق میں نہیں۔ پھر تم تو پھر ایک جیتا جاگتا وجود ہو۔“ کیپٹن کے حتمی انداز نے اسے یہ باور کروا دیا کہ اب کسی بھی دلیل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی اور وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے گا۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ اب مزید نزدیک آتی جا رہی تھی۔ یہ ایک قیامت خیز فیصلے کی گھڑی تھی۔ مقبول حسین اپنے ساتھیوں کی زندگی کسی بھی قیمت پر خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس نے چند ثانیوں کے لیے قرب وجوار کا جائزہ لیا اور پھر اپنی پوری قوت مجتمع کر کے خود کو ایک ڈھلوان سے نیچے گرا دیا۔ اس کے ساتھی اس حرکت پر انگشت بدنداں تھے۔ کیپٹن کی آنکھوں میں جذبات نمی بن کر چھلکے اور وہ بے اختیار کراہ کر بولا۔ ”آہ...... مقبول حسین! یہ تم نے کیا کیا میرے شیر؟“

اب وہاں ایک پل بھی رکنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ انہوں نے اپنے اس بہادر ساتھی کی جواں مردی کو سلام کرتے ہوئے واپسی کا رخ کر لیا۔ ذرا سی دیر میں وہ علاقہ پاکستانی فوجیوں سے خالی ہو گیا لیکن نہیں! ابھی وہاں وہ جری انسان موجود تھا۔ تاروں بھرا نیلا گگن، چاند کی مدھم روشنی اور جنگل کے بوڑھے شجر بڑی حیرت سے وہ منظر دیکھ رہے تھے۔ لہو اگلتے وجود اور کندھے پر وائرلیس سیٹ اٹھائے بانکا سجیلا نوجوان آخری گولی ختم ہو جانے کے بعد بھی خالی رائفل سے لڑنے لگا تھا۔ ہوائیں اس اجنبی کی بہادری اور جرأت پر یکدم ساکت رہ گئیں اور لمحاتی سکوت کے بعد پیڑوں میں دم سادھے پتوں سے مدھم سرگوشی میں پوچھنے لگیں۔

”اس قدر دلیری! اس اجنبی کو اپنی زندگی سے محبت نہیں ہے کیا؟“

”زندگی سے محبت کسے نہیں ہوتی بھلا؟ لیکن یہ اجنبی جس سرزمین کا باشندہ ہے، وہاں شہادت ہی ابدی زندگی ہے۔ یہ اسی زندگی کی چاہ میں ہی تو اپنی جنم بھومی کی طرف میلی نظر سے دیکھنے والوں سے لڑ رہا ہے۔“ پتوں کی سرسراہٹ نے جواب دیا۔

”آفرین اس دلیری اور کردار کی عظمت پر۔“ ٹمٹماتے تاروں نے اسے دشمن فوجیوں کے نرغے میں آتے دیکھ کر سوچا۔

☆......☆

مقبول حسین کی زندہ گرفتاری ہندوستانی فوج کے لیے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی۔

وہ ایک ایسے گروپ کا فعال رکن تھا جس نے محض دو روز میں انہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ اب مقبول کی دلیرانہ بغاوت، گرفتاری سے قبل مزاحمت اور اس پر مستزاد وائرلیس سیٹ کی موجودگی سے وہ اپنی ان قیاس آرائیوں پر پہنچ ہو چکے تھے کہ ان کے ہاتھ ایک ”انٹیلی جنس آفیسر“ لگ گیا ہے جس سے تمام تر فوجی راز اور خفیہ معلومات اگلوا کر وہ بھی اسی طرح جوابی کارروائیوں کا آغاز کر سکیں گے جیسے مقبول اور اس کے ساتھیوں نے کیا تھا۔

تباہی اور بربادی کا یہ خواب آنکھوں میں سجائے مقبول کو کڑی نگرانی میں ایک قلعے میں منتقل کر دیا گیا جہاں خصوصی طور پر تفتیشی سرگرمیوں کے لیے عقوبت خانے بنائے گئے تھے۔ مقبول حسین کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی۔ اس کے زخموں پر دانستہ مزید ضربات لگاتے ہوئے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں رسیوں کی مدد سے کرسی پر باندھ دیا۔ ذرا سی دیر میں ملٹری افسران میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اعلیٰ افسران زخمی ناگ کی طرح پھنکارتے اس کے پاس چلے آئے اور پھر تشدد کی ایک نہ تھمنے والی لہر کا آغاز ہو گیا۔ مقبول کی زخمی ٹانگ ان کا خصوصی نشانہ تھی۔

”قیدی نے اپنے بارے میں کچھ بتایا کہ نہیں؟“ ایک میجر نے اہلکاروں سے پوچھا۔

”سر! ابھی تک صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ اس کا نام مقبول حسین ہے اور وہ پاکستانی سینا میں ایک سپاہی ہے۔“

”امپاسیبل! یہ کسی صورت ممکن ہی نہیں۔ وہ اپنی اصل شناخت ہم سے چھپا رہا ہے۔“

”یس سر! مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ ایک معمولی سپاہی اتنی مزاحمت کر ہی نہیں سکتا۔ یہ انٹیلی جنس آفیسر ہے اور کسی سیکرٹ مشن پر ہی یہاں آیا تھا۔“ رام لعل نامی ایک اہلکار نے اپنے افسر کی فوری تائید کی۔

”میں نے کرنل کھنہ کو بھی قیدی کے بارے میں اطلاع دے دی ہے۔ وہ کسی بھی وقت یہاں موجود ہوں گے۔“ میجر نے کہا۔

چند لمحوں بعد مخصوص فوجی یونیفارم میں ملبوس سیاہ رو کرنل کی آمد نے سب اہلکاروں کو مستعد کر دیا۔ کرنل کھنہ سفاکی اور بربریت میں اپنی مثال آپ تھا۔ عیش و عشرت کی زندگی اس کا معمول تھی۔ شراب تو وہ پانی کی طرح استعمال کرتا تھا۔ اس وقت بھی اُس کی آنکھوں میں رقصاں سرخی اور مہکتی سانسیں واضح طور پر اعلان کر رہی تھیں کہ وہ نشے میں بری طرح دھت ہے اور صرف پاکستانی فوجی کی گرفتاری کی خبر نے اسے محفل نشاط برخاست کرنے پر مجبور کیا ہے۔

ٹارچ سیل میں رام لعل اور چیتا سنگھ، مقبول کو بری طرح پیٹ رہے تھے۔ اس کا چہرہ مختلف زخموں کی آماجگاہ بن چکا تھا اور وردی جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ کرنل کے درشت تاثرات دیکھتے ہی مقبول کے تن بدن میں برق دوڑ گئی۔ اس نے نفرت و حقارت سے کرنل کے منہ پر تھوک دیا۔ مقبول کی آنکھوں سے جھلکنے والے یہ دلیرانہ اور باغی جذبے کھنہ کو بے قابو کر گئے۔ وہ تو اس کی جانب سے کسی رحم کی التجا یا اعصابی شکستگی کا کوئی منظر دیکھنے کا متمنی تھا۔ اسے قوی اُمید تھی کہ مبینہ قیدی کے چہرے پر ممکنہ تشدد کا خوف لازمی نظر آئے گا لیکن یہاں تو گنگا ہی اُلٹی بہہ رہی تھی۔ مقبول حسین کے خوفناک تاثرات نے اس کا نشے سے ڈولتا دماغ مزید بے قابو کر دیا۔ کرنل کھنہ نے اپنے بھاری بھرکم بوٹ سے اس کی ٹانگ کا زخم بری طرح مسل ڈالا۔ مقبول بے اختیار کراہ کر رہ گیا۔

”کہاں ہیں تیرے باقی ساتھی؟ ان کا اگلا پلان کیا ہے؟ بول!“

”میرے جسم کا ہر ایک ریشہ بھی ادھیڑ دو گے تو اپنے کسی بھی ساتھی کا نام نہیں بتاؤں گا...... کبھی بھی نہیں بتاؤں گا۔“

”تیری تو آتما بھی اپنے ساتھیوں کے نام پتے اور ٹھکانے بتائے گی بیٹا! تو بس دیکھتا جا کہ میں تیرا حال کیا کروں گا؟“ کرنل نے اپنے ماتحتوں کو مخصوص اشارہ کیا اور میجر کے ہمراہ بیرونی سمت بڑھ گیا۔

”معمولی فوجی نہیں ہے میجر! میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ شخص بہت اہم ہے۔ اسے کسی بھی طرح زبان کھولنے پر مجبور کرو لیکن خیال رہے! اسے ہر قیمت پر زندہ رکھنا ہے۔“

”شیور سر! ہمارے سیک تو پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔“ میجر نے فدویانہ انداز میں جواب دیا اور کرنل کے رخصت ہوتے ہی ایک بار پھر اپنے سابقہ مشغلے میں مصروف ہو گیا۔

رام لعل اور چیتا سنگھ نے مقبول حسین کو کھولتے ہوئے پانی میں بے شمار غوطے دیئے۔ اس کے چہرے کی کھال کئی جگہ سے جل کر لٹک گئی تھی۔ بازوؤں کے بل چھت سے لٹکا کر اس کے جسم کے ایک ایک عضو پر وحشیانہ تشدد کیا گیا۔

”پاکستان میں تیرے فوجی ٹھکانے کہاں ہیں؟ تمہارے ساتھیوں کا پتا ٹھکانا کیا ہے؟ ہندوستان میں تمہاری سہایتا کون کرتا ہے؟“ وہ چلا کر اس سے پوچھتے۔

”پاکستان کا ہر ایک چپا عسکری ٹھکانا ہے۔ وہاں کا ہر ایک بچہ فوجی اور تم لوگوں کے لیے قہر ہے۔ ہندوستان میں ہمیں اللہ تعالیٰ پر ایمان کی سہولت کاری حاصل تھی اور ہمیشہ رہے گی۔“ اس قدر بھیانک تشدد کے بعد اس کی زبان سے ادا ہونے والے یہ الفاظ ان کی سماعت کے لیے تیزاب کے چھینٹے ثابت ہوتے اور وہ از سر نو تشدد کی لہر کا آغاز کر دیتے۔

☆......☆

ہندوستانی افسران مقبول حسین سے کوئی بھی راز یا معلومات اگلوانے میں ناکام رہے۔

ناکامی کا یہ غصہ تلملاہٹ بن کر ان کے وجود سے جھلکتا تھا۔ کرنل کی حالت ان سبھی سے قابل رحم تھی۔ اوپر والوں کے دباؤ کے باوجود وہ کوئی بھی حوصلہ افزا جواب دینے سے قاصر تھا۔ مقبول حسین زبان نہیں کھولتا تھا اور اعلیٰ انتظامیہ یہ حقیقت سمجھتی ہی نہیں تھی کہ ایک پاکستانی فوجی کا ایمان اس قدر مضبوط ہے کہ وہ موت سے بغلگیر ہونا تو منظور کر لے گا لیکن اپنی وردی اور فرائض سے کسی قسم کی کوئی غداری نہیں کرے گا۔ اس کشمکش اور وقتی دباؤ سے مجبور ہو کر کرنل کھنہ کے شیطانی دماغ میں ایک انوکھے خیال نے جنم لیا۔ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو اپنے مفاد کی خاطر ہر قسم کی اخلاقیات کو بہ آسانی قربان کر دیا کرتے ہیں۔

اس نے کچھ عرصہ قبل ہی ”مدھو“ نامی ایک نہایت حسین وجمیل اور پُرشباب عورت سے شادی کی تھی۔ مدھو کا حسن زہد شکن تھا اور کرنل کے دماغ نے اسے یہ راہ سجھانی شروع کر دی کہ پھول کی پتی سے بھی تو کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔ اس نے اپنی زندگی میں ایسے بے شمار افراد دیکھے تھے

جو چٹانوں کی طرح مضبوط دکھائی دیا کرتے لیکن صنفِ نازک کی قربت کی مدھم سی آنچ ان کے فولادی ارادے موم کی طرح پگھلا دیتی تھی۔

"یس! یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہ آیا؟ اس قفل کو توڑنے کی چابی صرف مدھو ہی کے پاس ہے۔ وہ کبھی بھی ناکام نہیں رہے گی۔" کرنل نے آتشیں سیال دھیرے دھیرے اپنے معدے میں انڈیلتے ہوئے سوچا اور پھر بلا تاخیر اپنا منصوبہ مدھو کے گوش بھی گزار دیا۔

"یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو کھنہ..... ہوش وحواس میں تو ہو؟" وہ حیران تھی۔

"اس میں حرج ہی کیا ہے مدھو؟ تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ یہ دیش کی سیوا ہے۔ تمہاری اس سہائتا سے ہم دوسرے پاکستانی سپاہیوں کا پتا معلوم کرکے دشمن کی کمر توڑ سکتے ہیں۔" وہ پچکار کر بولا۔

مدھو کو اپنے شوہر کے چہرے پر ایک گدھ نظر آرہا تھا۔ اس کے لیے انڈین آرمی کے کرنل سے شادی بھلے ہی سماجی رتبہ و ذاتی وقار میں اضافے کا باعث بنی ہو تاہم حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اس نئے بندھن سے بالکل خوش نہیں تھی۔ کرنل کھنہ شراب و شباب کے کثرت استعمال سے ایک کھوکھلا شجر بن چکا تھا جو اپنی پُر شباب بیوی کے سامنے بالکل بے بس ثابت ہوا کرتا۔ مدھو قسمت کی اس ستم ظریفی پر جھنجلا کر رہ جاتی۔ ایک عالم اس کے حسن کا دیوانہ تھا۔ انڈین آرمی کے "غیر تحریری آئین" کے مطابق وہ شوہر کو دیگر فوجی افسران سے فائدہ دلوانے کی خاطر ان کے بے حمیت تقاضے بھی پورے کردیا کرتی تھی لیکن آج کا یہ مطالبہ اس کا تن بدن بھسم کرنے لگا تھا۔

"تم اپنے سوارتھ کے لیے مجھے ایک دشمن سے سمبندھ بنانے کے لیے کہہ رہے ہو؟" اسے شاید اب بھی اپنی سماعت اور شوہر کے الفاظ پر کوئی شبہ تھا۔

"اپنے سوارتھ کے لیے نہیں۔ یہ دیش کا سوارتھ ہے مدھو! وہ کوئی معمولی افسر نہیں ہے۔ اس کی مضبوط کھال اور ڈھٹائی بتاتی ہے کہ وہ شطرنج کی اس بساط کا بہت اہم مہرہ ہے۔ میرا وشواس کرو اگر تم اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہوگئیں تو میں کرنل سے بریگیڈیئر بن جاؤں گا۔" وہ دھیرے دھیرے اسے رام کرنے لگا۔

"اوکے! آج تک میں نے تمہارے لیے اتنے بلیدان دیے ہیں، آج یہ بھی سہی۔ میں بھی تو دیکھوں کہ مقبول حسین آخر کب تک اپنی زبان بند رکھ پائے گا؟"

"گریٹ! تم حقیقتاً میرا لاجواب انتخاب ہو۔ بہت خوش قسمت ہوں میں۔" وہ مخمور نگاہوں سے بیوی کو دیکھ کر بولا۔

"کاش میں بھی تمہارے متعلق ایسا کوئی وچار بنا سکتی۔" مدھو نے سر جھٹکتے ہوئے تنفر سے جواب دیا اور اپنے اس نئے مشن کے متعلق غوروفکر کرنے لگی۔

☆......☆

قید خانے میں ہو کا عالم طاری تھا۔ دن بھر تشدد کے پہاڑ ڈھانے کے مناظر دیکھ کر اپنی سفاکی اور بربریت کو تسکین دینے کے بعد اعلیٰ افسران شراب کے نشے میں دھت کسی نہ کسی حسینہ کے ساتھ دادِ عیش دینے میں مگن تھے۔ نچلے درجے کے اہلکار البتہ ہنوز پہرے پر مامور تھے۔ اس نئے قیدی کی بدولت اس کی زندگیاں اور معمولات بھی تلاطم کی زد میں آچکے تھے۔ انہیں اپنے افسران کا بے جا غصہ اور نفرت برداشت کرنی پڑتی۔ آداب افسری کے بھرم میں وہ سب اہلکار اس وقت تو خاموش ہوجایا کرتے تھے لیکن بعدازاں اپنی مایوسی اور طیش مقبول حسین کے لہولہان وجود پر منتقل کردیتے جس کی زبان کا قفل ٹوٹ کر ہی نہ دیتا تھا۔

اسی لمحہ ایک جیپ کی آمد نے اس خاموشی اور سناٹے میں ہڑبڑاہٹ کی سی کیفیت طاری کردی۔ کرنل کھنہ کی جواں سال اور طرحدار بیوی سے وہ سب ہی واقف تھے۔ اس کے اختیارات اور 'آف دی ریکارڈ' سرگرمیوں سے بھی وہ ناآشنا نہیں تھے لہٰذا رات کے اس پہر مدھو کی آمد کا مقصد انہیں بخوبی سمجھ آرہا تھا۔

مدھو کے ایما پر مقبول حسین کے ٹارچر سیل کا دروازہ غیر مقفل کردیا گیا۔ قیدی کی حالت دیکھ کر وہ کئی لمحوں کے لیے بالکل ساکت رہ گئی۔ اس کے سامنے چوبی کرسی پر بندشوں سے جکڑا وہ شخص بری طرح لہولہان تھا۔ اس کے چہرے اور جسم پر کوئی مقام ایسا نہیں تھا جو زخم سے محفوظ ہو۔ ضربات کے نشان اور گرم پانی سے جلی ہوئی لٹکتی کھال دیکھ کر اسے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

"میڈم! آپ اس وقت یہاں کیسے؟" مقبول کے پاس ہی چت لیٹے رائفل بردار ادھیڑ عمر شخص نے ہڑبڑا کر کہا تو مدھو یکدم اپنے حواس میں لوٹ آئی۔

"یہ...... اس کی...... کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"میڈم جی! یہ خود ہی اپنی اس حالت کا ذمے دار ہے۔ کم بخت انتہائی ڈھیٹ مُسلا ہے۔ بہت ہی موٹی کھال ہے اس کی۔ کسی بھی بات کا سیدھی طرح جواب ہی نہیں دیتا۔" رام داس نے تنفر سے مقبول حسین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ چوٹوں کے نشان تو ابھی تازہ ہی محسوس ہو رہے ہیں۔ ابھی کیا ہوا ہے اس کے ساتھ؟" اس نے تحکمانہ انداز میں دریافت کیا۔

"یہ کچھ بھی کھاتا پیتا نہیں ہے۔ پچھلے کئی دن سے بالکل فاقے کی حالت میں ہے۔ آج چیتا سنگھ نے اسے انسانی ہمدردی کے تحت کھانے کا پوچھا تو بات بڑھ گئی۔"

"سب تفصیل سے بتاؤ رام داس! ورنہ میں کیا کرسکتی ہوں یہ تم اچھی طرح جانتے ہی ہوگے۔" وہ نخوت اور سختی سے بولی۔

"ج...... جی...... میڈم! چیتا سنگھ اسے کہہ رہا تھا کہ اگر کھانا نہیں کھاؤ گے تو مزید ٹارچر کیسے برداشت کروگے؟ افسران جو کچھ پوچھتے ہیں انہیں بتا کیوں نہیں دیتے؟"

"اس نے کیا جواب دیا پھر؟"

"اپنے دیش کے لیے جے جے کے نعرے لگانے لگا۔ رام لعل اس حرکت پر اپنا قابو کھو بیٹھا اور اسے بری طرح پیٹ ڈالا۔ چیتا سنگھ اگر اسے نہ روکتا تو شاید معاملہ اور بھی الجھ جاتا۔" رام داس نے سر جھکا کر حقیقت سے پردہ اٹھایا تو مدھو کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی۔ اس نے خیالی سوچ بچار کے بعد ذہن میں ایک اور منصوبہ ترتیب دیا اور گہری ہوتی نظروں سے نیم غشی کی کیفیت میں مبتلا مقبول حسین کا جائزہ لیتی واپس پلٹ گئی۔

☆......☆

اس قید خانے میں مقبول کے لیے زمان و مکان کا تصور ختم ہوچکا تھا۔

چار ضرب چار کی کوٹھری میں شب و روز کی قید نے اسے علم ہی نہ ہونے دیا کہ سترہ روز جاری رہنے والی وہ جنگ اپنے اختتام تک پہنچ چکی تھی۔ اس روز بھی وہ اپنے ماضی کی پرچھائیوں میں گھرا تھا۔

"اماں جانے کیا کررہی ہوگی؟ وہ ہر روز میری سلامتی کے لیے دعائیں کرتی ہوگی۔ بہن بھائی اسے دلاسا دیتے منتیں مانگتے خود بھی چپکے سے میری یاد میں آنسو بہا لیتے ہوں گے اور نصیراں...... وہ پگلی تو گاؤں کے باہر رستے پر ہی نظریں جمائے میرا انتظار کرتی ہوگی۔"

اپنوں کی ان یادوں میں کھوئے مقبول حسین کو بھلا کہاں علم ہوسکتا تھا کہ بھارتی فوج نے تمام تر جنگی اصول اور اخلاقیات بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے کسی سطح پر بھی جنگی قیدی تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ جنگ کے خاتمے پر دونوں ممالک کی جانب سے قیدیوں کی فہرست کا تبادلہ ہوا تو اس میں کہیں بھی 'سپاہی مقبول حسین' کا نام شامل نہیں تھا۔ ہندوستانی فوج کے لیے تو یوں بھی وہ "انٹیلی جنس افسر" تھا جس کے سینے میں مدفن راز جاننے کی خواہش انہیں انسانیت کے تمام اصول بھلا چکے تھے اور ادھر زمینی حقائق مدنظر رکھتے ہوئے حکومت کی جانب سے اسے "Missing believed killed" قرار دیتے ہوئے شہید کا درجہ دے کر اہلِ خانہ کو سرکاری طور پر باضابطہ مطلع بھی کردیا گیا۔ بیٹے اور بھائی کی اس خوش قسمتی اور ابدی جدائی کی ملی جلی کیفیت نے گھر والوں پر خوشی اور غم کی برسات طاری کردی۔

"بھرجائی! تو بہت خوش قسمت ہے۔ شہید کی بیوہ اور ماں ہونے کا اعزاز کم تو نہیں ہوتا۔" مقبول کے چچا نے گلوگیر انداز میں کہا۔

"میرا بیٹا حیات ہے۔ وہ اب بھی حیات ہے۔" ماں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں بھرجائی! وہ شہید ہے۔ اس نے ابدی زندگی حاصل کرلی ہے۔ یہی تمنا تھی نا اس کی؟"

دیور کی اس بات پر وہ بے اختیار ہونٹ کچل کر رہ گئی۔ وہ کسی کو بھی اپنے جذبات سمجھا ہی نہیں پا رہی تھی کہ اس کا دل یہ حقیقت تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔ اس کا وجدان گواہی دیتا تھا کہ اس کے جگر کا ٹکڑا اور وجود کا حصہ مقبول سانسوں کی ڈور سے اب بھی وابستہ ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بیٹے کی زندگی کی گواہی دیا کرتی تھیں۔

"ایک بات کہوں پتر؟" اس نے بڑے بیٹے سے کہا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے کہ کبھی نہ کبھی مقبول حسین لوٹ آئے گا۔ رب جانے میں اس وقت زندہ ہوں گی یا نہیں۔ بس میری ایک بات مان لینا۔ میں مرجاؤں تو میری قبر گاؤں آنے والے رستے پر بنانا۔ اگر کبھی میرا بیٹا لوٹ آئے تو مٹی کی ڈھیری سے ہی سہی لیکن اس کا دیدار تو کرلوں گی۔"

اُدھر نصیراں کا حال بھی اس سے کم نہ تھا۔ وہ بھی محبوب کی یاد میں گیلی لکڑی کے مانند سلگ رہی تھی۔ مقبول کی شہادت کی خبر اس نے بڑے صبر اور حوصلے سے سنی اور شہید کی منگیتر

ہونے پر فخر بھی محسوس کیا تھا۔اس کی زندگی میں انتظار کا موسم مستقل ٹھہر گیا تھا۔ مستقبل میں کسی کو بھی شریک سفر بنانے کا تصور فی الوقت محال تھا۔اس نے مقبول حسین سے وابستہ یادوں کو ہی زندگی بھر سینچ کر رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔مقبول کی سلامتی اور درازی عمر کی دعا اب اس کے درجات کی بلندی اور سفر آخرت کی آسانی میں تبدیل ہوگئیں اور ان سب دعاؤں کا مرکز مقبول حسین بھارتی فوج کے تریا چلتر کی زد میں آچکا تھا۔

☆......☆

کرنل کھنہ کے لیے مقبول حسین کی خاموشی زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکی تھی۔وہ ہر روز بے تابانہ انداز میں مدھو سے کسی بھی پیش رفت کے بارے میں استفسار کرتا۔

''میں نے شطرنج کی بساط بچھادی ہے کھنہ! اور اپنا ہر مہرہ بہت احتیاط سے چلنا چاہتی ہوں۔میری ذرا سی بے احتیاطی اسے مشکوک کردے گی۔''

''نہیں! ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے۔مجھے ہر حال میں کامیابی کی رپورٹ ملنی چاہیے۔'' کھنہ نے کہا۔

''اس کے لیے مجھے کچھ ''آؤٹ آف وے'' کام بھی کرنے پڑسکتے ہیں۔''

''میں ہر طرح سے سہاگا کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''ٹارچر سیل کا ماحول اس سے بات چیت کے لیے بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔میں اسے کسی اور استھان پر ملنا چاہوں گی۔'' مدھو نے اسے مختصراً اپنی سوچ سے آگاہ کیا تو کرنل گہری سوچ میں کھوگیا۔

''آئیڈیا برا نہیں۔میں اوپر والوں سے آگیا لے لوں گا۔''

''گڈ! تو پھر کام بھی جلد ہوجائے گا۔'' مدھو مسکرائی۔

اگلے روز طے شدہ منصوبے کے مطابق مقبول حسین کو چیتا سنگھ کے ہمراہ مدھو کے دفتر روانہ کردیا گیا۔روانگی سے قبل اس کی آنکھوں پر حسب سابق سیاہ پٹی باندھ دی گئی تھی۔مقبول کو کسی نئے عقوبت خانے میں منتقل ہونے کی توقع تھی لیکن اپنے سامنے چست لباس میں کیل کانٹوں سے لیس مدھو کو دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا۔

''میں نے آج تمہیں ایک خاص مقصد کے لیے بلایا ہے مقبول حسین!'' اس نے کرسی پر بیٹھے مقبول کو گہری نظروں سے ٹٹولتے ہوئے دیکھا جو اس کا وجود مکمل طور پر نظر انداز کیے عقبی سمت ساکت اور چوکس انداز میں کھڑے چیتا سنگھ کو دیکھ رہا تھا۔

''کیوں بلایا ہے میڈم؟'' زخمی حالت کی وجہ سے ایک فقرے کی ادائیگی ہی اس کے لیے بہت کٹھن ثابت ہوا کرتی تھی۔

''میں یہاں یو این او (اقوام متحدہ) کی جانب سے ہیومین رائٹس کمیشن (انسانی حقوق کی تنظیم) کی ممبر ہوں اور ایک خصوصی رپورٹ تیار کرنا چاہتی ہوں کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ بھارتی سینا ''جنیوا کنونشن'' کے تحت سلوک کرتی ہے کہ نہیں؟''

''آپ اس رپورٹ میں صاف لکھ دیجیے میڈم کہ یہ لوگ پی او ڈبلیوز (Prisoners of War) کی ابجد بھی نہیں جانتے۔'' اس نے بے ساختگی سے کہا۔

''ارے! تم تو کافی ایجوکیٹڈ معلوم ہوتے ہو۔'' وہ حیران رہ گئی۔ ''کس رینک کے آفیسر رہے ہو؟''

''میں پہلے روز سے ایک ہی بات کہتا چلا آرہا ہوں میڈم! میں ایک سپاہی ہوں۔''

''ایک معمولی سپاہی اور تعلیم...... کیا پاکستانی سینا میں سب ہی سپاہی ایسے ہوتے ہیں؟''

''مجھے کسی دوسرے کا علم نہیں لیکن میں نے بہرحال تعلیم حاصل کر رکھی ہے۔'' وہ اکتاہٹ سے گویا ہوا۔اس کی چھٹی حس کسی گڑبڑ کا عندیہ دے رہی تھی۔

''اپنے بارے میں مزید کچھ بتاؤ نا مجھے؟'' وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔

''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے میڈم کہ آپ ہیومین رائٹس کمیشن کی ممبر نہیں بلکہ کوئی تفتیشی افسر ہیں۔'' وہ صاف گوئی سے کہہ کر ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے ینگ مین! میں تو بس یونہی پوچھ رہی تھی۔'' وہ بھی سنبھل گئی۔

اس کی بات پر مقبول تو جانے قائل ہوا بھی تھا یا نہیں؟ لیکن کسی روبوٹ کے مانند ساکت کھڑے چیتا سنگھ کی آنکھوں میں اس کے لیے ستائش اور مرعوبیت کے تاثرات نے بڑی واضح جھلک دکھائی تھی۔وہ اپنے افسران اور مدھو کا یہ نیا کھیل بخوبی سمجھ گیا تھا اور جانے کیوں دشمن ملک کے اس سپاہی نے اپنی بہادری اور اعلیٰ ظرفی سے اس کے دل میں خاموشی سے گھر کرلیا تھا۔

چیتا سنگھ درمیانی عمر کا مخصوص خالصہ نظریات کا حامل فوجی تھا۔اس کی طبیعت میں عجب موج اور ترنگ تھی۔وہ دیسی رومانوی مزاج کا مالک تھا جو فوج کی سخت ترین روٹین میں بھی اپنے وجود میں موسیقی، بر کھارت، پھول اور خوشبوؤں سے محبت برقرار رکھے ہوئے تھا۔وہ اپنے علاقے میں بنتو نامی ایک لڑکی کے عشق میں بری طرح گرفتار تھا اور اکثر چاندنی لٹاتی یا سرما کی ٹھٹھری ہوئی راتوں میں اپنے بچپن سے جڑی یادوں کے علاوہ بنتو کے سنگ لمحات بھی بے خود ہوکر موسیقی و شاعری کے آہنگ میں بیان کرنے لگتا۔اسے بنیادی طور پر گلوکار بننے کا شوق تھا لیکن والد کے دباؤ نے فوج میں شمولیت پر مجبور کردیا۔وہ مکمل خودسپردگی اور حب الوطنی سے سرشار ہوکر ہی بھارتی فوج کا حصہ بنا تھا لیکن خالصہ ہونے کے باعث اس کی وفاداری اور وطن پرستی پر ہمیشہ ایک سوالیہ نشان لگا رہتا۔ساتھی اہلکار بھی اسے کچوکے لگانے سے باز نہ آتے۔مقبول حسین کی قید خانے میں آمد کے بعد اس نے بھی کامل خلوص سے اس پر ظلم وتشدد کے پہاڑ توڑے تھے۔ مگر اب میں مقبول کی خاموشی، وطن سے جنونی محبت اور ثابت قدمی نے بحیثیت فوجی اسے حقیقتاً بہت متاثر کیا تھا۔وہ اس عقوبت خانے کا واحد شخص تھا جو باتوں باتوں میں اسے خلوص نیت سے بدترین حالات سے بھی آگاہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ہاں، وہ بات الگ تھی کہ رام لعل اور اس جیسے دیگر ہندو اہلکار چیتا سنگھ کے اس عمل کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے طنزیہ گفتگو کرنے سے باز نہ آتے۔ان کے تکبر اور اعلیٰ انتظامیہ کی دہری پالیسی دیکھ کر وہ اکثر سوچتا تھا کہ مقبول حسین کے آباؤ اجداد نے الگ وطن حاصل کرکے نہایت بروقت اور دانشمندانہ فیصلہ کیا تھا۔اس جیسی سوجھ بوجھ کے انسان کی نگاہیں موجودہ حالات کے تناظر میں اپنی قوم پر آنے والے بدترین حالات ابھی سے بخوبی دیکھ رہی تھیں۔

''چیتا سنگھ! کہاں کھوگئے ہو؟'' مدھو کی آواز نے اسے یکدم اپنے خیالات کی رو سے چونکایا۔

''سوری میڈم جی! وہ بس......''

''میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم نے مقبول حسین کا خاص خیال رکھنا ہے۔جنیوا کنونشن کے تحت ہم جنگی قیدیوں سے ایسا غیر انسانی سلوک نہیں کرسکتے۔'' وہ بڑی شفقت و اپنائیت سے اپنا ہاتھ مقبول کے کندھے پر رکھ کر بولی۔چیتا سنگھ اس کے رموز بخوبی سمجھ گیا تھا۔

''جو حکم میڈم جی!'' اس نے سر جھکا کر کہا اور مقبول کے ہمراہ واپس لوٹ گیا۔

☆......☆

چار ضرب چار کی اس کوٹھری میں قید جانے کتنے روز بیت گئے تھے۔ہندوستانی فوجیوں کی ہٹ دھرمی اور مقبول حسین سے اہم عسکری ٹھکانوں کے راز اگلوانے کی ضد آج بھی جوں کی توں برقرار تھی۔ہر شب اس کے لیے ظلم وتشدد کا ایک نیا سلسلہ لے کر آتی۔ظلم کا وہ کون سا پہاڑ تھا جو اس پر نہیں ٹوٹا تھا۔جسمانی تشدد کے علاوہ کھانے پینے کے لوازمات بھی نہایت، غیر معیاری ہوتے۔اسے ریت سے آلودہ کھانا دیا جاتا تھا۔مقبول حسین کی ثابت قدمی اور استقلال ہر ستم سے برسرپیکار تھے۔شہادت کی تمنا اس کے وجود میں ہر بار ایک نئی قوت وتوانائی پیدا کرتی تو دوسری جانب ''اپنوں'' کا خیال بھی پردہ تصور سے ایک لمحے کے لیے اوجھل نہ ہوتا۔

اس رات بھی وہ کوٹھری کے ناہموار سنگی فرش پر بیٹھا اس نئے ''خطرہ'' کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا جو مدھو کی صورت میں اسے درپیش تھا۔وہ ایک خوبصورت بلا تھی اور اپنے حسن کی تباہ کاریوں سے مکمل طور پر آگاہ بھی۔وہ کئی بار مقبول حسین سے دفتر اور کوٹھری میں ملاقاتیں کرچکی تھی اور ہر بار ہمدردی و محبت کی آڑ میں اس کے بنیادی انسانی حقوق کی بحالی پر زور دیتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے گفتگو کا رخ مقبول کی ذاتی و پیشہ ورانہ زندگی کی جانب موڑ دیتی۔بات صرف یہاں تک محدود رہتی تو اتنی غیر فطری نہ لگتی۔اچنبھا تو اس بات کا ہونے لگا تھا کہ مدھو کے تیور اب ہرگز نظر انداز کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔مقبول سے بات چیت کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں در آنے والی مخصوص چمک اور کسی نہ کسی طریقے سے اس کے قریب ہونے کے بہانے تلاش کرنے کا ''پس منظر'' اسے بخوبی سمجھ آنے لگا تھا۔حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جاتا تو مقبول کو اس نئی صورت حال سے گھن محسوس ہونے لگی تھی۔

اس کے ان خیالات میں توقف اس وقت آیا جب بیرونی سمت ہلچل کے آثار پیدا ہوئے۔پہریداروں کی چند مخصوص آوازوں اور باتوں سے اندازہ ہوگیا کہ اس کی آج پھر بے وقت طلبی ہوگئی ہے۔تھوڑی ہی دیر میں چیتا سنگھ نے اس شبہے کی تصدیق کردی اور نہایت رازدارانہ انداز میں اسے کہا۔

''میڈم نے تجھے گھر بلایا ہے۔''

☆......☆

کرنل کھنہ کے گھر میں اس وقت چراغاں کا سا سماں تھا۔

کرنل حسب سابق شراب کے نشے میں دھت کسی ”غیر سرکاری ڈیوٹی“ سرانجام دینے کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ مدھو نے اسے خصوصی طور پر مقبول حسین کو گھر بلانے کے لیے قائل کیا تھا۔ یہ نادر خیال سن کر وہ کافی جز بز ہوا لیکن بیوی کے سامنے اس کی چلتی بھی کہاں تھی؟

”اسے دھیرے دھیرے مجھ پر وشواس آنے لگا ہے۔ اس نے اپنے پریوار کے بارے میں بھی کافی باتیں بتائی ہیں۔ اگر فوجی راز جاننے ہیں تو اسے مزید بھروسا دینی ہوں گی۔“

”ٹھیک ہے لیکن یہ کام اب جلد سے جلد ختم کرو۔“ اس کے مطالبے پر مدھو پہلو بدل کر رہ گئی۔ وہ اس معاملے کو جلد ہی تو ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس بانکے سجیلے سپاہی نے اپنی بہادری اور مزاحمت کی اعلیٰ مثالوں سے اس کے دل میں نرم گوشہ تو پہلے روز ہی پیدا کر دیا تھا۔ بعدازاں مقبول کے ساتھ گزرے وقت میں اس کے کردار کی کچھ جھلکیوں اور شرافت و بے نیازی نے مدھو کو بالکل ہی ہوش وحواس سے بیگانہ کر دیا۔ عورت ہمیشہ ستائش، مدح اور توجہ کی عادی ہوتی ہے لیکن اگر کوئی مرد اس کی ذات سے بے نیازی برتے تو وہ بے طرح الجھ جاتی ہے اور اسی الجھن کو سلجھانے کے عمل میں وہ اس کی مزید اسیر بنتی چلی جاتی ہے۔ مدھو کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ ان گنت ملاقاتوں کے باوجود مقبول حسین کی خاموشی اور گریز اس کے لیے ایک ذاتی چیلنج بن گیا تھا۔ تنہائی اور محرومی سے الجھتی مدھو کو مقبول کے روپ میں اپنی اس ادھوری زندگی کی تکمیل کا رستہ بھی دکھائی دینے لگا تھا۔ آج اس نے اس ضمن میں خصوصی اہتمام کیا تھا۔ مدھم روشنیاں، بہترین لذیذ کھانا اور اس کا سجا سنورا قیامت ڈھاتا سراپا کسی طور بھی نظرانداز کیے جانے کے قابل نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ مقبول حسین اس کی کسی بھی ”دعوت“ سے انکار نہیں کر پائے گا۔ یہ تمام امیدیں، آرزوئیں اور منصوبے اس وقت خاک میں مل گئے جب مقبول نے سرد مہری سے دریافت کیا۔

”مجھے اس طرح گھر پر کیوں بلوایا ہے میڈم؟“

”تم سے بات چیت کرنے کے لیے...... بہت افسوس ہوتا ہے کہ اتنی ملاقاتوں کے باوجود تم نے مجھے اپنا نہیں سمجھا۔ اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔“

”بتایا تو آپ نے بھی نہیں کہ آج اس ملاقات کا کیا مقصد ہے؟“ اس بار وہ قدرے سختی سے بولا۔

”آج تہوار کا موقع تھا۔ اس لیے میں نے اوپر والوں سے تمہارے لیے خاص آ گیا لی اور اپنے ہاتھوں سے بھوجن بنایا ہے۔“ مدھو نے اپنی نظروں سے پیغام دیتے ہوئے کہا۔

”کیسا تہوار؟“

”آج عید ہے مقبول حسین! اس لیے میں نے تمہارے لیے یہ سب کیا ہے۔“ وہ فخریہ انداز میں ایک پلیٹ میں سویاں نکال کر اسے تھماتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی حدت اسے منتقل کرنے لگی۔

مقبول نے ناگواری سے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کیے اور اپنے دل میں اٹھتی ٹیسوں کو دباتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنوں کی یاد اس پر پوری شدت سے حملہ آور ہوئی۔ والدہ، بہن بھائیوں اور پھر عید کے بعد نصیراں سے جڑنے والے نئے رشتے کے تصور نے یکایک بہت سے زخموں کا بیدھ چاک کر دیا تھا۔ دل پر گرتے آنسو تن بدن کو جھلسانے لگے۔ اسے اس ماحول اور مدھو کی آنکھوں میں پوشیدہ ”دعوت نامے“ سے بری طرح وحشت محسوس ہونے لگی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور مدھو کو ایک جانب دھکیل کر واپسی کے لیے پر تولنے لگا۔

”کیوں مقبول حسین...... یہ سب کیوں؟ کیا میں تمہاری پسند کے کسی معیار پر پوری نہیں اتر سکی؟“ اس نے چوہے بلی کا یہ کھیل ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”آپ نے میرے بارے میں ہر اندازہ ہی غلط لگایا ہے میڈم! میں ایک مسلمان ہوں جس کے لیے نامحرم عورت سے تعلقات کا تصور ہی بہت بڑا گناہ ہے۔“

”کیا کیول یہی وجہ ہے؟ تم مجھے اتنی آسانی سے کیسے ٹھکرا سکتے ہو؟“ وہ احساس ذلت سے بے حال ہو رہی تھی۔

”ہمیں دشمن کی عورتوں کی بھی عزت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ میں کسی بھی ذاتی مفاد کے لیے عورت کو سیڑھی نہیں بنا سکتا۔ ہم عورتوں کا احترام کرتے ہیں۔ انہیں کھلونا نہیں سمجھتے۔“ وہ نپے تلے مگر مضبوط لہجے میں کہتا اسے سناٹوں کی زد میں چھوڑ کر باہر موجود فوجی اہلکار سے کہنے لگا۔

”چلو! میڈم نے ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔“

☆......☆

کوٹھری میں واپسی کے بعد مقبول حسین کے لیے انہی

معمولات کا آغاز ہو گیا۔

بھارتی افسران کی سفاکی کسی طور ختم ہونے میں نہ آ رہی تھی۔ وہ کوٹھری میں شکاری کتے آزاد چھوڑ دیتے جو لمحوں میں اس کی پنڈلیاں چبا ڈالتے۔ فوجی راز جاننے کی ضد اب پاکستان اور پاکستانی فوج کو مغلظات بکنے میں ڈھل گئی۔ مقبول حسین کی زبان سے دین و وطن کے بارے میں کلمات ان کے لیے ناقابل برداشت ہونے لگے۔ ادھر مقبول کے جذبات بھی تاحال جوان تھے۔ اس نے اپنے زخموں سے رستے ہوئے خون سے کوٹھری کی دیواروں پر ہر طرف ایک ہی نعرہ لکھ دیا...... ”پاکستان زندہ باد......“

صید و صیاد کا یہ کھیل ہر گزرتے دن کے ساتھ خونخوار ہوتا جا رہا تھا۔ اسی دوران مدھو کی جانب سے اسے ایک بار پھر طلب کر لیا گیا۔ مقبول لاشعوری طور پر اس کی جانب سے کسی بھی انتقامی کارروائی کے لیے تیار ہو چکا تھا لہٰذا بے خوفی سے چیتا سنگھ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس کے تمام تر اندازوں کے برعکس ایک نئی حیرت اس کی منتظر تھی۔ کرنل کھنہ کی بیوی اسے کال کوٹھری سے فرار ہونے کی تجویز دے رہی تھی۔

”یہ ناممکن بات ہے میڈم! ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“

”میں تمہاری خودداری اور غیرت کی بہت عزت کرتی ہوں مقبول حسین! ناری کے لیے تمہارے وچار سن کر مجھے پہلی بار اپنا وجود معتبر محسوس ہوا۔ تم نہیں جانتے کہ اس دیش میں ناری کی حیثیت کسی کھلونے سے زیادہ نہیں ہے۔ تمہاری صورت میں پہلی بار ایسا پُرش دیکھا ہے جو ناری کی عزت کا رکھوالا ہے، راکھشس نہیں۔ تم چاہتے تو یہاں سے فرار کے لیے مجھے استعمال کر لیتے لیکن تم نے ایسا نہ کر کے میرا دل جیت لیا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب اپنی آزادی کے لیے کسی جائز سہارا لینے سے منع نہیں کرتا۔“

”لیکن یہ سب ممکن کیسے ہوگا؟“ مقبول کے تن میں آزادی کے تصور نے ایک نئی روح پھونک دی۔

مدھو نے اسے ایک کٹر تھمایا اور چیتا سنگھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

”چیتا سنگھ خوب جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے...... ہے نا چیتا سنگھ!“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میڈم۔ ان جیسے دلیر اور حق دار جی کو یہاں انا اور ضد کی بھینٹ نہیں چڑھنا چاہیے۔ آپ چنتا نہ کریں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔“ اس نے آہنی عزم سے جواب دیا۔

اور پھر سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق ہوتا چلا گیا۔ اس رات چیتا سنگھ نے اپنے ساتھی اہلکاروں کو جی بھر کر شراب پلائی۔ شراب کی بوتل میں نشہ آور گولیاں وہ پہلے ہی ملا چکا تھا۔ حسب توقع رام لعل اور سنہا جلد ہی انٹا غفیل ہو گئے۔ رام لعل کی جیب سے کوٹھری کی چابیاں برآمد کر کے اس نے قیدخانے کا دروازہ کھول دیا۔ مقبول حسین اس امداد غیبی پر اب تک حیران تھا۔

”یہاں سے نکلنے کے بعد پچھواڑے کی جانب پہاڑی کی اور سفر شروع کر دینا۔ پہاڑی کی دوسری طرف ٹرین چلتی ہے۔ وہاں تک پہنچ گئے تو آگے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ چیتا سنگھ نے اسے بتایا۔

”بہت شکریہ چیتا سنگھ! مجھے بس یہ خدشہ ہے کہ کہیں یہ بھیڑیے بعد میں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔“ وہ خلوص سے بولا۔

”میرے ساتھ ہر روز جو کچھ ہوتا ہے، جس طرح میری دیش بھگتی اور دھرم کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں اس سے بڑھ کر اور کیا کر لیں گے یہ؟ تم بس ایک کرپا کرنا۔ جب اپنے دیش کی ٹھنڈی فضاؤں میں لوٹ جاؤ تو ”حسن ابدال“ جا کر میری حاضری لگوا کر کہنا کہ ہم لوگوں نے بٹوارے کے وقت ہندو لومڑیوں پر وشواس کر کے بڑی غلطی کی۔ ہمارے لیے ایک چمتکار کریں کہ یہ غلطی آنے والی نسلوں کے لیے مہنگی ثابت نہ ہو۔“ چیتا سنگھ آبدیدہ ہو گیا۔ مقبول حسین گرمجوشی سے اس سے معانقہ کرتا ہوا کوٹھری سے نکل گیا۔ اس کے پاس مدھو کا دیا ہوا کٹر موجود تھا جس کی مدد سے خاردار تاریں کاٹ کر وہ پیٹ کے بل رینگتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔ ممکنہ آزادی کے تصور سے ہی اس کے اعصاب میں برق دوڑ گئی تھی۔ بیرونی جانب تعینات پہریدار اپنی غفلت کے باعث اس کے لیے بہت آسان شکار ثابت ہوئے۔ ناتوانی کے باوجود وہ ہانپتا، لڑکھڑاتا چیتا سنگھ کے سمجھائے ہوئے نقشے کے مطابق سفر کرتا رہا۔ اسے امید تھی کہ کسی کے علم میں آنے سے قبل وہ اس علاقے سے فرار ہو چکا ہوگا لیکن تقدیر کو ابھی بہت سی آزمائشیں مقصود تھیں۔

فرار کے اس بظاہر فول پروف پلان پر ایک اہلکار کی بے وقت آمد، بے ہوش اہلکاروں اور مقبول کی کوٹھری کا غیر مقفل دروازہ دیکھ کر شور وغل نے مکمل پانی پھیر دیا۔ مقبول حسین کا غیاب ایک طوفان کی نوید ثابت ہوا۔ ڈیوٹی پر موجود اہلکاروں کی غفلت اور کٹی ہوئی تاروں کے پاس گرے ہوئے کٹر نے

کرنل کھنہ کے تن بدن میں آگ لگادی۔وہ اس کٹر سے بخوبی واقف تھا۔ابھی چندروز قبل ہی تو ایک خانگی جھگڑے میں مدھو نے یہی کٹر اسے تھماتے ہوئے گھر میں ٹوٹے فرنیچر کی مرمت کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے اس کی ''کمزوری'' پر بھرپور کچوکے لگائے تھے۔مدھو پر شک اور غصہ طیش میں ڈھل گیا۔اگلی صبح اسے ''آرمی انٹیلی جنس'' کے حوالے کرنے کے بعد وہ سہولت کار چیتا سنگھ کی نشاندہی بھی کرچکا تھا۔

اپنے مجرموں کو قرار واقعی ''سزا'' دینے کے بعد اس نے تمام تر اہلکار مقبول حسین کے تعاقب میں روانہ کردیے۔کرنل کھنہ کو علم تھا کہ یہاں سے فرار کے لیے ''شانتی نگر'' کے زمینی راستے کے علاوہ ٹرین ہی محفوظ رستہ ہے۔زخمی کٹے پھٹے وجود اور چیتھڑوں کی صورت میں کپڑوں میں ملبوس مقبول حسین شانتی نگر کے باسیوں کی نظر میں آنے کی غلطی ہرگز نہیں کرسکتا تھا۔اس کے خیر خواہوں نے لازماً اسے ریلوے اسٹیشن کی راہ ہی دکھائی ہوگی۔اس کے اندازوں کے عین مطابق مقبول کو اس دوپہر سے قبل ہی ایک مال بردار ٹرین سے گرفتار کرکے واپس اسی کوٹھری میں لا پھینکا گیا۔

☆......☆

منظر ایک بار پھر اسی عقوبت خانے کا تھا۔

بھارتی فوجی چوٹ کھائے ہوئے ناگ کی طرح تلملاتے ہوئے مقبول حسین کے وجود کو بری طرح تختۂ مشق بنائے ہوئے تھے۔ایک 'پلاس' کی مدد سے اس کے پاؤں کے ناخن اکھاڑ دیے گئے۔تھوڑی ہی دیر بعد کرنل کھنہ بھی وہیں چلا آیا۔مقبول کے لہو اگلتے وجود کو دیکھ کر اس کے دل و دماغ میں سکون بخش لہریں ہلکورے لینے لگیں۔اس شخص کی بدولت کرنل کی حسین اور باوفا بیوی نے بے وفائی اور بغاوت کی جرأت کی تھی۔مدھو کو اپنی اس غداری پر رتی بھر ملال نہیں تھا۔وہ بہانگ دہل مقبول حسین کی شخصی اور پیشہ وارانہ خوبیوں کے گن گا رہی تھی۔کرنل کی نفرت اور طیش کی کوئی حد ہی نہ تھی۔وہ اسے نشانِ عبرت بنا دینا چاہتا تھا۔

''ایک بات تو ماننی پڑے گی مقبول حسین! تجھ جیسا ڈھیٹ انسان میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔'' اس کی آنکھوں سے شرارے لپک رہے تھے۔اذیت و کرب کے بحر میں غوطہ زن مقبول کے چہرے پر بے ساختہ فخریہ مسکراہٹ اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو گہر بن کر چھلک اٹھے۔بدترین دشمن کے منہ سے ان الفاظ نے اس کے سفر کو کامیاب ٹھہرا دیا تھا۔

''ایک بات تو بتاؤ مقبول حسین!'' کرنل نے بظاہر بہت ٹھنڈے لہجے میں کہا۔''وہ کون سی بوٹی ہے جو تم مسلوں کو کھلا پلا کر یوں ڈھیٹ اور بے حس بنایا جاتا ہے۔''

''تم کبھی نہیں سمجھ سکو گے کرنل! کبھی بھی نہیں۔'' مقبول کی لہو رنگ مسکراہٹ اس کے چہرے کو عجیب چمک عطا کررہی تھی۔

''آج میرے پاس بہت سے ہے۔تم سمجھاؤ گے تو میں سمجھ جاؤں گا۔'' اس کی حرکات و سکنات سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ نشے نے اس کا دماغ مکمل طور پر جکڑ رکھا ہے۔بظاہر پُرسکون حرکات کے پس منظر میں نفرت کی کھولتی ہوئی تپش اور آتش انتقام وہاں موجود سب اہلکاروں کا پتا پانی کررہی تھی۔

''یہ ایمان کی دولت ہے کرنل! میرے وطن کا ہر ایک بچہ اس دولت سے مالا مال ہے۔ہم میں سے ہر ایک وارث ہے۔ ان روایات کا وارث جو ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں سکھائی ہیں۔وہ پیٹ پر پتھر باندھ کر خندق کھودتے اور دشمنوں کا استقامت سے سامنا کیا کرتے۔ہم ان کے ساتھیوں کے اعلیٰ کردار کے ''وارث'' ہیں۔وہ ساتھی جو میدان جنگ میں سیکڑوں زخم اپنے جسم پر کھانے کے بعد شہادت کی آرزو لیے جواں مردی سے لڑتے اور بستر مرگ پر شہادت نہ پاسکنے پر ملول رہتے۔ہم حسین ابن علیؓ کے پاؤں کی دھول ہیں جو حق کی سربلندی کے لیے سجدے میں گردن کٹا کر جنت کے جوانوں کے سردار قرار پائے۔تم اور تمہارا ظلم و ستم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ہم وارث ہیں اور وراثت منتقل کرنے کے لیے ہر لحظہ شہادت سے بغلگیر ہونے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ہماری قوت ہے۔نعرۂ تکبیر......اللہ اکبر......پاکستان زندہ باد......''

اس کی زبان سے ادا ہونے والا ہر ایک لفظ کوڑے کی طرح کرنل کھنہ کے وجود پر برس رہا تھا۔طیش و غضب سے اس کا چہرہ انتہائی سیاہ ہوگیا۔

''میں تمہیں آج' ابھی اور اسی وقت آزاد کرنے کے لیے تیار ہوں۔بس تم ایک بار اپنی زبان سے بولو......پاکستان مردہ باد......جے ہند۔'' کرنل نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پاکستان تحفہ خداوندی ہے۔وہ تجھ جیسے ملعون کی خواہش سے کبھی بھی مردہ باد نہیں ہوسکتا۔میرے جسم کا ایک ایک ریشہ ادھیڑ دو......خون کا ہر ایک قطرہ پکارے گا......پاکستان زندہ باد......پاکستان زندہ باد......پاکستان زندہ باد......'' وہ جذب کے عالم میں کہتا چلا گیا۔

کرنل کے ہاتھ میں موجود کٹر پر اس کی گرفت سخت ہوگئی۔

''جس زبان سے جے ہند کا نعرہ نہیں لگ سکتا' اسے سلامت رہنے کا بھی کوئی ادھیکار نہیں۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور مقبول کا جبڑا دبوچ کر زبان باہر نکالنے پر مجبور کردیا۔اگلے ہی لمحے کٹر کی تیز رفتار دھار مقبول حسین کی زبان دو ٹکڑے کرچکی تھی۔

اس کے منہ سے خون کسی فوارے کی صورت برآمد ہوا اور عقوبت خانے کا سنگی فرش رنگین کرگیا۔اس غیر انسانی ظلم و اذیت کے بعد وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگیا تھا۔

''اسے ہر صورت میں زندہ رکھنا ہے۔شہادت کی اچھا ہے جس سوگ کو حاصل کرنے کے سپنے یہ جاگتی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اسے سپنا ہی رہنے دینا ہے۔'' وہ اس کے بے ہوش وجود پر نفرت و حقارت سے ٹھوکریں مارتا ہوا کوٹھری سے باہر نکل گیا۔

☆......☆

مقبول حسین کی زندگی سے الفاظ و صوتی آہنگ کا خاتمہ ہوچکا تھا۔انا' ضد اور ہٹ دھرمی کے پیکر ''امن کے پجاریوں'' نے اسے چار ضرب چار کی اس کوٹھری تک محدود کردیا۔شب و روز کا کھیل موسموں کی تبدیلیوں سے گزرتا اپنا سفر طے کرتا رہا لیکن مقبول حسین کے جیون میں رتی بھر تبدیلی پیدا نہ ہوسکی۔پہریداروں کی صورتیں بدل جانے یا جسم پر سردی و گرمی کے احساس کے علاوہ اس کے پاس کچھ بھی نہ بچا تھا۔کھانے کے نام پر صرف اتنا مواد دیا جاتا تھا جس سے جسم و روح کا رشتہ برقرار رہ سکے۔تشدد اور بربریت البتہ روز اوّل کی طرح برقرار تھیں۔برسہا برس غیر انسانی سلوک برداشت کرتے ایک وقت وہ بھی آیا جب مقبول حسین کی ذہنی رو عدم توازن کا شکار ہوگئی۔چار ضرب چار کی اس کوٹھری میں مستقل رہائش نے اس کے جسم کو خمیدہ کردیا۔وہ لیٹ سکتا تھا' نہ ہی سیدھا بیٹھ سکتا تھا۔سر کے بال' داڑھی بے ہنگم طریقے سے بڑھتے رہے' جسم پر میل کی کئی تہیں جم گئیں۔بصارت سورج کی روشنی کا تصور ہی فراموش کربیٹھی اور ذہن مکمل طور پر شعور و سوچ سے محروم ہوگیا۔اس حالت میں رہتے چالیس سال بیت گئے۔کڑیل جوان مقبول کے وجود پر بڑھاپا طاری ہوگیا۔خمیدہ جسم' غیر متوازن ذہنی حالت' نامناسب خوراک کے باعث اس کے وجود سے گوشت نابود ہوتا جارہا تھا۔شعور کی وادی میں کبھی یاد کے جگنو جگمگاتے تو وطن اور اپنوں کی یاد دل میں ایک کسک بن کر تڑپانے لگتی۔

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ سحراب تیرے رخ پر بکھر گئی ہوگی

☆......☆

چالیس برس تشدد کی لہریں برداشت کرتے بند مٹھی سے ریت کے مانند پھسل گئے۔اس کرب و جبر کا تصور ہی محال ہے جو مقبول حسین جیسے جیالے نے اپنے وجود پر تن تنہا برداشت کیے۔یہ کوئی دو چار سال کی بات نہ تھی۔چالیس سالوں میں تو ایک مکمل نسل جوان ہوجایا کرتی ہے لیکن وہ جسم کو خم دیے اس سنگی کوٹھری کے فرش پر زندگی گزارتا رہا۔مقبول کو اب لاشعوری طور پر اس وقت کا انتظار تھا جب ملک الموت اس کی روح قبض کیے اپنے ہمراہ اصل منزل تک لے جاتا۔شعور سے بیگانہ ہونے کے باوجود دل کی گہرائیوں میں اب بھی یہ حسرت پنہاں تھی کہ بعد از مرگ اسے اپنی مٹی' رسومات اور اصل شناخت نصیب ہوسکے۔

اور پھر ایک روز رہائی خود اس کے در پر چلی آئی۔

بوڑھے مقبول حسین کے لیے ''موسموں'' کی پہچان اپنے ناتواں وجود پر محسوس ہونے والی ''شدت'' سے منسلک رہ گئی تھی۔ان دنوں شہر دل میں یادوں کے حبس کا موسم طاری تھا۔عجب بات تو یہ تھی کہ اس کی یادوں میں صرف چنیدہ باتیں ہی سلامت تھیں۔سبز ہلالی پرچم' بارود اور گولیوں کی گھن گرج کے علاوہ وہ ''سوہنی دھرتی'' پردۂ تصور پر جھلک دکھاتی جس کے تقدس کی حفاظت کی قسم اس کے جسم میں لہو بن کر سمائی تھی۔ان دنوں اس ہولناک کوٹھری میں کسی نئے قیدی کو لایا گیا اور اسے ایک ایسی جگہ منتقل کردیا گیا جہاں کچھ نامانوس افراد موجود تھے۔ان کی شکل و صورت اس کے لیے شناسا تو نہیں تھی مگر جانے کیوں انہیں دیکھ کر بے عنوان اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔شعور کی رو بحال ہوتی تو اسے ان کے چہروں اور آنکھوں میں پریشانی سی جھلکتی دکھائی دیتی۔گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ماہی

گیری کے پیشے سے وابستہ ہیں اور کسی غلطی سے اس قفس میں آن پھنسے ہیں۔ یہ کیفیت اس پر وقتی طور پر ہی طاری ہوتی تھی ۔ دوسرے ہی لمحے خود فراموشی ذہن کو ایک بار پھر شکنجے میں جکڑ لیتی۔

اسی دھوپ چھاؤں کے عالم میں ایک روز وہ بھی آیا جب اسے ان ماہی گیروں کے ساتھ ہانک کر ''واہگہ بارڈر'' کی طرف دھکیل دیا گیا۔ شعور کی روشنی ہی کی جانب ہلکی سی جست لگائی تو اپنے سامنے ایک ''سبز ہلالی پرچم'' دیکھ کر اس کے اعصاب بھی سنسنا اٹھے۔ آنکھوں سے بے اختیار سجدے مچلنے لگے۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس وقت کس مقام پر موجود ہے اس کے ساتھ رہا ہونے والے بقیہ افراد کہاں ہیں یا خود اسے کہاں جانا ہے؟ رینجرز کی مخصوص وردیاں، پرچم اور مناظر اسے اپنے وجود میں کسی تشنگی کا احساس دلا رہے تھے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ ذہن کے کسی گوشے میں ایک نام مکمل آب وتاب سے جگمگا کر اسے اپنی منزل کا پتا دے گیا اور وہ اسی جذب و بے سروسامانی کے عالم میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

رستے غیر مانوس تھے لیکن مناظر سے اپنائیت کی خوشبو کا احساس مضبوط تر ہونے لگا تھا۔ راہ گیر اس عجیب الخلقت شخص کو حیرانی سے دیکھتے۔ کئی ایک ازراہ ترحم بھیک میں کچھ روپے تھماتے تو وہ بری طرح بھڑک اٹھتا۔ گویائی ساتھ ہی نہ دیتی تھی کہ وہ انہیں اپنی کہہ سکتا، ان کی سننے کی فرمائش کر سکتا۔ اس معذوری کے باوجود وہ کبھی اشاروں سے اور کبھی بہ زبان تحریر ان سے اپنی مطلوبہ منزل کے نشان پوچھ لیتا۔ مدد کے لیے ملنے والے روپے زادِ راہ میں کام آجاتے تو کبھی یوں بھی ہوتا کہ اس کی خستہ حالت دیکھتے ہوئے کوئی نہ کوئی فرد سواری کی پیشکش کر دیتا۔

کئی روز کے طویل، پر مشقت اور تھکا دینے والے اس سفر کا اختتام ''آزاد کشمیر'' میں ہوا۔ وہی آزاد کشمیر جہاں مقبول حسین نے ایک بہادر فوجی کے گھر جنم لیا تھا اور بہن بھائیوں کے سنگ ایک بھرپور زندگی گزارتے ہوئے پاکستانی فوج کا حصہ بنا۔ وطن کی محبت کے ساتھ نصیراں کی چاہت کی کلی دل میں پھوٹی۔ اس وقت مقبول کے دل و دماغ پر ایک دھند طاری تھی۔ وہ کشاں کشاں ایک عمارت کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی روح میں اٹھتا اضطراب اور تڑپ بہ زبانِ آنسو کہہ رہی تھی کہ اس گھڑی کے لیے اس نے چار دہائیوں تک بھارتی بھیڑیوں کے نرغے میں حیوانیت برداشت کی ہے۔ ان کے تمام ظلم و ستم، ہرزہ سرائی اور غیر انسانی رویے سہتے دل و دماغ کے کسی گوشے میں یہیں آنے کی حسرت تو جینے کی وجہ بنی ہوئی تھی۔

لمحہ بھر کے لیے رک کر مقبول حسین نے اپنے ہیجان پر قابو پایا اور اندر بڑھ گیا۔ آزاد کشمیر رجمنٹ کے کمانڈنٹ کے سامنے پہنچ کر اس کے رگ و پے میں وہی سرشاری امڈ آئی جو چالیس سال قبل اس کے وجود میں ہلکورے لیتی تھی۔ اپنے خمیدہ جسم کو پُروقار انداز میں حتی الامکان تانتے ہوئے اس نے سامنے نظر آتے آفیسر کو سیلیوٹ کیا اور اشارے سے کہنے لگا:

''سپاہی مقبول حسین نمبر 335139 ڈیوٹی پر واپس آگیا ہے۔''

☆......☆

چالیس سال قبل شہید تسلیم کر لیے جانے والے سپاہی مقبول حسین کا نام سن پینسٹھ کی ''شہداء کی یادگار'' پر بھی کندہ کر دیا گیا تھا۔ اس کی آمد کوئی معمولی سانحہ نہیں تھی۔ اس واپسی کی بازگشت بہت جلد ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ اس کی حالت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ کسی قسم کے کڑے تفتیشی مراحل سے گزارا جا سکتا۔ اس کے گروپ کے چند حیات ساتھیوں، چنیدہ بقیدِ حیات رشتے داروں اور خصوصی نفسیاتی علاج کی مدد سے عسکری انتظامیہ نے اس پر گزری قیامت کا احوال جاننے کی سر توڑ کوششیں کیں۔ دورانِ علاج وہ اپنے معالجین کو ٹوٹی پھوٹی تحریر سے کسی نہ کسی واقعے کی اطلاع دیتا اور ایک بار پھر لاشعور کی تاریک راہوں میں کھو جاتا۔ یہ بہت ہی صبر آزما اور تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ اپنے مردِ مجاہد کی یہ حالت ان کے دلوں پر قیامت ڈھا دیتی۔ چار دہائیوں تک ظلم و ستم اور جبر کے سامنے چٹان کی طرح ڈٹے رہنے والے مقبول حسین نے استقامت کی ایک انمول مثال قائم کر دی تھی۔ قومی سطح پر اس کے اعزاز میں ایک خصوصی تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں فوج کے سپہ سالار ''جنرل اشفاق پرویز کیانی'' نے اس دلیر سپاہی کی عظمت اور دلیری کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے بہترین علاج اور نگہداشت کی یقین دہانی کروائی۔

مقبول حسین ایک ''وارث'' تھا اور وارث خواہ جائیداد کا ہو یا روایات کا......اسے ہمیشہ پلکوں پر ہی بٹھا کر رکھا جاتا ہے۔ ہمیں فخر ہے اپنے اس ہیرو پر جس نے ایک نئی تاریخِ حب الوطنی قائم کر کے اہلِ وطن کو آواز دی ہے کہ وطن پرستی ایسے ہوتی ہے۔

کوپرا کا ریچھ

انجم فاروق ساحلی



شکار کسی بھی جانور کا ہو، ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ کتھا معروف شکاری محترم اصغر برلاس کی ہے لیکن یہ قصہ اتنا دلچسپ ہے کہ اسے الفاظ کے موتیوں سے سجا کر سرگزشت کے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا ہی پڑا۔

پاکستان کے معروف شکاری کی دلچسپ روداد

یہ سردیوں کا ذکر ہے۔ میں اسلام آباد میں تھا کہ دلاور کا خط آگیا۔ اس نے مجھے کوپرا آنے کی دعوت دی تھی۔ اس نے خط میں لکھا تھا کہ اس علاقے میں ایک ایسا ریچھ گھس آیا ہے جو انسانوں کو بے دردی سے مار رہا ہے۔ مارنے کے بعد وہ لاش کو اس طرح ادھیڑ دیتا ہے جیسے اسے انسانوں سے انتہا درجے کی نفرت ہے۔

اس نے خط میں لکھا تھا کہ اس ریچھ کو ختم نہ کیا گیا تو بستی ویران ہو جائے گی۔

کافی عرصے سے میں شکار کے لیے نکلا نہ تھا اس لیے فوراً تیار ہو گیا۔

ابھی پہاڑوں پر برف گرنی شروع نہیں ہوئی تھی لیکن دلاور کے خط سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرے کوپرا پہنچنے تک کم از کم تین فٹ برف پڑ چکی ہوگی۔

خط میں جس طرح کا موسم تحریر تھا میرے لیے وہ کوئی نیا نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار برف آلود ماحول، یخ بستہ ہواؤں اور برفانی جھکڑوں کا مقابلہ کر چکا تھا۔ شملہ، کانگڑا، نینی تال تو کئی مرتبہ گیا ہوں مگر آزادی کے بعد اسکردو کے مشرقی و مغربی حصے کے علاوہ گلگت جیسے برف پوش علاقوں میں بھی بہ غرض سرکاری ملازمت طویل مدت تک رہ چکا ہوں اس وجہ سے میں سخت جان بن چکا ہوں۔ حالات کو فتح کرنا ہی میری زندگی ہے۔ اسی میں میری خوشی پنہاں ہے چنانچہ شکار کی دعوت میرے لیے خوشی کی علامت تھی۔

کوہ مری سے تقریباً اسّی میل دور باغ میں میری اور دلاور کی ملاقات طے تھی۔ 25 تاریخ کو مجھے پہنچنا تھا۔ آزاد کشمیر بس سروس تحصیل باغ تک جاتی تھی۔ اس سے آگے عموماً پیدل یا پھر گھوڑوں، خچروں پر جایا جاتا تھا۔ 23 جنوری کی صبح کو میں مری پہنچ گیا۔ تقریباً 11 بجے تک مری کا موسم معمول کے مطابق تھا۔ گو آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، کہیں کہیں دھوپ بھی دکھائی دے رہی تھی، پہاڑوں کی چوٹیاں دھوپ سے چمک رہی تھیں۔ میں جس بس میں سوار تھا اس کا ڈرائیور بڑا ہی سمجھ دار اور ہوشیار تھا لیکن ناسازگار موسم کے آگے اس کا کوئی بس نہ چل سکا۔ کچھ دور جاتے ہی شدید قسم کا موسم بن گیا۔ پہاڑ اور آسمان سیاہ بادلوں سے اٹ گئے تھے۔ بیس گز کی دوری پر کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہ تو کہیں پہاڑ ہیں اور نہ ہی زمین۔ چار سو گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے بس کو آگے لے جانے سے انکار کر دیا۔ چونکہ راستہ خطرناک تھا اس لیے مجبوراً رکنا پڑا۔

بس اڈے پر رات بسر کرنے کے لیے جگہ مل گئی جو آرام دہ بھی تھی مگر نیند نہ آسکی۔ رات بھر کروٹ بدل بدل کر صبح کا انتظار کیا۔ یہ فکر دامن گیر تھی کہ کہیں دلاور انتظار کرنے کے بعد تحصیل باغ سے واپس نہ لوٹ گیا ہو۔ یہاں سے باغ زیادہ دور نہ تھا بس کا اگلا اسٹاپ تحصیل باغ میں تھا۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کے لیے کوئی ذریعہ نہ بن سکا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ دوسرے دن صبح ہی صبح جب ہماری بس تحصیل باغ میں داخل ہوئی تو اڈے والوں سے معلوم ہوا کہ کل ہی وہ ''کافر پہاڑ'' کے لیے نکل گیا ہے۔ موسم خراب ہو رہا تھا اس لیے میرے وہاں پہنچنے کی دلاور کو اُمید نہ تھی۔

بادل شمال مغربی پہاڑوں کی اوٹ سے مسلسل یلغار کرتے بڑھ رہے تھے۔ پھر برف باری سے چند منٹ پہلے کا سماں پیدا ہو گیا۔

اگر یہاں پر بادلوں کے چھٹنے کا مزید انتظار کرتا تو ہو سکتا تھا کہ آج کا دن بھی ضائع ہو جاتا اور دلاور کافر پہاڑ پر بھی نہ ملتا۔ وہاں اسے ایک دن کے لیے رکنا تھا۔ اس کے بعد ہمیں پیر کنٹھی روانہ ہونا تھا۔

پیر کنٹھی وہ جگہ تھی جہاں دلاور محکمہ جنگلات میں پچھلے سال سے مقیم تھا۔ یہاں اس کے رہنے کے لیے ایک بنگلا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ یہ لوگ جنگل میں منگل کرنا خوب جانتے ہیں موسم کے خوفناک تیور دیکھ کر نہ جانے کیوں میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ میں بس کے اڈے میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو کھڑکی کھول کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور دور سیاہ پہاڑوں پر بادلوں کو جھکتے دیکھنے لگا۔ سرد کٹیلی ہوا کے جھونکے بدن میں کپکپی پیدا کرنے لگے۔ برف باری میں آگے بڑھنا نہایت خطرناک بات تھی لیکن یہ دل جو کئی آدم خور شیروں کے شکار سے مضبوط ہو چکا تھا جان جوکھم راستوں پر حوصلہ بلند رکھنے کا عادی تھا۔ کسی طرح بھی یہاں رکنے کے لیے راضی نہ تھا پھر اچانک ہی دلاور کی طرف خیال مڑ گیا، جو پچیس میل کا سفر طے کر کے مجھے لینے کے لیے یہاں تک آیا تھا مگر مایوس ہو کر لوٹ گیا۔ آخر وہ بھی تو سردی اور برفیلی ہواؤں کے صدمے جھیل کر یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ بھی تو انسان ہے۔ بس اس خیال کا ذہن میں آنا تھا کہ میں نے برساتی پہن لی اور گلے میں شکاری رومال لپیٹ لیا اور اللہ کا نام لے کر گھوڑے کو پہاڑی پگڈنڈی پر ڈال دیا۔ بارش زوروں پر تھی پھر بھی رفتار کم نہ ہوئی۔ برساتی سے مینہ کا کافی بچاؤ رہا۔ خلاف توقع بمشکل تین گھنٹے کی مسافت کے بعد کافر پہاڑ پہنچ گیا۔ تحصیل باغ سے یہ جگہ کوئی خاص دور تو نہ تھی مگر راستہ نہایت دشوار گزار تھا۔ کہیں پگڈنڈیاں بھیانک جنگل میں سے ہو کر گزرتی تھیں اور کہیں پہاڑی راستہ تنگ تھا جو نہایت ہی وحشت ناک اور پُرخطر تھا۔ اگر بارش زور کی ہوتی تو میرا زندہ بچنا محال تھا۔ بونداباندی میں چرند پرند کم ہی نظر آتے ہیں۔ کافر پہاڑ سے تین میل ادھر ایک جگہ آتی

ہے۔ وہاں ایک طرف گھنا جنگل ہے اور پگڈنڈی کی دوسری جانب پہاڑیاں گویا کہ میرے بائیں طرف پہاڑی سلسلہ کافر پہاڑ تک بڑھتا چلا گیا ہے۔ وہاں سب سے پہلے ایک مارخور پر نظر پڑی جو مجھ سے کافی دور تھا اور ایک چٹان پر کھڑا نیچے اُگے ہوئے سبزے کو دیکھ رہا تھا۔

وہاں تک پہنچنے کے لیے کسی آسان اور چھوٹے راستے کی تلاش میں تھا۔ میں نے گھوڑا اس پگڈنڈی پر ڈال دیا جو تقریباً ایک سو ستر گز کے فاصلے پر جا کر ٹوٹ گئی تھی۔ اس سے آگے راستہ تنگ اور عمودی ڈھلوان کی شکل میں تقریباً نو ہزار فٹ کی گہرائی میں اتر گیا تھا۔ میری بات دیگر، گھوڑے کو بھی کھڈ میں اترنے سے پسینا آ رہا تھا۔ جس جگہ میں پہنچ گیا تھا وہاں سے بھی مارخور بندوق کی رینج سے باہر تھا۔ وہ بڑے مزے سے وہیں کھڑا رہا۔ اس جگہ ہوا تیز تھی۔ میں مارخور کی کوہان پر لہراتے ہوئے بالوں کا گچھا دیکھ رہا تھا۔ دیر تک وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ مایوسی کے عالم میں میری ایک کمزوری بعض اوقات فائدہ مند ثابت ہوتی۔ وہ کمزوری یہ تھی کہ بغیر مقصد بندوق داغ دینا۔ چنانچہ اس کمزوری نے مجھ سے بندوق چلوا دی۔ میرا خیال تھا کہ مارخور ڈر کر بھاگے گا اور عین ممکن تھا کہ وہ میرے سامنے سے گزرتے ہوئے میری دوسری گولی کا نشانہ بن جائے لیکن وہ ادھر سے نہ گزرا۔

ہوائی فائر کی گونج نے ساری وادی میں طوفان برپا کر دیا تھا۔ میں مڑ کر گھوڑے کے پاس پہنچا۔ میری دائیں طرف کھوہ تھا۔ اس کھوہ سے چار آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں جس کا مجھے پتا نہ تھا کبھی بجلی سی کوندی اور دھپ کی آواز آئی جیسے کوئی کودا ہو۔ بغیر توقف کے انگلی لبلبی پر پڑی۔ گولی نر بھیڑیے کے جبڑے کو چیرتی ہوئی پتھر پر پڑی۔ مادہ بھیڑیا اچھل کر کھوہ سے باہر نکلی تھی کہ میری دوسری گولی نے بروقت اسے موت کی نیند سلا دیا۔ بپھری ہوئی مادہ جو نر بھیڑیے کی موت کا بدلہ لینا چاہتی تھی میرے سامنے پڑے تڑپ رہی تھی۔ اس کی دہشت زدہ آنکھوں سے اب بھی انتقامی شعلے پھوٹ رہے تھے۔ میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت اگر قدرت میرا ساتھ نہ دیتی تو میرا کوپرا کا سفر یہیں پر ختم ہو جاتا۔ ہوائی فائر جنگل میں کرنا بے وقوفی ہی ہوتی ہے۔ سچے شکاریوں کو جنگل کے اندر قطعی ایسی کوئی فضول حرکت نہیں کرنی چاہیے۔

جس وقت میں کافر پہاڑ پر بخیر و عافیت پہنچا تو معلوم ہوا دلاور وہاں سے بھی جا چکا ہے۔ چنانچہ میں بھی اس کے پیچھے پیر کنٹھی کے لیے نکل کھڑا ہوا جو ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ وہاں کے لوگ جنگل میں لکڑیاں کاٹنے کا کام کرتے تھے۔ پہاڑی کے دامن میں ایک ندی تھی جس کی لہریں کوپرا کے جنگل کی لکڑیاں میدانی علاقوں تک بہا لے جانے کا آسان ذریعہ تھیں۔ ندی کے کنارے پر محکمہ جنگلات کا مختصر سا دفتر تھا۔ دفتر کے سامنے میدان میں بے شمار کٹے ہوئے درخت پڑے تھے۔ کوپرا پہاڑ کا بالائی حصہ برف پوش تھا۔ وہاں درخت بہت کم تھے۔ زیریں حصے میں جنگل گھنا تھا۔ یہاں چیڑ اور پڑتل کے اونچے درخت تھے، اس حصے میں برف کم پڑتی تھی۔ شام کا دھندلکا چھانے لگا تھا۔ میں آگے بڑھ رہا تھا کہ میری نظر دلاور پر پڑی۔ شاید یہاں کے فارسٹ آفس میں رکا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ گاؤں کی جانب جانے والی پگڈنڈی پر کھڑا ہو گیا۔ ملاقات کے وقت ہماری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اسی کے ساتھ میں ریسٹ ہاؤس میں آ گیا۔

فارسی کے اشعار بمع ترجمہ اردو

نشانِ مردِ مومن باتو گویم
چوں مرگ آئید تبسم بر لبِ اوست

علامہ اقبال

مرد مومن کی نشانی یہ ہے کہ جب اس کی موت آتی ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔

حیف در چشمِ زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد

افسوس پلک جھپکتے میں دوست کی رفاقت ختم ہو گئی۔ بلبل نے ابھی جی بھر کے پھول کا چہرہ دیکھا بھی نہیں تھا کہ بہار رخصت ہو گئی۔

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
آں کس کہ گناہ نہ کرد چو زیست بگو
من بد کنم، تو بد مکافات دہی
پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

اے خدا! اس جہان میں کون ہے جس نے غلطی یا گناہ نہ کیا ہو جس نے خطا یا گناہ کیا ہی نہیں وہ زندہ کیونکر رہا۔ میں برا ہوں تو اس کا برا بدلہ دے گا۔ پھر مجھ میں اور تجھ میں کیا فرق رہا۔ (عمر خیام کی رباعی)

نجمی رحمن۔ یو ایس اے

رات بھر ہنسی مذاق اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ولاور کا ملازم جو باورچی کا کام کرتا تھا اس کے پاس اپنی بندوق بھی تھی وہ بھی ہمارے ساتھ شکار پر چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس کے علاوہ ایک لکڑ ہارا بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگیا۔ میرے پاس صرف چھ روز باقی تھے۔ انہی چھ روز میں ہمیں اس خونی ریچھ کا کام تمام کرنا تھا۔ چنانچہ دوسری صبح ریچھ کے شکار کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ریچھ آدم خور نہیں ہے لیکن انسان کو ہلاک کرنے کا اسے شوق ہے۔ انسان کو مارنے کے بعد وہ لاش کو پامال کردیتا ہے۔ وہ کافی نڈر ہوگیا ہے۔ اب وہ شکار پر چیتے کی طرح حملہ کرتا ہے۔

ریچھ کا پہلا شکار پیر کنٹھی کی ایک بدنصیب عورت تھی جو نیچے وادی میں اپنے خاوند اور دو مزدور بھائیوں کے لیے سر پر روٹیوں کی چنگیری اٹھائے جارہی تھی۔ ریچھ اچانک پگڈنڈی پر نمودار ہوا اور عورت کی چنگیری پر جھپٹ پڑا۔ میرے خیال میں اس کا حملہ روٹیوں کے لیے تھا۔ دونوں میں اچھی خاصی کشمکش ہوئی تھی۔ جب ریچھ نے لوگوں کا شور سنا تو عورت کو زخمی حالت میں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس عورت کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ پہاڑی عورتیں اپنی حفاظت کے لیے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ ضرور رکھتی ہیں۔ اس نے ریچھ کے دائیں نتھنے پر بھرپور وار کیا تھا لیکن کلہاڑی کا پھل زیادہ گہرائی تک پہنچ نہ سکا تھا پھر بھی ریچھ کی تھوتھنی سے خون کا فوارہ نکلا تھا۔ لوگ خون کے نشانات پر دور تک پیچھا کرتے چلے گئے تھے لیکن کوپرا کے جنگل میں داخل ہونے کے بعد اس کا کچھ نشان نہ مل سکا۔

عورت چند دنوں بعد زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسی۔ اس حادثے کے دو ماہ بعد ہی دوسری مرتبہ وہ ایک ایسے آدمی پر حملہ آور ہوا جو محافظ جنگل تھا۔ یہ واقعہ کوپرا کے زیریں پہلو میں رونما ہوا۔ محافظ جنگل اپنی جھونپڑی میں بیٹھا گانا گا رہا تھا۔ ریچھ اچانک نمودار ہوا اور ادھ کھلے دروازے سے اندر گھس کر محافظ کو نیچے گرا لیا۔ وہ ایسے کشتی لڑتا تھا جیسے کہ مداری کا بھاگا ہوا ریچھ ہو۔ اس نے محافظ جنگل کو اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچ کر دم نکال دیا۔ یہ واقعہ بھی دن کی روشنی میں ہوا۔ محافظ کافی مضبوط اور چوڑے چکلے جسم کا آدمی تھا لیکن ساڑھے چار فٹ لمبے ریچھ کے آگے اس کا زور کچھ کام نہ آیا۔ ریچھ نے محافظ کے جسم کا انگ انگ لہولہان کردیا۔ علاوہ اس کے محافظ کے جسم میں دو جگہوں سے مٹھی بھر گوشت غائب تھا۔ اس کی بائیں بغل کے ذرا نیچے گوشت کے اندر دھنسے ہوئے دانتوں کے نشانات تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ محافظ نے خود کو اس سے چھڑانے کے لیے ریچھ کی گردن یا منہ پر کلہاڑی کا وار کیا تھا۔ اندر اس جگہ سے ظالم ریچھ کے دانت آسانی سے باہر نہ آسکتے تھے کہ سر پر گہرا زخم بھی تھا۔ وہاں سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ یہ زخم کیسے ہوا؟ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

تھوڑے ہی عرصے میں ریچھ کوپرا کے لیے وحشت بن گیا۔ کوپرا کے گرد و نواح میں دس پندرہ میل تک اس کا اتنا رعب اور دبدبہ بیٹھ گیا تھا کہ لوگ اس سے ڈرتے ہوئے شام گھروں میں بند ہو جاتے تھے بلکہ دن کی روشنی میں بھی باہر نکلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ شروع شروع میں دلاور اکیلا ہی ریچھ کے تعاقب میں نکلتا رہا مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ اس بات کا اتنا فائدہ ہوا کہ ریچھ نے اپنی سرگرمیاں چھوڑ دی تھیں۔ اس وقت برف باری کا موسم آچکا تھا۔ ریچھ کی تلاش کا کام آسان تھا۔ سردی کے موسم میں اور برف باری کے ایام میں پیشہ ور شکاری ہی برفانی ریچھ کا شکار کرتے ہیں۔ ہم تو محض انسانی جانوں کی بقا کی خاطر خود کو اس خطرناک مہم میں ڈال رہے تھے۔ پہلے دن ہم نے کوپرا کے جنگل میں جو نشیبی حصہ کہلاتا تھا وہاں دو جگہوں پر گھاس پھونس کی جھونپڑیاں بنوائیں اور ان میں چھپ کر بیٹھے رہے۔ دو آدمیوں کو مختلف درختوں پر چڑھا دیا تاکہ وہ چھپ کر ریچھ کی فوراً اطلاع دیں۔ دو دن تک ہم ایسا ہی کرتے رہے لیکن ریچھ اس طرف نہ آیا، نہ ہی اس کا کچھ نشان ملا۔ تیسرے دن ہم نے اس کی تلاش شروع کردی۔

ہم نے مزید دو دو فل آستین سوئیٹر پہن لیے تھے کیونکہ اس وقت شدید سردی ہڈیوں میں اترتی معلوم ہورہی تھی۔

اب ہم کوپرا کے بالائی حصے کی طرف بڑھنے لگے۔ موسم بدستور خاموش تھا۔ لگاتار تین گھنٹے تک چڑھائی چڑھنے کے بعد ہم کھلے میدان میں پہنچ گئے تھے۔ ہم نے کوپرا کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن ریچھ کا کہیں سراغ نہ مل سکا۔ نہ ہی کہیں اس کے قدموں کے نشانات نظر آئے۔ دوپہر ڈھل گئی تھی۔ ہم تھک ہار کر چٹان کی آڑ میں سرد ہوا سے بچنے کے لیے پناہ گزین ہوگئے تھے۔

اس جگہ ہوا کا دباؤ کم تھا۔ ہم قدرے سکون کے ساتھ چٹان کی آڑ میں کھڑے تھے۔ سورج کی کرنیں بادلوں کے

گھونگھٹ سے جھانکتے ہوئے شرما رہی تھیں۔ گویا نقاب کشائی ایک الجھن بنی ہوئی تھی۔ تند و تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس کی تیز رفتاری کا اندازہ کھلی جگہ پر جا کر کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ آسمان پر بادلوں کی زبردست گڑگڑاہٹ تھی اور فرازِ کوہ سے سینکڑوں من وزنی پتھروں کے لڑھکنے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ہم لوگ سہمے ہوئے تھے۔ برفانی ہواؤں کے چلنے اور ان کے قائم رہنے کا دستور ہم جانتے تھے۔ برفانی جھکڑ جن کا زور شل ہونے کا امکان نہیں تھا یوں چل رہے تھے جیسے ہماری لاشیں برف میں دب کر رہ جائیں گی اور ہماری موت کی خبر پہنچانے والا کوئی نہ ہوگا۔

پونے دو گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر اندھیرا چھٹنے لگا کچھ دیر کے لیے برف گرنا بھی بند ہو چکی تھی۔ ماحول میں زندگی بخش آثار نظر آنے پر ہم واپسی کے لیے مڑے اور بمشکل چند گز گئے ہوں گے کہ ایک جگہ تازہ نشانات نظر آئے جو برفانی ریچھ کے تھے۔ شاید اس نے بھی خود کو ہوا سے محفوظ کرنے کی خاطر یہاں پناہ لی تھی۔

ہم ان نشانات کے تعاقب میں کوپرا کے دامن میں جانے والی راہ پر پہنچ گئے تھے۔ یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ریچھ کے قدموں کے نشانات نے ہماری رہبری کی تھی۔ یہ راستہ کافی مختصر اور آسان بھی تھا۔ ہم نشانات کے تعاقب میں اس جگہ تک پہنچ گئے جہاں پر پیر کنھٹی کو ملانے والی پگڈنڈی سے کچھ فاصلے پر واقع ایک کھڈ تھی۔ کھڈ تقریباً 200 فٹ گہری تھی۔ نشیب میں پتھریلا میدان تھا جہاں پر برف زیادہ نہیں تھی۔ برف کی صرف پتلی سی تہ پتھروں پر جمی ہوئی تھی۔ کھڈ سے باہر نکلنے کے لیے بھی 200 فٹ کا فاصلہ طے کر کے اوپر آنا پڑتا تھا۔ کھڈ میں جھنڈ نما جھاڑیاں تھیں، جو قدِ آدم تھیں، کئی بڑے بڑے دیوہیکل پتھر بھی تھے جو بارش سے پھسل کر نیچے لڑھک آئے تھے۔ راستہ نہایت دشوار گزار اور تاریک تھا۔ کھڈ کے کنارے پہنچتے پہنچتے اندھیرے نے آلیا۔

ریچھ کے پاؤں کے نشانات کھڈ میں جاتے نظر آ رہے تھے۔ شاید وہ بھی آنے والے موسمی خطرے کو بھانپ گیا تھا اور اب وہ یقینی طور پر کھڈ میں پناہ گزیں ہو چکا تھا۔ پیر کنھٹی پہنچنے کے لیے ہمیں اس کھڈ میں سے ہو کر جانا پڑتا تھا کیونکہ یہی ایک راستہ تھا۔ کھڈ شمالاً جنوباً آٹھ دس میل تک پھیلا ہوا تھا، ہمیں کہیں نہ کہیں سے کھڈ کو عبور کرنا تھا۔ اس لیے کیوں نہ اسی جگہ سے کھڈ میں اترا جائے۔ ہم نے آپس میں صلاح و مشورے کیے اور طے پا گیا۔ ہم سب کھڈ میں اترنے لگے۔ بندوق کے ساتھ ٹارچ فٹ کر لی تھی۔ صرف میں نے اپنی ٹارچ کا بٹن دبایا تھا تاکہ راستہ صاف نظر آئے۔ ہماری بندوقوں کی پوزیشن اس وقت وہی تھی جو میدانِ کارزار میں دشمن کا تعاقب کرنے والے سپاہیوں کی ہوتی ہے۔ کھڈ کے وسط میں پہنچ کر راستہ گنجلک ہو گیا تھا اس کے علاوہ تاریک بھی تھا۔ یہاں پہنچ کر دلاور نے بھی ٹارچ کا بٹن کھول دیا تھا۔ روشنی بڑی تگ و دو کے بعد ہم سے چند گز کے فاصلے پر پڑ رہی تھی۔ ہم پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے کہ اچانک برفانی ریچھ جو سفیدی مائل تھا تیزی کے ساتھ ہماری راہ سے ایک طرف ہٹ گیا جیسے کوئی بھوت یا پری ہمارے سامنے سے گزر گئی ہو۔ ریچھ ہمارے بائیں ہاتھ 15 فٹ کے فاصلے پر ایک گھنی جھاڑی کے عقب میں ہو گیا تھا۔ ہم نے اسے چھپتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اب ہم زیادہ محتاط ہو گئے تھے۔

موت اور زندگی کی اس مڈبھیڑ میں فتح کس کی ہوگی۔ یہ کسی کو بھی پتا نہیں تھا اس لیے کہ ریچھ ہم سے بھی زیادہ نڈر اور چالاک و چوبند نظر آتا تھا۔ میں نے اس جگہ پر دلاور اور دوسرے ساتھیوں کو پگڈنڈی کے ساتھ ایک بڑے تکونی پتھر کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جانے کو کہا اور خود اس طرف بھاگا، جہاں پر کہ وہ چھپا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو واضح کر دیا تھا کہ ہم سخت خطرے کے وقت ایک دوسرے کو مدد کے لیے پکاریں گے۔ جب میں اس جھاڑی کے عین عقب میں پہنچ گیا تو وہاں اس کو نہ پا کر میری حیرت سوا ہو گئی۔ میں نے گھبراہٹ میں جلدی سے ٹارچ کا بٹن پش کیا تو وہ نظر آ گیا۔ وہ صرف دو گز کے فاصلے پر چھاتی تانے کھڑا تھا۔ وہ اس وقت جھاڑی کے اندر تنے سے ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ روشنی میں اس کی آنکھوں کی پتلیاں چمک رہی تھیں۔ میں نے موقع دینا مناسب نہ سمجھا اور فائر کر دیا گولی اس کی چھاتی پر لگی وہ دوسری گولی کھانے سے پیشتر ہی جھاڑی سے باہر آ گرا تھا۔ پھر اٹھا حملہ کرنے کی نیت سے مگر میں نے پے در پے فائر کر کے ریچھ کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بھیانک چیخوں اور غراہٹوں کے تڑپنے لگا۔ اس کے جسم سے خون بہہ بہہ کر تالاب کی صورت میں جمع ہونے لگا۔ خون سرکتا ہوا میرے قدموں تک آ گیا اور میرے جوتے تر ہو گئے۔ اسے مردہ دیکھ کر میرے ساتھی تالیاں بجانے لگے۔



فلم نگری



انور فرہاد

پاکستانی فلم نگری میں کیسے کیسے لعل و گہر تھے، کیسے کیسے ہنرمند تھے کہ ان کا تذکرہ نہ کرنا سخت ناانصافی ہوگی، اسی طرح اداکار و اداکارائیں بھی غضب کی تھیں۔ اداکاری کے اوج پر نظر آنے والے یہ فنکار کہیں ذہن سے محو نہ ہو جائیں اس لیے بھی ان کا تذکرہ ضروری ہے۔

فلمی دنیا کی ایک مایہ ناز اداکارہ کا زندگی نامہ

اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ ایک دن میں نے آج کے ایک نوجوان فلم بین سے پوچھا۔ ”نشو کو جانتے ہو؟“

چند لمحہ اس نے سوچا، پھر بولا۔ ”آپ میڈم نشو کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہے ہیں۔“

”ہاں ہاں ان ہی کے بارے میں، کیا جانتے ہو ان کے بارے میں؟“

”وہ......وہ اداکارہ صاحبہ کی امی جان ہیں اور جان ریمبو کی ساسو ماں ہیں اور صاحبہ اور ریمبو کے بچوں کی نانی

اماں ہیں۔"

"ہاں آج وہ نانی اماں بھی ہیں اور دادی اماں بھی لیکن...... لیکن کبھی وہ صرف نشو تھیں۔ نشو کا کیا مطلب ہوتا ہے جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"نشہ سے بھرپور شے۔ جیسے شراب۔"

نوجوان نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔ "میری عمر کے لوگوں نے اسے عین عالم شباب میں دیکھا ہے۔ جب وہ نگاہوں کو خیرہ کر دینے والے حسن اور اپنی مست جوانی سے دیکھنے والوں کے قدم لڑکھڑا دیتی تھی۔ دل کی دھڑکنیں تیز کر دیتی تھی۔ شاید اسے نشو کا نام دینے والوں نے اس کی انہی خصوصیات کی وجہ سے اسے اس نام سے منسوب کیا۔"

"یقین نہیں آتا کہ......" نوجوان نے بے یقینی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میڈم کبھی ایسی تھیں۔"

"ہاں!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "یہی قدرت کا نظام ہے۔ ہر کمالے را زوال، کل جو تھا آج نہیں ہے۔ آج جو ہے کل نہیں ہوگا۔ ایک وقت تھا صبیحہ خانم فلموں کی فرسٹ لیڈی ہوا کرتی تھیں۔ ان کے حسن و شباب کے آگے سب ماند تھیں۔ آج ان کی نواسی فلموں میں کام کر رہی ہے۔ نشو بھی اب نانی دادی بن گئی ہیں مگر ان کا بھی ایک وقت تھا جب وہ حسن و شباب کی ملکہ تھیں۔ نشیلی مخمور آنکھوں والی نشو سحر انگیز ملکوتی حسن کا مرقع تھی۔ وہ جب ہنستی تو اس کے ہنسنے سے اس کے نرم و ملائم گلابی گالوں میں خفیف سے گڑھے پڑ جاتے تھے۔ کھلے گلاب کی مانند چہرے پر مسکراہٹ بکھیرے نشو نے جب فلمی دنیا میں قدم رکھا تو فن کے قدر دانوں نے پیشگوئی کر دی تھی کہ یہ حسین و خوب صورت لڑکی ایک روز تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ پردۂ سیمیں پر فلمی شائقین کے دلوں پر راج کرے گی۔"

نشو کا شمار ان پاکستانی اداکاراؤں میں ہوتا ہے جنہیں قدرت کی طرف سے اچھی آواز کے ساتھ ساتھ اچھی شکل کا عطیہ بھی ملا۔ صاف گلابی رنگت بھرے بھرے ہونٹ، متناسب قد، زاہدوں کو پسینا آ جائے ایسا شباب انگیز سراپا، اس پر سحر زدہ کر دینے والا لہجہ۔ وہ جتنی سحر انگیز ملکوتی حسن و دلکشی کا مرقع تھی اتنی ہی ٹیلنٹڈ اور گہری سوچ والی بھی تھی۔ فلم بین اس کے فن کے عاشق تھے۔ اس نے فلم انڈسٹری میں آمد کے کچھ عرصہ بعد ہی فلم دیکھنے والوں کو اپنا مداح بنا لیا۔

نشو کی انفرادیت صرف اس کی اداکاری ہی نہیں بلکہ اس کا خوب صورت اور پُرکشش چہرہ بھی تھا۔

نشو کون تھی؟ کہاں رہتی تھی؟ سلور اسکرین کی ملکہ کیسے بنی؟ یہ بھی اس کی طرح حسین اور رنگین کہانی ہے۔

نشو کے والدین 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد بھارت کی ایک سکھ ریاست پٹیالہ سے ہجرت کر کے سوہنی کے شہر گجرات میں سکونت پذیر ہو گئے۔ وہیں ناظر حسین قریشی کے گھر 28 اکتوبر 1952ء کو جو منگل کا دن تھا ایک چاندی سی گڑیا نے جنم لیا جس کا نام انہوں نے بلقیس رکھا۔ ناظر حسین قریشی کپڑے کی خرید و فروخت کا کام کرتے تھے۔ ان کے بلقیس سمیت چار بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ جن کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ ان پر تھا۔ انہوں نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر اپنے بچوں کی کفالت کی اور سب بچوں کو لکھایا پڑھایا۔ وہ ایک شریف اور نیک آدمی تھے اور حقوق العباد کو عبادت سمجھ کر ادا کرتے تھے۔

بلقیس ابھی اسکول کی طالبہ ہی تھی کہ وہیں اسے ایک نوجوان سے محبت ہوگئی اور اس نے اس نوجوان سے شادی کا وعدہ بھی کر لیا۔

بلقیس کو بچپن سے ہی اداکاری کا شوق تھا۔ وہ فلمیں دیکھتی اور خوابوں میں خود کو اداکاروں کی جگہ محسوس کرتی جن اداکاراؤں کو وہ فلموں میں دیکھتی ان میں صبیحہ خانم، شمیم آراء، نیر سلطانہ، زیبا، رانی اور شبنم وغیرہ شامل تھیں۔ ان کو دیکھ کر سوچتی کاش میں بھی کبھی ان کی طرح سلور اسکرین پر نظر آؤں۔

چونکہ بلقیس بے حد خوب صورت لڑکی تھی اس لیے اس کی کلاس فیلو اور سہیلیاں اسے ہیروئن کہہ کر چھیڑا کرتی تھیں۔ اس لیے بھی اسے فلموں کی سچ مچ کی ہیروئن بننے کا شوق مہمیز کرتا رہا۔ وہ ایک اچھی اور باصلاحیت طالب علم تھی اس لیے تقریری مقابلوں کے علاوہ اسکول میں ہونے والے اسٹیج ڈراموں اور پروگراموں میں بھی حصہ لیتی تھی۔ اس کی کچھ ہم جولیاں اسے شبنم کہہ کر بھی پکارتی تھیں۔ سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے ایک طرح سے اس کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی تھی کہ وہ فلموں کی ہیروئن بن سکتی ہے۔ شوق کی ماری اس لڑکی نے فلمی ہیروئنوں کے انداز میں بات کرنا اور نت نئے ڈیزائن کے کپڑے پہننا اور ناز نخروں اور اداؤں سے گفتگو کرنا اپنا شیوہ بنا لیا۔

میٹرک کا امتحان دینے کے بعد بلقیس سیر و تفریح کی

غرض سے ایک دن گجرات سے لاہور گئی اور وہاں کئی دنوں تک خوب گھومتی پھرتی رہی۔ اس دوران اخبار میں اس نے ایک اشتہار پڑھا۔

"فلم کے لیے نئے چہروں کی ضرورت ہے۔"

بس پھر کیا تھا۔ بلقیس نے فوراً اپنی ایک خوب صورت تصویر کھنچوائی اور اخبار میں چھپے پتے پر ارسال کر دی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے گھر کا مکمل ایڈریس بھی لکھ دیا۔

ایک دن فلم ساز و ہدایت کار اقبال شہزاد بلقیس کے گھر پہنچ گئے۔ بلقیس کے والد محترم ناظر حسین قریشی نے ان سے کہا۔ "جی فرمائیے! آپ کون ہیں؟ اور کس مقصد سے تشریف لائے ہیں؟"

"جناب! میرا نام اقبال شہزاد ہے۔ میں فلم ساز و ہدایت کار ہوں۔" اتنا کہہ کر اقبال شہزاد نے بلقیس کی تصویر نکال کر انہیں دکھائی۔ "اس لڑکی نے ہماری آنے والی فلم میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے اور اپنا یہ ایڈریس ہمیں بھیجا ہے۔"

"اقبال شہزاد صاحب! میں ایک شریف آدمی ہوں اور اپنی بچی کو فلم میں کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ وہ نادان بچی ہے اس نے اپنی ناسمجھی کی وجہ سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا ہوگا۔"

اقبال شہزاد نے انہیں بڑی شائستگی سے سمجھایا۔ "محترم! ہم لوگ بھی شریف آدمی ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ آپ لوگ جس طرح فلم انڈسٹری کے ماحول اور اس سے وابستہ افراد کے بارے میں سوچتے ہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔" وہ ذرا رک کے پھر بولے۔ "آپ کو معلوم ہوگا محمد علی بھی فلموں میں کام کرتے ہیں۔ وہ ایک امام مسجد کے صاحبزادے ہیں۔ اگر فلمی دنیا گندی جگہ ہوتی تو وہ فلموں میں کیسے کام کر سکتے تھے؟"

غرض کہ فلم ساز و ہدایت کار اقبال شہزاد نے بڑی محبت، بڑی شائستگی اور ادب و احترام کے ساتھ ناظر حسین قریشی کو اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنی بیٹی بلقیس کو ان کی فلم میں کام کرنے کی اجازت دے دیں۔ مگر وہ چٹان کی طرح اپنی بات پر اڑے رہے انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا ادھر بلقیس نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا کھانا پینا چھوڑ دیا بچی کی ضد اتنی بڑھی کہ انہیں نرم پڑنے کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ جب وہ رضامند ہو گئے تبھی اس نے رونا دھونا بند کیا۔

زندگی نامہ

خاندانی نام: بلقیس
فلمی نام: نشو
پیدائش: 28 اکتوبر 1952ء بروز منگل
مقام پیدائش: گجرات
والد: ناظر حسین قریشی
پیشہ: کپڑے کے تاجر
پہلی فلم: بازی، ہدایت کار اقبال شہزاد
آخری فلم: گناہ کا انجام، ہدایت کار سعید علی خان
شادی: تین شادیاں کیں۔ پہلا شوہر انعام درانی، دوسرا شوہر تسلیم فاضلی، تیسرا شوہر جمال۔
اولاد: پہلے شوہر سے ایک بیٹی مدیحہ، جو بعد میں صاحبہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ دوسرے شوہر سے ایک بیٹی عائشہ جو اداکارہ فردوس کی بہو بنی۔ تیسرے شوہر سے ایک بیٹا حمزہ۔

آج کے نئے فلم بینوں کو اقبال شہزاد کے بارے میں اتنا معلوم نہیں ہوگا۔ یہ اقبال شہزاد وہی ہیں جنہوں نے "بدنام" جیسی فلم بنائی تھی۔ وہی بدنام جس کا غریب کوچوان علاؤ الدین اپنی بیوی کے کانوں میں سونے کے جھمکے دیکھ کر غصے سے کہتا ہے۔

کہاں سے آئے یہ جھمکے؟
کون لایا تھا یہ جھمکے؟
کس نے دیئے ہیں یہ جھمکے؟
کیوں دیئے ہیں یہ جھمکے؟

اس فلم کے یہ مکالمے بعد میں ضرب المثل بن گئے۔

اقبال شہزاد نے اس فلم سے پہلے بطور فلم ساز ایک سپرہٹ فلم "بنجارن" بھی بنائی تھی جس کے ہدایت کار حسن طارق تھے۔

اقبال شہزاد کی بیگم عابدہ شہزاد اپوا ویمن کالج کی پرنسپل تھیں۔ اقبال شہزاد نے اپنی اہلیہ سے بلقیس کا تذکرہ کیا تو بیگم صاحبہ نے کہا۔ "اس لڑکی کو میرے حوالے کر دو۔ میں اس کی تربیت کروں گی۔"

یوں عابدہ شہزاد نے بلقیس کی تربیت کی۔ اسے ملبوسات پہننے، میک اپ کرنے، جیولری سلیکٹ کرنے اور

ہلکے پھلکے رقص کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسے چلنے پھرنے اور بات کرنے کے آداب بھی سکھائے اور پھر ایک دن انہوں نے اپنے شوہر اقبال شہزاد کو یہ کہہ کر بلقیس کو ان کے حوالے کر دیا۔

"لیجیے آپ کی فلم کی ہیروئن حاضر ہے۔" اور اقبال شہزاد بلقیس کو دیکھتے ہی رہ گئے۔

بلقیس کا فلمی نام نشاط تجویز کیا گیا اور اسی نام سے اس کا ایک تعارف کراچی کے ہفت روزہ اخبار جہاں کی زینت بنا۔ 27 نومبر 1968ء کے اخبار جہاں میں بلقیس کا تعارف آنسہ نشاط کے نام سے چھپا لیکن بعد میں نشاط کی بجائے نشو کے نام سے اس کی پہلی فلم "بازی" میں اسے پیش کیا گیا۔

یہ تھی سوہنی کے شہر گجرات کی من موہنی حسینہ بلقیس کی کہانی جو سلور اسکرین کی رانی بنی اور نشو کے نام سے جس نے لاکھوں شائقین فلم کے دلوں پر حکمرانی کی۔

نشو کو جب بتایا گیا کہ جس فلم میں اسے ہیروئن کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے اس کا نام "بازی" ہے اور اسے محمد علی اور ندیم کے مقابل کام کرنا ہوگا تو وہ سر سے پیر تک لرز کر رہ گئی۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"سر جی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ایک ننھے سے ممولے کو شاہین سے لڑا رہے ہیں اور شاہین بھی ایک نہیں دو۔ ذرا سوچیے میرا کیا حشر ہوگا؟"

اقبال شہزاد مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ بڑی دلکش تھی۔ انہوں نے اپنی من موہنی ہیروئن کو مخاطب کر کے کہا۔

یہ بازی عشق کی بازی ہے
جو چاہو لگا دو تم اس میں
گر جیت گئے تو کیا کہنا
ہارے بھی تو بازی مات نہیں

نشو نے انہیں اس انداز میں دیکھا جیسے وہ ان کی بات کچھ سمجھی ہے اور کچھ نہیں سمجھی۔ اقبال شہزاد نے اسے اس کیفیت میں دیکھ کر کہا۔ "شاید تمہیں اپنے آپ پر اور اپنے اندر چھپی صلاحیتوں کا علم نہیں۔ تم بے حد ٹیلنٹڈ اور باہمت لڑکی ہو۔ کیا ہوا اگر تمہارے مقابل فلم انڈسٹری کے دو توپ ہیں۔ تم ان کے ساتھ پرفارم کرتے ہوئے یہ سوچنا کہ تم ان سے بڑی توپ ہو۔ بلکہ توپ شکن میزائل ہو۔"

"اچھا!" کہتے ہوئے نشو کے چہرے پر کسی قدر طمانیت نظر آئی۔

"میری ایک بات یاد رکھو۔" اقبال شہزاد بولے۔ "جو ڈر گیا وہ مر گیا۔ مقابلہ چھوٹے سے ہو یا بڑے سے۔ جوانمردی کے ساتھ مقابلہ کرو۔ اس طرح اگر ہار بھی جاؤ گی تو بازی مات نہیں ہوگی۔"

"بازی" نشو کی پہلی فلم تھی جس میں اس نے اس دور کے دو بڑے اداکاروں محمد علی اور ندیم کے مقابل کام کیا اور ایسا جم کر کام کیا کہ سب کو حیران کر دیا۔ ندیم اور محمد علی کے مقابل اسے لیا جانا ہی فلمی حلقوں کے لیے تہلکہ خیز بات تھی لیکن اقبال شہزاد نے نشو کی صلاحیتوں پر بھروسا کیا، بھرپور اعتماد کیا اور ان کو اس کا صلہ فلم کی کامیابی اور نشو کی مقبولیت کی صورت میں ملا اور نشو نے بھی پوری فلم میں کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہ اس کی پہلی فلم ہے۔ اس نے اپنی محنت اور صلاحیتوں سے اپنے آپ کو منوایا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی پہلی ہی فلم میں پاکستان فلم انڈسٹری کے دو بڑے نامور فنکاروں نے اس کے مقابل کام کیا۔

اس فلم کا ہٹ ہونا تھا کہ شہرت کی دیوی نے نشو کا ہاتھ تھام لیا اور ناموری اس کے گھر کی باندی بن گئی۔ یوں بھی نشو ہر زاویے سے بنی بنائی فلم ہیروئن تھی۔

اس فلم میں نشو نے انتہائی خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ فلم "بازی" اپنے وقت کی ایک کامیاب اور سپرہٹ فلم ثابت ہوئی اور یوں اداکارہ نشو پر فلم انڈسٹری کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ 1970ء میں ریلیز ہونے والی فلم بازی محبت کے ٹرائی اینگل پر بنی تھی۔ یوں تو اس انداز کی متعدد فلمیں بن چکی ہیں لیکن بازی ان سب پر بازی لے گئی اور ایک کامیاب اور منفرد فلم ثابت ہوئی۔

اس فلم کی کہانی ہارون پاشا نے لکھی تھی۔ فلم ساز و ہدایت کار اقبال شہزاد اور موسیقار سہیل رعنا تھے جب کہ دیبو بھٹہ چاریہ نے اس فلم کا صرف بیک گراؤنڈ میوزک ترتیب دیا تھا۔ اس فلم کے تقریباً سبھی گانے مشہور ہوئے جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

☆ راتیں تھیں چاندنی جوبن پہ تھی بہار (گلوکار حبیب ولی محمد۔ شاعر واجد قریشی)

☆ آشیاں جل گیا گلستاں لٹ گیا (گلوکار حبیب ولی محمد۔ شاعر راز الہ آبادی)

☆ دنیا کو کیا سمجھائیں کیا جیتے کیا ہار گئے (گلوکار مہدی حسن، شاعر فیاض ہاشمی)

دو دوستوں کے ایثار و قربانی کے جذبے پر مبنی اس فلم کے گانوں نے اپنے وقت میں ریڈیو پاکستان پر دھوم مچا دی تھی۔

نشو، محمد علی، ندیم کے علاوہ اس فلم کی کاسٹ میں ریحان، قوی، عطیہ اشرف، وحیدہ خان اور اطہر شاہ خان (جیدی) شامل تھے۔ اقبال شہزاد کی بھی بطور ہدایت کار یہ پہلی رنگین فلم تھی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بازی کے بارے میں اقبال شہزاد نے پہلے پہل نشو سے کہا تھا کہ تم اس فلم میں محمد علی کی بہن کے طور پر پیش ہوگی مگر جب شوٹنگ کا مرحلہ آیا تو انہوں نے نشو سے کہا۔ "آپ میری اس فلم کی فرسٹ ہیروئن ہیں۔"

یہ سن کر نشو کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔

"بازی" کی کامیابی نے نشو کو صف اوّل کی ہیروئنوں میں لا کھڑا کیا۔ یوں اس کی کامیابیوں کے ایک درخشاں سفر کا آغاز ہو گیا۔ نشو نے اپنی کامیابی کے اس یادگار دور میں بے شمار فلموں کے ذریعے اپنی اعلیٰ کارکردگی کے نقوش گہرے کیے۔

"بازی" کی شوٹنگ ہو رہی تھی کہ اداکار فلم ساز و ہدایت کار رنگیلا نے اس حسن و شباب کی پیکر ہیروئن کو اپنی فلم "رنگیلا" میں کاسٹ کرنے کا ارادہ کیا۔ رنگیلا نے اقبال شہزاد سے درخواست کی کہ "آپ اس لڑکی کو میری فلم میں کام کرنے کی اجازت دے دیں۔"

اقبال شہزاد مجبور ہو گئے اور انہوں نے نشو کو "رنگیلا" میں کام کرنے کی اجازت اس شرط پر دی کہ جب تک میری فلم "بازی" ریلیز نہیں ہو جاتی آپ اپنی فلم ریلیز نہیں کریں گے۔ "کیونکہ نشو کو فلموں میں متعارف کرانے کا کریڈٹ میرا ہے۔"

رنگیلا نے ان کی شرط مان لی اور اس موقع پر ایک باقاعدہ تحریری معاہدہ بھی ہوا۔

رنگیلا پکچرز کی فلم "رنگیلا" نشو کی دوسری فلم تھی۔ رنگیلا اس فلم کے فلم ساز و ہدایت کار تھے جب کہ موسیقی کمال احمد نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم اپنی بہترین کہانی، دل کو چھو لینے والی موسیقی اور بے داغ ہدایت کاری کے سبب بے حد کامیاب رہی اور دو ایوارڈز کی مستحق قرار پائی۔ رنگیلا کو اس فلم کی بہترین کہانی لکھنے پر اور اداکارہ صاعقہ کو بہترین معاون اداکارہ کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس فلم میں نشو نے رنگیلا جیسے کامیڈین کے ساتھ کھل کر اداکاری کی اور کہیں بھی اپنے نئے ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔ اس فلم کے اداکاروں میں نشو، رنگیلا، صاعقہ، عقیل، سلمیٰ، ممتاز، مظہر شاہ اور منور ظریف شامل تھے۔ اس فلم کے کئی گیت زبان زد عام ہوئے جیسے

☆ کس نے توڑا ہے دل حضور کا۔ کس نے ٹھکرایا تیرا پیار (آواز مالا۔ بول خواجہ پرویز)

☆ وے سب توں سوہنیا۔ ہائے وے من موہنیا (آواز تصور خانم۔ بول وارث لدھیانوی)

☆ ہم نے جو دیکھے خواب سہانے (آواز۔ رنگیلا)

دیگر فنی سرگرمیاں

ٹی وی اور اسٹیج پر بھی کام کیا۔ "اپنا چینل" پر وہ ایک طویل عرصے تک مقبول ترین ٹی وی پروگرام "نشو دی چاہ" کامیابی سے پیش کرتی رہیں۔

☆☆☆

نشو کی پنجابی فلمیں

"بازیگر" ہدایت کار سہیل اشرف۔ "یار دیس پنجاب دے" ہدایت کار اقبال کاشمیری۔ "ظالم تے مظلوم" ہدایت کار کے ایچ زاہد۔ "اقرا" ہدایت کار خواجہ سرفراز۔ "بدتمیز" ہدایت کار حیدر چوہدری۔ "اج دیاں کڑیاں" ہدایت کار سید کمال۔ "لکھا" ہدایت کار شفیق احمد۔ "قدرت" ہدایت کار الطاف حسین۔ "بشیراں ان ٹرابل" ہدایت کار جاوید حسن۔ "ظلم دا سورج" ہدایت کار جاوید اقبال۔

☆☆☆

اداکار رشتے دار

نشو کی وجہ سے نشو کے بھائی بہنوں کو بھی فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ نشو کا ایک بھائی خالد نے فلم ضدی میں کام کیا۔ اس فلم میں اس نے یوسف خان کے بچپن کا کردار کیا۔ اسی طرح نشو کی بہن شبو نے بھی کئی فلموں میں اداکاری کی مگر وہ اپنے لیے کوئی جگہ نہ بنا سکی۔ نشو کے اپنے بچوں نے بھی فلموں میں کام کیا جن میں صاحبہ سب سے زیادہ کامیاب رہی مگر حمزہ بطور چائلڈ اسٹار ہی کام کر سکا۔

☆ جھلک دکھلا کے دل لے لیا۔ بجلی گرا کے دل لے لیا
(آواز احمد رشدی۔ بول فیاض ہاشمی)

یہ فلم 18 ستمبر 1970ء کو نمائش پذیر ہوئی اور اس نے باکس آفس پر بڑی کامیابی حاصل کی۔

نشو کی تیسری فلم ''روپ بہروپ'' تھی جو کمال فلمز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔

اس کے فلم ساز اداکار کمال تھے جب کہ ہدایت کار حبیب الرحمٰن اور موسیقار لال محمد اقبال تھے۔ 18 جون 1971ء کو یہ فلم ریلیز ہوئی لیکن خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کرسکی۔ اس کی کاسٹ میں کمال، زمرد، نشو، محمود اور بالم نمایاں کردار تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ فلم بھارتی فلم ''ساون بھادو'' کا چربہ تھی۔

نشو کی فلموں میں مصروفیت جب بہت بڑھ گئی تو وہ اپنے والدین کے ساتھ گجرات سے لاہور آگئی۔ یہاں آکر نشو نے ایک گاڑی بھی خرید لی۔ لاہور شفٹ ہونے کے بعد اس نے اپنے کلاس فیلو انعام درانی سے کیے گئے وعدے کے مطابق شادی کرنے کا ارادہ کرلیا۔ یہ نشو کے عروج کا دور تھا۔ اس کے بہی خواہوں نے اسے اس ارادے سے روکنے کی بڑی کوشش کی۔

''یہ تم کیا کرنے جارہی ہو؟''

''ارے بھئی! شادی کرنے جارہی ہوں جو کوئی جرم نہیں ہے۔''

''نہیں یہ شادی نہیں۔ تم اپنے ابھرتے ہوئے فلمی کیریئر کا گلا گھونٹنے جارہی ہو۔''

''مجھے تو ایسی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔''

''اری پگلی! شادی شدہ اداکاراؤں کی مقبولیت کم ہو جاتی ہے۔ شادی شدہ ہیروئنوں سے شائقین فلم کی دلچسپی کم ہوجاتی ہے۔ وہ ان کی فلمیں بھی کم دیکھتے ہیں۔''

''مجھے تو تمہاری اس دلیل میں وزن نظر نہیں محسوس ہوتا۔ کیا صبیحہ خانم نے سنتوش کمار سے شادی نہیں کی؟ کیا درپن سے نیئر سلطانہ نے شادی نہیں کی ہے؟ کیا شبنم نے روبن گھوش سے شادی نہیں کی؟ کیا زیبا نے محمد علی سے شادی نہیں کی؟ کیا سائرہ بانو نے دلیپ کمار سے شادی نہیں کی؟ کیا مدھو بالا نے......''

''ہاں، کی ضرور کی مگر کب کی؟ جب فلم انڈسٹری میں ان کی ساکھ ان کی بنیاد مضبوط ہوگئی۔ مستحکم ہوگئی۔ وہ اس پوزیشن میں پہنچ گئیں جب وہ فلم والوں کی ضرورت بن گئیں جب کہ تم ابھی فلم انڈسٹری میں ان کے مقابلے میں نئی ہو۔ ابھی تمہیں اپنی ساکھ کو مضبوط سے مضبوط تر کرنا ہے۔''

مگر اس نادان لڑکی پر ویل ویشیرز کے سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے اپنی ضد کے آگے سب کی بات رد کردی اور اپنے بوائے فرینڈ سے کیے ہوئے وعدے کو نبھاتے ہوئے اس سے شادی رچالی۔ البتہ یہ کیا کہ یہ شادی دھوم دھڑکے کے ساتھ نہیں کی۔ بس دونوں جانب کے کچھ عزیز و اقارب کو ساتھ لے کر شادی کی رسم ادا کرلی۔ جس سے یہ شادی فلم انڈسٹری سے باہر مشہور نہ ہو سکی۔ اس طرح اس شادی کا آفٹر ایفکٹ عوام کی جانب سے نہ ہوسکا۔

انعام درانی جتنا خوش قسمت تھا کہ اس کی محبوبہ نے اپنے فلمی کیریئر کو داؤ پر لگا کر اس سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا، اس سے شادی رچالی اور اپنا تن من سب اس پر نچھاور کردیا، اس سے کہیں زیادہ بدبخت تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اپنی قسمت پر ناز کرتا۔ اپنے عروج کی طرف پرواز کرتی ہوئی اداکارہ کے جسم و جان کا مالک بن کر اس کے قیامت خیز حسن وشباب کے بحر بیکراں میں ڈبکیاں لگاتا رہتا۔ مگر وہ بدبخت شادی کے بعد ہی نشو کو مجبور کرنے لگا کہ وہ فلموں میں کام کرنا ترک کردے۔

''کیوں؟ میں فلموں میں کام کرنا کیوں چھوڑ دوں؟''

''اس لیے کہ تم میری بیوی ہو اور میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی ایک کٹھ پتلی، ایک تماشا بن کر لوگوں کی دلبستگی کرے۔''

''یہ بات تو تمہیں شادی کرنے سے پہلے سوچنی چاہیے تھی۔ اگر تمہاری یہ سوچ ہے تو تم ایک اداکارہ سے شادی نہیں کرتے۔''

''میں نے جب تم سے محبت کی تھی اس وقت تم اداکارہ نہیں تھیں۔''

''مگر مائی ڈیئر محبوب! تم سے پہلے سے میں کسی اور سے بھی محبت کرتی تھی اور میری یہ محبت اداکاری تھی۔ میں اس محبت کو اپنی زندگی سے کیسے نکال دوں؟''

''تم میری بیوی ہو نا؟''

''ہاں......ہوں۔''

''تو میں شوہر ہونے کے ناتے یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ میری بیوی مختلف اداکاروں کے ساتھ۔''

''میں تمہاری بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اداکارہ

بھی ہوں مسٹر شوہر! فلموں کی شوٹنگ کے دوران پیار محبت کا سوانگ رچا کر پیشہ وارانہ فریضہ ادا کرنا میری ذمہ داری ہے۔ ضرورت ہے یہ سب کچھ تو میں کروں گی۔ کرتی رہوں گی۔''

یہ بدقسمت شخص کچھ دنوں تک تو اپنی سی کوشش کرتا رہا کہ نشو اس کی بات مان جائے مگر جب ہر طرح سے ناکام ہو گیا تو مایوس ہو کر اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اس کی دنیا سے دور چلا گیا۔ ملک سے باہر چلا گیا۔ بس جاتے وقت اپنی ایک نشانی چھوڑ گیا۔ اپنی ایک بیٹی جس کا نام اس نے بڑے پیار سے مدیحہ رکھا تھا اور کہا تھا میں اپنی بیٹی کو اداکارہ نہیں بنانے دوں گا۔

مگر جب وہی نہیں رہا تو اس کی خواہش پر عمل درآمد کیسے ہوتا۔ یہ بچی اپنی ماں نشو کی گود میں پل بڑھ کر جوان ہوئی تو ماں کی طرح اس نے بھی اداکاری سے اپنا ناتا جوڑا۔ نشو نے مدیحہ کو صاحبہ کے نام سے متعارف کرایا۔

نشو انعام درانی سے محبت کرتی تھی اس لیے اس کے جانے کا اسے افسوس ہوا۔ دکھ ہوا۔ صدمہ ہوا مگر آخر کار اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور سوچا کہ شاید اس کے حق میں یہی بہتر تھا۔ قدرت کو شاید یہی منظور تھا کہ روز روز کی چخ چخ سے وہ بچ جائے اور اپنی اداکارانہ ذمہ داریاں صبر و سکون کے ساتھ نبھاتی رہے۔

محبت ایک فطری جذبہ ہے جو ہر جوان لڑکے لڑکی کے دل میں انگڑائی لیتا ہے۔ صاحبہ کو بھی ایک لڑکے۔ ایک اداکار لڑکے افضل خان سے محبت ہوگئی جو ٹیلی ویژن ڈرامے سے ابھر کر فلم انڈسٹری میں آیا تھا اور جان ریمبو کے نام سے مشہور تھا۔ نشو کو جب بیٹی کی محبت کا پتا چلا تو وہ ولن بن گئی۔

''نہیں تم دونوں کا ملاپ نہیں ہوسکتا۔''

وہ بے چاری بھی کیا کرتی۔ دودھ کا جلا چھاج کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ اس نے بھی محبت کی تھی۔ اس کا انجام کیا ہوا؟ اب وہ اپنی بیٹی کو ایسے کسی تلخ تجربے کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتی تھی مگر پانچوں انگلیاں جس طرح ایک برابر نہیں ہوتیں اسی طرح تمام چاہنے والے انعام درانی کی طرح نہیں ہوتے۔ جب جان ریمبو کو نشو نے ہر طرح سے آزما لیا تو اس کے ساتھ صاحبہ کی شادی کردی۔

بات نکلی تو کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ بات ہو رہی تھی نشو کی فلموں کی۔ 30 جولائی 1971ء کو نشو کی چوتھی فلم

نشو کی اردو فلمیں

''بازی'' 1970ء، ''رنگیلا 1970ء، ''روپ بہروپ'' 1971ء، ''یہ امن'' 1971ء، ''بازار'' 1972ء، ''انگارے'' 1972ء، ''فرض'' 1973ء، ''نادان'' 1973ء، ''آر پار'' 1973ء، ''سہرے کے پھول'' 1973ء، ''ملاقات'' 1973ء، ''دلہن رانی'' 1973ء، ''حال'' 1973ء، ''انسان اور گدھا'' 1973ء، ''کبڑا عاشق'' 1973ء، ''ایک تھی لڑکی'' 1973ء، ''ترا غم رہے سلامت'' 1973ء، ''سماج'' 1974ء، ''مٹی کے پتلے'' 1974ء، ''ٹائیگر گینگ'' 1974ء، ''پردہ نہ اٹھاؤ'' 1974ء، ''نمک حرام'' 1974ء، ''ایماندار'' 1974ء، ''نیلام'' 1974ء، ''پھول میرے گلشن کا'' 1974ء، ''بہشت'' 1974ء، ''معاشرہ'' 1975ء، ''شکوہ'' 1975ء، ''گمراہ'' 1975ء، ''پروفیسر'' 1975ء، ''بکھرے موتی'' 1975ء، ''نیکی بدی'' 1975ء، ''صورت اور سیرت'' 1975ء، ''حیوان'' 1975ء، ''روشنی'' 1975ء، ''نیک پروین'' 1975ء، ''زبیدہ'' 1976ء، ''راستے کا پتھر'' 1976ء، ''آج اور کل'' 1976ء، سوسائٹی گرل'' 1976ء، ''دھڑکن'' 1976ء، ''آمنا سامنا'' 1977ء، ''گورا کالا'' 1977ء، ''دل کے داغ'' 1978ء، ''آپی'' 1978ء، ''احتجاج'' 1978ء، ''محمد بن قاسم'' 1979ء، ''ہنستے آنسو'' 1980ء، ''پیاری'' 1980ء، ''تانگے والی 1981ء، ''ایجنٹ 009'' 1982ء، ''سہارے'' 1982ء، ''سیاست'' 1986ء، ''طوفان اور زندگی'' 1986ء، ''نازک رشتے'' 1987ء، ''میری آواز'' 1987ء، ''مسٹر چار سو بیس'' 1992ء، ''خوبصورت شیطان'' 1994ء، ''انوکھا پیار'' 1994ء، ''انجام'' 2008ء، ''گناہ کا انجام'' 2012ء۔

''بازیگر'' ریلیز ہوئی۔ یہ نشو کی پہلی پنجابی فلم تھی جس کے فلم ساز اقبال شہزاد اور ہدایت کار سہیل اشرف تھے۔ موشانا فلمز کے بینر تلے بننے والی اس فلم کی موسیقی آنجہانی دیبو بھٹہ چاریہ نے ترتیب دی تھی۔ دیبو کے کیریئر کی یہ واحد پنجابی فلم تھی۔

''بازیگر'' میں نشو کو اعجاز کے مقابل ہیروئن لیا گیا تھا۔ دیگر کاسٹ میں اقبال حسن، فرزانہ، سلطان راہی، نبیلہ، ستارہ، چنگیزی اور علاؤ الدین شامل تھے۔ اس فلم نے پنجاب میں درمیانے درجے کا بزنس کیا جب کہ کراچی میں یہ فلم نرم گئی۔

''بازیگر'' کے بعد نشو نے پنجابی فلموں میں بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ اسی سال 2 ستمبر 1971ء کو اقبال کاشمیری کی فلم ''یار دیس پنجاب دے'' ریلیز ہوئی یہ نشو کی دوسری پنجابی فلم تھی۔ اس فلم کے فلم ساز علی عباس سید تھے جب کہ موسیقی بابا جی اے چشتی نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے نغمہ نگاروں میں وارث لدھیانوی، عابد شجاع اور جی اے چشتی تھے۔

یہ ایک کامیاب فلم تھی جس کے تقریباً تمام گیت مشہور ہوئے۔ اس کی کاسٹ میں نشو، عالیہ، یوسف خان، نغمہ، سلطان راہی اور اقبال حسن شامل تھے۔

کشمیریوں کی جنگ حریت کے پس منظر اور حقائق و واقعات پر مبنی ریاض شاہد کی تحریر کردہ کہانی پر بنائی گئی فلم ''یہ امن'' نشو کی 1971ء میں ریلیز ہونے والی آخری فلم تھی۔ ریاض شاہد فلمز کی اس ولولہ انگیز فلم کی فلم ساز عابدہ ریاض (نیلو) اور موسیقار اے حمید تھے۔ کشمیر کی خونچکاں داستان پر مشتمل اس سنسنی خیز فلم میں نشو نے آمنہ کا کردار ادا کیا تھا۔ نشو نے نہ صرف اس فلم میں ایک شوخ و چنچل کشمیری لڑکی کا کردار ادا کیا بلکہ وقت آنے پر وہ ایک وطن پرست مجاہدہ کے روپ میں بھی نظر آئی۔ ''یہ امن'' کشمیر پر ہندوستان کے ظلم و ستم کی داستان پر بنی فلم تھی جسے ریاض شاہد نے ''امن'' کے نام سے بنانا شروع کیا تھا لیکن حکومت پاکستان نے اس فلم پر پابندی عائد کر دی۔ بعد میں اس فلم میں کافی رد و بدل کی گئی اور اس کا نام ''یہ امن'' کر دیا گیا۔ یہ پاکستان فلم انڈسٹری کی واحد فلم ہے جو کشمیر جیسے متنازعہ مسئلے پر بنی ہے۔ ریاض شاہد کے علاوہ آج تک کسی اور فلم ساز نے اس مسئلے پر فلم بنانے کی ہمت نہیں کی۔ یوں بھی ریاض شاہد ایک مخصوص طبقہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ معاشرے کی برائیوں کے خلاف انہوں نے درجنوں فلمیں لکھیں۔ فلم یہ امن جو امن کے نام سے بن رہی تھی اس کے بہت سے سین اور مکالموں کو کاٹ دیا گیا۔ جس سے ریاض شاہد کو بہت دکھ پہنچا پھر وہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے۔

نشو جس نے اس فلم میں آمنہ کا کردار ادا کیا تھا۔ اقبال حسن کی بہن اور علاؤ الدین کی بیٹی بنی ہے۔ جو ایک نوجوان رمضانا (اداکار جمیل) سے محبت کرتی ہے وہ اپنے محبوب کو جو اکثر رباب کے تاروں میں الجھا اور حسین نظاروں اور پیار میں کھویا رہتا ہے کو ہندوستان کی ظالم و جابر افواج کے سامنے سر اٹھانے کا حوصلہ دیتی ہے۔ ایک موقع پر نشو اپنے محبوب جمیل کو کہتی ہے۔

''وہ ہاتھ کٹ جائے جو دشمنوں کے خلاف نہ اٹھ سکے۔''

اس فلم میں نشو کی اداکاری قابل دید ہے۔ خصوصاً جب دشمن اس کی زبان کاٹ دیتے ہیں تو پھر وہ ظلم کی داستان پاکستانی مجاہدین کو لکھ کر بیان کرتی ہے۔

اس فلم کے نغمے نامور اور انقلابی شاعر حبیب جالب نے لکھے ہیں جبکہ

''اڑتا ہوا وقت تھام لو ساتھی

نہ ہو جائے شام'' خود ریاض شاہد نے تحریر کیا تھا۔

حبیب جالب کا یہ گیت ظلم رہے اور امن بھی ہو۔ کیا ممکن ہے تم ہی کہو؟ اس فلم کا گویا تھیم سانگ تھا۔ ''یہ امن'' کے بعض سین اور اس میں بولے گئے اکثر مکالمے لاجواب ہیں۔ ریاض شاہد نے اپنے مکالموں سے ہندو فوج کی نام نہاد امن پسندی کے نعروں پر ایسے نشتر چلائے جو ہندوستان کے سیکولرازم کے پردے چاک کر دیتے ہیں۔

اس فلم کے عکاس نبی احمد تھے اور اداکاری کے جوہر دکھانے والوں میں نشو، جمیل، سنگیتا، طالش، شاہد، اقبال حسن، علاؤ الدین، اعجاز اختر، ادیب اور ساقی شامل تھے۔ یہ ایک ایوارڈ یافتہ فلم تھی۔ ریاض شاہد کو بہترین مکالمے لکھنے پر ایوارڈ سے نوازا گیا جب کہ سنگیتا کو بہترین معاون اداکارہ کا، حبیب شاہ کو بہترین آرٹ ڈائریکٹر کا اور اے زیڈ بیگ کو بہترین صدابندی کے نگار ایوارڈز دیے گئے تھے۔

1972ء میں نشو کی جو پہلی فلم ریلیز ہوئی وہ ''بازار'' تھی۔ اس فلم کے فلم ساز اے حمید اور ہدایت کار شباب کیرانوی تھے جب کہ موسیقی ایم اشرف نے ترتیب دی

تھی۔ شباب صاحب نے نشو کو ایک نئے ہیرو عمران کے مدمقابل ہیروئن کاسٹ کیا تھا۔ کہانی اچھی ہونے کے باوجود فلم کامیاب نہ ہو سکی۔ اس فلم کی دیگر کاسٹ میں سنگیتا، عادل، طالش، خانم اور قوی شامل تھے۔ یہ فلم 30 مارچ 1972ء کو ریلیز ہوئی تھی۔

15 ستمبر 1972ء کو نشو کی آٹھویں فلم ''انگارے'' عام نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ اس فلم کے ہدایت کار فرید احمد تھے جب کہ کہانی، مکالمے اور اسکرین پلے تقی مصطفیٰ کے تھے۔ موسیقی اے حمید نے مرتب کی تھی۔ یہ فلم نشو، ندیم، شمیم آرا اور آغا طالش کی بہترین اداکاری کی وجہ سے نہ صرف مقبول ہوئی بلکہ بہترین ہدایت کاری اور عمدہ موسیقی کی وجہ سے ایک شاہکار فلم بھی ثابت ہوئی۔ اس فلم میں نامور شاعر احمد فراز کی غزل جسے مہدی حسن نے گایا تھا آج بھی مقبولیت میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

نشو اس فلم میں ایک کالج گرل ہی نظر آتی ہے، اس کی معصومیت اور بات چیت کا فطری انداز کردار کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔

ہدایت کار فرید احمد نے خالص فلمی انداز کی کہانیوں کو زندگی کی جزئیات سمیت پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرید احمد کی فلمیں آج بھی ایک علیحدہ مقام پر کھڑی نظر آتی ہیں۔ انگارے میں نشو اور ندیم کا رومانس نوجوانی کی محبت کا ایک منفرد زاویہ سامنے لاتا ہے۔ عموماً ہمارے ہاں کی فلموں میں جس قسم کا رومانس دکھانے پر زور دیا جاتا ہے۔ اسے رومانس تو نہیں البتہ سر درد کہا جا سکتا ہے مگر فرید احمد نے ہمیشہ رومانس کو بڑے ہی دل چھو لینے والے انداز میں برتا ہے۔ انگارے میں بھی محبت کوئی سطحی تاثر پیش نہیں کرتی۔ نشو ہلکے پھلکے انداز میں شروع ہونے والے اس کردار کو بعد میں ایک جذباتی کردار بنتا دیکھ کر بھی ہچکچائی نہیں، بلکہ کمال سادگی سے کہانی کے اس موڑ کو بھی اپنی اداکاری میں جذب کر لیتی ہے۔ شمیم آرا جیسی عمدہ پرفارمنس کی موجودگی کے باوجود کہیں بھی اس سے کمتر نظر نہیں آئی۔ فلم کے کئی حصوں میں اس کی اداکاری کی بے ساختگی متاثر کرتی ہے۔ خاص طور پر ابتدائی حصے میں اس کی اور ندیم کی چھیڑ چھاڑ اسکرین پر بہت زیادہ فطری رنگ لیے ہوئے ہے۔

اس فلم کے فلم ساز اسلم چوہدری اور میاں صدیق تھے جب کہ عکاسی کے فرائض افضل چوہدری نے نبھائے۔

5 جنوری 1973ء کو پنجابی زبان کی فلم ''ظالم تے مظلوم'' ریلیز ہوئی۔ یہ نشو کی نویں اور تیسری پنجابی فلم تھی۔ اس کے ہدایت کار کے ایچ زاہد اور موسیقار وجاہت عطرے تھے۔ اس کے نغمات بشیر کھوکھر نے لکھے تھے۔ صرف ایک گیت احمد راہی نے تحریر کیا تھا۔ جسے مالا نے گایا تھا اور جس کے بول تھے۔

گورے رنگ تے دوپٹا سجے

اس کی کاسٹ میں نشو، فردوس، حبیب، صاعقہ اور اقبال حسن شامل تھے۔

شمیم آراء پروڈکشن کے بینر تلے بننے والی فلم ''فرض'' نشو کی ریلیز کے حساب سے دسویں فلم تھی۔ لئیق اختر اس کے ہدایت کار اور ناشاد موسیقار تھے جب کہ شمیم آراء اور محمد عثمان نے مشترکہ طور پر اس فلم کی فلم سازی کی تھی۔ کہانی مسرور انور کی تھی۔ انہوں نے اس کا اسکرین پلے اور مکالمے بھی تحریر کیے تھے۔ اس فلم نے سلور جوبلی کی۔ شمیم آراء، کمال، نشو، ممتاز اور قوی اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ مالا کی آواز میں اس فلم کا یہ گیت ''جان بہار آیا دل کو قرار آیا'' اپنے وقت کا ایک مقبول گیت تھا۔

فلم ''نادان'' نشو کی پہلی ڈائمنڈ جوبلی فلم تھی۔ ہدایت کار اقبال اختر کی یہ فلم نہ صرف کامیاب رہی بلکہ نشو، اقبال اختر اور کراچی فلم انڈسٹری کی بھی پہلی ڈائمنڈ جوبلی فلم قرار پائی۔ ''نادان'' کراچی میں بنی تھی۔ یہ فلم کراچی کے ریوالی سنیما میں ایک سو دو ہفتے مسلسل چلتی رہی۔ اس فلم کے فلم ساز قدیر خان اور موسیقار لال محمد اقبال تھے۔ نشو نے اس فلم میں ندیم کی ہیروئن کا رول ادا کیا تھا۔ اس فلم میں ندیم کی اداکاری اور اس کے مقبول گیتوں نے اس فلم کو نمایاں کامیابی سے ہمکنار کیا۔ اس فلم کا یہ گیت جو ندیم پر ہی پکچرائز ہوا تھا اس دور کا مقبول گیت تھا ''بھولا بھولا میرا نام۔ ہنسنا گانا میرا کام''

اسے احمد رشدی نے گایا تھا جو آج بھی خاصا مقبول ہے۔ اس کے دیگر گیت بھی پسند کیے گئے۔

☆ سیاں اناڑی سے دل لگا بیٹھی
☆ تیری جبیں پہ چودھویں کا چاند جھانک رہا ہے
☆ کہاں گوری چلی ہو بچ بچ کے
نگاہوں سے بچ کے
یہ بھید کھل جائے نہ

اس فلم کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ یہ انڈین فلم ''گوپی'' کا ہو بہو چربہ ہے۔ ندیم والا کردار دلیپ کمار نے ادا کیا تھا اور یہ ان کی شہرہ آفاق فلموں میں شمار ہوتی ہے۔ گوپی جیسی کامیاب فلم کی بے حد کامیاب کاربن کاپی تھی اس لیے اس نے اپنے وقت کی تمام فلموں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کی کاسٹ میں ندیم، نشو، تمنا، نِنّی، عطیہ اشرف، سنتوش رسل، لہری، قوی خان، نرالا، راشد، ایم حسین، رحمان اور سبحانی با یونس شامل تھے۔ مصنف کے خانے میں اداکار رحمان کا نام تھا۔ جب کہ مکالمے دانش دیروی نے لکھے تھے۔ ناوان کے نغمہ نگاروں میں تسلیم فاضلی، دکھی پریم نگری اور صہبا اختر شامل تھے۔ کامیڈی سے بھرپور یہ فلم 23 فروری 1973ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ نشو نے اس فلم میں تمنا کی بیٹی ببلی کا کردار ادا کر کے اسے یادگار بنا دیا تھا۔

مارچ 1973ء کو ہدایت کار اقبال شہزاد کی فلم ''آر پار'' سلور اسکرین کی زینت بنی۔ نشو، شاہد، حسنہ، زرقا، منور سعید، افضال احمد، طلعت صدیقی، شاکر اور ساقی نے اپنی اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ ''آر پار'' کے فلم ساز ریاض گل اور موسیقار ایم اشرف تھے اس فلم کے گیت

رات نشیلی ہے
آگ سینے میں لگی ہے

طاہرہ سید کی آواز میں ریکارڈ ہوا تھا اور حسنہ پر عکسبند کیا گیا تھا۔

اسی طرح
راج دلارے انکھیوں کے تارے
صدقے میں جاؤں تو سو جا

طلعت صدیق پر پکچرائز ہوا تھا جب کہ اس کے بول تسلیم فاضلی کے تھے۔

فلم ''سہرے کے پھول'' 10 مارچ 1973ء کو ریلیز ہوئی۔ یہ ہدایت کار آرا ے راکھن کی بہترین فلموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس فلم میں مہدی حسن کا ایک گیت آج بھی مقبول ہے

آج تک یاد ہے وہ پیار کا منظر مجھ کو
جس کی تصویر نگاہوں میں لیے پھرتا ہوں

اس فلم کی موسیقی ناشاد نے مرتب کی تھی جب کہ کاسٹ میں ندیم، نشو، آسیہ، تمنا، قوی، البیلا، نرالا اور لہری شامل تھے۔ یہ ایک اچھوتی کہانی پر ایک بہترین فلم تھی۔ اس فلم کا ملکہ ترنم کا گایا ہوا یہ گیت بھی بہت مشہور رہا۔ ''ان کا ہی تصور ہے محفل ہو کہ تنہائی''

اس کے بول تسلیم فاضلی نے لکھے تھے۔ اس کے مصنف بھی آرا ے راکھن تھے۔ عکاسی جان محمد کی تھی جب کہ فلم ساز بشیر ناخدا اور جان محمد تھے۔ یہ سلور جوبلی فلم تھی۔

وحید مراد اور نشو کی فلم ''ملاقات'' 20 اپریل 1973ء کو منظر عام پر آئی۔ ملاقات کے فلم ساز شیخ عبدالرشید اور ہدایت کار لئیق اختر جب کہ موسیقار نثار بزمی تھے۔ اس فلم کی کہانی اور مکالمے ذاکر حسین نے لکھے تھے۔ نغمات کلیم عثمانی کے تحریر کردہ تھے۔ عکاس کامران مرزا تھے۔ نشو، وحید مراد، مینا چوہدری، منور سعید، نجمہ محبوب، قوی، افضال احمد اور خالد سلیم موٹا اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ احمد رشدی کا اس فلم کے لیے گایا ہوا یہ نغمہ بہت پسند کیا گیا۔ ''لکھ دیجیے اک پیار کی عرضی میرے نام''

جو نشو اور وحید مراد پر فلمبند ہوا تھا۔

نامور ہدایت کار شوکت حسین رضوی کی فلم ''دلہن رانی'' 24 اگست 1973ء کو ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں نشو کی اداکاری دیدنی تھی۔ ہدایت کاری کا معیار بھی بلند تھا لیکن یہ فلم کامیاب نہ ہو سکی۔ نشو، ناظم، عقیل، رخسانہ، لہری اور صبیحہ خانم کاسٹ میں شامل تھے۔ موسیقی ناشاد کی تھی۔

دلکش نقوش والی اداکارہ نشو کا شمار ہماری فلمی صنعت کی باصلاحیت فنکاراؤں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ اس نے بہت کم فلموں میں کام کیا لیکن جو کام بھی کیا معیاری کیا۔ اس نے ہمیشہ معیار کو ترجیح دی۔ وہ فلم کے ہر بڑے اور مقبول ہیرو کے مقابل جلوہ گر ہوئی۔ جن میں محمد علی، ندیم، وحید مراد، شاہد، کمال، سدھیر، یوسف خان، حبیب اور اعجاز جیسے سینئر اداکار بھی تھے۔

1973ء میں اس کی ریلیز ہونے والی فلموں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر مقبول ہیروئن تھی اور گویا فلموں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی۔

اداکارہ نیلو نے عابدہ ریاض کے نام سے جب اپنے مرحوم شوہر کی نامکمل فلم ''بہشت'' کی فلم سازی کا بیڑہ اٹھایا تو ان کی نظر نشو کے خوب صورت چہرے پر گئی جو اس فلم کی ہیروئن کے طور پر نہایت مناسب تھا۔ اس فلم میں ندیم اور نیر سلطانہ کے مقابل نشو نے بہترین اداکاری کی۔ اس فلم کے خوب صورت گیت آج بھی اپنی مقبولیت کا احساس دلاتے ہیں۔

☆ کیوں پوچھتے ہو، کیا تم سے کہوں۔ میں کس لیے

جیتا ہوں (آواز مہدی حسن۔ بول تنویر نقوی)

☆ نقاب تو اٹھائیے ذرا قریب آئیے (آوازیں احمد رشدی، نسیم بیگم، بول ریاض شاہد)

☆ کل تک جو کہتے تھے اپنا۔ آج وہی بے گانے ہیں (آواز ملکہ ترنم نور جہاں۔ بول ریاض شاہد)

☆ ہے رات، رات بھر کی۔ کاٹیں نہ کیوں خوشی سے (آوازیں مہدی حسن نور جہاں، بول ریاض شاہد)

☆ میں جو شاعر بھی ہوتا ترا سہرا کہتا۔ چاند کو چاند نہ کہتا ترا چہرہ کہتا (آواز مہدی حسن۔ بول ریاض شاہد)

''بہشت'' کی موسیقی اے حمید اور رشید عطرے نے ترتیب دی تھی۔ ریاض شاہد اس فلم کے مصنف اور مکالمہ نگار تھے۔ نغمات ریاض شاہد، تسلیم فاضلی اور تنویر نقوی نے لکھے تھے۔ یہ نشو کی زندگی کی ایک بڑی فلم تھی جس میں اس نے ریحانہ کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کو نیلو نے ہدایت کار حسن طارق سے مکمل کروایا تھا جو بلاشبہ اپنے عہد کے لیجنڈ ہدایت کار تھے۔

اس فلم کا موضوع ساس اور بہو کے نازک رشتے کا تھا۔ اس فلم کی کاسٹ میں ندیم، نشو، صاعقہ، نیر سلطانہ، لہری، اورنگ زیب، زمرد، تمنا، خالد سلیم موٹا، طالش اور افضال احمد شامل تھے۔ یہ فلم 29 نومبر 1974ء کو ریلیز ہوئی اور اپنی عمدہ کہانی، نشو اور ندیم کے علاوہ دیگر فنکاروں کی خوب صورت اداکاری اور بہترین ہدایت کاری کی وجہ سے تماشائیوں کی پسند کا مرکز بنی۔

31 اگست 1973ء میں نشو کی ایک اور فلم ''چال'' ریلیز ہوئی۔ یہ فلم، فلم آرٹس کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ جس کے فلم ساز وحید مراد ہدایت کار افتخار خان مصنف و مکالمہ نگار، ریاض ارشد تھے جب کہ گیت خواجہ پرویز اور مسرور انور نے لکھے تھے۔ اس فلم میں وحید مراد ایک ٹیکسی ڈرائیور اور نشو نے موٹر مکینک لڑکے کا کردار ادا کیا تھا۔ ''چال'' کے عکاس ریاض بخاری اور علی جان تھے جب کہ موسیقی نذیر علی نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے کئی گیت مشہور ہوئے۔ جن میں ایک گیت یہ بھی ہے ''ہم سے نہ بگڑ اے لڑکی۔ اپنوں سے نہ لڑ اے لڑکی'' (آواز احمد رشدی۔ بول مسرور انور)

''چال'' کے ستاروں میں وحید مراد، نشو، شائستہ قیصر، ساقی، حسنہ، ننھا، اعجاز اختر، ناظر چنگیزی، راشد اور ایس ایم سلیم شامل تھے۔

''انسان اور گدھا'' بھی 31 اگست 1973ء کو عام نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اس فلم کے فلم ساز ہدایت کار مصنف اور مکالمہ نگار اداکار رسید کمال تھے جنہوں نے اتنی اچھی اور خوب صورت فلم بنا کر کمال کر دیا تھا۔ نشو نے اس فلم میں نشی کا کردار ادا کیا تھا۔ دیگر آرٹسٹوں میں شکیل، نرالا، کمال، روزینہ، قوی، طارق عزیز، سکندر، حنیف، ریشماں، اسلم پرویز، لاڈلہ، رنگیلا اور افضال احمد شامل تھے۔ اس فلم کے گیت تسلیم فاضلی نے لکھے تھے۔ موسیقی ناشاد نے ترتیب دی تھی اس سبق آموز فلم کے چند گیت یہ ہیں۔

☆ ڈھنگ انسانیت کا سکھا دے اے خدا مجھ کو۔ انسان بنا دے اے خدا مجھ کو (آواز۔ احمد رشدی)

☆ میں تے ماراں گا دولتی سنہارنوں (آواز۔ رنگیلا)

☆ ہیلو ہیلو مسٹر منگو! مجھ سے پیار کرو گے؟ (آواز۔ شاہین)

ہنس مکھ اور خوش گفتار نشو نے اشتہاری فلموں میں بھی کام کیا مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ اپنے کیریئر کا آغاز اشتہارات سے شروع نہیں کیا جس طرح عام طور پر اداکارائیں ماڈل کی صورت میں کمرشل فلموں سے اپنا فنی سفر شروع کرتی ہیں۔ بابرہ شریف جیسی اداکارہ اس کی بہترین مثال ہے۔ نشو نے اپنے عروج کے دور میں اشتہاری فلم میں کام کیا۔ یہ اشتہار کریپ کپڑا کے نام سے چلا تھا اس کے کمرشل میں نشو نے کام کر کے اس کپڑے کی مشہوری میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

نشو کو ادب سے بھی خاصا لگاؤ ہے۔ میر تقی میر، غالب، اقبال، فیض کی شاعری کی دلدادہ ہے۔ خود بھی شعر کہتی ہے اور لکھنو کے ایک مشاعرے میں بطور شاعرہ شرکت بھی کر چکی ہے۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

خاموش مرے لب تھے میں گفتار میں گم تھی
پلکیں نہ جھپکتی تھیں کہ دیدار میں گم تھی

رنگیلا نے کثیر سرمائے سے ''کبڑا عاشق'' نامی فلم بنائی تو نشو کو بطور ہیروئن کاسٹ کیا اور اس سے ڈبل رول ادا کرائے، ایک کردار عاشی کا تھا تو دوسرا انوشی کا۔ یہ اس وقت کی ایک مہنگی فلم تھی۔ اس کے مصنف ہدایت کار ممتاز علی خان تھے۔ جب کہ اس کے مکالمے خورشید اللہ نے تحریر کیے تھے۔ نغمات قتیل شفائی، خواجہ پرویز اور مسرور انور کے تھے۔ موسیقی ایم اشرف نے ترتیب دی تھی۔ عکاس جان محمد تھے۔ اس کے چند گیت یہ ہیں۔

☆ تو حسن کی دیوی ہے۔ میں ہوں تیرا پجاری

(آوازمہدی حسن)

☆ پہلے نین سے نین ملے۔ پھر پیار کا شعلہ بھڑکا (آواز۔مالا)

☆ میرے محبوب کی طرح مجھ پر اے خدا۔تو بھی مہربان ہوجا (آواز۔مسعودرانا)

یہ فلم پہلے ''حسن کی دیوی'' کے نام سے بننا شروع ہوئی تھی جو بعد میں ''کبڑا عاشق'' کے نام سے مکمل کی گئی۔ دراصل مشہور اطالوی فلم ''ہنچ بیک آف نوٹرڈیم'' کو پیشِ نظر رکھ کر اس فلم کی کہانی لکھی گئی تھی۔ ''فلم دیکھنے والوں کو مایوسی ہوئی۔ یہ فلم 28 اکتوبر 1973ء کو عیدالفطر کے دن ریلیز ہوئی۔ یہ ایک اچھی اور خوب صورت فلم تھی مگر بری طرح فلاپ ہوگئی۔ اس فلم میں رنگیلا نے دل کھول کر سرمایہ لگایا تھا اور اس پر محنت بھی بہت کی تھی۔ اس کی کامیابی کا اسے بے حد یقین تھا اس لیے اپنا ذاتی تقسیم کار ادارہ قائم کرکے پورے ملک میں ریلیز کیا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

اس کی کاسٹ میں رنگیلا، نشو، اورنگ زیب، کمال ایرانی، آصف خان، اقبال درانی، امان خان، ساون، رشید ظریف، چکرم، چھم چھم، عمر دراز، زرق، چوہدری امداد، فریدہ عثمانی اور طارق عزیز شامل تھے۔

ایک فلم بنی تھی۔ ''ایک تھی لڑکی'' اس کی خاص بات یہ تھی کہ تین بڑے ہدایت کاروں نے اسے ڈائریکٹ کیا تھا، یہ حسن طارق، شریف نیر اور احتشام تھے۔ نشو نے اس فلم میں ٹائٹل رول کیا تھا اور ٹاپ کے تینوں ہدایت کاروں کی ہدایت کاری سے خوب خوب فائدہ اٹھا کر اپنی اداکاری کا بہترین مظاہرہ کیا تھا۔ یہ فلم 23 نومبر 1973ء کو سینماؤں کی زینت بنی۔ اس کی کاسٹ میں نشو، رانی، شاہد، یوسف خان، ناصرہ، ننھا اور اسلم پرویز شامل تھے۔ اس فلم کا یہ گیت کسی دور میں ریڈیو پاکستان سے بہت بجا کرتا تھا۔

ایک تھی لڑکی بھولی بھالی
روپ کی رانی نام تھا جس کا
ہرنی جیسی آنکھوں والی

اس فلم کے مصنف آغا حسن تھے۔

1973ء کی نشو کی آخری فلم ''ترانغم رہے سلامت'' تھی جو 14 دسمبر کو ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے فلم ساز محمد عاشق بٹ، ہدایت کار ایس سلیمان، مصنف خورشید اللہ، موسیقار ایم اشرف، علی جان تھے۔ یہ فلم نشو کی جاندار اداکاری ایس سلیمان کی عمدہ ہدایت کاری کی وجہ سے پسند کی گئی۔

نشو کی اگلی فلم ''سماج'' تھی جو 11 جنوری 1974ء میں ریلیز کی گئی۔ یہ نشو کی ایک میگا ہٹ کامیاب فلم تھی، اس کے پروڈیوسر ناصر بخاری اور ڈائریکٹر جعفر شاہ بخاری تھے۔ یہ ان ہی کی ایک پرانی فلم ''بھروسا'' کاری میک تھی۔ اس فلم کے مصنف ریاض شاہد مرحوم تھے۔ موسیقی اے حمید نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے تقریباً تمام ہی گیت آج بھی مشہور ہیں۔

چند گیت کے تیور دیکھیے۔

☆ پیار خود جینے کے انداز سکھا دیتا ہے (آواز۔منیر حسین)

☆ کس منہ سے ترا نام لوں دنیا کے سامنے (آواز۔ نورجہاں)

☆ یہ اعجاز ہے حسن آوارگی کا۔ جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے (آواز،مہدی حسن)

☆ چلو کہیں دور یہ سماج چھوڑ دیں۔ دنیا کی رسم و رواج توڑ دیں (آوازیں، مہدی حسن، مالا)

اس فلم کے نغمات حبیب جالب اور ریاض الرحمٰن ساگر نے لکھے تھے۔ اس فلم میں بھی نشو نے ندیم اور محمد علی کے مقابل کام کیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اپنی پہلی فلم ''بازی'' میں بھی نشو نے انہی دونوں فنکاروں کے مدمقابل اداکاری کی تھی۔ وہ فلم بھی کامیاب ہوئی تھی، یہ فلم بھی کامیاب ہوئی۔ اس فلم میں بھی نشو کے ہیرو کا کردار ندیم نے ادا کیا تھا جب کہ محمد علی نشو کے شوہر بنے تھے۔ ندیم کا رول اس فلم میں منفی تھا۔

''سماج'' کی دیگر کاسٹ میں صاعقہ، قوی، ننھا، مسعود اختر، صبیحہ خانم، اسلم پرویز، شاہد، نیر سلطانہ اور بینا چوہدری شامل تھیں۔

واضح رہے کہ جعفر شاہ بخاری کی فلم ''بھروسا'' کی کہانی ریاض شاہد نے لکھی تھی جو 1957ء میں ریلیز ہوئی اور اس نے کامیابی حاصل کی تھی۔ جعفر شاہ بخاری نے 1974ء میں جب بھروسا کاری میک بنایا اور اس کا نام ''سماج'' رکھا تو بھروسا میں جو کردار اداکارہ یاسمین نے ادا کیا تھا وہی کردار نشو نے پرفارم کیا۔ ناقدین کی رائے ہے کہ نشو کی اداکاری کہیں بھی یاسمین سے کم نظر نہیں آئی۔

''مٹی کے پتلے'' نشو کی ریلیز ہونے والی 22 ویں فلم تھی۔ اس فلم کے فلم ساز ندیم اور ہدایت کار ان کے سسر احتشام تھے۔ یہ فلم احتشام کی ایک بنگالی فلم ''مائیر پوتل''

کاری میک یا اردو ورژن ہے۔ اس فلم ''مٹی کے پتلے'' کے موسیقار ایم اشرف اور مصلح الدین تھے۔ عکاسی اے آر ... کی تھی۔ یہ فلم 22 فروری 1974ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے چند گیت درج ذیل ہیں۔

☆ نادان تھے ہم جو آپ کی محفل میں آگئے (گلوکار ... گیت نگار اختر یوسف)

☆ آئی رے پیار کی بیلا آئی رے (آواز مسعود رانا، مالا۔ گیت نگار تسلیم فاضلی)

☆ یہ مٹی کے کھلونے یہ مٹی کے پتلے۔ یہ بھی تو انسان ہیں (گلوکار، اخلاق احمد)

''مٹی کے پتلے'' بہترین سوشل فلم تھی لیکن شاید یہ موضوع لوگوں کو پسند نہیں آیا اس لیے باکس آفس پر یہ ناکام ثابت ہوئی۔

جرمنی کے اشتراک سے بننے والی فلم ''ٹائیگر گینگ'' میں نشو نے بین الاقوامی شہرت کے حامل اداکاروں ٹونی کینڈل اور براڈ ہیرس کے ساتھ کام کیا۔ جو کسی اعزاز سے کم نہیں۔ اس فلم کی کہانی منشیات کے اسمگلروں کے خلاف تھی۔ اس کے ہدایت کار اقبال شہزاد اور موسیقار دیبو بھٹہ چاریہ تھے۔ اس کی کاسٹ میں محمد علی، زیبا، نشو، علی اعجاز، قوی اور جرمنی کے کئی اداکار تھے۔ یہ ایک جاسوسی فلم تھی۔ کسی دوسرے ملک کے اشتراک سے بنائی جانے والی یہ پاکستان کی اولین فلم تھی۔ اس کی تاریخ نمائش 29 مارچ 1974ء تھی۔ اس کے دو گیت ملاحظہ فرمایئے۔

☆ میخانے میں شام ہوتی ہے۔ ہر سو مستی عام ہوتی ہے (آواز، رونا لیلیٰ)

☆ شمشیر برہنہ مانگ غضب ہوتی ہے (آواز، حبیب ولی محمد)

1974ء میں ریلیز ہونے والی نشو کی دیگر فلموں میں ہدایت کار اقبال اختر کی ''پردہ نہ اٹھاؤ'' ہدایت کار ایس اے آفاقی کی ''نمک حرام'' ہدایت کار ایس ٹی زیدی کی ''ایماندار'' ہدایت کار اقبال کاشمیری کی ''نیلام'' ہدایت کار اقبال اختر کی ''پھول میرے گلشن کا'' اور ہدایت کار حسن طارق کی ''بہشت'' شامل تھیں۔

ہدایت کار اقبال اختر کی فلم ''پردہ نہ اٹھاؤ'' مکمل مزاحیہ فلم تھی جس میں رنگیلا نے چار کردار ادا کیے تھے۔ اس فلم کو گولڈن جوبلی کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ یہ انڈین فلم ''ہم ... '' کا چربہ تھی۔ موسیقار ایم اشرف کی دھنوں پر تیار ہونے والے یہ دو گیت بہت پسند کیے گئے تھے۔

☆ دادا جی اپنے بیٹے کو سمجھاؤ
☆ زندگی میں پیار ملتا ہے ایک بار

پھول میرے گلشن کا ایک کامیاب فلم تھی...... فلم ساز بیگم ریاض بخاری، جی کے آفریدی اور میاں فیاض تھے۔ کہانی زاہدہ مسرور نے تحریر کی تھی جب کہ اس کے گیت اور مکالمے مسرور انور نے لکھے تھے۔ عکاسی ریاض بخاری نے کی تھی۔ اس کی کاسٹ میں محمد علی زیبا، نشو، ندیم، وحید مراد، اورنگ زیب، لہری، سائرہ اور ماسٹر خالد (بطور پھول) نیر سلطانہ، عشرت چوہدری، سیما، قوی، جہانگیر، مغل، تمنا، کمال ایرانی، اقبال حسن اور رنگیلا شامل تھے۔

اس فلم میں نشو نے ایک اندھی لڑکی کا کردار بڑی عمدگی سے نبھایا تھا۔ پھول میرے گلشن کا ہر لحاظ سے ایک شاہکار فلم تھی جس کی موسیقی ایم اشرف نے ترتیب دی تھی اس فلم کے چند مقبول گیت

☆ چھیڑ چھاڑ کروں گا (آواز۔احمد رشدی)

☆ جو دیکھے ہیں ہم نے ادھورے سے سپنے (آواز۔مہدی حسن)

☆ تو ہے پھول میرے گلشن کا۔تو ہے چاند میرے آنگن کا (آواز۔مالا)

☆ ڈھولک پر جب تھاپ پڑے گی دھنک دھنک۔ میرے یار زمانہ سنگ ناچے گا (آواز۔ندیم)

☆ تو ہی بتا پگلی پون۔ کس کے لیے جلے میرا من (آواز۔نیرہ نور)

اس کی نمائش 12 جولائی 1974ء میں ہوئی تھی۔

1975ء میں نشو کی دس فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔ ان میں ہدایت کار جعفر شاہ بخاری کی ''معاشرہ'' ہدایت کار ظفر شباب کی ''شکوہ'' ہدایت کار ایس سلیمان کی ''گمراہ'' ہدایت کار رضا میر کی ''پروفیسر'' ہدایت کار قدیر غوری کی ''نیکی بدی'' ہدایت کار اقبال یوسف کی ''صورت اور سیرت'' ہدایت کار خواجہ سرفراز کی ''اتھرا'' (پنجابی) ہدایت کار ایس اے حافظ کی ''حیوان'' ہدایت کار قوی خان کی روشنی اور ہدایت کار ایس ایم یوسف کی فلم ''نیک پروین'' شامل تھیں۔ اسی سال یعنی 1975ء میں ہدایت کار کیفی کی فلم ''بکھرے موتی'' بھی ریلیز ہوئی تھی۔ اتھرا اس سال ریلیز ہونے والی نشو کی واحد پنجابی فلم تھی۔

فلم ''شکوہ'' نشو کی محمد علی کے ساتھ چھٹی فلم تھی۔ شکوہ غلام محی الدین کی ریلیز کے لحاظ سے پہلی فلم تھی۔ شکوہ کے یہ گیت بہت پسند کیے گئے۔

☆ دامن سے لپٹ گیا دیوانہ (آواز۔ مہدی حسن)

☆ کتنے پیارے ہو تم، خوب صورت ہو تم (نغمہ نگار تسلیم فاضلی)

☆ پھولوں پہ بھنورا کیوں ڈولے (آواز ناہید اختر)

ہدایت کار ایس سلیمان کی فلم گمراہ کے فلم ساز واصف شیخ، موسیقار ناشاد، مصنف یونس راہی، عکاس نبی احمد تھے۔ کاسٹ میں محمد علی، ندیم، نشو زیبا، لہری، صبیحہ خانم، نیر سلطانہ، نازلی اور افضال احمد شامل تھے۔ اس فلم کے لیے نیرہ نور کا یہ گانا بے حد مقبول ہوا۔

کچھ لوگ محبت کا صلہ مانگ رہے ہیں۔

روبینہ بدر کی آواز میں یہ گیت بھی پسند کیا گیا۔

کبھی اپنا بنائے کبھی انکھیاں چرائے

''گمراہ'' 4 جولائی 1975ء میں ریلیز ہوئی متذکرہ بالا دونوں گانے تسلیم فاضلی کے تحریر کردہ تھے۔

فلم نیکی بدی نشو کی بلیک اینڈ وائٹ فلم تھی جو باکس آفس پر ناکام ثابت ہوئی۔ اس فلم کا یہ گیت بہت مقبول ہوا

دل میں طوفان چھپائے بیٹھا ہوں
یہ نہ سمجھو کہ مجھ کو پیار نہیں
تم جو آئے ہو میری دنیا میں
اب کسی کا بھی انتظار نہیں
(آواز مہدی حسن)

22 اگست 1975ء کو ریلیز ہونے والی اس فلم کی کاسٹ میں نشو، شاہد، صبیحہ خانم، ادیب، خالد سلیم موٹا اور طالش شامل تھے۔

''صورت اور سیرت'' فلم ساز ادارہ ایم این اے پروڈکشن کی کامیاب تخلیق تھی۔ اس کے فلم ساز مظفر حسین، مشتاق حسین اور محمد نذیر تھے۔ اقبال یوسف ہدایت کار اور ایم اشرف موسیقار تھے۔ کہانی خورشید اللہ نے تحریر کی تھی جب کہ گیت تسلیم فاضلی نے لکھے تھے۔ عکاسی ارشاد احمد کی تھی۔ یہ فلم 17 اکتوبر 1975ء کو عید الفطر کے دن ریلیز ہوئی تھی۔ اس گولڈن جوبلی فلم کے اداکاروں میں سدھیر، محمد علی، وحید مراد، نشو، ممتاز، مصطفیٰ قریشی، نیر سلطانہ، نو روز، فاخرہ، لہری، سکندر، الیاس کاشمیری، حنیف راج ملتانی، بینا داؤد، ایس گل اور جلیل افغانی شامل تھے۔ اس فلم میں نشو نے جلیل افغانی کی بیٹی نائلہ کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ ایک شریف زادی کا کردار تھا۔

''صورت اور سیرت'' کے کچھ مقبول گیت درج ذیل ہیں۔

☆ لیے پھرتی ہوں ہتھیلی پہ دل سجناں۔ کبھی آ کے اکیلے میں مل سجناں (آواز، نور جہاں)

☆ شیشے کی بوتل ہوں ہر دل کی ہلچل ہوں (آواز، ناہید اختر)

☆ بندہ تو گناہ گار ہے، رحمان ہے مولا (آواز۔ مہدی حسن)

☆ میں ہوں بنے خان بھوپالی۔ جب چھیڑوں گا قوالی (آواز۔ احمد رشدی، ناہید اختر)

☆ ہم تم تم ہم اک دوجے کے ہو جائیں۔ اتنی دور چلے جائیں (آواز۔ مہدی حسن)

اس فلم کے تمام گیت تسلیم فاضلی نے لکھے تھے۔

عدنان فلمز کے بینر تلے بننے والی فلم ''روشنی'' کے فلم ساز و ہدایت کار محمد قوی خان تھے۔ موسیقی کمال احمد نے ترتیب دی تھی۔ کہانی اقبال رضوی نے تحریر کی تھی۔ عکاس وقار بخاری تھے۔ اس کی کاسٹ میں نشو، ندیم، ممتاز، لہری، قوی، بدر منیر، حنیف، صبیحہ خانم، ساجن اور ادیب شامل تھے۔ صبیحہ خانم نے اس فلم میں بڑی خالہ کا رول بڑے احسن طریقے سے ادا کیا تھا۔ 14 نومبر 1975ء میں ریلیز ہونے والی اس فلم کے موسیقار کمال احمد نے اس کے گانوں کی بڑی خوب صورت دھنیں ترتیب دی تھیں۔ اس کے چند گیت کے مکھڑے درج ذیل ہیں۔

☆ چھاب تلک سب چھین لی رے موسے نیناں ملائی کے

☆ بڑی خالہ سلام بڑی خالہ سلام

☆ سنا ہے گھنگرو باندھ کر پیار ملتا ہے

اس فلم کے گانے تسلیم فاضلی اور ریاض الرحمان ساغر نے تحریر کیے تھے۔

ہدایت کار ایس ایم یوسف کی گھریلو فلم نیک پروین 5 دسمبر 1975ء میں نمائش پذیر ہوئی، اس کے فلم ساز اقبال بیگ، موسیقار اے حمید تھے۔ کاسٹ میں نشو، محمد علی، سنگیتا، رحمان اور اسلم پرویز شامل تھے۔ یہ ایک سلور جوبلی فلم تھی جس میں نشو نے ٹائٹل رول ادا کیا تھا۔ اس فلم کا یہ گیت دیکھیے۔

لکھ دی ہم نے آج کی شام
آپ کی خاطر آپ کے نام
(آواز ناہید اختر، بول ریاض الرحمٰن ساغر)

سوہنی مہیوال کے دیس گجرات کی بلقیس (نشو) کی 1976ء میں جو فلمیں نمائش پذیر ہوئیں ان میں ہدایت کار اسلم ڈار کی ''زبیدہ'' ہدایت کار ایم اے رشید کی ''راستے کا پتھر'' ہدایت کار ایس سلیمان کی ''آج اور کل'' ہدایت کار محمد چوہدری کی ''بدتمیز'' ہدایت کارہ سنگیتا کی ''سوسائٹی گرل'' ہدایت کار سید کمال کی ''جٹ کڑیاں توں ڈردا'' ہدایت کار سید حفیظ احمد کی فلم ''دھڑکن'' تھیں۔ اس سال نشو کی دو پنجابی فلمیں ''بدتمیز'' اور جٹ کڑیاں توں ڈردا ریلیز ہوئیں۔ باقی پانچ فلمیں قومی زبان کی تھیں۔

عزیز میرٹھی کی لکھی ہوئی کہانی پر ''زبیدہ'' وجود میں آئی۔ اس فلم کے مکالمے بھی عزیز میرٹھی نے لکھے تھے۔ اسلم ڈار اس سلور جوبلی فلم کے فلم ساز و ہدایت کار تھے۔ موسیقی کمال احمد کی تھی۔ نغمات فیاض ہاشمی، ریاض الرحمٰن ساغر اور خلیل شفائی نے تحریر کیے تھے۔ اس کی کاسٹ میں نشو، وحید مراد، اسلم پرویز، بابرہ شریف، رنگیلا، مسرت شاہین، لہری، صبیحہ خانم، تمنا، وردانہ رحمٰن اور نینا شامل تھے۔ سعید ڈار اس کے عکاس تھے۔ یہ فلم 16 جنوری 1976ء کو نمائش پذیر ہوئی۔ اس کے چند گیت ملاحظہ کیجیے۔

☆ ساتھی میرے بن تیرے۔ کیسے بیتے گی عمریا بن تیرے (آواز۔ نور جہاں، بول فیاض ہاشمی)

☆ چہرہ ہے ترا چاند بدن تاج محل ہے

اس فلم میں نشو نے زبیدہ کا ٹائٹل رول ادا کیا تھا جو ایک وفا شعار بیوی کا کردار تھا اور اس میں وہ خوب جچی تھی۔

''راستے کا پتھر'' کے پروڈیوسر اعجاز رشید اور ڈائریکٹر ایم اے رشید تھے۔ موسیقی ناشاد کی تھی۔ کہانی شہباز بخت نے تحریر کی تھی۔ مکالمے اور نغمات مسرور انور نے لکھے تھے۔ یہ ایک خوب صورت اور اچھی فلم تھی مگر کامیابی سے محروم رہی تھی۔ مرحوم سلطان راہی کی یہ ایک یادگار فلم تھی۔ اس کی کاسٹ میں نشو، وحید مراد، روحی بانو، امبر، زرقا، لہری، مسرت چوہدری، قوی، اسلم پرویز اور رنگیلا شامل تھے۔ یہ فلم مارچ 1976ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کا یہ مشہور گیت اخلاق احمد نے گایا تھا جو سلطان راہی پر فلمایا گیا تھا۔

میں ہوں راستے کا پتھر۔ میرا نصیب ٹھوکر

دیگر گیت بھی اچھے تھے۔ جو درج ذیل ہیں۔

☆ پیار کرنا تو اک عبادت ہے (آواز۔ مہدی حسن)

☆ تری جھیل سی گہری آنکھوں کا۔ تری صندل جیسی بانہوں کا (آواز۔ مہدی حسن)

ہدایت کار ایس سلیمان کی فلم ''آج اور کل'' 12 اپریل 1976ء کو نمائش پذیر ہوئی۔ یہ فلم ماضی کی کامیاب فلم پیغام کاری میک تھی جو جہیز کی لعنت پر مبنی تھی۔ اس کے فلم ساز عرفان ملک اور موسیقار خلیل احمد تھے۔ یہ ایک انقلابی انداز کی کہانی پر فلم بنائی گئی تھی۔ اس فلم کے حوالے سے جو سب سے اہم واقعہ رونما ہوا وہ یہ تھا کہ جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو اس نے چند ہی ہفتوں میں سارے ملک میں خواتین کو نہایت سرعت اور شدت سے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ یہ فلم نہ صرف خواتین کی توجہ کا مرکز بنی بلکہ بعض خواتین کی تنظیموں نے اس فلم کے حوالے سے جہیز کے ایشو کو اس طرح اٹھایا کہ حکومت وقت بھی متوجہ ہو گئی۔

اس فلم میں نشو اور شبنم دو سہیلیاں ہیں۔ شبنم بے حد کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور ایک شوقیہ جرنلسٹ ہے جو اخبار میں جہیز اور اس قسم کی سماجی برائیوں کے خلاف لکھتی ہے اور اپنے ہی اسٹیٹس کے ایک شخص غلام محی الدین سے محبت کرتی ہے۔ دوسری طرف اس کی سہیلی نشو کی شادی ایک امیر گھرانے میں طے پا جاتی ہے۔ امیر گھرانے کا سربراہ لہری ہے جو انتہائی کنجوس ہے۔ نشو ایک سفید پوش قوی خان کی بیٹی ہے۔ لہری، قوی خان سے جہیز اور رقم کا مطالبہ کرتا ہے۔ مطالبہ پورا نہ ہونے کی وجہ سے برات واپس لے جاتا ہے۔ راحت کاظمی لہری کا بیٹا ہے وہ چاہتے ہوئے بھی برات کو نہیں روک سکا۔ حالانکہ وہ نشو کو پسند کرتا ہے۔ بعد ازاں شبنم اپنی اس سہیلی (نشو) کا بدلہ لیتی ہے اور شرم کرانے والی خاتون کے ذریعے راحت کاظمی سے اپنا رشتہ کرواتی ہے۔ فلم کے اینڈ میں نشو کا گھر آباد ہو جاتا ہے اور لہری صاحب بھی راہ راست میں آ جاتے ہیں۔

اس ہٹ فلم کا ایک گانا اس دور میں گھر گھر اور گلی گلی میں گونجتا تھا۔

دنیا والو! جہیز کی لعنت آج تو ہے
کیا کل بھی رہے گی؟
باپ کی عزت ماں کی ممتا
آخر کب تک بکتی رہے گی؟
(آواز۔ نور جہاں، بول۔ تسلیم فاضلی)

''آج اور کل'' کے کچھ دیگر گیت بھی دیکھیے۔

☆ پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں
کوئی جدا کرنے نہ پائے
میں بھولوں تو میں مرجاؤں
تو بھولے تو تو مر جائے
(آواز۔مہدی حسن، بول۔تسلیم فاضلی)

☆ تو ملا ہے تو یہ احساس ہوا ہے مجھ کو (آواز۔مہناز)

☆ کون کہتا ہے ملاقات نہیں ہوتی ہے۔ روز ملتے ہیں مگر بات نہیں ہوتی ہے (بول۔تسلیم فاضلی)

ہدایت کار حیدر چوہدری کی پنجابی فلم ''بدتمیز'' کے فلم ساز ایس اے رزاق تھے۔ موسیقی نذیر علی نے ترتیب دی تھی۔ مصنف حزیں قادری اور عکاس نصیر الدین شاہ تھے۔ اس کی کاسٹ میں آسیہ، منور ظریف، نشو، نازلی، نیر سلطانہ، قوی، شاہنواز اور اسلم پرویز شامل تھے۔ اس کے تمام تر نغمات حزیں قادری نے لکھے تھے۔

اسی سال نشو کی دوسری پنجابی فلم ''جٹ کڑیاں توں ڈردا'' ریلیز ہوئی جو کمال فلمز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ یہ سید کمال کی بطور ہدایت کار پہلی پنجابی فلم تھی۔ اس فلم میں نشو، نجمہ اور نیلوان کی ہیروئنز تھیں۔ وجاہت عطرے اس فلم کے موسیقار تھے جب کہ گیت خواجہ پرویز نے لکھے تھے۔ اس فلم نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی تھی جس سے کمال کو اگلی پنجابی فلم بنانے کا حوصلہ ہوا۔

''سوسائٹی گرل'' سنگیتا کی بطور ہدایت کارہ پہلی فلم تھی۔ اسی فلم سے سید نور بطور کہانی نویس فلم انڈسٹری میں متعارف ہوئے۔ 16 اپریل 1976ء کو ریلیز ہونے والی اس فلم کے فلم ساز رضا علی رضوی اور موسیقار نذیر علی تھے۔ سنگیتا، کویتا، نشو، غلام محی الدین، بہار اور قوی اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ سوسائٹی گرل کا یہ گیت جسے نور جہاں نے گایا تھا اور نشو پر فلمایا گیا تھا بہت مشہور ہوا۔

☆ تیرے قدموں میں بکھر جانے کو جی چاہتا ہے۔ آج تو پیار میں مرجانے کو جی چاہتا ہے (بول۔تسلیم فاضلی)

اس فلم کے یہ گیت بھی پسند کیے گئے۔

☆ اک کٹی پتنگ ہوتی ہے سوسائٹی گرل (بول۔تسلیم فاضلی)

☆ انداز وہی اپنایا ہے ترے دل کو پسند جو آجائے
(آواز ناہید اختر، بول تسلیم فاضلی کویتا پر عکس بند ہوا)

1977ء میں نشو کی جو فلمیں ریلیز ہوئیں ان میں ہدایت کار جان محمد کی ''آمنا سامنا'' ہدایت کار رفیق علی راکھن کی ''گورا کالا'' اور ہدایت کار سید کمال کی پنجابی فلم ''اج دیاں کڑیاں'' شامل تھیں۔

1978ء میں نشو کی جو فلمیں منظر عام پر آئیں ان میں ہدایت کار رضا میر کی ''دل کے داغ'' ہدایت کار ایم اے رشید کی ''آدمی'' ہدایت کار فاروق خان کی احتجاج اور ہدایت کار شفیق احمد کی سینما اسکوپ پنجابی فلم ''لکھا'' شامل تھیں۔ رضا میر کی فلم ''دل کے داغ'' کے یہ گیت بہت پسند کیے گئے۔

☆ میرے دل سے زندگی بھر تیرا پیار کم نہ ہوگا
(آواز۔مہدی حسن، بول۔مسرور انور)
☆ اک نئے موڑ پر زندگی آگئی
☆ اک تصور زندگی پانے کو ہے

1979ء میں نشو کی صرف ایک ہی فلم ریلیز ہوئی، یہ فلم ''محمد بن قاسم'' تھی اس کے فلم ساز عبدالغفور اور ہدایت کار اکبر بنگلوری تھے۔ تصدق حسین اس کے موسیقار تھے۔ نشو، ناظم، سنگیتا، ادیب، زمرد اور طالش اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ زمرد نے اس فلم میں راجا داہر کی خوب صورت بہن کا کردار ادا کیا تھا جو محمد بن قاسم پر فریفتہ ہوجاتی ہے مگر اپنے مقصد میں ناکام ہونے کے بعد انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے محمد بن قاسم پر الزام لگا کر اس کی معزولی اور بصرہ واپسی کا موجب بنتی ہے۔ اس فلم محمد بن قاسم کا شمار پاکستان کی تاریخی فلموں میں ہوتا ہے۔ بھلا ان کے نام سے کون واقف نہیں۔ سرزمین ہند پر قدم رکھنے والے اس مسلمان مجاہد نے اس خطے میں اسلام کی شمع روشن کی تھی لیکن یہ فلم ناتجربہ کار اور اناڑی لوگوں کے ہاتھوں بنی اور ناکام ثابت ہوئی۔ اس فلم کا ہیرو بھی نیا اور غیر معروف تھا۔ یہ فلم 5 جنوری 1979ء کو ریلیز ہوئی تھی۔

1980ء میں نشو کی دو فلمیں سلور اسکرین کی زینت بنیں۔ پہلی فلم ہدایت کار منور رشید کی ہنستے آنسو تھی۔ دوسری ہدایت کار جمشید نقوی کی پیاری تھی۔ ہنستے آنسو ہدایت کار منور رشید کی آخری فلم تھی جس میں نشو، شبو، طارق، نازنین، ساقی اور علاؤ الدین نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ دوسری فلم ''پیاری'' عذرا پروڈکشن کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس کی فلم ساز عذرا چوہدری تھیں۔ ایم اشرف اس کے موسیقار تھے۔ سید نور نے اس کی کہانی اور مکالمے تحریر کیے تھے۔ اظہر برکی اس کے عکاس تھے۔ تسلیم فاضلی اور خواجہ پرویز نے

کی نغمہ نگاری کی تھی۔ یہ گولڈن جوبلی فلم 12 دسمبر 1980ء کو ریلیز ہوئی۔ اس کی کاسٹ میں شبنم، نشو، وحید مراد، غلام محی الدین، حنیف، جمیل فخری، اعجاز اختر، چمن آرا، قوی اور ہمایوں قریشی شامل تھے۔ اس فلم کے یہ گیت مقبول ہوئے تھے۔

☆ برا نہ کہو، برا نہ سوچو، برا نہ سنو، برا نہ دیکھو
☆ اپنے ہاتھوں سے دلہن سجاؤں گی میں
(آواز۔ناہید اختر)
☆ نئے سال کی ابتداء کریں ہم محبت سے (آواز۔مہناز ناہید اختر)

1981ء میں نشو کی جو فلمیں ریلیز ہوئیں ان میں تانگے والی 1982ء ''ایجنٹ 009'' اور ''سہارے'' اور 1983ء میں قدرت شامل ہیں۔ قدرت کے ہدایت کار اقبال حسین تھے۔ فلم تانگے والی کے فلم ساز صابر ملک اور ہدایت کار ایم جے رانا، موسیقار ایم اشرف تھے۔ یہ ماضی کی فلم ''یکے والی'' کا ری میک تھی جب کہ سہارے بھی پرانی فلم ہماری کا ری میک تھی۔

1986ء میں نشو کی فلم ''سیاست'' ریلیز ہوئی۔ اس کے فلم ساز و ہدایت کار سید کمال اور موسیقار لال محمد اقبال تھے۔ یہ فلم 12 دسمبر 1986ء میں ریلیز ہوئی تھی اور بری طرح ناکام ثابت ہوئی۔ 1986ء میں نشو کی فلم طوفان اور بجلی بھی ریلیز ہوئی تھی۔ اس کی کاسٹ میں بدر منیر، مسرت شاہین، نشو، بہار اور آصف خان شامل تھے۔ اس فلم کا پشتو ورژن، چوندیا طوفان کے نام سے 1986ء ہی میں ریلیز ہوئی۔

1987ء میں ایک بار پھر نشو کی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ جن میں پہلی فلم ہدایت کار مشتاق بابر کی ''نازک رشتے'' اور دوسری فلم ہدایت کار اقبال رضوی کی ''میری آواز'' تھی۔ 1988ء میں نشو کی فلم بشیرا ان ٹرابل ریلیز ہوئی۔ یہ پنجابی فلم ہدایت کار جاوید حسن نے ڈائریکٹ کی تھی جب کہ اس کے موسیقار وجاہت عطرے تھے۔ 1988ء میں نشو کی پھر ایک پنجابی فلم ''ظلم دا سورج'' نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم کے ہدایت کار جاوید اقبال اور موسیقار مشتاق علی تھے۔ نغمات وارث لدھیانوی اور حزیں قادری کے تھے۔ یہ نشو کی آخری پنجابی فلم تھی۔

1992ء میں نشو کی ایک بڑی کامیاب فلم مسٹر 420 ریلیز ہوئی۔ اس کے فلم ساز پرویز کلیم اور ہدایت کار عمر شریف تھے۔ موسیقی کمال اختر کی تھی۔ کاسٹ میں نشو، عمر شریف، مدیحہ شاہ، شکیلہ قریشی، روبی نیازی، عابد علی اور طارق شاہ شامل تھے۔

1994ء میں نشو کی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ایک مصنف فلم ساز و ہدایت کار اور مکالمہ نگار ایم اے زاہد کی انوکھا پیار تھی جو کئی سال تک تکمیل کے مراحل میں رہی۔ اس دوران اس کا نام کئی مرتبہ تبدیل ہوا۔ ایک بار اس کا نام کیسی محبت کیسا پیار بھی رکھا گیا مگر آخر کار انوکھا پیار فائنل کردیا گیا۔ اس کی موسیقی خلیل احمد نے ترتیب دی تھی جو ان کی آخری فلم تھی۔ واضح رہے کہ یہ فلم ایم اے زاہد کے ایک ناول ''لندن کی ایک شام'' سے ماخوذ تھی۔ اس کا یہ گیت

آندھی

جھکڑ، طوفان باد۔ ہوا کا بہت تیزی سے چلنا۔ آندھیاں عام طور پر گرم خشک علاقوں میں آتی ہیں، جہاں گرمی کی شدت سے ہوا گرم ہوکر پھیلتی اور اوپر کو اٹھتی ہے اور اس کی جگہ لینے کے لیے اوپر اور آس پاس کی ہوا تیزی سے اس علاقے کی طرف بڑھتی ہے۔ یہ ہوا اپنے ساتھ گرد و غبار کو اڑا لاتی ہے۔ اس کی تندی کا اندازہ بیرومیٹر سے لگایا جاتا ہے۔ یہ طوفان باد شمالی منطقوں میں الٹے اور جنوبی منطقوں میں سیدھے (گھڑی کے رخ) چلتے ہیں۔ اس کے چکر بہت شدید ہوتے ہیں اور قطب شمالی کی طرف بڑھتے بڑھتے ختم ہوجاتے ہیں۔ جو طوفان باد غرب الہند میں چلتے ہیں، ان کو ہری کین (hurricane) کہا جاتا ہے۔ یہ اگست، ستمبر اور اکتوبر کے مہینوں میں آتے ہیں۔ جزائر شرق الہند میں چلنے والے طوفان باد کو ٹائی فون (طوفان) کہتے ہیں۔ یہ جولائی سے اکتوبر تک چلتے ہیں اور جزائر فلپین اور فارموسا میں تباہی مچاتے ہیں۔

مرسلہ: رانا اخلاق احمد، سیالکوٹ

پسند کیا گیا تھا۔

اب تک ہم نے یہ نہیں جانا
کیسی محبت کیسا پیار
(آواز، اخلاق احمد، بول۔ خاور سعید نظامی)

دوسری فلم فلم ساز و ہدایت کار رنگیلا کی ''خوب صورت شیطان'' تھی۔ یہ فلم 12 اگست 1994ء کو ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں رنگیلا نے اپنے بیٹے سلطان رنگیلا کو بطور ہیرو پیش کیا۔ اس فلم میں نشو اور اس کی بیٹی صاحبہ دونوں نے اداکاری کی۔ یہ رنگیلا کی بطور گلوکار بھی آخری فلم تھی۔ اس کی کاسٹ میں صاحبہ، سلطان، رنگیلا، نشو، عبدال اور امان اللہ شامل تھے مگر یہ فلم بری طرح ناکام ہوئی۔ اس سال کی پہلی فلم ''انوکھا پیار'' بھی پھر فلاپ ہوئی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ کوئی پندرہ سال کی مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچی لہٰذا اس کا یہ انجام تو ہونا ہی تھا۔

کئی سال کے وقفے کے بعد 2008ء میں نشو کی ایک فلم انجام ریلیز ہوئی۔ اس کے فلم ساز حاجی عبدالرشید اور ہدایت کار اقبال کاشمیری تھے۔ اس فلم کے مصنف اور مکالمہ نگار بھی اقبال کاشمیری تھے۔ موسیقی دانش جاوید نے ترتیب دی تھی۔ گیت سعید گیلانی اور عبداللہ چلی نے تحریر کیے تھے۔ کاسٹ میں شان، فرزین، وینا ملک، سمیع خان، حیا علی، شاہد، نشو، اظہر رنگیلا اور افتخار ٹھاکر شامل تھے۔

نشو کی آخری فلم ''گناہ کا انجام'' تھی جو 2012ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے ہدایت کار سعید علی خان تھے۔ اس فلم کا انجام بھی کوئی اچھا ثابت نہیں ہوا۔

اداکارہ نشو نے اپنا شوبز کیریئر فلم سے شروع کیا تھا مگر ایک وقت آیا جب نشو نے ٹی وی اور اسٹیج پر بھی کام کیا۔ ''اپنا چینل'' پر وہ ایک طویل عرصے سے مقبول ترین ٹی وی پروگرام ''نشو دی چاہ'' کامیابی سے پیش کرتی آئی ہیں۔

نشو جو اپنے وقت کی حسن و شباب کی ملکہ تھی۔ اس نے ازدواجی زندگی کے حوالے سے تین شادیاں کیں۔ پہلی شادی اپنی طالب علمی کے زمانے کے محبوب انعام درانی سے عین اس وقت کی جب اس کا فلمی کیریئر ابتدائی اسٹیج پر تھا۔ اس شادی اور اس کی ناکامی کی روداد پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔

ایک طویل عرصہ کے بعد نشو نے اس وقت کے مقبول ترین نغمہ نگار تسلیم فاضلی سے دوسری شادی کر لی۔ اس شادی کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ایک محفل جہاں تاش کی بازی لگائی جاتی تھی وہاں کرنا خدا کا یوں ہوا کہ عشق کی بازی بھی لگی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔

تاش کی بازی پر چونکیے نہیں اکثر فلم والے اور فلم والیاں مختلف ادوار میں ایک جگہ جمع ہو کر تاش کی محفل جماتے رہے ہیں۔

کسی زمانے میں اداکارہ شبنم بھی ایک تاش کی محفل میں شریک ہوئی تھیں۔ اس محفل کے کچھ شرکاء جو اتفاق سے غیر فلمی تھے۔ شبنم کے ساتھ ایک دن وہ سب کچھ کر بیٹھے جو انتہائی شرمناک تھا۔

اداکارہ شمیم آرا جن دنوں بیمار تھیں دل بہلانے کے لیے اپنی سہیلیوں جن میں بہار بیگم نمایاں تھیں تاش کی محفل جمایا کرتی تھیں۔ ایسی ہی تاش کی ایک محفل نشو بیگم کے ساتھ بھی ان کے کچھ فلمی احباب اور سہیلیاں سجایا کرتی تھیں جن میں تسلیم فاضلی بھی بڑی پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ عام طور پر تاش کھیلنے والے کھلاڑی اپنے پتوں پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ ساتھی بازی گروں پر بھی گہری نظر ڈالتے رہتے ہیں اور ان کے چہروں کے تاثر سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کس کے پاس کیسے پتے ہو سکتے ہیں۔

اپنا طرحدار شاعر تسلیم فاضلی بھی تاش کھیلتے وقت ساتھی کھلاڑیوں پر نظر رکھتا تھا۔ اس دوران اکثر اس کی نظریں نشو سے ٹکرا جاتی تھیں۔ نظروں کا یہ ٹکرانا، تاش کی بازی سے کسی اور بازی کی سرحدوں میں داخل ہو گیا۔ نشو کو بھی آہستہ آہستہ احساس ہونے لگا کہ شاعر صاحب کی نگاہیں جیسے اس سے کچھ کہہ رہی ہوں جیسے کہہ رہی ہوں۔ ''مجھ سے شادی کرو گی؟''

پہلے پہل تو اس نے محض اسے اپنا گمان سمجھا۔ نہیں، یہ بات نہیں ہے کہ وہ مجھ سے آنکھ مٹکا کرنے لگا ہے۔ شریف آدمی ہے۔ ایسی حرکت نہیں کر سکتا مگر ایک دو بار جب وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نگاہوں کی تپش سے موم کی طرح پگھلنے لگتی اور شرما کر نگاہیں جھکا لیتی تو دوسری طرف بھی جیسے نظروں سے مستیاں چھلک پڑتیں۔ نگاہوں سے چھلکنے والی اس کیف و مستی کے کھیل کو وہاں موجود دیگر کھلاڑیوں نے بھی آہستہ آہستہ محسوس کرنا شروع کر دیا اور پھر یوں ہوا کہ

الجھی نینوں کی ڈور، تو مچ گیا شور، کہ دل ہوا بوکاٹا

ساتھیوں نے دونوں کو سمجھایا۔ دور دور رہ کر ایک





دوسرے کے لیے تڑپنے سے بہتر ہے ایک ہو جاؤ۔ اس آگ میں پانی ڈال دو جو تم دونوں کو اندر ہی اندر جھلسا رہا ہے۔

ایک بار دونوں تنہائی میں ملے تو تسلیم فاضلی نے بے دھڑک وہی بات زبان سے کہہ دی جو اس کی نگاہیں کہتی تھیں۔ ”مجھ سے شادی کرو گی؟“

”مگر...... میں...... میں تو......“

”تم جو کچھ بھی ہو اور جیسی بھی ہو، مجھے سب معلوم ہے۔ بس میری بات کا جواب دو۔“

نشو نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔

شاعر صاحب اس خاموش جواب پر سرمست ہو گئے اور آگے بڑھ کر اپنے لب اس کے لب لعلیں پر ثبت کرنے والے ہی تھے کہ وہ اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بول پڑی۔ ”ابھی نہیں پہلے نکاح اور شادی۔ پھر ہر بات کی آپ کو آزادی۔“

شادی ہو گئی۔ دو چاہنے والے ایک دوسرے کے ہو گئے مگر فلموں ہی میں دو پیار کرنے والوں کے رنگ میں بھنگ ڈالنے والا ولن نہیں ہوتا۔ عام زندگی میں بھی کچھ لوگ یہ منفی کردار ادا کرتے ہیں۔ نشو اور تسلیم فاضلی کا ٹوٹ کر چاہنا بھی کچھ لوگوں کو برداشت نہ ہوا اور یہ کوئی اور لوگ نہیں تھے تسلیم فاضلی کے خاندان کے لوگ تھے۔ انہیں ایک اداکارہ کو بہو کے طور پر قبول کرنا گوارا نہ ہوا۔ کیسی عجیب بات تھی۔ ان کے گھر کا فرد (تسلیم فاضلی) خود بھی فلمی دنیا سے وابستہ تھا۔ وہاں سے کما کر وہ جو کچھ لاتا تھا اسے جائز سمجھتے تھے مگر وہاں کی ایک لڑکی انہیں قابل قبول نہیں تھی۔

ایک طرف نشو کی محبت دوسری طرف خاندان کے بزرگوں کا روز بروز بڑھتا ہوا دباؤ کہ اسے چھوڑ دو۔ یہ ہمارے خاندان کی بہو بننے کے قابل نہیں۔ شاعر یوں بھی حساس طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ تسلیم فاضلی اس کشمکش میں مبتلا ہو کر ڈپریشن کا شکار ہو گیا۔ نشو کو چھوڑ کر بے وفاؤں کی فہرست میں اپنا نام نہیں لکھوایا بلکہ یہ دنیا ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ جواں سال شاعر جس کی عمر صرف 35 برس تھی 17 اگست 1982ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گیا اور نشو ایک بار پھر تنہا ہو گئی۔ جانے والے نے اپنی ایک نشانی اپنی ایک بیٹی عائشہ کے نام سے چھوڑی تھی۔ بہت دنوں کے بعد جب عائشہ جوان ہوئی تو نشو نے اپنی اس بیٹی کی شادی اداکارہ فردوس کے بیٹے علی رضا کے ساتھ کر دی۔

کچھ دنوں تک نشو اپنے محبوب شاعر کے غم کو اپنے سینے سے لگائے رہی پھر اس کے بہی خواہوں نے اسے سمجھایا۔ ”کب تک جانے والے کی یاد میں آنسو بہاتی رہو گی؟ زندہ رہنے کے لیے زندگی سے بھرپور رویہ اختیار کرو۔“

”میں کیا کروں۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔“

”تمہارا علاج یہی ہے کہ کوئی نیا شریک سفر چن لو۔“

نشو کچھ دنوں تک سوچتی رہی۔ باقی زندگی گزارنے کے لیے کیا واقعی اسے کسی سہارے کی ضرورت ہے؟

اور آخر اس نتیجے پر پہنچی کہ اسے سچ مچ کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ پیار بھری بانہوں کی ضرورت ہے جو جیون کے سفر میں اسے لڑکھڑانے اور گرنے سے بچائے۔ تنہائی تو اسے کہیں کا نہیں رکھے گی۔

اور کچھ دنوں کے بعد اسے ایک مخلص اور پیارا شخص مل گیا جس نے اسے اس کی زندگی کا نیا ہمسفر بن کر نہ صرف اس کی تنہائیوں کے آسیب کو اس کی زندگی سے دور کیا بلکہ اس کے خزاں رسیدہ شب و روز کو اپنی محبت کی برسات سے سرسبز و شاداب کیا۔ یہ جمال نامی ایک شخص ہے جس نے واقعی کمال کر دکھایا اور جلد ہی اس کی گود ایک بیٹے سے بھر کر زندہ رہنے کا ایک انمول تحفہ پیش کیا۔ اس بچے کا نام حمزہ ہے۔

نشو کو اس کے تین شوہروں نے تین بچوں کی ماں بنایا۔ پہلے شوہر انعام درانی سے مدیحہ (صاحبہ) دوسرے شوہر تسلیم فاضلی سے عائشہ اور تیسرے شوہر جمال سے حمزہ اس کی زندگی بھر کا سرمایہ ہیں۔ حمزہ بھی بطور چائلڈ اسٹار ایک فلم ”منڈا بگڑا جائے“ میں کام کر چکا ہے۔

نشو، اب وہ نشو نہیں رہی ہیں جنہیں دیکھ کر نشے کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی وہ صحیح معنوں میں حسن کی دیوی تھی۔ اس پر اس کا زاہدوں کو بھی متزلزل کر دینے والا شباب۔ بالکل اس مصرعہ کے مصداق

نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

مگر وقت بڑا ظالم ہے۔ کسی کو ایک ہی حال اور ایک ہی کیفیت میں رہنے نہیں دیتا۔ نشو کا حسن و شباب بھی گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ چودھویں کے چاند کی طرح روز بروز گھٹنے لگا۔ ماند پڑنے لگا۔ اب اس کے بچے جوان ہو گئے ہیں اور وہ......!!



شاعرِ زندگی

سلمیٰ اعوان

اس کی شاعری زندگی کی عکاس ہے۔ وہ ایک عظیم شاعر کہلاتا ہے۔ اس کے ناول بے شمار زبانوں میں ترجمہ ہوتے ہیں۔ نوبل انعام بھی اسے ملا ہے لیکن اس کے وطن میں اسے سرکاری طور پر غدار کہا جاتا ہے۔ آخر اس بے قدری کی وجہ کیا ہے؟

ایک منفرد قلم کار کا زندگی نامہ

ڈاکٹر ژواگو" جیسے شہرۂ آفاق ناول کا خالق، عظیم بڑا موسیقار اور بہترین ترجمہ نگار۔ ذاتی اور سماجی ں سے حاصل ہونے والے تجربات اور مشاہدات نے شاعری کو بے حد توانا اور مقبول بنایا۔ گویا فطرت اس کی نظموں میں بارش اور برف کے راستوں سے اندر داخل ہوتی ہے۔ وہ روسی ہے۔ روس اسے دنیا کے ہر تمغے سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کی عزت، ذلت، اس کا جینا، مرنا سب روس کے ساتھ ہے۔ اس کی ایک نظم ملاحظہ کریں۔

"میں دروازے پر کھڑا! اس کوشش میں ہوں
کہ جس اسٹیج پر مجھے اب نمودار ہونا ہے
میری شکایات زیر لب ہی رہیں
میرے شکوے میرے ہونٹوں میں ہی رہیں
کہ میرے دماغی خانے میں محفوظ
میرے آنے والے سالوں کی
دریافت کی گونج اپنا دم توڑ رہی ہیں
رات کی تاریکی اپنے سینکڑوں خوفناک منظروں کے ساتھ
میرے اوپر نظریں گاڑے بیٹھی ہے
میں تمہارے اِن منصوبوں کے مقابل بہت ثابت قدم ہوں
اور اپنا کردار ادا کرنے کے لیے بہت مطمئن بھی ہوں
لیکن اور ڈراما تشکیل دیا جا رہا ہے
اِس بار تو مجھے اِس سے نکال ہی دو
لیکن جو کیا جاتا ہے وہ تو طے ہے
مگر انجام تو ہاتھ سے نکلے ہوئے تیر کی مانند ہے
میں تنہا ہوں اور میرے گرد جھوٹ کے ڈرون ہیں
ایسی کتنی ہی نظموں کا خالق بورس پاسترک"

گیارہ جون کی شب دو بجے میری دوست اور میں پیٹرز برگ میں نیوا کے ساحلوں پر کھڑے گل رنگ شفق کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کے ان ٹولوں کو بھی دیکھ رہے تھے جو پیٹرز برگ کی "سفید راتوں" کو منانے کے لیے یہاں آئے ہوئے موج مستی کی سی کیفیت میں گٹار پر گیت گا رہے تھے۔ روسی زبان میں یہ ہماری سمجھ سے بالاتر تھا مگر زندہ دلوں کی شوخیاں تو "ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا" جیسے جذبوں کی غماز تھیں۔ ہم ان کے قریب جا بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک نیا منظر سامنے نمودار ہوا۔ لندن سے آنے والا ایک ٹولہ انگریزی میں گیت گاتا، جھومتا، بل کھاتا گٹار سے کھیلتا آیا۔ بڑا خوبصورت سا گیت تھا جس کے بار بار دہرائے جانے والے بول میری سمجھ میں آتے تھے کہ وزارت سیاحت کی جانب سے ملنے والے کتابچوں میں بورس پاسترنک کی یہی نظم برفباری کے حوالے سے درج تھی۔

"دیوانوں کی طرح برستی اِس برفباری میں
ہم گلا بوشتا بو کا کھیل کھیلتے ہیں
اور اپنے ہی شور سے خود کو بہرہ کر لیتے ہیں"

اپنی کم علمی کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ میں پشکن کو اس طرح نہیں جانتی تھی جس طرح بورس پاسترنک میری آوائل بلوغت کی یادوں میں بحث کی صورت موجود تھا۔ میرے گھر میں میرے بہت پڑھے لکھے، صاحب علم ماموں نظریاتی طور پر دائیں بازو سے متاثر تھے۔ کارل مارکس، فریڈرک اینگلز اور لینن کا پرستار میرا خالو جس کا قبلہ و کعبہ ماسکو تھا۔ جب کبھی سب اکٹھے بیٹھتے تو دنیا میں رونما ہونے والے واقعات پر ان کے تبصرے اور مباحثے کچھ انہی تناظر میں ہوتے۔ بحث مباحثے کبھی کبھی غصے کی صورت بھی اختیار کر لیتے مگر ایسا کم کم ہی ہوتا۔

موسم کے اعتبار سے یہ بڑے میٹھے سے دن تھے۔ سال غالباً 1958 کا ہی تھا۔ بڑے ماموں اور چھوٹے ماموں سالانہ چھٹیوں پر گھر آئے ہوئے تھے۔ کشادہ آنگن میدان کارزار کا سا روپ پیش کر رہا تھا۔ ہم آٹھویں، نویں اور ایف ایس سی میں پڑھنے والے کزنز کھڑے بیٹھے یہ تماشا دیکھتے اور سنتے تھے۔ آٹھویں جماعت میں پڑھنے والی اوسط ذہانت کی لڑکی کے پلے خاک کچھ پڑتا تھا۔ اگر کچھ پڑا تو بس اتنا کہ وہ قانون والے ایک ملک نام جس کا نام غالباً روس ہے۔ جس کے ایک لکھنے والے کو اس کے ناول پر اس کے ملک نے معتوب ٹھہرایا۔ امریکا اور برطانیہ اسے انعام دلانے کے آرزو مند اور اس کا ملک اسے نکالنے کے درپے۔

قارئین میرے ذکر کردہ کرداروں کے حوالوں سے بخوبی جان چکے ہوں گے کہ کس کی ہمدردیاں کس کے ساتھ تھیں۔ میں اپنے ماموں کی کبیریں شخصیتوں سے متاثر ہونے اور انہیں دل میں بٹھانے کے باوجود ان سے کہیں نفرت بھی کرتی تھی کہ وہ خاندان اور ہمارے ماحول میں طبقاتی بغض کا باعث تھے۔ کھدر پہننے والے درویش سے خالو کو بھی حوالے سے ناپسند کرتے ہوئے بھی ان کی باتوں سے متاثر تھی۔ سو دلی ہمدردیاں کوہ قاف والے ملک کے ساتھ تھیں۔

کالج لائبریری میں جب "ڈاکٹر ژواگو" کا ناول دیکھا تو اسے گھر لائی۔ اردو میڈیم والوں کی انگریزی کچھ اتنی اچھی تو ہوتی نہیں مگر یہ کتاب تو بورس پاسترنک کی تھی۔ اس کے ساتھ میری یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ سو پڑھا۔ ریگل سینما میں فلم لگی تو پہلا شو اور پہلا دن۔ میں ٹکٹ کھڑکی میں کھڑی دھکے کھاتی تھی۔

تو آج میں پاسترنک کی اسی سرزمین پر بیٹھی اسے سن رہی تھی۔ روس آنے سے قبل میں نے پشکن کے ساتھ ساتھ بورس پاسترنک کی شاعری بھی پڑھی تھی اور یہ اس کی بڑی خوبصورت نظم تھی۔

بورس پاسترنک منفرد قلم کار، شہرہ آفاق ناول ڈاکٹر ژواگو کا لکھاری، نوبیل ایوارڈ یافتہ، ایک عظیم شاعر، جنوبی ساز، بہترین ترجمہ نگار، انقلاب روس کا حامی مگر جو اپنے نظریاتی لوگوں کے ظلم و ستم کا شکار رہا۔

ان کی پیدائش ایک صاحب ثروت یہودی گھرانے میں دس فروری 1890 میں ماسکو میں ہوئی۔ باپ Leonidovich روح کی پور پور میں فن رچا ہوا مستند پینٹر، بہترین مجسمہ ساز، مصور اور ماہر تعمیرات تھا۔ ماں روزا کف مین ماہر پیانو نواز تھی۔ اس کے والدین کا دانشوروں، موسیقاروں اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے گہرا یارانہ تھا۔

خاندان لیو ٹالسٹائی کا بھی وہ بہترین دوست تھا۔ اس کی کتابوں کے سرورق اور اندر کی تصویر کشی باپ کرتا تھا۔ نومبر 1910 میں جب ٹالسٹائی گھر سے بھاگا اور Astapovo اسٹیشن ماسٹر کے گھر فوت ہوا۔ بورس کا والد اس کی مرگ کی ڈرائنگ کرنے کے لیے گیا تو بورس اس کے ہمراہ تھا۔ وہ سب لمحے اور واقعات اس کی یادوں میں محفوظ ہو گئے۔

1956 میں اپنے باپ کے کام کے بارے میں لکھے مضامین میں وہ اپنے بچپن کی یادداشتوں کو آواز دیتا ہے۔ میرے تصورات کی بچگانہ دوڑ کا سرا ہمیشہ ٹرین کنڈیکٹر کے جا نکراتا تھا۔ ریلوائی یونیفارم میں ملبوس وہ بھی ریلوے پلیٹ فارم پر کسی کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑا مجھے متاثر کرتا۔ اس کی چمن دروازے پر جہاں اسٹوو پر گلو ابلتا، پارسلوں کے تھیلوں کی پیکنگ ہوتی اور مہریں لگتیں۔ وہ ان مرحلوں کو دیکھتا ہدایات دیتا۔ بہت سالوں میں نے خود کو اسی روپ میں دیکھا تھا۔

وہ آرمی میں نہ جا سکا کہ گھوڑے سے گر گیا تھا اور ٹانگ ٹوٹ گئی تھا۔ سرجری کے بعد ایک ٹانگ بڑی اور دوسری چھوٹی ہو گئی۔

کہا جاتا ہے اس کا پہلا پیار باٹنی سے تھا۔ دوسرا موسیقی سے۔ موسیقی کی اس نے پورے چھ سال تک تعلیم حاصل کی۔

یہاں 1959 میں اس کی "I Remember" ایک تحریر بہت اہم ہے۔ وہ لکھتا ہے "میں چار سال کا تھا جب ٹالسٹائی سے پہلی بار ملا۔ میری والدہ نے اس کے گھر میں ایک کنسرٹ کا اہتمام کیا تھا۔" پاسترنک آگے لکھتا ہے جب ٹالسٹائی کے اعزاز میں خصوصی طور پر آلات موسیقی کی طرف ایک تانت کو بجایا گیا، میں چونک اٹھا۔ ایک میٹھا سا تیز چبھن والا درد مجھے اپنے سینے میں محسوس ہوا۔ یہ یقیناً میری موسیقی سے عشق کی ابتدا تھی۔

اگرچہ بورس موسیقی کو شاعری کے ہم پلّہ ماننے سے انکار کرتا ہے تاہم حقیقت ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بقول پلنک جس نے پاسترنک کی موسیقی کا گہرا مطالعہ کیا ہے کا کہنا ہے کہ اس کی آوازوں کی رمزیت، الفاظ کی بندش، سرتال کا ملاپ اور دل کو چھو لینے والے پُراثر لفظ ان سب کو بہت خوبصورت بناتے ہیں۔

اپنی ماسکو سیاحت کے دوران جب میں ایلیٹکا اسٹریٹ کی سیر کرتی تھی۔ مجھے بورس پاسترنک کی پہلی محبت یاد آئی تھی۔ ماسکو کے چائے کے امیر ترین تاجران جن کی تیل بھری ٹوپیاں انیسویں صدی تک ہیٹوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ اسی شاہراہ پر ان کے کاروباری مراکز اور ملکی و غیر ملکی تاجروں کے زمین دوز خفیہ تجوری خانوں کی تفصیلات انیتا کور مجھے بتا رہی تھی۔ ida wissotzkaya ایسے ہی ٹی مرچنٹ گھر گھرانے کی بیٹی تھی۔ جس کے آباؤ اجداد کی جیبوں کو بھاری کرنے میں روس کا محنت کش طبقہ کسی نہ کسی انداز میں دن رات ہلکان ہو رہا تھا۔ نشیلی آنکھوں والی Ida wissotzkaya جسے بورس نے ہائی اسکول کی تیاری میں مدد دی تھی اور جس سے وہ محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ مربرگ Marburg جرمنی میں اس کی دوبارہ ملاقات ہوئی کہ اس کے والد کو ida کا پورٹریٹ بنانے کے لیے بلایا گیا تھا۔ وہ بھی ان دنوں مربرگ یونیورسٹی کا ہی طالب علم تھا۔ یونیورسٹی سے اس نے فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔

دونوں کے درمیان وعدے وعید تو کچھ اتنے نہ ہوئے تاہم پسندیدگی کا واضح اشارہ ایڈا کی جانب سے ضرور ملا۔ پہلی جنگ عظیم میں بورس واپس روس آ گیا۔ ida کے لیے پروپوزل بھیجا۔ بے حد دولت مند خاندان نے بہت برا منایا اور بیٹی کو مجبور کرتے ہوئے لعن طعن کی۔

"کچھ شرم کرو۔ ایسے کنگلے خاندان سے ناطہ جوڑنا چاہتی ہو۔"

انکار بڑا دلبرداشتہ سا تھا۔

1918 - 1920 کے سول وار کے دوران اس نے باہر جانے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی جیسا کہ اس وقت کے بے شمار لکھنے والے ملک چھوڑ گئے تھے۔ انقلاب سے محبت رکھنے کے باوجود اس نے اس طرز حکومت کو سخت ناپسند کیا جس میں سرخ فوجوں کا پیدا کردہ ڈر، خوف، دہشت اور بربریت کے

ساتھ ساتھ کھانے پینے کی اشیاء کی کمیابی نے زندگی کو بہت مشکل اور تکلیف دہ بنا دیا تھا۔

شاعری اس کی حسین چاہت تھی۔ کم عمری سے ہی وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ 1905 کے انقلاب پر اس کی دو طویل نظموں نے بڑی دھوم مچائی۔ یہی وہ دور تھا جب وہ نثر کی طرف بھی متوجہ ہوا۔ کہانیاں بھی لکھیں۔ "آٹو بائیو گرافی" اور "Luvers" کا بچپن بہت مقبول ہوئی۔

"Twin in the clouds" اور "Themes and variations" اس کی جوانی کی شاعری ہے۔ یعنی یہی کوئی 1914 اور 1917 کے درمیانی وقتوں کی۔ جب وہ صرف چوبیس برس کا تھا۔ my sister, life بہت مشکل حالات میں چھپی۔ یہ 1922 کا زمانہ تھا۔ یہ روسی سوسائٹی میں بہت انقلابی ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کی شاعری پر بہترین کتابوں میں سے ایک سمجھی گئی۔ اس نے پاسترنک کو نوجوانوں میں بہت مقبول بنا دیا۔ ہمیں ان میں انقلاب سے پہلے کے روس کی جھلک بھی ملتی ہے۔

اِسی مجموعے کی ایک دلکش نظم The racing star ہے۔ یہ نظم اس لمحے کو بہت خوبصورتی سے قید کرتے ہوئے اس کیفیت کو بیان کرتی ہے جب انیسویں صدی کے روسی شاعر الیگزینڈر پشکن نے "پیغمبر" لکھی تھی۔

اس نظم میں اس نے ان خوبصورتیوں کو دریافت کیا جسے اس سے پہلے نقادوں نے قابل توجہ نہیں سمجھا تھا۔ یہ انداز اوسپ مینڈل کی شاعری پر بھی اثر انداز ہوا۔ اس کی ماسٹر پیس نظم "Rupture" بھی اسی مجموعے میں ہے۔ اس دور کی شاعری میں اس پر Immanuel Kant کی فلاسفی، اس کے محبوب شعرا جن میں پشکن اور جرمن شعرا سرفہرست تھے کے اثر کے ساتھ ساتھ ہم 1917 کے انقلاب کی روح کو بھی محسوس کرتے ہیں۔

1922 میں اس نے ایوگینیا Evgenia Lurye سے شادی کی جو آرٹ کے ایک بڑے ادارے کی طالبہ تھی۔ اسی سال ایک بیٹا پیدا ہوا۔

"ریسنر Reissner کی یاد میں" اس کی ایک بے مثل طویل نظم تیس سالہ کمیونسٹ لیڈر ریسنر کے لیے تھی جو چھوٹی سی عمر میں فوت ہو گیا تھا۔ اس نے اسے مقبولیت دینے کے ساتھ ساتھ اس کے بارے میں اس تاثر کو بھی زائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ انقلاب اور انقلابی لیڈروں سے ناامید ہو گیا ہے۔

تاہم ایک ٹھوس یہ حقیقت تھی کہ وہ نظام کے تہ و بالا ہونے اور مار دھاڑ سے مایوس ہوا تھا۔ اسے امید تھی کہ انقلاب عام آدمی کی زندگی میں تبدیلی لائے گا ان خوابوں، ان امیدوں کو کہیں تعبیر ملے گی جو زمانوں سے انہوں نے دیکھے تھے۔ آنے والے دنوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ غلط باتوں پر سمجھوتا نہیں کر سکتا۔

اپنی بہن جوزیفائن کو لکھتے ہوئے اس نے اپنے دکھ کا اظہار کیا۔ "میں ولادی میر مایا کووسکی اور نکولائی سے تعلقات ختم کر رہا ہوں کہ انہوں نے ادب اور آرٹ کو کمیونسٹ پارٹی کی خواہشات اور ضروریات کے تابع کر دیا ہے۔ میرے لیے ان کی دوستی کو خیرباد کہنا کس قدر دشوار اور تکلیف دہ ہے مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ میں بہت مجبور ہوں۔"

یہ 1932 تھا جب اس نے اپنی تحریر کو مزید آسان اور قابل فہم بنایا۔ نثر کی طرف توجہ کی۔ Safe conduct اور The Second Birth اس دور کی بہترین نثری کتابیں شمار ہوئیں۔ اس کے کاکیشیائی حصوں میں اس کے خیالات کا اظہار جس طرح ہوا وہ قابل فخر ہیں۔ ان کتابوں نے بیرون ملک اس کے ان مداحوں کی تعداد میں اضافہ کیا جو کمیونسٹ نہیں تھے۔

1932 میں ہی وہ ایک بار پھر محبت کا شکار ہوا۔ Zinaida Neigauz زینیدا نیگوز کی بیوی تھی۔ یہ محبت اتنی شدید تھی اور دونوں اتنے جنونی ہو رہے تھے کہ ان کے لیے طلاقیں لینے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ پس دل کی مانی اور شادی کر لی۔

اِس دور میں وہ مسلسل اپنی نظموں کی نوک پلک سنوارنے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کی جدوجہد میں مصروف رہا۔ اس نے اپنی شاعری کو ایک نہج پر نہیں چلایا۔ تبدیلیاں کرتا رہا۔ اپنے اسٹائل کو سادہ اور دلکش بناتا رہا۔ ذاتی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیاں، اپنی حساس طبیعت کے ہاتھوں ملنے والے دکھ اور مصائب، سماجی رویوں سے حاصل ہونے والے تجربات اور مشاہدات بھی اِن میں شامل ہوئے۔ وہ اِن گوشوں اور پہلوؤں میں سانس کی طرح اترا اور بہت نیچے تک اترتا گیا۔

فطرت اس کی نظموں کا بہت اہم موضوع ہے۔ وہ درختوں، بوٹوں، پتوں، شاخوں، گھاس، پھولوں، پھلوں

اور جنگلی پودوں کی دنیا میں رہتا ہے۔ فطرت اس کی نظموں میں کہیں بارش اور کہیں برفباری کے راستوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک ایکٹریس کا کردار ادا کرتی ہے۔ اس کی نظموں میں ہے۔ کہیں خوشبو بکھیرتی ہے اور کہیں آکسیجن فراہم کرتی ہے۔

نقادوں کی رائے تھی کہ My sister life کی نظمیں ٹی بی کے مریضوں کے لیے صحت کا پیغام ہیں۔ کہیں یہ قاری کو زندگی اور خوشی کے احساسات سے دوچار کرتی ہیں۔ کہیں یہ گنگنانے پر مجبور کرتی ہیں۔

شاعرہ مارینا کہتی ہے ہم نے فطرت کے متعلق لکھا ہے پاسترنک کو فطرت نے لکھا۔ اس نے فطرت کی دنیا میں اپنی جگہ کو بھی دریافت کیا ہے۔ اس نے ہمیشہ کے روایتی خیالوں کو ریورس گیئر لگایا۔ یہاں ہم اس کے انتہائی منفرد انداز دیکھتے ہیں وہ فطرت کو متحرک کرتے ہوئے اسے اپنی نظموں میں لاتا ہے۔

اس کی نظموں کے ٹائٹل کس قدر انوکھے اور منفرد ہیں۔ "فروری سیاہی لو اور آنسو بہاؤ"، "روتے ہوئے"، "walts with a tear in it"، "حیرت زدہ"، "چمکتے پھول کو نے جہاں سے جدا ہے مڑتے ہیں" اس کی یہ نظمیں جو موسم، جذبات اور دکھوں کے امتزاج سے سج کر صفحوں پر بکھریں۔ ذرا دیکھیے تو

"ایک خواب"
کھڑکی میں سے جھانکتی خزاں کو میں نے خواب میں دیکھا
اور تم
ہجوم میں گھرے، نشے میں چور متوالے
مجھے اس شکرے کی طرح نظر آئے
جو سر اور کندھے جھکائے
قربان گاہ کی طرف جاتا ہو
اور
میرا دل تمہاری کلائی پر بیٹھنے کے لیے بضد ہوا

winter night میں اس کے جذبات محسوس کریں

برف باری ہوتی رہی
ہوتی رہی
دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک
برف نے سب کچھ چھپا دیا
بس میز پر ایک موم بتی جلتی رہی
جلتی رہی
دو ننھے منے سے جوتے فرش پر گرے
بہت بھدے سے انداز میں
نائٹ اسٹینڈ پر جلتی موم بتی اپنے آنسو بہاتی رہی
ایک خوبصورت لباس پر"

ایک اور خوبصورت نظم
فروری سیاہی لو اور آنسو بہاؤ
لکھو نا کہ تم سسکیاں بھر رہی ہو
بہار کا کیا پوچھتی ہو
وہ تو ابھی تک برف کے کیچڑ میں
دھنسی، جلتی اور آہیں بھرتی ہے

"A walts with a tear in it" میں دیکھیے۔

اِن پہلے چند دنوں میں
آہ میں اِسے کتنا پیار کرتا ہوں
برف باری کے دن بیت گئے
اس کی تازگی اور ہریالی جنگل جیسی ہونے والی ہے
لیکن وہ بدنمائی اس کی ہر شاخ میں ابھی بھی موجود ہے
مجھے انتظار ہے اس وقت کا
جب نقری شعاؤں کے دھاگے سے
جیسے انہیں دھیرے دھیرے ہلائیں گے
اور چیڑ کے پھل دھیرے دھیرے چمکنے لگیں گے
موم بتی کی روشنی اور نیچے بچھی نقری چادر
اس کے بدنما ٹھنٹھوں کو ہماری نظروں سے چھپا لیں گے

اسی نظم کا ایک اور بند دیکھیے۔

اس کی قسمت تو صرف چند صنوبر کے درخت ہیں
سنہری و آگ کی سی رنگت اور تمازت لیے ہوئے
بلندیوں کی طرف اس کی اڑان ہو گی
اس عمر رسیدہ پیغمبر کی طرح
جو آسمانوں کی طرف محو پرواز ہوتا ہے
آہ میں اِسے کتنا پیار کرتا ہوں
ان کے پہلے چند دنوں میں
میں اسے کتنا پیار کرتا ہوں
جب ساری دنیا موج میلے میں مصروف ہوتی ہے۔

بنیادی طور پر وہ بہت مثبت اور رجائیت پسند تھا۔ امید اور نوید دیتا ہوا۔ ایک خوبصورت شاعر اور لکھاری اس کی Second Birth کتاب میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ کہیں وہ بدلتے موسموں سے لطف اندوز ہوتا ہے، کہیں زندگی اور موت کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ اس کی شاعری محبت

کے آفاقی جذبوں کی تہوں میں اترتی، سوال وجواب کرتی برائی اور برے رویوں اور کہیں خدا کے ساتھ تجدید تعلقات کے مرحلوں سے اپنے قاری کو بہت حسن وخوبی سے گزارتی ہے۔ On Early Trains میں بھی اس کا یہ اثر برقرار رہا۔

اسٹالن کی ہجو کا بھی قصہ بڑا دلچسپ ہے۔

یوں تو 1929 سے ہی اسٹالن cpsu کا مستند لیڈر تسلیم کرلیا گیا تھا مگر آہستہ آہستہ بورس پارٹی اور اسٹالن سے مزید متنفر ہوگیا تھا۔ انہی دنوں اوسپ مینڈل نے اسٹالن پر سخت طنزیہ نظم لکھی۔ قابل بھروسا دوست اکٹھے ہوئے۔ کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بھی بند کیے گئے حتیٰ کہ روشن دان بھی۔ مینڈل نے مدھم سی آواز میں پڑھنی شروع کی۔

ہم زندہ ضرور ہیں مگر
اس دھرتی کے بارے میں سوچتے نہیں
جہاں ہم رہ رہے ہیں
کچھ دس قدم پرے یا نزدیک
تم سن ہی نہیں سکتے ہو
جو ہم کہتے ہیں
لیکن اگر لوگ موقع پر بات کریں
تو وہ کریملن کا کپتین کے بارے میں ہی ہوگی
اس کی موٹی انگلیاں بھدی ہیں
اور پھنسنے والی مچھلی کی طرح پلی ہوئی
موزوں لفظوں کی تلاش اتنی مشکل
جتنے بھاری وزن دار پتھر
اس کا کروچ کی مونچھیں بہت ڈراؤنی ہیں
بوٹوں کا ابر چمکتا اور چھب دار ہے
لیکن گرداگرد چھوٹی اور موٹی گردنوں والے
خوشامدی ٹٹو اور پٹھو ہیں
یہی اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں
کچھ تو سیٹیاں بجاتے
کچھ میاؤں میاؤں کرتے
اور کچھ سوں سوں کرتے ہیں
وہ اکیلا
گرجتا، دخل در معقولات کرتا
اور کش لگاتا
اپنے ہی اصولوں کو توڑتا
حکومتی فرمانوں کو سموں تلے روندتا
اپنے جبڑوں، اپنے ماتھے
اپنی آنکھوں اور بھنووں میں
ہر قتل پر خوش ہوتا

نظم سننے کے بعد بورس نے بے اختیار کہا۔

"مینڈل تم نے کیا لکھ ڈالا؟ ہمارے جذبات کا اتنا حقیقی ترجمان۔" پھر وہ خوف سے لبریز آواز میں بولا۔ "مینڈل تم سمجھو تم نے کچھ نہیں سنایا اور ہم نے کچھ نہیں سنا۔ تم جانتے ہو بہت ظالمانہ رویہ روا ہے۔ لوگوں کو ان کا جرم بتائے بغیر اٹھالیا جاتا ہے۔ دیکھو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور کچھ پتا نہیں کب کیا کہانیاں بن جائیں؟ بس سمجھو تم نے کچھ نہیں سنایا۔"

بورس بھول گیا تھا کہ شاعری خوشبو کی طرح ہوتی ہے جسے دیواروں، بند دروازوں میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کوچہ کوچہ قریہ قریہ سفر کرتی کریملن پہنچ گئی تھی۔

مینڈل کو گرفتار کرلیا گیا۔ بورس سخت پریشان۔ ایک گرفتاری دوسرے یہ ڈر کہ کہیں اس پر بے وفائی کا الزام نہ لگ جائے۔ سارے شہر میں وہ بھاگا بھاگا پھرا۔ اپنے بارے میں وضاحتیں دیتا ہوا کہ اس نے تو کوئی بات نہیں کی تھی۔

ایسے ہی صبر آزماؤں میں اس کے اپارٹمنٹ میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کسی نے کہا۔ "کامریڈ اسٹالن تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

پاسترنک تو گنگ سا ہوگیا ایسی صورت کا سامنا تو اس کے گمان میں نہ تھا۔

ایک آواز ماؤتھ پیس میں سے ابھری۔ اسٹالن کی آواز، ایک جابر اور ظالم حکمران کی آواز۔ رعب اور کرختگی سے بھری ہوئی آواز۔

پاسترنک کی آواز میں گھبراہٹ، جھجک اور احمقانہ پن تھا۔ ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ اس کے اور مینڈل کے خیالات میں بہت اختلاف ہے۔

ایسا ثابت کرنے میں اس نے فضول وقت ضائع کیا۔ اسٹالن نے اس سے ادبی حلقوں میں مینڈل کی گرفتاری کا ردعمل جاننا چاہا۔ اور یہ کہ اس کی رائے اس بارے میں کیا ہے؟

مینڈل حواس باختہ سا تھا اوسان تو اڑے ہوئے ہی تھے۔ فوراً ہی انکار کرتے ہوئے بولا۔ "اب ماسکو میں ایسے اسٹڈی سرکل کہاں رہے ہیں؟"

اسٹالن نے ایک تمسخرانہ انداز میں یہ کہتے ہوئے کہ "وہ کامریڈ سے بات نہیں کرسکتا فون بند کردیا۔

بہت سالوں بعد اپنے اس وقت کے جذبات و احساسات پر اس نے لکھا کہ وہ سخت خوف زدہ ہوگیا تھا۔ جب اس کے اوسان بحال ہوئے۔ اس نے دوبارہ رابطے کی کوشش کی کہ وہ اسے بتائے کہ وہ بہت غلطیاں اور زیادتیاں کررہا ہے کریملن سے ایک ہی جواب تھا۔ "کامریڈ اسٹالن بہت مصروف ہیں۔"

حقیقت تو یہ تھی کہ اس کا پچھتاوا ختم ہونے میں نہ آرہا تھا۔ بعد میں اس نے لمبا چوڑا خط بھی اسٹالن کو لکھا۔ اسے ہمیشہ اس بات کا تاسف رہا کہ وہ صورتِ حال کو ہینڈل کرنے میں بری طرح ناکام رہا۔

دوسری جنگ عظیم میں جب نازی جرمنی اور سوویت یونین میں جنگ چھڑ گئی۔ ماسکو میں برفباری کی طرح کی بمباری شروع ہوگئی تھی۔ پاسترنک فوراً رائٹرز بلڈنگ جو Lavrushisk میں تھی کی چھت پر فائر وارڈن کی ڈیوٹی سرانجام دینے لگا۔ اس نے بہت بار ایسے بہت سے بموں کو تلف کیا جو وہاں گرے اور پھٹے نہیں۔ فتح کے بعد اسٹالن کے مظالم پر اس نے ایک بار پھر لکھا کہ جنگ کی تباہ کاریاں یقیناً اس سے بہت کم تھیں جو سٹالن نے روسیوں پر ڈھائیں۔

یہ 1946 کے دن تھے جب پاسترنک Olga ivinsk سے ملا۔ سنگل مدر جو نووامیر کے ہاں ملازم تھی۔ عجیب سی بات تھی کہ اس کی غیر معمولی مشابہت پاسترنک کی محبوبہ ایڈا کے ساتھ تھی جس کی محبت ابھی بھی کہیں بورس کے دل میں تھی۔

اس نے اپنی شاعری کے بہت سے والیوم اور نثر میں تراجم اسے پڑھنے کو دیئے۔ یہ عجیب سی محبت تھی۔ نہ تو اپنی بیوی کو چھوڑا اور اولگا کے ساتھ بھی شادی جیسے تعلقات قائم کرلیے۔ جو اس کی زندگی کی آخری سانسوں تک رہے۔ روزانہ اسے فون کرتا۔ تھوڑا خوف زدہ بھی رہتا پر اس کے ساتھ کے لیے مرا بھی جاتا۔

اولگا اونسکایا اپنی یادداشتوں میں جھانکتے ہوئے کہتی ہے کبھی میں ہکلاتے ہوئے کہتی۔

"سنو آج میں بہت مصروف ہوں۔ کام کا بہت بوجھ مجھے نپٹانا ہے مجھے۔"

لیکن ہوتا کیا؟ ہر سہ پہر کام کے خاتمے پر وہ بذات خود دفتر میں آجاتا۔ ساتھ ساتھ پیدل چلتے ہیں بلیووارڈ کی شاہراہوں پر نکل پڑتا۔ کبھی کبھی ہنستے ہوئے کہتا۔ "جی چاہتا ہے یہ اسکوائر تمہیں تحفے میں دے دوں۔"

میں ہنس پڑتی۔ اس کی سادگی پر۔ محبت بھرے جذبے کی شدت احساس پر، معصومانہ سے انداز میں اظہار پر۔ یہ تعلق بڑا مسرور کن تھا۔ اولگا نے اپنی ہمسائی کا نمبر اسے دے رکھا تھا۔ ہمسائی رازدار بھی تھی۔ جب رات کو فون آتا وہ پانی کا آہنی پائپ بجاتی جو دونوں گھروں کے درمیان تھا۔

اولگا مزید لکھتی ہے کہ جب وہ پہلی مرتبہ ملے تھے بورس اس وقت ہنگری کے قومی شاعر Sandor Petofi کا ترجمہ کررہا تھا۔ اولگا کو اس کی ٹرانسلیشن دیتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ میرے جذبات کے صحیح عکاس ہیں جو میں تمہارے لیے اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔ تم انہیں پڑھو گی تو میں اور میرے جذبات دونوں کی ترجمانی ہوجائے گی۔"

اس تعلق اور محبت کے بارے میں بورس کی بیوی کو پتا چل جانے پر اس کے ردعمل پر اولگا کا کہنا تھا کہ اسے اپنے شوہر کی بے وفائی پر سخت غصہ اور رنج تھا۔ ایک بار جب ان کا چھوٹا بیٹا سخت بیمار ہوگیا۔ بیمار بچے کے بیڈ کے قریب کھڑے اس نے اپنے شوہر سے وعدہ لیا کہ وہ میرے ساتھ اپنے ہر تعلق کو ختم کرے گا۔

اسی دوران میں سخت بیمار ہوگئی۔ اتنی شدید کہ وہ جو مجھے لعن طعن کرنے آئی تھی۔ اسے اور میری ہمسائی دونوں کو مجھے اسپتال لے جانا پڑا۔ میں اس جیسی اونچی، لمبی اور دماغ والی عورت کو دیکھتی رہی جس نے بہتر ہونے پر مجھے بتایا کہ اسے بورس سے محبت نہیں رہی تاہم وہ اپنے گھر کو ہرگز توڑنا نہیں چاہتی ہے۔

میرے صحت یاب ہونے پر بورس ہمارے گھر آیا۔ اس کے انداز میں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ میری والدہ سے پُرسکون انداز میں باتیں کرتا اور اسے یہ بتاتا رہا کہ وہ مجھے کتنا پیار کرتا ہے؟ اس کے جانے کے بعد میں بھی اس کی اِن باتوں پر دیر تک ہنستی رہی۔

1948 میں پاسترنک نے اولگا اونسکایا کو نووامیر کی ملازمت چھوڑنے کا کہا۔ ملازمت ان کے تعلقات کے لیے عذاب بنتی جارہی تھی۔ Potapov st۔ پر انہوں نے ہماری "دکان" کے نام سے ایک اپارٹمنٹ لیا اور ترجمے کا کام ذرا وسیع پیمانے پر شروع کردیا۔

یہاں اولگا اونسکایا کی ایک تحریر اس کے طرز ... پر

روشنی ڈالتی ہے۔

ہم ہندوستانی بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی نظموں کو روسی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا تھا وہ لفظوں کے پیچھے نہیں بھاگتا تھا۔ ادبی چاشنی میں انہیں ڈبوتا۔ کبھی ساری ٹرانسلیشن نہ کرتا۔ رس نکالتا اور پھوک پھینک دیتا۔

یہ 1949 کی ایک سرد شام تھی۔ جب اولگا اونسکایا کو کے جی بی نے گرفتار کیا۔ وہ اپنی یادداشتوں میں اِس خوفناک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ جب ایجنٹوں کا ڈھیر اس کے اپارٹمنٹ پر حملہ آور ہوا۔ وہ اس وقت ٹائپ رائٹر پر بیٹھی کورین شاعر Won Tu. Son کا ترجمہ کر رہی تھی۔

پاسترنک سے متعلق سارا کام انہوں نے اکٹھا کر کے سمیٹا اور مجھے Lubyanka جیل میں لے گئے۔ مجھ سے بار بار بورس اور اس کی سرگرمیوں بابت پوچھا جاتا۔ میں نے ہر بار انکار کیا۔ اس وقت میں بورس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اور میرا وہ بچہ بھی جیلوں کی اِن ہی اذیتوں میں ضائع ہوگیا۔

یہاں لیوسا پوپورا Liuisa Popora دونوں کی مشترکہ دوست کی تحریر ہمیں وہ تصویر دکھاتی ہے کہ بورس نے اِس صورت کا سامنا کیسے کیا؟! اپنی محبوبہ کی گرفتاری کا سنتے ہی اس نے لیوسا پوپورا کو فون کیا اور فوراً گوگول بلیوارڈ میں آگیا۔ جب وہ وہاں پہنچی اس نے دیکھا تھا۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھا زار زار رو رہا تھا۔ پاسترنک کے لہجے میں کیسا یاس گھلا ہوا تھا جب اس نے کہا۔

”میرا تو سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ وہ میری متاعِ حیات کو لے گئے ہیں۔ میں اسے کبھی دوبارہ نہ دیکھ سکوں گا۔ اف میرے لیے یہ سب برداشت کرنا موت سے بھی زیادہ بدتر ہے۔“

ہمیں اس کا مغربی جرمنی میں اپنے دوست کو لکھا ہوا خط بھی اس کے جذبات کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

”دیکھو وہ میرے لیے اور صرف میرے لیے جیل بھیجی گئی۔ سیکرٹ پولیس کو علم تھا کہ وہ میرے بہت قریب ہے۔ انہوں نے میرے بارے میں جاننے کے لیے اسے اذیتوں کی کس بھٹی میں جلایا مگر اس کے بند ہونٹ ایک لفظ بولنے کے لیے نہیں کھلے۔ میری زندگی اسی کی مرہونِ منت ہے کہ وہ مجھے ہاتھ تک نہیں لگا سکے۔ میں اس کے صبر، اس کی برداشت، اس کی محبت کا کتنا مقروض ہوں کوئی نہیں جان سکتا۔

یہاں اولگا کی بھی ایک تحریر اس کی شخصیت پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔ میری قید کے دوران اس نے اسٹالن کو ہمیشہ قاتل کا ہی درجہ دیا۔ ادبی حلقوں، رسائل و جرائد اور اخباروں کے دفاتر میں لوگوں سے باتیں کرتے تکرار کیے چلا جاتا۔

”یہ خوشامدی، یہ درباری کاسہ لیس یہ جو دندناتے پھرتے ہیں۔ انسانی لاشوں پر اپنی خواہشات کے محل بناتے ہیں۔ کب کوئی انہیں نکیل ڈالے گا۔“

Akhmatova کے ساتھ اس کا اچھا وقت گزرا اور اس نے ڈاکٹر ژواگو کے دوسرے حصے پر سنجیدگی سے کام کیا۔

اونسکایا کے تعلقات رہا ہونے کے بعد پاسترنک سے اسی طرح دوبارہ جڑے جیسے ماضی میں تھے۔ وہ ماضی کی طرح ایک بار پھر اس کے حصار میں تھا۔

اِس دوران پاسترنک نے جارج آرویل کی Animal Farm انگریزی میں پڑھی اور لطف اٹھایا۔

ڈاکٹر ژواگو کے کچھ ٹکڑے 1920 - 1910 میں لکھے گئے مگر درحقیقت یہ کتاب 1956 سے پہلے مکمل نہ ہوسکی۔ اسے چھپنے کے لیے نوامیر کو دیا گیا جس نے چھاپنے سے انکار کر دیا کہ کتاب سوشلزم کی سچائی سے انکاری تھی۔ اس کے ہیرو یوری ژواگو کے ہاں انفرادی فلاح کی بہتری کا پہلو زیادہ اہم تھا بہ نسبت سوسائٹی کی ترقی کے۔ چھاپنے والوں اور تنقید نگاروں نے بھی اس کے کچھ پیراگراف کو اینٹی سوویت کہا۔ اینٹی اسٹالنزم اور ”معاشرے کی صفائی“ پر بھی تنقید تھی۔ ناپسندیدہ لوگوں کو پارٹی سے نکالنے پر بھی بہت لعن طعن کا اظہار تھا۔

انہی دنوں اٹلی کی کیمونسٹ پارٹی کے متعین کردہ نوجوان جرنلسٹ مسٹر میوڈی اینگلو جو سوویت کے سماجی اور ثقافتی حلقوں میں خاصا مقبول ہو رہا تھا اور جس کا میلان کے ایک پبلیشر سے کمیشن بھی طے تھا کہ وہ روسی لکھاریوں کے نئے مسودے حاصل کرے کہ جو مغربی قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں۔

شہر میں ڈاکٹر ژواگو کے بارے میں مختلف آرا کی گردش نے اسے فوراً متوجہ کیا اور وہ پیریڈیلکونو پہنچا جہاں پاسترنک اپنے ڈاچے میں مقیم تھا۔ اس نے ناول کو اشاعت کے لیے Feltrinelli کمپنی کی پیشکش کی۔ پاسترنک

پہلے تو ایک دم سراسیمہ سا ہوگیا پھر وہ اٹھا اپنی اسٹڈی روم سے مسودہ لاتے ہوئے انجلوڈی سے بولا۔

”تو تم نے مجھے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا ہونے کی دعوت دے دی ہے۔“

یہاں ہمیں لیزر فلیش مین کے بیانات سے مزید راہنمائی ملتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاسترنک کو احساس تھا کہ وہ ایک بڑا خطرہ مول لے رہا ہے۔ ایک بھی ایسی مثال نہیں تھی کہ جہاں کسی روسی مصنف نے کسی مغربی پبلیشر سے 1920 سے لے کر اب تک کوئی ڈیل کی ہو۔ اب طوفان تو متوقع تھا۔ تاہم پاسترنک کو تھوڑی سی یہ بھی امید تھی کہ فلٹرینیلی پبلیشنگ ہاؤس کی کیمونزم سے وابستگی اور تعلق شاید سوویت اسٹیٹ کو نہ صرف اجازت بلکہ شائع کرنے پر بھی مجبور کرے۔

تاہم جب معاہدہ ہو رہا تھا اس کے ہر ہر لمحے میں پاسترنک کی زندگی کی دونوں اہم عورتیں اس کی بیوی زینیدا اور محبوبہ اولگا اونسکایا خوف زدہ تھیں۔ پاسترنک البتہ حوصلے میں تھا۔ اس نے دو ٹوک لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ ناول کی اشاعت کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہے۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کو ایک اچھے ناول سے محروم کر دینا زیادتی نہیں جرم ہے۔ یہاں فلٹرینیلی پبلیشنگ ہاؤس کو بھی خراجِ تحسین پیش کرنا پڑے گا کہ انہوں نے سوویت کے ہر دباؤ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ سوویت گورنمنٹ نے پاسترنک پر بھی دباؤ ڈالا کہ مسودہ واپس منگوائے مگر اس نے اندرخانے پیغامات سے کہا کہ حکومت کے ہر دباؤ کو نظر انداز کیا جائے۔

ناول کے خلاف ایک مسلسل مہم چلانے کے باوجود ڈاکٹر ژواگو غیر کیمونسٹ دنیا میں اپنی اشاعت پر بے حد سنسنی خیز واقعہ ثابت ہوئی۔ اسرائیلی ریاست میں بھی، تاہم اس ناول پر سخت تنقید ہوئی۔ یہودیوں سے متعلق اس کے خیالات و نظریات کھرے، سچے اور متاثر کن تھے۔ پاسترنک نے اعتراضات پر صاف گوئی سے کہا۔ ”میں تو مذاہب، قبائل اور نسل پر ایمان ہی نہیں رکھتا۔“

یہاں ہمارے سامنے فلیشن مین کا ایک بیان ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت پاسترنک بہت باقاعدگی سے ایسی عبادت گاہوں میں حاضری دینے لگا تھا جہاں عبادت مروجہ طریقوں کی بجائے لبرل طریقوں سے ہوتی تھی اور اس کا خیال تھا کہ روسی یہودیوں کے لیے اسٹالن ازم اور دہریے بننے کی بجائے عیسائی بننا زیادہ بہتر ہے۔

ژواگو کا پہلا انگریزی ترجمہ بہت جلدی میں ہوا۔ 1958 میں یہ ترجمہ منظرِ عام پر آگیا اور پچاس سال سے زیادہ عرصے تک یہی رہا۔ کتاب بیسٹ سیلر کی لسٹ پر رہی۔ اونسکایا کی بیٹی بھی اِس کتاب کی ٹائپ شدہ کاپیاں بانٹنے میں سرگرم رہی۔ یہ بڑی پُرلطف سی بات تھی کہ سوویت نقادوں نے بین کردہ ناول نہیں پڑھا پھر بھی پریس میں یہ سرگرم موضوع رہا۔ ایک لطیفہ بھی زبان زدِ عام ہوا۔ ”اگرچہ میں نے پاسترنک کو نہیں پڑھا مگر اس کی مذمت کرتا ہوں۔“

مصنف کو اندرون اور بیرون ملک اپنی آخری زندگی تک بے شمار ایسے خطوط ملتے رہے جس میں کتاب پر اچھے برے تبصرے ہوئے۔ اس ضمن میں اس کی ایک دوست Ekaterina Krashennikova کا خط ہمارے سامنے ہے جس میں وہ لکھتی ہے۔ ”پاسترنک مت بھولو یہ بات کہ تم نے یہ کام کیا۔ یہ تو روسی لوگ ہیں۔ یہ تو ان کے مصائب اور ان کے دکھ ہیں جنہوں نے تم سے یہ کام کروایا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہارے قلم کو یہ طاقت دی۔ ہاں میں یہ ضرور کہوں گی کہ تمہارا کیمیکل فیکٹری میں کام کرنے کا تجربہ تمہیں مالا مال کر گیا۔“

ناول نے چونکہ بین الاقوامی سطح پر بہترین پڑھی اور لکھنے والی کتاب کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ اب استعماری طاقتوں کو بھی سیاست کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ برٹش ایم 16 اور امریکی سی آئی اے نے اِسے نوبل پرائز دلوانے کی مہم جوئی شروع کر دی تھی۔ ایسا اس لیے بھی کیا جا رہا تھا کہ ظاہر تھا پاسترنک کو نوبل ایوارڈ کا ملنا سوویت یونین کے وقار اور معتبریت کو نقصان پہنچانے کا موجب بنتا۔ دونوں بڑی طاقتیں سرگرمی سے اس پر عمل پیرا تھیں۔

23 اکتوبر 1958 کو ادبی ایوارڈ بورس کو دینے کا اعلان ہوا۔ پچیس اکتوبر کو بورس نے سویڈش اکیڈمی کو شکریے کا تار بھیجا۔ اس میں حیرت، خوشی و مسرت اور فخر کے سے جذبات کا اظہار تھا۔

یہی وہ دن تھا جب ماسکو کے ادبی حلقوں نے اپنے تمام طلبہ سے ایک مطالبہ کیا کہ وہ سب ایک مظاہرہ کرنے کا اہتمام کریں جس میں اس کا نہ صرف ایوارڈ سے انکار بلکہ یہ مطالبہ بھی کہ بورس کو جلاوطن کیا جائے۔ اسی پر اکتفا نہ ہوا، اس مہم جوئی کو حکومتی سطح پر دہرایا جانے لگا۔

صورت ایسی گھمبیر اور کشیدہ ہوگئی کہ اس نے پریشان

ہو کر ایک دوسرا تار بھیجا۔ انکار کا، اپنی مجبوری کا۔

تاہم سویڈش اکیڈمی نے اعلان کیا۔ یہ انکار ایوارڈ پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوگا۔ یہ سویڈش اکیڈمی کے پاس رہے گا۔ ہاں اس کی تقریب نہیں ہوگی۔ اِس سب کے باوجود سوویت کے لکھاریوں نے پاسترنک کو ملامت کرنا نہ چھوڑا۔

وہ لکھتا رہا۔ لکھتا رہا۔ When the weather clears جیسا شاہکار اس کے اسی آخری دور کی یادگار ہے، شاعری کا ایک لاجواب مجموعہ۔

پھیپڑوں کے کینسر میں مبتلا ہو کر اذیتیں سہتا، اپنے دکھوں پر کڑھتا وہ 30 مئی 1960 کو اپنے "ڈاچا" میں فوت ہوگیا۔

سچ تو یہ ہے کہ 1930 کی کمیونسٹ حکومت نے اس کی شاعری کو زندہ درگور کر دیا۔ ایک طویل تاریکی کا دور جہاں وہ ترجمے جیسے کاموں سے زندگی کو گھسیٹتا رہا تھا۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ انقلاب کے ساتھ ردِ انقلاب کا لاحقہ بھی جڑا ہوتا ہے۔ شاعروں، مصنفوں، موسیقاروں اور فنونِ لطیفہ کے ماہروں نے اکتوبر انقلاب کی آبیاری اپنے خون سے کی۔ ٹراٹسکی، میکسم گورکی، مایاکوفسکی۔

لیکن وہ جو انقلاب میں کہیں عقبی سیٹوں پر تھے، ناقابلِ اعتبار تھے۔ فرنٹ لائن پر آگئے اور شاعری اِس شعر کی تفسیر بن گئے۔ "منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے۔"

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اپنے ملک کی تاریخ چھوٹی بڑی جزئیات کے ساتھ میرے سامنے آگئی تھی۔

اور پھر وہ تاریخ کا آگے بڑھتا ہوا پہیا گھما کر اسے وہیں لے جاتے ہیں جہاں سے وہ شروع ہوا تھا۔ "انقلاب کے نقیب" کا خطاب پانے والا مایاکوفسکی جیسا شاعر اور ڈراما نگار نہ اسٹالن سے ہضم ہو رہا تھا نہ اس کی بیوروکریسی سے۔ 1930ء میں اس کی خودکشی اِس نوکر شاہی کے خلاف بڑا واضح احتجاج تھی۔

ٹراٹسکی جیسے دانشور کو اسٹالن کے ایجنٹ رامون مرکیڈور نے 1940ء میں میکسیکو میں قتل کروا دیا اور 1960ء میں اسے سیاسیات پر لینن ایوارڈ سے نوازا گیا۔

عظیم شاعر اوسپ مینڈل کا بھی یہی حشر ہوا۔

شوستاکووچ کی چھٹی سمفنی پر اسٹالن نے خود پابندی لگائی۔

بورس پاسترک نے خودکشی تو نہ کی پر زندگی کی تلخیوں نے اسے پھیپڑوں کے کینسر میں مبتلا کر دیا تھا۔ 1858ء میں سویڈن نے جب ڈاکٹر ژواگو پر اسے نوبل پرائز دیا۔ اس نے خوشی کا اظہار کیا لیکن اس کے خلاف نفرت کا طوفان کھڑا ہوگیا۔ اسے غدار کہا جانے لگا۔ الزامات اور اعتراضات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ ملک بدری پر اصرار ہوا۔

ایسے وقت میں ہندوستان اور پاکستان کے اہلِ قلم میری آنکھوں کے سامنے آگئے تھے۔ میری آنکھیں بھیگ رہی تھیں کیونکہ اس کی اپیل مجھے یاد آئی تھی صدر مملکت کے نام۔

"کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا ہے کہ روس میرے لیے کیا ہے؟ میرا کام میرا نام میری عزت اور موت سب روس سے ہیں۔ مجھے کسی نوبل پرائز کی نہیں صرف اپنے وطن کی ضرورت ہے۔ میرا وطن روس۔"

اور نوبیل پرائز لینے سے اس نے انکار کر دیا۔

یہ سب پڑھ کر آنسوؤں کی بوچھاڑ تھی جو میرے گالوں پر بہہ رہی تھی۔ اسے اتنی تاویلیں دینے کی کیا ضرورت تھی۔ ہائے یہ اہلِ اقتدار۔

اس کی موت پر ایک بڑے ہجوم کے سامنے باوجود حکومتی ڈر اور خوف کے ایک نوجوان نے اونچی اور غصیلی آواز میں اس کی بین شدہ نظم Hamlet پڑھی۔

پھر ایک بڑے مقرر نے اپنی آواز کی پوری طاقت سے قبرستان میں مجمع کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ "خدا کے نامزد لوگوں کے راستے کانٹوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ پاسترنک کو بھی خدا نے منتخب کیا۔ وہ ابدیت پر ایمان رکھنے والا سچا اور کھرا انسان تھا۔ ہم نے ٹالسٹائی پر لعن طعن کی۔ ہم نے دوستووسکی کو دھتکارا اور اب ہم پاسترنک کو بھی اسی سولی پر چڑھا رہے ہیں۔ ہر وہ چیز جو ہمارے لیے عزت اور شہرت لاتی ہے۔ ہم اسے مغرب کے حوالے سے بین کرتے ہیں لیکن اب ہم اس کی اجازت نہیں دیں گے۔"

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ اور جب اس نے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا۔ اس کا لہجہ جوش وجذبے سے لبریز تھا۔ "ہم پاسترک سے پیار کرتے ہیں اور ہم اس کا ایک عظیم شاعر، ایک عظیم مصنف کے طور پر اعتراف کرتے ہیں۔ پاسترنک ہمیشہ ہمارے دلوں میں اور اپنے قارئین کے دلوں میں زندہ رہے گا۔"





براعظموں کا ٹکراؤ

سید احتشام

سائنس کا کہنا ہے کہ ہماری یہ دنیا ہر روز بدل رہی ہے۔ نئی نئی تبدیلیاں دیکھی جا رہی ہیں۔ ایک ملک کی سرحد کا فاصلہ دوسرے ملک کی سرحد سے بڑھ رہا ہے کیونکہ تمام براعظم مسلسل سفر میں ہیں۔ نئے نئے پہاڑ جنم لے رہے ہیں۔ دریا اور جھیلیں خود بخود بنتی جا رہی ہیں۔

معلوماتی تحریریں پڑھنے والوں کی مدارات

پہاڑ ہمارے سیارے کے ایک نہایت ہی اہم اور دلکش خدوخال ہیں لیکن درحقیقت یہ بالکل ہی بے قاعدہ ہیں کیونکہ یہ دنیا کے صرف چند ہی حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ ماہرین ارضیات کئی برسوں سے غور و فکر کرتے آئے ہیں کہ پہاڑوں کی تخلیق، ان کی ابتدا یا اس کی کیسے وضاحت کی جائے اور ابھی حال ہی میں انہوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ پہاڑ پورے سیارے کی آب و ہوا کو باقاعدہ بنانے میں کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

دنیا بھر میں سب سے بڑا پہاڑی علاقہ ننھا منا سا نیپالی دارالخلافہ ہے۔ یہ جنوب میں بھارت کے میدانی علاقوں اور شمال میں تبت کے سطح مرتفع کے درمیان جکڑا ہوا ہے۔ ماہرین ارضیات.... اپنے اس انتہائی اہمیت کے حامل بنیادی سوال کا جواب پانے کے لیے یہاں آتے رہے ہیں کہ پہاڑ کس طرح تشکیل پاتے ہیں۔ نیپال کرۂ ارض کا سب سے بڑا پہاڑی علاقہ ہونے کے علاوہ ایک اور بے مثال خصوصیت کا بھی حامل ہے۔ یہاں زلزلے کے ماہرین ہر روز تقریباً پندرہ زلزلوں کا پتا چلاتے ہیں۔

1960ء کی دہائی سے ماہرین ارضیات یہ سراغ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آیا ہمالیائی زلزلوں کا پہاڑوں سے کوئی تعلق ہے۔ اسی بات پر تحقیق کرنے کے لیے وہ ٹیم اس سلسلہ کوہ میں متیم تھی۔ اسی ٹیم میں جین فلپی ایورک بھی تھی۔ وہ لوگ اس علاقے میں تھے۔ جہاں ہمالیہ کی بلندی سے دریا بہہ کر بھارت کے میدانی علاقوں میں پہنچتے ہیں۔

فلپی ایورک کی ٹیم ایک خشک دریا کی گزرگاہ کے گول مٹول پتھر پر چل رہی تھی۔ جب انہوں نے غور سے دیکھا تو انہیں پرانی جلی ہوئی لکڑی کے ٹکڑے ملے۔

''یہاں جلی ہوئی لکڑی کا ایک ٹکڑا ملا ہے۔'' انہوں نے وہ ٹکڑا دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس قسم کے مواد کی عمر بتائی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر ڈھلوان سے اوپر کی یہ روش چار ہزار سال پرانی ہے اور جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔''

پہلی نظر میں ایسا لگ سکتا ہے کہ چار ہزار سال کے بعد دریا پتھروں کے درمیان سے اپنا راستہ بناتا ہوا، بیس میٹر نیچے بہنے لگا چنانچہ جین فلپ کو یقین ہے کہ کچھ اور بھی ضرور پیش آیا ہے۔

''ہمیں جو بات معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ آس پاس کی پوری زمین پرانے دریا کی گزرگاہ سمیت بلند ہو رہی ہے جب کہ وادی اپنی جگہ جوں کی توں موجود ہے۔'' جین فلپ نے بیان کیا۔

پہاڑ کے الٹے رخ آگے جا کر انہیں مزید تین پرانے دریاؤں کی خشک گزرگاہیں ملیں جو موجودہ دریا سے بھی بلند ہیں۔ سب سے بلند گزرگاہ درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔

''گویا چٹانیں ہر سال اوسطاً ایک سینٹی میٹر کی شرح سے بلند ہوتی رہی ہیں لیکن درحقیقت یہ مسلسل عمل نہیں۔ چٹانیں کسی بہت بڑے زلزلے کے سبب بلند ہوتی ہیں جیسا کہ 1934ء میں رونما ہوا تھا اور ان زلزلوں کے دوران یہاں کی چٹانیں اچانک ہی دو سے تین میٹر بلند ہو گئیں۔'' جین فلپ نے کہا۔

جین فلپ کی پیائش سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین اوسطاً ایک میٹر سالانہ کی شرح سے بلند ہوتی رہی ہے۔ یہ تیز ترین شرح ہے جو پیائش کی گئی ہے۔ یومیہ پندرہ میں سے ایک زلزلہ زمین کی سطح کو بلند کرتا ہے۔ یہ زلزلے بہت گہرائی میں واقع چٹانوں میں پیدا ہونے والے نقص سے رونما ہوتے ہیں۔''

''وہ نقص یا فالٹ پہلو ٹوٹ جاتے ہیں اور اچانک پھسلنے لگتے ہیں۔ جب بھی کوئی فالٹ پھسلتا ہے، زلزلہ پیش آجاتا ہے اور لاکھوں کروڑوں سال میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ اور اپنی جگہ سے بے دخلی جب یکجا ہوتی ہے تو پہاڑ تشکیل پاتے ہیں۔'' جین فلپ نے کہا۔

''ہمالیہ سلسلہ ہائے کوہ اب بھی فعال ہیں اور نشوونما پارہے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پہاڑ کا وسیع سلسلہ بہت کم ارضیاتی وقت میں تشکیل پاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر زلزلے پہاڑوں کو جنم دے رہے ہیں تو زلزلوں کو کون سی طاقت جنم دے رہی ہے۔

''ہم یہاں سطح سمندر سے 3600 میٹر کی بلندی پر ہیں اور جہاں میں کھڑی ہوں، یہ ایک قسم کا سلیٹی پتھر ہے اور اگر آپ غور سے دیکھیں تو ان میں گانٹھیں ہیں اور ان گانٹھوں کو توڑ سکیں تو دیکھیں گے کہ یہ فوسلز کی حامل ہیں۔'' لیولو ربولی۔ ''درحقیقت یہ ایک ایمونائٹ ہے اور یہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ گاد سمندری ہے اور اس ایمونائٹ کی مکمل ساخت سے ہم اس گاد کی عمر بتا سکتے ہیں جو لگ بھگ 150 ملین سال ہے۔

☆......☆

1960ء کے بعد سمندر کی تہہ میں ٹیکٹونک پلیٹوں کے بننے کی نئی تھیوری نے یہ وضاحت کردی کہ برّاعظم کرۂ ارض کے چاروں طرف حرکت کر رہے تھے۔ بھارت بھی گونڈوانا نامی براعظم کا ایک حصہ تھا جو قطب جنوبی کے قریب واقع تھا۔ 85 ملین سال پہلے برصغیر الگ ہوگیا اور تیزی سے شمال کی سمت ایشیا کی طرف بڑھنے لگا۔ جب یہ ایشیا سے ٹکرایا تو اس نے پرانے سمندر کی تہہ کو موڑ دیا جس سے ہمالیہ تشکیل پایا۔ 55 ملین

سال پہلے ایشیا سے پہلی بار ٹکراؤ کے وقت سے بھارت مسلسل پانچ سینٹی میٹر سالانہ کی شرح سے شمال کی سمت بڑھ رہا ہے اور تقریباً 20 ملین سال پہلے یہاں پہاڑ کی تعمیر اپنی بلندی کو پہنچ گئی تھی۔

یہ برّاعظموں کا ٹکراؤ ہی ہے جو تمام زلزلوں کا باعث بن رہا ہے اور دنیا بھر میں بلند ترین پہاڑوں کے سلسلے کو جنم دے رہا ہے، لہٰذا پہاڑوں کے راز کے جواب کا پہلا حصہ سمندر کی تہہ میں بننے والی پلیٹوں کی تیکنیک میں پوشیدہ ہے اگرچہ یہ پہاڑوں کے سلسلے نہایت ہی متاثر کن ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اس سے بھی بڑے سلسلہ ہائے کوہ کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔ ان کے شمال میں تبت کا وسیع و عریض سطح مرتفع ہے۔

تبت کا سطح مرتفع ہمالیہ پہاڑوں کے سلسلے کے شمال میں تقریباً دو ہزار کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے اور یہ بے حد بلند ہے۔ یہ پانچ سے بھی زیادہ کلومیٹر تک اوسطاً ہمالیہ جتنا ہی بلند ہے اور یہ متحرک بھی ہے لیکن یہاں ایک مسئلہ ہے۔ پلیٹ ٹیکٹونکس وہ تھیوری ہے جو زمین کی سطح پر واقع سخت اور عظیم الشان پلیٹوں کی حرکت کے بارے میں ہے۔ سخت پلیٹوں کے ٹکراؤ سے تبت جیسی شکل اور جسامت کی کوئی شے جنم نہیں لے سکتی تھی۔

گویا پلیٹ ٹیکٹونکس اس امر کی وضاحت نہیں کرتی جو ہمیں نظر آتا ہے۔ فلپ انگلینڈ نے کہا۔ چنانچہ کیوں نہ ہم سخت پلیٹوں کا آئیڈیا بالکل ہی ترک کردیں اور برّاعظموں کے بارے میں یہ سوچیں کہ وہ ایک طرح کے سیال تھے۔

جب انڈیا ایشیا سے ٹکرایا تو اس ٹکراؤ کی طاقتوں کو سیال چٹانوں پر موجود دوسری طاقت نے متوازن کیا ہوگا۔ اس طاقت کو کششِ ثقل کہتے ہیں۔

1980ء کے عشرے میں فلپ اور ان کے رفقاء سیال کی حرکت کے بنیادی قوانین کو استعمال کر کے تبت کی تشکیل کے مسئلے سے نبرد آزما تھے۔ کیا وہ کسی سیال کو ایسی شکل دے سکتے تھے کہ وہ ایشیا کے پہاڑوں کے وسیع سلسلے جیسا نظر آئے؟ انہیں مساوی تقسیم پر پانچ سال سے بھی زیادہ عرصہ تک کام کرنا پڑا۔ جب جا کر وہ ایک ایسی شکل دینے میں کامیاب ہوسکے جو تبت سے مشابہ تھی۔

تو یہ پہاڑوں کے سیال ہونے کی ان کی تھیوری جیسی لگتی تھی جو تبت کی ساخت کی وضاحت کرسکتی تھی لیکن اس تھیوری نے ایک غیر معمولی پیش گوئی بھی کردی۔ جب پہاڑوں کو اوپر دھکیلنے والی طاقت رک گئی کہ پہاڑ بہنے لگے اور فلپ انگلینڈ کو وہ جگہ مل گئی جہاں پہاڑ بہتے ہوئے لگے اور وہ جگہ تھی یونان۔

یہ اس کلیسا کے کھنڈر ہیں جہاں دو ہزار سال پہلے سینٹ پال کورِنتھیس تبلیغ کرتے تھے لیکن یہ زیر آب نہیں ہے کیونکہ سمندر کی سطح بلند ہو رہی ہے۔ یہاں کی زمین آہستہ آہستہ دھنس رہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پورا یونان ہی سمندر میں دھنس رہا ہے اور جس طرح یہ دھنس رہا ہے وہ چٹانوں سے صاف ظاہر ہے۔

''یہ ناقابل یقین حد تک چکنا ہے۔'' فلپ انگلینڈ نے پتھر پر پانی انڈیلتے ہوئے کہا اور پھر اس پر ہاتھ پھیرا۔ ''بالکل چکنا، یہ ایک فالٹ کا حصہ ہے جو یہاں ہمارے پیروں کے نیچے دس یا پندرہ کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ آپ یہ تصور کرسکتے ہیں کہ ایک ملین سال پہلے چٹان کا ایک دوسرا ٹکڑا بھی تھا جو فالٹ کے ساتھ جکڑا ہوا تھا اور جب کوئی زلزلہ آیا تو وہ چٹان جو یہاں تھی ایک یا ڈیڑھ میٹر نیچے دھنس گئی۔ ہم اسے نارمل فالٹ کہتے ہیں اور نارمل فالٹس، پہاڑوں کی تشکیل کا الٹ کرتے ہیں یہاں کی زمین دھنس رہی ہے۔''

فلپ اور ان کی ٹیم نے اس کا پتا لگانا شروع کیا کہ یونان کتنی تیزی سے حرکت کر رہا ہے۔ انہیں پیائش کرنے کے لیے تقریباً ہر پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنا پڑا۔ وہ دن بھر GPS یعنی گلوبل پوزیشننگ سیٹلائٹ کے ذریعے پورے یونان میں فالٹس کی سینکڑوں حرکتوں کے نمونے اکٹھا کرنے کے بعد وہ فاصلے کی پیائش مکمل کرسکیں۔ یہ بالکل صحیح پیائش ہے۔ سو میل دور ایتھنز کے فاصلے کی ٹھیک ٹھیک پیائش پانچ ملی میٹر کی جاسکتی ہے۔ وہ جن سروے پوائنٹس سے استفادہ کر رہے تھے وہ 1980ء کی دہائی میں بنائے گئے تھے۔ جب پورے یونان کی بالکل درست پیائش کی گئی تھی۔

''اٹھارہ اعشاریہ تو۔'' ٹیم کے ایک ممبر نے پیائش کرتے ہوئے کہا۔

''اب ہم واپس جا کر پتا چلاسکتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک سروے پوائنٹ کتنا آگے بڑھا ہے۔'' فلپ نے کہا۔ ''یہاں شمال میں جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، یہ زیادہ نہیں بڑھا ہے۔ یہاں وسط میں جہاں ہم ابھی ہیں یہ تقریباً دو میٹر بڑھا ہے اور نیچے یہاں جنوب مغرب میں پچھلے سو برسوں

کے دوران یہ چار یا پانچ میٹر آگے بڑھی ہے۔ یہ رفتار انڈیا کے ایشیا کی طرف بڑھنے جتنی تیز ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک ہی سمت میں جنوب مغرب کی سمت بڑھ رہا ہے۔ غور کریں کہ یہاں اس کی حرکت دو میٹر ہے جب کہ یہاں چار یا پانچ میٹر رہی ہے۔" فلپ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "گویا زمین پھیل رہی ہے۔ ان سب کی حرکت ایک ہی سمت میں ہے اور اس کی ایک وجہ ہے۔ یہاں پورے خطے میں سمندر کی تہہ کا سب سے گہرا حصہ واقع ہے۔...... یہ پہاڑ سے نیچے اردگرد کی سب سے نچلے زمین کے حصے کی طرف بہہ رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی پھیل رہا ہے۔"

یہ رود بار کارینتھ ہے۔ یہ ان مقامات میں سے ایک ہے جہاں یونان پھیل رہا ہے۔ یونان کے دھنسنے کے ساتھ ہی زمین دھنستی جا رہی ہے۔ اگلے چند ملین سال میں یہ خوب صورت ملک سمندر کے نیچے غائب ہو چکا ہوگا تو پہاڑوں کے سلسلے جو کرۂ ارض پر بکھرے ہوئے ہیں۔ ایک متحرک سیال سسٹم کا حصہ ہیں جو براعظموں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے سے وجود میں آتے ہیں۔ پہاڑوں کی تعمیر، سیارے کی آب وہوا کو کنٹرول کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔

☆......☆

سوئٹزر لینڈ میں بہت سی وادیوں میں گلیشیئر یعنی برف کے دریا ہیں جو پہاڑوں کے درمیان سے اپنا راستہ بناتے ہوئے بہتے ہیں۔ گلیشیئر ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں۔ پچھلی صدی میں وہ اس پہاڑ سے بہت نیچے پھیل گئے تھے۔ ایک ایسے ہی وقت میں تاریخ طبیعی کے ایک سوئس ماہر لوئس اگاسی نے ایسی دریافتیں شروع کر دیں جس نے اس آئیڈیا کو چیلنج کر دیا کہ زمین کی آب وہوا بنیادی طور پر کبھی نہیں بدلی تھی۔

جدید دور کے ماہر ارضیات کرچن شلنٹر نے ایک بار پھر چٹانوں سے اس دریافت کا ازسرنو سراغ لگایا ہے۔ ان کا تعلق یونیورسٹی آف برن سے ہے۔

"یہ ان مقامات میں سے ایک ہے جہاں اگاسی گلیشیئر کا مطالعہ کرنے آیا کرتے تھے۔" پروفیسر شلنٹر نے گھٹنوں کے بل ایک چٹان کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ ایک بہت ہی خاص مقام ہے۔ یہ چٹانوں کی ایک انتہائی خوب صورتی سے پالش کی ہوئی سطح ہے۔" انہوں نے چٹان پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"سوال یہ ہے کہ اتنی عمدہ پالش آخر ہوتی کیسے ہے؟ یہ حرکت پذیر گلیشیئر کی تہہ میں ہوتی ہے، جہاں بہت سے پتھروں کا بہاؤ، پالش کرنے والے ایجنٹ کا کام کرتا ہے۔"

برف میں پھنسے ہوئے پتھر کے قسم قسم کے ٹکڑے اس سبب سے کسی عمدہ ریگ مال کی طرح رگڑ کھاتے ہیں۔ پہاڑ کی طرف دور دور تک پھیلی ہوئی چکنی سطح ظاہر کرتی ہے کہ یہاں کسی زمانے میں برف کی ایک کلومیٹر موٹی تہہ تھی لیکن برف محض پتھر کے ذرات ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ اپنے ساتھ بہا لے جاتی تھی۔ یہ گول مول پتھر گلیشیئر میں سے گرے ہیں اور یہ برف کے بہنے کی زیادہ سے زیادہ رفتار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ گویا کسی زمانے میں پورا ملک بھلا برف سے ڈھکا ہوا ہوگا۔

آج سے اٹھارہ ہزار برس پہلے ایک کلومیٹر دبیز برف نے سمندر کو ڈھک دیا ہوگا۔ برف سوئٹزر لینڈ سے باہر تک پھیل گئی تھی۔ دوسرے ملکوں میں پائے جانے والے گول مول چکنے پتھروں نے اس امر کی نشاندہی کی کہ برف کی وسیع وعریض چادروں نے بیشتر یورپ اور شمالی امریکا کو بھی ڈھک دیا تھا۔ کسی کسی مقام پر برف کی تہہ چار کلومیٹر تک موٹی تھی۔

سوئس کی کان کے یہ عمدہ سنگریزے گلیشیئر اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ یہ مخصوص کان امتیازی خصوصیت کی حامل پرتوں پر مشتمل ہے جو نصف ملین سال سے جمتی رہی ہیں۔ گلیشیئر کے ملبے کے درمیان جکڑی ہوئی ایک تیسری پرت ہے جو ایک بالکل ہی مختلف کہانی بیان کرتی ہے۔

"آپ کو کسی چیز کے یہ عجیب وغریب ٹکڑے باہر نکلے ہوئے نظر آ رہے ہیں اگر میں ان میں سے کسی ایک ٹکڑے کو پکڑوں تو یہ قدیم لکڑی کا ایک خوب صورت سا ٹکڑا ہوگا۔" پروفیسر کرچن شلنٹر نے ایک ٹکڑے کی طرف اشارہ کیا جو پتھر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ "اگر ہم ان قدیم لکڑیوں کے ٹکڑوں کا تجزیہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ جب یہاں کے اطراف میں جنگلات تھے تو درجہ حرارت موجود درجہ حرارت سے بھی دو یا دو اعشاریہ پانچ ڈگری زیادہ گرم تھا۔"

سردی سے گرمی اور ایک بار پھر سردی کی یہ تبدیلی صرف ایک لاکھ پچاس ہزار برسوں میں رونما ہوئی۔ درحقیقت کان سے حاصل ہونے والی دیگر شہادتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ بہت ہی کم مدت میں آب وہوا کم سے کم تین مرتبہ تبدیل ہوئی۔ اس دریافت نے کہ زمین کی آب وہوا کبھی یکسر مختلف ہوا کرتی تھی، ایک بہت ہی گہرا اثر ڈالا۔ ماہرین ارضیات نے ہمارے سیارے پر رونما ہونے والی آب وہوا میں تبدیلی کی الجھی ہوئی تاریخ سلجھانے کے لیے وقت میں سفر کا آغاز کیا۔ برف کی لامتناہی اور نہایت عظیم الشان چادروں کی تاریخ کی حتمی سمجھ ایک ایسے مقام کو دیکھنے پر پیدا ہوئی جو گرم سیر جزیرہ بار باڈوس سے ہزاروں کلومیٹر دور برف سے ڈھکا ہوا ئے سائی کے انتہائی فاصلے پر واقع تھا۔

☆......☆

ڈاکٹر مورین ای ریمو میس چوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی یو ایس اے کے پروفیسر ہیں۔ وہ ایک ارضیاتی کیمیا داں ہیں جو اس برف کے دور کی حدت کا سراغ لگانے کے لیے بارباڈوس جاتے رہتے ہیں۔ یہ بات عجیب لگتی ہے کہ اس دور کا زیادہ ثبوت میں برف ان چٹانوں پر اپنا نشان چھوڑ گئی ہے، جس سے یہ جزیرہ ڈھکا ہوا تھا۔

"تقریباً پورا جزیرہ ہی مونگے کی چٹانوں سے بنا ہوا ہے۔" ڈاکٹر مورین چٹانوں پر جھکتے ہوئے بولے۔ "مشرقی کیریبین کے دیگر جزیروں کے برعکس جو آتش فشانی ہیں، یہ جزیرہ تعمیری ہے، کیونکہ یہ مونگے کی چٹانوں سے بنا ہوا ہے۔" وہ رک کر چٹانوں کا قریبی جائزہ لینے لگے۔ "یہ خوب صورت ہے۔ میرا مطلب ہے آپ کو مونگے کی ان چٹانوں پر انفرادی نامیاتی اجسام بھی نظر آ سکتے ہیں۔" انہوں نے جھک کر ایک گھونگا اٹھا لیا۔ "یہ خوب صورتی سے محفوظ ایک بہت بڑا گھونگا ہے۔"

فوسلز میں تبدیل ہو جانے والی چٹانوں کا یہ سلسلہ سمندر کی سطح میں بہت زیادہ پستی آنے کی وجہ سے ساحل پر آ گیا ہے۔ برف کی چادر نے وسعت پذیر ہونے کے ساتھ ساتھ کئی ملین کیوبک پانی کو جکڑ دیا۔ اپنی انتہا کو پہنچ کر برف کی یہ چادریں دنیا بھر میں سمندر کی سطح کو ایک سو تیس میٹر پست کرنے کا سبب بنیں۔ اس کے عالمی اثرات سے براعظموں کی شکل بدل گئی ہوگی۔ بار باڈوس میں جزیروں کے چاروں طرف بڑھتی ہوئی مونگے کی چٹانیں ابھر آئی ہوں گی اور زمین سخت ہو گئی ہوگی لیکن بار باڈوس میں یہ مونگے کی واحد بلند سطح نہیں ہے۔ جزیرے کے پہلو میں ایسی کئی تہہ دار بلند سطحیں ہیں۔ تہہ

ڈنمارک کی ایک کمپنی نے کوؤں کو سڑک اور پارکوں سے سگریٹ کے ٹوٹے اٹھانے کی تربیت فراہم کرنے کا منصوبہ بنایا ہے تاکہ پرندوں کی مدد سے شہر کو صاف رکھا جا سکے۔ انڈسٹریل ڈیزائنر روبن وان ڈرلیوٹن اور بوب سپائیکمان نے پہلے تو سگریٹ کے ٹوٹے صاف کرنے کے لیے روبوٹ استعمال کیا جس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، اس کے بعد انہوں نے شہروں میں موجود سب سے عام پرندے اور کوؤں کو اس کام کی تربیت دینے کا پروگرام بنایا۔ ماہرین کے مطابق کوے کسی چمپینزی کی طرح ذہانت رکھتے ہیں۔ اس بناء پر انہیں آزمانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ سگریٹ کے ٹوٹے صاف کرنے کے لیے ایک اور موجد جوشور کلائن نے کور باکس تیار کیا۔ یہ ایک مشین ہے جو از خود کوؤں کو سڑک صاف کرنے کی تربیت دیتی ہے اور اس کے بدلے میں کوے کو مونگ پھلی ملتی ہے۔ اس تربیت سے کوے بہت آسانی سے سگریٹ کے ٹکڑوں کو اٹھا سکتے ہیں۔

☆☆☆

شمالی چین میں واقع ہیوبی صوبے میں بنایا جانے والا ایسٹ تائی ہانگ پل تین ہزار آٹھ سو فٹ اونچا ہے اور اس پر چلنے والے سیاحوں کے اس وقت چھکے چھوٹ گئے جب ان کے قدموں کے نیچے شیشے سے بنا یہ پل چٹخنے لگا اور اس میں دراڑیں پڑ گئیں۔ اس پل پر چلنے والے ایک سیاح کے قدموں...... تلے موجود شیشے میں دراڑیں پڑنے کا عمل شروع ہو کر آگے بڑھتا چلا گیا تو وہ سیاح چیخنے چلانے لگا اور پل پر لیٹ سا گیا۔ وہاں موجود دیگر لوگ بھی شدید پریشان ہو گئے مگر یہ پریشانی اس وقت حیرت میں بدل گئی جب پتا چلا کہ حکام نے سیاحوں کو لطف اندوز کرنے کے لیے اس پر لگے شیشے میں تھری ڈی افیکٹ شامل کیے ہیں، اس پل میں حرکت کا پتا چلانے کے لیے انفراریڈ سینسر نصب کیے گئے ہیں، اس کے علاوہ اس میں ساؤنڈ افیکٹ بھی شامل کیے گئے ہیں تاکہ جب دراڑوں والا افیکٹ ظاہر ہو تو اس کے ساتھ ایسی آوازیں بھی آئیں کہ جیسے واقعی شیشہ کریک ہو رہا ہے اور جلد ہی ٹوٹنے والا ہے۔

مرسلہ: بنشی محمد عزیز مے۔ لڈن

دار سطحیں، سمندر کی سطح میں بار بار رونما ہونے والی تبدیلیوں سے بنی ہوں گی اور سمندر کی سطح میں بار بار تبدیلیوں کا مطلب برف کی صرف ایک نہیں بلکہ کئی چادروں کا بڑھنا اور کمزور پڑ جانا ہے۔

بار باڈوس واحد جزیرہ ہے جہاں کئی تہہ دار بلند سطحیں ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ زمین کے اندر ایسا کچھ ہو رہا ہے جو بہت عجیب ہے۔ بار باڈوس بہت ہی عجیب جزیرہ ہے کیونکہ ٹیکٹونک قوتیں اسے بہت آہستہ آہستہ سمندر سے بلند کر رہی ہیں۔ ہمیں بار باڈوس میں مونگے کی چٹانوں سے بنے ہوئے قدمچوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے جو بلندی کی طرف جاتا ہے اور ایک مدت گزر جانے کے بعد نیچے بھی آ جاتے ہیں۔ لہٰذا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ وہ بلند ترین مونگے کی چٹانیں ہیں جو طویل عرصے میں سمندر سے نمودار ہوئی تھیں۔ تو یہ سب کی سب آہستہ آہستہ سمندر سے باہر دھکیلی جا رہی ہیں۔

بار باڈوس چونکہ بلند ہو رہا ہے، یہ سطح سمندر اور آب و ہوا میں تبدیلی کا ایک بے مثال ریکارڈ مرتب کر رہا ہے۔ جب جب سمندر کی سطح بلند یا پست ہوتی ہے، ایک نئی مونگے کی بلند سطح نمودار ہو جاتی ہے۔

”ہمارے پاس اس کا بہت ٹھوس ثبوت ہے کہ ہم جہاں کھڑے ہیں وہ کبھی سمندر کی سطح کے برابر تھی۔ اسے بار باڈوس کی ٹیکٹونک قوتوں نے بلند کیا ہے۔“ ڈاکٹر مورین نے کہا۔

نیچے ایک اور بلند سطح ہے اور ایک تیسری بلند سطح بھی ہے جو نظروں سے اوجھل ہے۔ یہ تینوں ٹیریس ان ادوار کی عکاسی کرتے ہیں جب یہ بہت گرم تھا اور سمندر کی سطح بہت بلند تھی۔

”اب 60ء کی دہائی کے اواخر یا 70ء کی دہائی کے اوائل سے ہم نے تیکنیک کو ترقی دی ہے جس سے ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ اس قسم کے نمونے کی تاریخ بتا سکیں اور اسی وجہ سے ہم جانتے ہیں کہ یہاں موجود چٹانوں کا سسٹم ایک لاکھ پچیس ہزار سال پرانا ہے۔“ ڈاکٹر مورین نے تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں وہاں جو ایک چٹان نظر آ رہی ہے ایک لاکھ پانچ ہزار سال پرانی ہے اور جو نظروں سے بالکل اوجھل ہے، بیاسی ہزار سال پرانی ہے۔“

☆......☆

سوئٹزر لینڈ اور بار باڈوس جیسے مقامات کی شہادتوں نے برف کے دور کے ایک تانے بانے کو اجاگر کیا ہے۔ پچھلے لاکھوں برسوں میں برف کی چادریں دس گنا زیادہ نرم اور کمزور پڑ گئی ہیں لیکن یہ کبھی بھی یکسر غائب نہیں ہوئیں لیکن زمین کی تاریخ میں ایک لاکھ سال ایک بہت ہی مختصر سا عرصہ ہے۔ یہ دیکھنا کہ آیا یہ تانا بانا لامتناہی ماضی کے ادوار میں بھی جاری تھی، ایک حیرت انگیز مقام کو دیکھنے کے مترادف ہوگا۔ یہاں ایک ریسرچ شپ اپنا کام کر رہا ہے جس پر عملہ جیمز آسٹن کی سربراہی میں اپنے تفتیشی کام میں مصروف عمل ہے۔ جیمز آسٹن کا تعلق یونیورسٹی آف ٹیکساس سے ہے۔ یہ جہاز آب و ہوا کی تاریخ کی حدود کو پیچھے دھکیل رہا ہے۔ یہ دنیا کا واحد جہاز ہے جو سمندری گاد کی تہہ میں انتہائی گہرائی تک سوراخ کر سکتا ہے۔ یہ چوبیس گھنٹے مسلسل سوراخ کرتا رہتا ہے۔

”براعظمی برفانی چادروں کی گلیسی ایشین اور انٹر گلیسی ایشین یعنی ان کے تشکیل پانے ان کے باہمی عمل نیز ان کے نرم اور کمزور پڑنے کا نظریہ بالکل یہی تھا۔ یہ پہلی .... بار براعظمی سمجھا اور پرکھا گیا لیکن براعظمی ریکارڈ کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔ آپ اس کے سطح پر نمودار ہونے کا معائنہ کر رہے ہیں اور ادھر زمین کٹ پھٹ رہی ہے۔ آپ کو ریکارڈ کا ایک حصہ مل نہیں رہا ہے۔“ جیمز آسٹن نے تجزیہ پیش کیا۔ ”سمندر میں قریب قریب یہ مسئلہ نہیں ہوتا۔“

کیچڑ کی سب تہیں گھٹ کر خوردبینی گرد بن جاتی ہیں جو طشت میں نمونے کے طور پر نظر آ رہی ہیں۔ یہ ان جانوروں سے تعلق رکھتی ہیں جو تھیورم کہلاتے تھے۔ ان کے خولوں پر یہ معلومات نقش ہیں کہ جب تھیورم زندہ تھے تو آب و ہوا کیسی تھی۔

”جب وہ مرے تو سمندر کی تہوں میں دھنس گئے۔“ جیمز آسٹن نے کہا۔ ”اور وہ تہوں میں مدغم ہو گئے۔ وہ تہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جمتی گئیں اور ہم مسلسل ان تہوں کی بنیادیں نکال نکال کر آب و ہوا کی تبدیلی کا ریکارڈ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ یہ خاص جگہ ہے کیونکہ یہ ایک بہت ہی گھنا حصہ ہے لہٰذا ہم پوری کہانی تفصیل سے بیان کر سکتے ہیں۔“

کیچڑ کا یہ ستون بیس ہزار سال میں بنا ہے۔ شمال بحر اوقیانوس کے دوسرے مقامات پر سمندر کی تہہ کے اوپر 70 ملین برسوں کی تہہ جمی ہوئی ہے۔ ڈیلنگ پروگرام سے

متواتر تھیورم کا ذخیرہ نکالا جا رہا ہے۔ مختلف قسم کے تھیورم کا شمار کرنے اور ان کے خولوں کا کیمیاوی تجزیہ کرنے پر ہمیں پچھلے کم سے کم 70 ملین برسوں کی آب و ہوا کا سراغ ملتا ہے۔ تجزیے سے ڈائنوسارس کے زمانے سے اب تک کی آب و ہوا میں تبدیلی کا ایک پیٹرن ظاہر ہوا ہے۔

''ہم نئے انداز سے یہ سمجھنے کے قابل ہو گئے ہیں کہ پچھلے 70 ملین برسوں میں دنیا کا درجہ حرارت کتنا بدلا ہے۔'' ڈاکٹر مورین نے کہا۔ ''یہ آج ہے اور یہ 70 ملین سال پہلے ڈائنوسارس کا زمانہ ہے اور یہ گرم اور یہ سرد آب ہوا ہے۔'' وہ ریت پر گراف بنا کر سمجھاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''ہم یہ دیکھتے ہیں کہ 40 سے 70 ملین سال پہلے آب و ہوا بے انتہا گرم تھی۔ آج کی بہ نسبت بے انتہا گرم۔ آج کے مقابلے میں اوسطاً تقریباً 15 ڈگری زیادہ گرم اور یہ کہ اس وقت سے درجہ حرارت میں بتدریج کمی واقع ہو رہی ہے۔ 35 ملین سال پر انٹارکٹیکا کے برف بننے نیز شمالی امریکا اور اسکینڈے نیویا میں بڑی بڑی برفانی چادروں کے وسعت پذیر ہونے کے ساتھ ساتھ آب و ہوا بہت تیزی سے سرد ہوتی چلی گئی۔ جو پچھلے 70 ملین سال کی نمایاں خصوصیت ہے۔''

برف کی چادروں کے اتار چڑھاؤ کا پچھلا ملین سالہ پیٹرن اس سیارے کے ٹھنڈا ہونے کے اس سے بھی بہت زیادہ طویل عرصے کا اختتام ہے۔ ارضیاتی اصطلاح میں ہم اب بھی برفانی دور میں ہیں۔ اب بھی انٹارکٹیکا اور گرین لینڈ پر مستقل برفانی چادریں اور بلند پہاڑوں پر گلیشیئرز موجود ہیں۔ تھیورم کا شکریہ۔ ہم اب جان گئے ہیں کہ یہ صورتِ حال ہمیشہ سے نہیں رہی ہے۔ تقریباً 70 ملین سال سے یعنی ڈائنوسارس کے زمانے کے دوران سے چند ملین سال بعد تک اس قدر گرمی اور حدت تھی کہ کرۂ ارض پر کہیں بھی برف کا وجود نہیں تھا لیکن ڈائنوسارس سے پہلے کیا تھا؟

☆......☆

مارٹن ڈی ویٹ ایک ماہر ارضیات ہیں جو ماضی میں لاکھوں سال پیچھے سفر کرنے کے عادی ہیں۔ اس وقت وہ ایک جیپ میں باربیٹن کے مضافات میں سفر کر رہے ہیں۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رک کر جیپ سے اترتے ہیں اور چٹانوں کی طرف بڑھتے ہیں۔ یہاں ہر طرف چٹانیں ہی چٹانیں ہیں۔ بعض چٹانوں کے ٹکڑوں پر پچی کاری نظر آتی ہے۔ ان ٹکڑوں کی پچی کاری کو ٹلیائٹ کہتے ہیں اور جب یہ یہاں جنوبی افریقا میں دریافت ہوا تو اس نے افریقا کی آب و ہوا کے بارے میں ماہرین ارضیات کو باطل قرار دے دیا۔

''اس غیر معمولی چٹان کو دیکھیں۔'' مارٹن ڈی وٹ نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''یہ...... یہ ایک بہت ہی عجیب و غریب چٹان ہے اور اسے جو شے بہت ہی انوکھا پن عطا کرتی ہے وہ پتھروں کے یہ چھوٹے بڑے گول مول ٹکڑے ہیں۔''

شروع شروع میں پتھروں کے ان ٹکڑوں کے الجھے ہوئے پیٹرن کو سمجھنا بہت ہی مشکل تھا لیکن خوش قسمتی سے ان کی تفصیلات طے کرنے والے ماہر ارضیات نے نصف کرۂ شمالی میں کچھ وقت گزارا تھا اس لیے وہ سمجھ گئے کہ پتھر کے وہ ٹکڑے یقیناً برف کی کسی چادر سے گرے ہوئے قدیم ملبے ہیں۔ چٹانوں کا یہ پیٹرن اسی کا نتیجہ ہے اور اس سائٹ پر اس چٹان کے تشکیل پانے کی اور بھی نشانیاں ہیں۔

''اس کے اوپر اور اس کے نیچے فوسلس ہیں اور ہمیں ان فوسلس کی عمر کا پتا ہے۔ یہ مخصوص ٹلائٹ 300 ملین سال پرانا ہے۔ لہٰذا یہ سوچتے ہوئے بہت عجیب لگتا ہے کہ 300 ملین سال پہلے جنوبی افریقا کا یہ ایریا برف کی بہت ہی دبیز چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔'' مارٹن ڈی وٹ نے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہاں کی آب و ہوا میں درجہ حرارت یقیناً بہت ہی مختلف رہا ہوگا۔ ایک برفانی دور جس میں ایک بہت ہی وسیع و عریض اور عظیم الشان برفانی چادر نے اس مضافات کو ڈھک رکھا تھا۔''

جنوبی افریقا کے اس حصے میں پائے جانے والے ٹلائٹ انٹارکٹیکا بھارت اور آسٹریلیا جیسے دوسرے براعظموں میں بکھرے ہوئے پائے گئے ہیں۔ یہ لگ بھگ ایک ہی عمر کے ہیں یعنی 300 ملین سال پرانے لیکن یہ پھیلی ہوئی تقسیم بالکل قابلِ فہم ہے۔

تین سو ملین سال پہلے دنیا بہت مختلف تھی۔ نصف کرۂ جنوبی کے سارے براعظم ایک جگہ اکٹھا تھے۔ جسے سپر براعظم گونڈوانا کہتے تھے۔ اس زمانے میں جنوبی افریقا قطب جنوبی پر واقع تھا اور بھارت، آسٹریلیا اور انٹارکٹیکا کے براعظم اسی طرح کی برفانی چادر سے ڈھکے ہوئے ہوں گے۔ ٹیلائٹس سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ کرۂ ارض اس سے پہلے بھی ایک اور برفانی دور سے گزر چکا ہے اس زمانے میں برف نے سپر براعظم کو ساٹھ ملین سال سے بھی زیادہ عرصے تک جکڑے رکھا تھا۔

''یہ ایک برفانی دور نہیں، جس سے ہم گزر رہے بلکہ ماضی بعید میں ایک سے زیادہ برفانی دور رہا ہے۔'' پروفیسر مارٹن نے کہا۔

''یہاں تک کہ ہمیں جنوبی افریقا میں بھی چار سو تیس چار سو چالیس ملین سال پہلے کی گلیسی ایشین یعنی یخ بستگی کے ثبوت ملے ہیں اور افریقا کے میدانوں میں افریقا کے بہت سے حصوں میں 700 ملین سال پرانی یخ بستگی کے مزید ثبوت ملے ہیں۔ ہم دنیا میں کہیں بھی تقریباً ڈھائی ملین سال پیچھے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم جتنی دور بھی جائیں اس ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کرۂ ارض برفانی ادوار کے اندر اور باہر ہوتا رہا ہے۔''

☆......☆

یہ ریسرچ اسٹیشن روئے زمین پر واقع ایک سب سے الگ تھلگ لیبارٹری ہے۔ قریب ترین زندگی کے آثار یہاں سے پانچ سو کلو میٹر دور ہیں۔ یہ گرین لینڈ کے وسط میں واقع نارتھ گرپ کیمپ سائٹ ہے۔ سال میں تین مہینے یہاں سائنس دانوں کی ایک ٹیم ڈیرہ ڈالے رہتی ہے۔ یہاں سائنس دانوں کے ذہن میں ایک ہی بات ہے۔ برف کی تہہ میں مسلسل طویل ترین سوراخ کیے جانا اور اس کے گودے کو نکالنا۔ وہ اب تک تقریباً تین میں پہنچ گئے ہیں۔ مزید ڈیڑھ کلو میٹر سوراخ کرنا باقی ہے۔ سطح پر لائی جانے والی ہر میٹر کی برف ماضی کے برفانی دور میں مزید ایک قدم پیچھے لے جاتی ہیں۔ برف کے اندر قدیم فضا کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ برف کے گرنے اور منجمد ہونے کے دوران ہوا کے ننھے ننھے پاکٹ ان میں مقید ہو جاتے ہیں۔ ہوا کے یہی بلبلے ٹائم کیپسول یا وقت کی ڈبیا ہیں۔ جب ماہرین نے کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کی شہادتوں کے لیے نمونے اکٹھے کرنے شروع کیے تو انہیں ایک ایسی چیز ملی کہ وہ پیچ ہی میں رک گئے۔ پچھلے یخ بستہ دور میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی سطح آج کی نسبت بہت ہی کم تھی۔

''کاربن ڈائی آکسائیڈ نے کرۂ ارض کی آب و ہوا کو کنٹرول کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے، اس کے پیشِ نظر یہ بہت دلچسپ اور قابلِ فہم امر ہے۔'' ڈاکٹر مورین نے کہا۔ ''یہ ایک گرین ہاؤس گیس ہے۔ یہ ہماری فضا میں ہمیشہ موجود رہتی ہے اور کرۂ ارض کی سطح کو گرم رکھنے کا کام کرتی ہے۔ اگر گرین ہاؤس گیس نہ ہوتی اور CO_2 نہ ہوتا تو کرۂ ارض کی سطح اتنی گرم نہ ہوتی۔ لہٰذا اگر برفانی دور میں اس گرین ہاؤس کاربن ڈائی آکسائیڈ کی سطح نیچے آ گئی اور آب و ہوا سرد ہو گئی تو گرین ہاؤس کے اثرات کو فزکس اور کیمسٹری کی رو سے سمجھنے کے بعد یہ حقیقت قابلِ فہم ہے۔''

ایک ارضیاتی کیمیا داں رابرٹ برنر کا خیال ہے کہ انسان کی وجہ سے فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ میں اضافہ ہونے سے پہلے دیگر فطری عمل بھی تھے جو فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ میں کمی اور اضافے کے سبب تھے اور یہ سب اس عمل کا حصہ ہے جسے کاربن کی طویل المیعاد گردش کہتے ہیں جو کئی ملین سال سے جاری ہے۔

''اس پورے عمل کا آغاز اس وقت ہوا جب آتش فشاں سے CO_2 خارج ہو کر فضا میں شامل ہوئی۔'' ڈاکٹر رابرٹ برنر نے بیان کیا۔

جب بھی کوئی آتش فشاں پھٹتا ہے وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ فضا میں اگل دیتا ہے۔ اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو یہ کثیف ہونے لگتی ہے لیکن بارش اسے رفتہ رفتہ دھو دیتی ہے اور پھر یہ بارش کے پانی میں حل ہو کر تیزاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ تیزاب ایک عمل کے ذریعے جسے ویدرنگ کہتے ہیں۔ چٹان کو کھانے لگتا ہے جو کاربن ڈائی آکسائیڈ کو ایک دوسرے کیمیکل کاربونیٹ میں بدل دیتا ہے۔

''یہ حل شدہ کاربونیٹ بالآخر دریا کی راہ لیتا ہے اور پھر دریا کے بہاؤ کے ساتھ سمندر میں شامل ہو جاتا ہے۔'' رابرٹ برنر نے مزید بیان کیا۔

اس حل شدہ کاربن کو مونگا اور دوسرے نامیاتی اجسام سمندر کے پانی سے الگ کرتے ہیں۔ جب یہ نامیاتی اجسام مر جاتے ہیں تو ان کی باقیات سمندر کی تہہ پر نشو و نما پاتے ہیں اور آخر میں چونے کے پتھر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

''اب یہ چونے کا پتھر جو یہاں موجود ہے اس گردش کو آخر کار مکمل کرتا ہے کیونکہ یہ اتنی گہرائی میں دفن ہوتا ہے کہ یہ تپتا ہے، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے اور اس چونے کے پتھر سے کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج ہو کر دوبارہ سطح پر پہنچ جاتا ہے یا پھر آتش فشاں کی صورت پھٹ جاتا ہے۔ اس کو کاربن کی طویل المیعاد گردش کہتے ہیں۔'' رابرٹ برنر نے اپنی بات مکمل کی۔

تمام چیزیں یکساں ہونے کے باعث کاربن ڈائی آکسائیڈ کی سطح Co2 ہمیشہ قائم رہتی ہے کیونکہ گیس مسلسل فضا کے اندر اور باہر ہوتی رہتی ہے لیکن سیارہ مستقل غیر متعین حالت میں رہتا ہے۔ براعظم روئے زمین پر کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ آتش فشاں جاگتے ہیں اور پھر ٹھنڈے ہوجاتے ہیں۔ ہریالی آتی جاتی رہتی ہے۔ یہ تمام عوامل فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ اور کرۂ ارض کی حدت کی مقدار کو متاثر کرسکتے ہیں۔

☆......☆

بوب اسپائسر نے پچھلے نصف بلین سال کی Co2 کی سطح کا اب تخمینہ لگایا ہے۔

"جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ بیشتر وقت کاربن ڈائی آکسائیڈ کی سطح موجودہ دور سے خاصی بلند رہی ہے اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اوّلین دور میں اس کی سطح کتنی بلند تھی۔" رابرٹ برنر نے بلیک بورڈ پر گراف کے ذریعے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "پھر یہ سطح ازمنہ وسطیٰ میں کتنی نیچے آگئی۔ پھر اس دور سے اب تک کتنی بلند ہوئی لیکن آپ دیکھ سکتے ہیں کہ تقریباً 300 ملین سال پہلے کی سطح اور حالیہ سطح سب سے نیچی ہے۔"

بوب اسپائسر کے حساب سے اس گراوٹ کا ایک ہی خاص سبب ہے اور وہ ہے پودے۔ پودے چٹانوں کی ویدرنگ کی رفتار میں اضافہ کرکے فضا سے Co2 کو ختم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب پودے پہلی پہلی بار نشوونما پانے اور پھلنے پھولنے لگے تو Co2 کی سطح گرنے لگی۔ یہ سطح 300 ملین سال تک واضح طور پر جب تک برفانی دور جنوبی افریقا کی چٹانوں پر اپنے نشان نہیں چھوڑ گیا، تمام وقت نیچی رہی۔

یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ پودوں نے 300 ملین سال پہلے کے برفانی دور کو قائم رکھا ہوگا لیکن کاربن ڈائی آکسائیڈ کی سطح بھی گزشتہ 65 ملین سال سے گرتی ہوئی لگتی ہے۔ یہی گراوٹ برفانی دور کو جنم دینے کا سبب بنی ہوگی جس میں ہم آج بھی زندہ ہیں۔ اس گراوٹ کی ایک وضاحت پہاڑوں کی تعمیر میں مساوات سے بھی ہوتی ہے۔

"ہم جانتے ہیں کہ Co2 آتش فشاں پہاڑوں کے ذریعے فضا میں داخل ہوتی ہے لیکن چٹانوں کی ویدرنگ کے ذریعے خارج ہوجاتی ہے اور دنیا بھر میں چٹانوں کی ویدرنگ کا آغاز علاقوں سے ہوتا ہے۔" پروفیسر مورین ریمو نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ گزشتہ چالیس سے پچاس ملین سال پہلے کا دور پہاڑوں کے بننے کے معاملے میں بے حد فعال رہا ہے۔ یہاں وہ ہمالیہ، اینڈس اور راکیز ہیں اور یہ ٹیکٹونک سرگرمی غالباً دنیا کے وسیع و عریض حصے میں فضا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کی سطح کے خاتمے کا سبب بنی ہے۔"

کاربن ڈائی آکسائیڈ کی علیحدگی ہی غالباً اس سردی کا سبب رہی ہے جو ہمیں اس عرصے میں نظر آئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ اس کا ثبوت ہے کہ زمین کی ٹیکٹونک سرگرمی اور زمین کی آب و ہوا کے درمیان کوئی تعلق ہے۔ اب ہم آب و ہوا کے پیٹرن کو سمجھنا شروع کر سکتے ہیں۔ یہ وہ پیٹرن ہے جو ارتقاء کے تال میل کو اور زمین کی ٹیکٹونک پلیٹوں کی حرکتوں کو تبدیل کرتا ہے۔ ہمارے سیارے کے گرد براعظموں کے اِدھر سے اُدھر ہونے کے ساتھ ساتھ آب و ہوا ایک برفانی دور سے دوسرے برفانی دور میں بھٹکتی رہتی ہے لیکن ہمارے ماضی قریب میں [illegible] آخری ملین سال میں برفانی چادریں ہر تیس ہزار سال پر خاصی تیزی سے آتی جاتی رہی ہیں۔ یہ رفتار براعظموں کی حرکتوں، پودوں کے ارتقاء اور پہاڑوں کے بننے کی رفتار کی وضاحت سے بھی تیز تر تھی۔ ان گردشوں میں تیزی کا سبب یقیناً کچھ اور ہوگا۔

گرمی اور سردی میں درجہ حرارت کے فرق سے اس کی وضاحت ہوگئی۔ لگاتار سردیوں گرمیوں کا مطلب یہ ہوگا کہ برف کی چوٹیاں مکمل طور پر کبھی نہیں پگھلیں گی۔ سردیاں برسہا برس تک ان میں اضافہ کرنے میں معاون ہوں گی جس کے نتیجے میں یہ بڑی بڑی برفانی چادروں میں تبدیل ہو جائیں گی۔ اگر پھر گرمیوں میں تپش اور حدت پیدا ہوئی تو یہ برفانی چادر پھر سکڑ جائے گی۔

شاید انسانی تہذیب صرف اس وجہ سے ابھر سکی کیونکہ تیزی سے آب و ہوا میں تبدیلی کا یہ دور اختتام کو پہنچ گیا۔ آج ہم شاید چند ہزار سال کے مستحکم درجہ حرارت کا پھل کھا رہے ہیں لیکن کوئی نہیں جانتا کہ یہ مہربان وقفہ کب تک برقرار رہے گا۔ ہمارا یہ متحرک سیارہ پوری زمینی تاریخ کے دوران آب و ہوا میں اتار چڑھاؤ کا سبب بنا ہے اور یہ توقع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ مستقبل بھی کچھ کم متلون مزاج نہیں ہوگا۔

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔



ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا پچیسواں حصہ

تبھی میری نظر ایک سائیڈ میں رکھے یہ بڑے بڑے گلاسوں پر پڑی اور میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگا کہ یہ ہاتھ بھر کے گلاس کو لوگ خالی کیسے کردیتے ہوں گے۔ کیا ایک آدمی ایک گلاس بیئر پی لیتا ہوگا۔ اِدھر سے نظریں ہٹا کر بیئر پیش کرنے والی پر نظر ڈالی بار ٹینڈر لڑکی تھی اور جین ہی کی طرح دِکھتی تھی۔ تیز طرار اور پھرتیلی۔ وہ شاید جین کو جانتی تھی اس لیے اس سے پوچھے بغیر ہاتھ جتنے بڑے شیشے کے گلاس کو نکالا اور اسپرے پائپ سے اسے ڈرافٹ بیئر سے بھر دیا۔

بیئر دیکھ کر جین کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ نتاشا نے بھی لبوں پر زبان پھیری تو بارٹینڈر نے اس کا جام بھی بھر دیا جین نے مجھ سے پوچھا۔ ”تم کیا پیو گے؟“

میں نے بہانہ کیا۔ ”دن میں پی لوں تو مجھے دردِ شقیقہ ہو جاتا ہے۔“

وہ حیرت سے گھونٹ بھرتی ہوئی بولی۔ ”یہ کون سا درد ہوتا ہے؟“

دردِ شقیقہ کو انگلش میں Migaine کہتے ہیں مگر میں نے اسے افسانوی رنگ دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ لاکھوں میں صرف ایک بندے کو ہوتا ہے، جب سورج نکلتا ہے اور جب تاروں کی روشنی پھیلتی ہے تو یہ درد ختم ہو کر سرور میں بدل جاتا ہے۔“

وہ اب بھی نہیں سمجھی تھی، نتاشا بھی حیران بیٹھی تھی۔

نتاشا ہمدردی سے پوچھنے لگی۔ ”تو پھر تم دن میں ڈرنک تو نہیں کر سکتے ہو گے؟“

میں نے بے چارگی سے کہا۔ ”نہیں میں اس سے مستفید نہیں ہو سکتا۔“

پھر وہ دونوں مل کر مجھ پر افسوس کرنے لگیں اور میں بھی قسمت کی ستم ظریفی پر رنجیدہ ہو گیا۔

جین نے ایک بیئر کا گلاس چڑھایا تو اس کی منکتی آنکھیں تھم گئیں۔ نتاشا آدھے گلاس پر کھلنے لگی۔ زبان اور دماغ کے درمیان رابطہ منقطع ہوا تو زبان نے دل سے رابطہ جوڑ لیا۔ دل تو وہی کہتا ہے جو محسوس کرتا ہے۔ وہ سوچتا کب ہے۔ پھر جین نے ترنگ میں آ کر ایک اور گلاس بھروایا۔ نتاشا نے شاید اپنی جھجک محسوس کی تو پہلا گلاس جسے حلبی گلاس کہہ سکتے ہیں، اسے اس نے حلق میں انڈیلا اور دوسرا گلاس بھرنے کا اشارہ دے دیا۔ میں پیاسا بیٹھا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا کہ بارٹینڈر نے گلاس میں کوک بھر کر اور برف ڈال کر میرے آگے سرکا دی۔ میں بھی کوک اور ان دونوں کی باتوں کی چسکیاں لینے لگا۔

جین لہک کر مجھ سے بولی۔ ”کبھی شام کو تاروں کی روشنی میں آؤ تو تمہیں نئے نئے ذائقے چکھاؤں۔“

”تم وہ نئے نئے ذائقے روزانہ چکھتی ہو؟“ میں سوال کو اپنے رخ پر لے آیا۔

وہ ترنگ میں تھی۔ اس نے سر ہلا کر کہا۔ ”ہاں ہاں روزانہ دیکھتی ہوں۔“ پھر وہ مفتی کو گالی دے کر بولی۔ ”وہ کہتا ہے کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی۔ مجھے شادی کی کیا ضرورت ہے۔ میرے اتنے بوائے فرینڈز ہیں کہ مجھے شادی کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔“

میں نے بھی مفتی کو ہلکی سی گالی دی اور اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو احمق ہے۔ اسے کیا معلوم کہ جین کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔“

وہ سرور میں بولی۔ ”کبھی تم بھی آؤ ناں، اکٹھے شام کو ڈرنک کریں گے۔“

میں بولا۔ ”شادی شدہ ہوں۔ بچے ہیں اس لیے رات کو تمہارے پاس آنا اچھا نہیں لگتا۔“

”شادی شدہ ہو تو کیا ہوا۔ فیملی تو ابھی پاکستان میں ہے۔ باقی تم سوچ لو میری آفر برقرار ہے۔“ وہ بولی۔ میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

اتنے میں جین باہر چلی گئی یہ کہہ کر کہ سگریٹ پی کر ایک اور گلاس پیوؤں گی۔

وہ باہر گئی تو نتاشا اپنی آنکھوں سے مسکرا رہی تھی۔ اس نے دوسرا گلاس ختم کیا اور لبوں پر زبان پھیرنے لگی۔ مجھ سے بولی۔ ”لگتا ہے تم جین کی کمپنی کو پسند نہیں کرتے۔ اس لیے جھوٹ بول رہے تھے۔“

”کون سا جھوٹ؟“

”یہی کہ تم گرل فرینڈ نہیں بنانا چاہتے۔ میں جو سمجھی ہوں وہ یہ ہے کہ تم جین کو نہیں چاہتے۔ تم نے اس کا دل توڑ دیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ میں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور خاموش رہا۔

مجھے یاد ہے کہ اس دن پہلی بار میں نے ATM مشین سے کیش نکلوایا تھا۔ ریب میں کریڈٹ کی بجائے کیش لیتے تھے۔ میرے پاس کیش نہ تھا۔ میں ان دونوں سے کہہ بیٹھا تھا کہ ادائیگی میں کروں گا اور کیش دیا تھا۔

کچھ دن بعد میں بس کے انتظار میں اسٹاپ پر کھڑا تھا کہ ایک گاڑی نے ائرپورٹ روڈ کی جانب ٹرن لیا۔ دیکھا تو اس میں ہمارے I.T ڈپارٹمنٹ کا ایک لڑکا نتاشا کو لیے کہیں جا رہا تھا۔ دو تین ماہ تک وہ اکٹھے گھومتے رہے اور پھر لڑکے کے ساتھ کوئی دوسری لڑکی نظر آنے لگی تھی مگر جین کو میں نے ہمیشہ ہی اکیلے دیکھا تھا۔

یہاں کی مغربی تہذیب نے عورت کو کھلونا بنا کر رکھ دیا ہے۔ مرد کو برتری حاصل ہے۔ کہنے کو تو شخصی آزادی وغیرہ سب کچھ ہے مگر بھگتتی تو عورت ہے۔ وہ آج ایک در پر ہوتی ہے اور کل دوسرے در پر۔ بغیر نکاح کے بچے پیدا کرتی ہے

اور وہی سنبھالتی ہے۔ مرد تو دور ہٹ کر کسی اور کو بانہوں میں لیے ہوتا ہے۔ جین کہتی تھی کہ میرے بہت سے بوائے فرینڈز ہیں۔ دس سال بعد اس کے سب بوائے فرینڈز اوروں کے ساتھ ہوں گے اور یہ ڈھلتی عمر میں اکیلی بیٹھی نفسیاتی مریض بنی ہوگی۔ عورت آزاد ہوئی، اڑی اور کسی جال میں جا اٹکی۔ میرے لیے کوئی مشکل نہ تھا کہ جین ہو یا نتاشا، کسی سے بھی پل دو پل کی دوستی بنا لیتا۔ وہ آزاد لڑکیاں تھیں اور اسی لیے آسان شکار تھیں۔ مرد اور عورت کے ناجائز تعلق میں عزت عورت کی جاتی ہے۔ اس بات کو نہ تبدیل ہونا ہے اور نہ ہوگی کہ تضحیک عورت کے حصے میں آتی ہے۔ بھلے مغرب زدہ عورتیں جتنے نعرے عورت کی آزادی کے لگائیں وہ قانونِ فطرت تبدیل نہیں کر سکتیں۔ عزت انسان کا غرور ہے، اثاثہ ہے اور تکبر ہے۔ آندھی چلتی ہے تو پھول ٹہنی سے گرتا ہے اور عورت پھول ہے۔ احساس کی طرح نازک اور دلکش جس کی خوب صورتی ٹہنی پر ہے نہ کہ خاک میں۔ مرد بدراہ ہو تو پھر بھی ماں، بیٹی اور بہن کا سایہ بنا رہتا ہے اور اگر عورت بدراہ ہو جائے تو سائے کو ترس جاتی ہے۔ میں صرف یہ بات سمجھانا چاہتا ہوں کہ لڑکیاں کسی بھی طرح لڑکوں کے جھانسوں میں نہ آئیں اور اپنا وقار بلند رکھیں۔

ہم پانچوں ایک شام پارک میں بیٹھے تھے۔ پانچوں کیا تین افراد بینچ پر بیٹھے تھے اور دو افراد سرجی اور مطیع اللہ پارک کے بیچ لگا جھولا جھول رہے تھے۔ شہباز نے بھی جھولا جھولنے کی ناکام کوشش کی تھی اس نے جا کر جھولے کی زنجیر کو ہاتھوں سے کھینچ کر اس کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور پھر مایوسی میں سر ہلا کر ہمارے ساتھ درخت تلے رکھی لکڑی کی بینچ پر آ بیٹھا۔

موسم اتنا خوشگوار ہو رہا تھا کہ اپارٹمنٹ کے اندر بیٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد میں اور سرجی سب کو ہانک کر پارک میں لے آئے تھے۔ چاند نکلا ہوا تھا اور اس کی دودھیا روشنی میں ہم درختوں پر سفید، گلابی اور کاسنی پھولوں کو دیکھ سکتے تھے۔ یہاں پھول جھاڑیوں کے علاوہ درختوں پر بھی بے تحاشا آ گئے تھے۔ وہ ایسے درخت تھے جن کے پھول کھل جانے کے بعد ہر ماہ اپنا رنگ بدل دیتے ہیں۔ آج گلابی تو بعد میں سفید اور پھر گلابی۔ ان کے رنگوں کا کھیل بہار سے گرمیوں تک جاری رہتا ہے پھر خزاں آتی ہے تو یہ زرد ہو جاتے ہیں۔ زرد سے نارنجی اور پھر کملا کر گر پڑتے ہیں۔

ہم بینچ پر بیٹھے تھے کہ سرجی اور مطیع اللہ جھولا جھول کر قہقہے لگاتے ہوئے واپس آئے۔

میں نے ہنستے ہوئے سرجی سے پوچھا۔ ”جھولنے کا بہت شوق ہے آپ کو، لگتا ہے جھولتے جھولتے ہی بڑے ہو گئے۔“

سرجی بات کو نہ سمجھ سکے اور معصومیت سے بولے۔ ”پاکستان میں جب میں ایکسین تھا تو گھر کے صحن میں درخت پر میں نے جھولا لگوایا تھا۔“

مفتی بولا۔ ”بچوں کے لیے؟“

وہ بولے۔ ”بچے تو جھولے پر ڈرتے تھے۔“ پھر ذرا سا شرما کر بولے۔ ”آپ کی بھابی اور میں بچوں سے چھپ کر جھولا جھولتے تھے۔ ہم ایک ساتھ پینگ پر سوار ہوتے، وہ بیٹھی ہوتیں اور میں رسی پکڑے کھڑا ہوتا۔ میں زور لگا کر پینگ کو اوپر لے جاتا تو وہ بہت ہنستی تھیں۔ ماشاء اللہ۔“

مطیع اللہ، شہباز سے بولا۔ ”اب تم بھی شادی کر لو تاکہ تمہاری پینگ بھی اوپر جائے۔“

شہباز سنجیدہ ہو گیا اور بڑی متانت سے بولا۔ ”والد صاحب سے بات ہوئی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہمیں ایک لڑکی تمہارے لیے پسند آئی ہے۔ تصویریں بھیج دیتے ہیں تاکہ تم بھی پسند کر لو۔“

مفتی بولا۔ ”آخر شادی میں رکھا کیا ہے؟“

مطیع اللہ بولا۔ ”اسی لیے میں نے شادی کی تب معلوم ہوا کہ آخر اس میں کیا رکھا ہے۔“

شہباز بات کاٹ کر بولا۔ ”میری بات تو آپ لوگ سنیں۔ میں نے والد صاحب سے کہا ہے کہ صرف فوٹو دیکھ کر شادی کرنے کا رسک میں نہیں لے سکتا۔ جب تک آمنے سامنے لڑکی سے بات نہ ہو تب تک میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔“

وہ دو تین گہرے سانس لینے کے بعد اپنی بات بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے صاف بول دیا ہے کہ جب تک میں پاکستان کا چکر نہیں لگاتا آپ لوگ ہاں نہ کریں۔“

میں نے کہا۔ ”اگر تم جا کر لڑکی سے ملے اور وہ بولی کہ یہ رسک تو میں بھی قطعاً نہیں لے سکتی تو؟“

شہباز میری بات نہیں سمجھ سکا مگر سرجی سمجھ گئے اور بولے۔ ”پھر تو بھینسا بھینسوں میں یا پھر قسائی کے کھونٹے پر۔“

یہ مثل تو ہم میں سے کوئی نہ سمجھ سکا مگر شہباز نے بھینسا

کا لفظ سنا اور فوراً اکھڑ گیا۔ ہمیں سرجی سے اس مثل کا مطلب پوچھنے کا موقع ہی نہ ملا کہ شہباز نے آستینیں چڑھا لیں۔

ملگجے اندھیرے میں اس کا رنگ نظر تو نہ آتا تھا مگر سب کو معلوم تھا کہ وہ یا تو زرد ہے اور یا پھر سرخ۔ وہ بولا تھا میری شادی کی بابرکت بات ہو رہی ہے اور سرجی نے مجھے بھینسا بنا دیا۔

مطیع اللہ نے شہباز سے کہا۔ ”جب تک تم اپنا منوں وزن کم کر کے میری طرح دبلی نہیں ہوتی تمہارا کوئی رشتہ نہیں آئے گا۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”مطیع اللہ اپنا شہباز مرد ہے۔ رشتہ لے کر جائے گا۔ مردوں کے رشتے آیا نہیں کرتے۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”ہاں کہتی تو ہے مرد ہوں۔ وہ بولتی ہے تو مان لیتے ہیں مگر ہوگا وہی جو میں کہتی ہوں۔“

مفتی، مطیع سے بولا۔ ”تم بتاؤ آخر شادی میں رکھا کیا ہے کہ بندہ کھونٹے سے بندھ جائے۔“

پٹھان بھائی نے کچھ سوچا اور پھر بولا۔ ”زرا چ چ ہے۔ بندے کا بھیجا بھی کھراب (خراب) ہو جاتا ہے۔ بندہ نہ ادھر کا رہتی ہے اور نہ اُدھر کا رہتی ہے۔“

یہ اتفاق کی بات تھی کہ مطیع اللہ نے ہاتھ اٹھایا تو اس کا رخ سرکی طرف تھا پھر جب دوسری بار یہ کہنے کے لیے اٹھایا کہ ”نہ ادھر کا رہتا ہے“ تو ہاتھ کا رخ شہباز کی طرف تھا۔ شہباز نے پتا نہیں کیا سمجھا وہ چیخا ”یہ کون سا سیاپا ہے، کیا میں اِدھر اُدھر کا“ سرجی سا ہوں۔

سرجی سے کوئی نہیں پوچھ رہا تھا۔ خود ہی بول پڑے۔ ”سنجوگ تو تب ہوتا ہے جب کوئی موافقت ہو۔ کچھ لوگوں کا تو کوئی تال میل بھی نہیں ہوتا مگر اپنے لیے پری ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ اسی کو تو کہتے ہیں حور کے ساتھ......“ شہباز نے بات کاٹی اور غرا کر بمشکل اٹھا۔ سرجی پھرتی سے اٹھے زقند بھری اور پارک کے اندھیرے حصے کی جانب دوڑ پڑے، شہباز ان کے پیچھے لپکا ہمیں معلوم تھا ابھی وہ ہانپتا ہوا سرجی کو برا بھلا کہتا ہوا لوٹے گا۔ اسی لیے ہم بیٹھے ہنستے رہے۔

کچھ دیر ہم نے انتظار کیا مگر وہ نہ آئے۔ میں اور مطیع اللہ دیکھنے گئے تو کیا نظارہ دیکھتے ہیں کہ سرجی انجیر کے درخت پر چڑھے ہوئے ہیں اور کچی انجیریں شہباز کی جانب توڑ کر پھینک رہے ہیں اور شہباز کچھ کھاتا بھی جا رہا تھا اور باقی اپنی اونی ٹوپی میں جمع کر رہا تھا۔ میں نے آواز لگائی فرصت مل جائے تو فلیٹ پر آ جانا اور مطیع اللہ کے ساتھ چل پڑے۔

اگلی شام ہماری محفل جمی۔ خان قیصر بھی آیا ہوا تھا۔ اس کا شیخ دوست اب اسے داغ معرفت دینے والا تھا۔ کیونکہ اس کے امتحان ہو گئے تھے اور اب اسے خان کی ضرورت نہ تھی۔ خان جو ہمیشہ اسے سر پر بٹھاتا چلا آ رہا تھا۔ آج اسے سر سے اتار کر اپنے سامنے کھڑا کیا ہوا تھا۔ یعنی اب خان دبے الفاظ میں اس کے بارے میں خیالات ظاہر کر رہا تھا جس میں برائیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کے مطابق اس میں سب سے بڑی برائی یہ تھی کہ وہ سخت کنجوس ہے۔ پچھلے چار ماہ اس نے خان کے گھر ٹھہر کر چار ڈالر بھی خرچ نہیں کیے تھے۔

ہمارے لیونگ روم کا ٹی وی آن تھا اور چینل پر مختلف ہائی وے کی ٹریفک براہ راست دکھلا رہے تھے۔ قصور یہ تھا کہ ڈرائیونگ کے لیے نکلنے والوں کو ادراک ہو جائے کہ ٹریفک کہاں پھنسی ہے اور کہاں رواں ہے۔ ہر ہائی وے پر مختلف مقامات میں کیمرے لگے تھے۔ شام کا وقت تھا اور ہر ہائی وے کی چلتی ٹریفک نے روشنیوں کا ایک سیلاب بہا دیا تھا۔ ایک اور ہی طرح کا نظارہ تھا۔ جب Q.E.W ہائی وے دکھائی تو پیچھے ڈاؤن ٹاؤن کے سر بہ فلک عمارتیں روشنی میں نہائی کھڑی تھیں۔ ہم بڑے اشتیاق سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے کہ سرجی۔ نے سب کو چائے کے مگ پکڑاتے ہوئے اپنی یہ فرمائش اس طرح سے کی کہ خدانخواستہ آخری خواہش ہو۔ ”لوگ خود تو معلوم نہیں کہاں کہاں گھومتے رہتے ہیں مگر ہم ہیں کہ ابھی تک دل کھول کر ڈاؤن ٹاؤن کے نظارے بھی نہیں کیے۔“

ہم میں سے اکثر نے ڈاؤن ٹاؤن کو زیادہ نہیں کھنگالا تھا۔ میں دوبار سرسری سا گیا۔ پہلی بار ایک فراڈی جاب، پلیسمنٹ ایجنسی کے چنگل میں اور دوسری بار چائنا ٹاؤن کا مختصر جائزہ۔ نسرین کے ہمراہ۔

میں تو خود موسم بدلنے کے انتظار میں تھا کہ سردی ختم ہو تو میں ڈاؤن ٹاؤن ٹورنٹو کو سرسری نہیں بلکہ تفصیلی انداز میں دیکھوں۔ دنیا کے تیسرے بڑے ڈاؤن ٹاؤن کو میں صرف دور سے عمارتیں اور ان کی روشنیاں دیکھ کر ٹرخانا نہیں چاہتا تھا۔

اب سرجی نے بات چھیڑی تو سب لوگ کچھ نہ کچھ کہنے لگے۔ خان قیصر بولا۔ ”ندیم بھائی لیڈ کریں تو میں بھی

...نے کو تیار ہوں۔“

شہباز بولا۔ ”وہاں کھانے کو کیا ملے گا؟“

مطیع اللہ بولا۔ ”سب جا رہی ہیں تو ہم بھی دیکھ لیں ...گر فرنگیوں کے ملک کو دیکھنا اور اتنے شوق سے دیکھنے جانا ...اسلامی ہے۔“

مفتی خان نے پوچھا۔ ”رات کو کسی کلب کا چکر بھی ...ئیں گے۔“

”کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“ مطیع اللہ اپنی پہلی بات ...ل کر بولا۔

دو دن بعد فیڈرل ہالیڈے تھی۔ اس دن کا موسم ...کھا تو معلوم ہوا کہ آسمان کھلا ہے۔ میں نے سب سے کہا۔ ...ڈاؤن ٹاؤن چودہ مربع کلومیٹر میں پھیلا ہے۔ ہر اس مقام ...پیدل یا ٹرین سے جا پکڑیں گے جس کو دنیا بھر سے سیاح ...تے ہیں۔ پورا دن لگے گا اور تھکاوٹ بھی ہوگی جو ...جانا چاہتا ہے وہ سوچ لے۔“

شہباز تردد کرنے لگا مگر جب سب ساتھیوں کو جوش و ...وش سے تیار دیکھا تو بولا۔ ”میں نے ندیم بھائی کے ساتھ ...پارک کا ڈاؤن ٹاؤن دیکھا ہے مگر ایک شرط رکھتے ہیں کہ ...کوئی میوزیم نہیں دیکھیں گے۔“

میں نے شرط مان لی۔ پھر اپنے آپ کو ذہنی طور پر ...ڈاؤن ٹاؤن ٹورنٹو کے نقشے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے لگا۔

دوسرے دن نسرین کو فون کیا۔ فون اٹھاتے ہی ...لی۔ ”اتنے دن سے کہاں غائب پھر رہے ہیں۔ کبھی سوچا ...کہ ادھر بھی آپ کا انتظار ہوتا ہے۔“

”اسی لیے تو کہا تھا کہ تمہارے گھر ہی شفٹ ہو جاتا ...کہ تمہاری شکایت تو دور ہو جائے گی۔“

”زیادہ بہانے مت بنائیں۔ نہ آنے کی بڑی اچھی ...آپ نے ڈھونڈ لی ہے۔“

”وہ جاب پر ایک لڑکی جبین ہے۔ اس کے ساتھ ...آؤٹ کر رہا تھا۔“

مرد کی فطرت بھی عجیب ہوتی ہے۔ عورت کو رقابت ...ے لے آئے تو اسے بھی چین نہیں آتا۔ جھوٹے سچے قصے ...کر اسے اپنی جانب زیادہ مائل کرنے کی کوشش میں لگا ...ہے۔ عورت اگر ذہین ہو تو مرد کی اس فطرت کا بڑا ...ست فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ مرد اگر کسی دوسری عورت کے ...تعلقات میں بندھا ہو تو کبھی سچ نہیں بولے گا۔ صرف ...ن بتائے گا جو یا تو سچ نہیں ہوں گے اور یا پھر وہ جو اس کے ماضی کا قصہ پارینہ بن چکے ہوں گے۔

نسرین اس معاملے میں سمجھدار تھی، بولی۔ ”اگر اس میں تمہاری خوشی ہے تو میں اعتراض نہیں کروں گی۔ بس یہ خیال کرنا کہ کوئی ایسی ویسی مت پکڑ لینا، مجھ سے بہتر نہ ہو تو مجھ سے کم بھی نہ ہو۔“ میں لاجواب ہو کر سر کھجانے لگا۔

وہ پھر بولی۔ ”تم نے ایک اہم بات مجھ سے پوچھی نہیں۔“

میں خاموش ہو کر سوچ میں پڑ گیا کہ کس اہم بات کا ذکر کر رہی ہے۔ خاموشی لمبی ہوئی تو ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ ”تمہارے بھول جانے کی عادت سے میں بہت پریشان ہوں۔ تمہاری بیوی آ جائے تو وہ تمہیں ٹھیک سے سنبھالے گی۔ مجھے تو خدشہ رہتا ہے کہ کہیں تم ہم دونوں کو کسی دن نہ بھول جاؤ۔“

”ناممکنات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اب یاد دلاؤ میں کیا بھول گیا ہوں۔“

”میں نے جاب چھوڑ دی ہے۔ اگلے ویک اینڈ کے بعد پکی چھٹی۔ اب گھر پر رہوں گی اور وقت ہی وقت ہوگا۔“ پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔

”معلوم ہے کیا کروں گی؟“

”کیا؟“

”تمہیں یاد کروں گی۔ تمہارا انتظار کروں گی۔ تمہارے لیے اور بہت سے پاکستانی کھانے بنانا سیکھوں گی۔“ پھر بولی۔ ”معلوم ہے میں آج کل کیا کرتی ہوں؟“

”کیا کرتی ہو؟“

”میں ہر وقت صوفے پر اسی جگہ بیٹھتی ہوں جہاں تم بیٹھتے ہو۔ سعد کہہ رہا تھا کہ یہ تو انکل کی جگہ ہے۔ دل میں سوچتی ہوں کہ تمہارے انکل سب چیزیں مجھے دے گئے ہیں۔ جب آئیں گے تو لوٹا دوں گی۔“

”ٹھیک ہے لوٹا دینا اور بھی سب لوٹا دینا جو اب تمہارے سپرد کیا ہے۔“

”بہت کچھ کا تو مجھے مالک بنا دیا ہے کیا وہ بھی لو گے؟“

”کچھ نہیں لوں گا بلکہ اپنی محبت کا احساس تم کو اور بھی دوں گا اور دیتا رہوں گا۔ تم نے میرا کہا مانا اور جاب چھوڑ دی۔ مجھ پر بھروسا کیا اور اس بھروسے کے بدلے تم وہ بھی لینے کا حق رکھتی ہو جو میں دے بھی نہیں سکتا۔ تم صوفے کی

سیٹ پر بیٹھی ہو جہاں میں بیٹھتا ہوں اور اِدھر میں نے تمہیں اپنے دل میں بٹھایا ہوا ہے۔ تم نے میرا مان رکھا، احسان کیا۔ میں آج سوچتا ہوں کہ میں نے تمہیں سارا کا سارا جیت لیا ہے سعد سمیت۔"

"بہت شکریہ۔" وہ بولی۔

"کس بات کا؟"

"یہ سب کہنے کا جو میں سننا چاہتی تھی۔ تم نے تو میرا وقت ہی بدل ڈالا۔ معلوم نہیں یہ احسان کیسے اتاروں گی۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

میں نے بات بدلی اور بولا۔ "دو دن بعد ہم چھ لوگ ڈاؤن ٹاؤن دیکھنے جا رہے ہیں۔ سرجی اور شہباز سمیت۔"

"یہ ہوئی نا بات۔ جب تم نئی چیزوں کو دل سے ڈوب کر دیکھتے ہو تو اس وقت میں تمہیں دیکھ رہی ہوتی ہوں۔ مجھے سب بتانا کہ تم نے کیا کیا دیکھا اور یہ بھی بتانا کہ کیا کچھ نہیں دیکھا جو میرے ساتھ تم نے دیکھنا ہے۔"

میں بولا۔ "جی سرکار، اب چلتا ہوں اور سعد کو بہت پیار کرنا۔"

"جب آنا تو خود ہی پیار کرنا۔ میرے لیے تو خود پر پابندیاں لگائی ہوئی ہیں۔ کوئی بات نہیں مگر جب پیار سعد کو کرتے ہو تو محسوس میں کرتی ہوں۔ میں تو اس پر بھی راضی ہوں۔"

فون بند ہوا تو اس نے دوبارہ مجھے اپنی سوچوں میں باندھ دیا۔ وہ بھی کیا لڑکی تھی جو ایک کچے دھاگے سے مجھے باندھے اپنے ساتھ لیے پھرتی تھی۔

جس دن ڈاؤن ٹاؤن جانا تھا اس دن موسم یہاں کے لحاظ سے گرم تھا، یعنی 22 سینٹی گریڈ ٹمپریچر تھا۔ اسپرنگ جیکٹس اتر چکی تھیں اور سب ٹی شرٹس پہنے نظر آتے تھے۔ ہم نے بھی سب کی دیکھا دیکھی کچھ اس قسم کی شرٹس زیب تن کرلیں۔ ڈاؤن ٹاؤن جا کر معلوم ہوا کہ ہم ایک غلطی کے مرتکب ہو چکے ہیں۔

پاکستان میں میرا خواب امریکا جانا تھا اور کینیڈا میں مجھے رومانویت محسوس ہوتی تھی۔ امریکا کے تذکرے تو میں آنے جانے والوں سے سنتا رہتا مگر کینیڈا ابھی دھند میں چھپا تھا۔ اس کے بارے میں جب بھی سوچتا تو کسی رنگین وادی کا تصور ذہن میں ابھرتا۔ جس طرح بارش کے بعد جنگل دھل جاتا ہے، اسی طرح کا ایک اجلا ملک جہاں سرسبز وادیاں ہیں، جھیلیں اور دریا ہیں، آبشاریں اور پھول ہیں۔ وہ ملک جو ابھی خوابیدہ ہے اور جہاں کا ہر باسی نیند میں سہانے سپنے دیکھ رہا ہے۔ زندگی تو رواں ہوگی مگر ایسے کہ تھم تھم کے چلتی ہوگی۔ چنگھاڑتے جہاز اس کی زمین پر خاموشی اور دھیان سے اترتے ہوں گے۔ ہر بندہ چین کی نیند سوتا ہوگا۔ ایک فسوں ساز ماحول ہوگا جہاں لوگ خاموشی سے اور مسکرا کر قریب سے گزرتے ہوں گے۔ میں جب یہاں آیا تو اسے ایسا ہی پایا جو محسوس کرتا اور سوچتا تھا۔ سب کچھ تھا مگر زندگی مزدور کے بوجھ کی طرح لگی۔ اس کے نظارے اور دلفریب مناظر دیکھنے کے لیے وقت، ڈالر اور ذہنی سکون کا ہونا ناگزیر ہے مگر یہاں ڈالر کے لیے وقت دینا پڑتا ہے اور وقت پیسے کو زیادہ دیا جائے تو ذہنی آسودگی چھن جاتی ہے۔

مگر میں نے اللہ کے کرم سے اور اپنی طبیعت کی وجہ سے کچھ وقت ہمیشہ بچا کر رکھا تھا۔ ڈالر جمع کرنے کا جذبہ تو تھا مگر جنون نہ تھا۔ ڈالر کمائے بغیر بھی میں تنہا سوچوں میں بیٹھ کر زیادہ اچھا وقت گزار سکتا ہوں تو لہٰذا میں نے کوشش کی کہ اتنا کام کروں کہ زندگی آرام سے گزرتی رہے۔ اسی لیے اللہ نے مجھے بے شمار مواقع دیے کہ اس ملک کو اور باقی تمام ممالک کو اپنی ذہنی فراغت میں دیکھوں۔ میں اپنے شہر میں ایسے رہتا تھا جیسے دور دراز کے ملکوں سے سیاح کثیر رقم خرچ کر کے یہاں کی خوب صورتی دیکھنے آتے تھے۔ ہر مقام کو ہمیشہ ایسے دیکھتا جیسے پہلی اور آخری بار دیکھ رہا ہوں حالانکہ کئی بار اس مقام سے گزر چکا ہوتا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ جب بھی دیکھا تو نئے روپ میں نظر آیا اور اب لکھنے چاہوں تو ایک ہی جگہ کو کئی انداز میں بیان کروں۔

پاکستان میں جب بھی پی آئی اے کے آفس گیا تو دیواروں پر چسپاں پوسٹروں میں اٹک جاتا تھا۔ پیرس، لندن، نیویارک، ٹورنٹو، بینکاک، کوالالمپور، سنگاپور، ایمسٹرڈیم وغیرہ کے پوسٹرز کو تادیر حسرت سے دیکھتا رہتا کہ میں بھی کبھی ان جہانوں کو دیکھ پاؤں گا۔ آج ان سب شہروں کے علاوہ اور بھی بہت سے ملک اور شہر دیکھنے کے بعد میں سوچ رہا ہوں کہ ٹورنٹو کو میں کس کیفیت میں دیکھا کرتا تھا۔

پی آئی اے کے آفس میں ٹورنٹو کی جو تصویر تھی وہ ڈاؤن ٹاؤن کی تھی جس میں سی این ٹاور نمایاں تھا۔ اس کے ارد گرد اونچی اونچی عمارتیں تھیں بلکہ عمارتوں کا ہجوم تھا جسے دیکھ کر میں اس پورے منظر کا خود ساختہ مالک بن بیٹھتا تھا۔ سوچتا تھا کہ دن رات اسی منظر میں کھوئے گزر جائیں گے

اور گزرنے کا احساس بھی نہ ہوگا مگر حقیقت کی دنیا بڑی ہوتی ہے اور خوابوں کی زمین اتنی ہی سہانی ہوتی ہے۔ میں کہیں بھی بور نہیں ہوا اور نہ اکتایا کیونکہ ہمیشہ بہت کچھ میں اپنے اندر لیے گھومتا ہوں۔ جب تک کسی کسی نئی دنیا کو دیکھ کر ہر بار آپ حیرت اور خوشی کا اظہار کرتے رہیں گے تو زندگی اتنی ہی حسین لگے گی کیونکہ دنیا بھی اتنی نہیں جتنی ہم سوچتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ زندگی کا بھرپور لطف لینے کے لیے دوستوں کے ہمراہ ڈاؤن ٹاؤن ٹورنٹو کی طرف چل پڑا۔ صبح کے دس بج رہے تھے اور ایک دن ڈاؤن ٹاؤن دیکھنے کے لیے بہت کم ہے۔ میں نے بیگ میں دو بوتلیں رکھیں اور چلا گیا۔ سرجی نے آلو اور چنے ابالے اور مصالحے ڈال کر چاٹ تیار کرلی۔ آلو دہی کو پانی میں بھگو کر پانی ڈالا اور پھر چھینٹے مارنے لگے۔ شہباز ہر ایک کا بیگ کھول کر کچھ نہ کچھ کھانے کو تلاش کر رہا تھا۔ خان قیصر گھر سے کچھ برگر اور شامی کباب بنوا لایا اور آتے ہی شہباز سے بولا۔ "خبردار جو ان کو ہاتھ بھی لگایا۔"

مفتی دو ڈبل روٹی کے سلائس کے درمیان ایک انڈے کا آملیٹ تیار کر کے مطیع اللہ سے کہنے لگا۔ "آدھا تم لے لینا۔"

مطیع اللہ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ڈاکٹر نے مجھے پرہیزی کھانا منع کیا ہوا ہے۔"

خان قیصر کہنے لگا۔ "میری گاڑی میں چلتے ہیں وہاں پارک کر کے گھومنے نکل جائیں گے۔"

اعتراض میرے علاوہ سرجی کو بھی تھا۔ وہ کہنے لگے۔ "ہم کھٹارا گاڑی میں ڈاؤن ٹاؤن جا کر ہمارا تاثر خراب ہوگا کہ پاکستانی کس طرح کی گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ دوسری وجہ وہ یہ بتانے لگے کہ سب سے یہ کہیں گے کہ ہم پاکستان سے خصوصی طور پر سیر کرنے ٹورنٹو آئے ہیں مگر وہ گاڑی دیکھ کر سمجھ جائیں گے کہ ہم فراڈیے ہیں۔

مطیع اللہ بولا۔ "اگر کسی فرنگی نے ہمیں پھر اڑیا (اڑایا) بولا تو میرے اندر کا سویا پٹھان جاگ جائے گا اور آپ سب جانتی ہو کہ ایک بار پٹھان جاگ جاتا ہے تو کئی دن نہیں سوتا۔"

میں نے بحث سمیٹی اور بولا۔ "ٹرانسپورٹ کا ڈے پاس لے لیں گے۔ گاڑی کو ایک جگہ پارک کرنے کے بعد پیدل پھرتے میلوں دور نکل گئے تو اس تک واپس آنا نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے۔"

اور یہ سب جانتے تھے کہ ڈے پاس میں سات ڈالر میں پورا دن سب وے، بسوں اور اسٹریٹ کار پر کہیں بھی مفت میں گھومتے رہیں۔ ایک جگہ اترے کچھ دیکھا اور پھر دوسری ٹرانسپورٹ میں کہیں اور جا نکلے۔

میں نے شہباز، مطیع اللہ اور سرجی کے ذمہ ڈاؤن ٹاؤن کے مشہور مقامات کی ایک لسٹ تھما دی تھی۔ ان سے بولا تھا کہ کاغذ پر ان مقامات کی ضروری معلومات لکھ لائیں۔ ہر ایک کو چند چند جگہیں بتا دی تھیں۔ ان کے لکھے ہوئے کاغذوں کا میں سرسری مطالعہ کر چکا تھا۔ اگر مقامات کی بنیادی معلومات ہوں تو دیکھنے میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ اب سرجی اپنے لکھے کاغذوں کو بحفاظت تھامے سر پر پی کیپ اور دھوپ کے چشمے لگائے ایک سفری بڑا بیگ تھامے تیار تھے۔

ہم بس اسٹاپ پر گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ مفتی سرجی سے بولا کہ اپنے بیگ میں اس کا سینڈوچ بھی رکھ لے۔

سرجی کہنے لگے کہ پہلے ہی وزن بہت زیادہ ہے۔ خان قیصر سرجی پر بگڑ گیا۔ ان کا بیگ کھولا تو کسی کونے میں چنے چاٹ پلاسٹک کے لفافے میں رکھی تھی اور باقی سارا بیگ خالی تھا۔ خان اب سرجی کو گھور کر بول رہا تھا کہ اگر اس بیگ میں آپ کو بھی ڈال دوں تو جگہ بھی بچے گی اور وزن بھی زیادہ نہیں بڑھے گا۔

اس کے لہجے کی تیزی سے سرجی نرم پڑ گئے لیکن منہ بنانے کی روش ترک نہ کی۔ انتہائی برا سا منہ بنا کر مفتی کا سینڈوچ لیا، اس کو سونگھا اور منہ بنا کر بڑی احتیاط سے اپنے بیگ میں رکھ دیا۔

ہم بس میں بیٹھے اسی ذہنی حالت میں ڈاؤن ٹاؤن جا رہے تھے کہ جیسے سب کل ہی ٹورنٹو آئے ہوں اور آج ڈاؤن ٹاؤن دیکھنے سب ایک ساتھ جا رہے ہوں۔ ہر ایک نے دوسرے کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ ٹورسٹ بن کر رہنا ہے اور یہ محسوس نہیں ہونے دینا کہ اس سسٹم سے ہم واقف ہیں۔

میں بھی اپنے تئیں ایک سیاح بنا ارد گرد کی چیزوں کو حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا مگر جب سب ڈاؤن ٹاؤن دیکھ کر واپس آئے تو ہر ایک یہی کہہ رہا تھا کہ کیسی کیسی جگہیں ہم نے دیکھ لیں جو اگر نہ آتے تو کبھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

میں اس کے بعد کئی بار ڈاؤن ٹاؤن گیا۔ کبھی اکیلا اور اکثر مہمانوں کو لے کر مگر جو مزہ مجھے ان سب کے ساتھ آیا وہ دوبارہ کبھی نہ آیا۔

کپلنگ سب وے (Kipling) تک ہمیں بس نے چھوڑا اور ہم سب ڈبے پاس لینے کاؤنٹر پر آئے۔ ہم نے سرجی کو خزانچی بنایا ہوا تھا۔ ادائیگی ان کے ذمے تھی۔ وہ کاؤنٹر پر خراماں خراماں چلتے ہوئے پہنچے۔ ہم دور کھڑے دیکھ رہے تھے کہ وہ ٹکٹ کلرک سے باتیں کرتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ کلرک انہیں کچھ نقشے تھما رہا ہے۔ شیشے کے کیبن میں بیٹھے کلرک اسے کچھ سمجھا رہا ہے اور باہر کھڑے مسکرا کر بار بار ہاتھ ملا رہے ہیں۔ وہ ان کا شکریہ ادا کر رہا ہے اور یہ اس کے واری جا رہے تھے اور ہماری جانب اشارے کر کے کلرک کو کچھ سمجھا رہے ہیں۔

شہباز نے جملہ کسا۔ ''سرجی کا سیاپا آج کچھ نہ کچھ رنگ لائے گا یا تو ہمیں ڈبوئیں گے، یا ہمیں پار لگائیں گے۔''

واپس آئے تو سب نے بیک زبان ان سے پوچھا۔ ''یہ آپ کون سی کتھا سنا رہے تھے۔''

جواب ملا۔ ''میں نے کہا کہ پاکستان سے ہم ایک فلم شوٹ کرنے ٹورنٹو آئے ہیں۔ آج گھوم پھر کر ڈاؤن ٹاؤن میں لوکیشنز دیکھنی ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ جو ہماری جانب اشارے کر کے اسے کچھ بتا رہے تھے؟''

وہ بولے۔ ''میں بتا رہا تھا کہ خان قیصر نام کا ولن ہے۔ شہباز ہیروئن کا باڈی گارڈ ہے۔ مطیع اللہ ہیرو کا بھانجا ہے۔''

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''میرا اور مفتی کا کیا بتایا؟''

وہ بولے۔ ''ندیم فلم کا ڈائریکٹر ہے اور مفتی ایک تماش بین ہے۔''

''اور ہیرو؟''

بولے۔ ''وہ میں نے اپنا بتایا ہے۔''

اس پر خان نے اپنی مخصوص کھی کھی والی ہنسی نکالی اور شہباز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہڈ حرام باڈی گارڈ اپنی ہیروئن کو کسی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ڈاؤن ٹاؤن چنا چاٹ کھانے جا رہا ہے۔''

ٹرین چیختی چنگھاڑتی اتنی تیزی سے آ رہی تھی کہ محسوس ہوا کہ وہ کلرک کیبن سمیت سب کچھ اپنے ساتھ اڑا لے جائے گی مگر وہ اپنی حد سے ایک فٹ پیچھے اچانک تھم گئی۔ ہم سوار ہوئے۔ ڈبے میں سوار مسافر اتر چکے تھے۔ یہ آخری اسٹاپ تھا۔ رنگ برنگی پلاسٹک کی کرسیاں دونوں جانب دو تھیں۔ بیچ میں بھی کھڑے ہونے کی جگہ تھی اور چھت کے ساتھ اسٹیل کا پائپ پکڑنے کے لیے لگا ہوا تھا۔

کرسیاں سب خالی تھیں اور ہم آرام سے بیٹھ گئے مگر شہباز پائپ پکڑے کھڑا رہا۔ میں نے پوچھا۔ ''بیٹھ کیوں نہیں جاتے؟''

وہ بولا۔ ''میں ٹورسٹ ہوں۔ میری مرضی بیٹھوں یا کھڑا رہوں۔'' ڈبے میں ہمارے علاوہ کوئی نہ تھا مگر سرجی شہباز کو اشاروں کنائیوں سے سمجھا رہے تھے کہ بیٹھ جاؤ۔

میں نے کہا ''آپ لوگوں سے ٹورسٹ بننے کو کہا تھا بے وقوف بننے کو نہیں۔''

شہباز کندھے اچکا کر کھڑا رہا۔

ہر ڈبے میں دو تین جگہ بورڈ لگے تھے۔ جہاں ایک لائن پر پہلے سے لے کر آخری اسٹیشن کا نام لکھا تھا۔ جہاں ٹرین رکتی تو اس اسٹیشن کے نام کے پیچھے کی لائٹ جل جاتی اور اسپیکر سے اسی اسٹیشن کے آنے کا اعلان بھی ہوتا۔ ٹرین روانہ ہونے کا اعلان ہوتا تو سلائیڈنگ دروازے کھلے ہوئے آتے اور کھٹ کھٹ سے بند ہو جاتے۔ جب کوئی اسٹیشن آتا تو یہی دروازے ٹرین رکنے کے بعد کھل جاتے تھے۔

سرجی سے خان نے پوچھا۔ ''ہم نے کس اسٹاپ پر اترنا ہے؟''

انہوں نے نقشہ کھولا۔ اس پر انگلیاں پھیرتے رہے پھر بولے سپاڈائنا پر اترنا ہے۔ ہم پہلی بار آ رہے تھے تو سرجی باقاعدگی سے نقشہ دیکھ کر ہماری رہنمائی کر رہے تھے۔ میں اور مفتی اس ساری صورت حال سے محظوظ ہو رہے تھے۔

نیشنل ہالیڈے ہونے کی وجہ سے اتنا رش نہ تھا۔ لیبر ڈے پر سب پبلک آفس، بینک اور اسکول بند ہوتے ہیں۔ زیادہ تر ٹورسٹ سب وے سے نہیں بلکہ کیب سے سفر کرتے ہیں۔ سب وے کا نظام سمجھنے کے لیے وقت لگتا ہے۔ ٹورسٹ کے پاس ڈالر بھی ہوتے ہیں اور انہیں کم دنوں میں بہت کچھ دیکھنا ہوتا ہے۔ وہ یا تو گروپ ٹرپ لے لیتے ہیں جس میں رٹے رٹائے جملے سنتے ہیں اور ہر مقام کو گائیڈ کی

نظر سے دیکھتے ہیں۔ بہت سے سیاحوں کے عزیز شہر میں ہیں اور وہی انہیں لیے پھرتے ہیں۔

بیس پچیس منٹ ہی میں ہم ڈاؤن ٹاؤن کے مغربی جانب کے پہلے سب وے سپاڈائنا پہنچ گئے۔ ٹرین اسٹیشن پر دو تین منٹ میں پہنچ جاتی ایک ڈیڑھ منٹ رکتی پھر چل پڑتی۔ ہم سپاڈائنا کے اسٹیشن پر اترنے لگے تو سرجی نے اشارے سے حکم دیا کہ ٹرین رکنے سے پہلے کوئی اپنی سیٹ نہ چھوڑے۔ دوسرے سب ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر مسکرا پڑے۔

سپاڈائنا ڈاؤن ٹاؤن کے مغربی حصے کو لگتا پہلا سب وے اسٹیشن ہے۔ یہاں سے ڈاؤن ٹاؤن جنوب کی جانب فرنٹ اسٹریٹ تک پھیلا ہوا ہے۔ ڈاؤن ٹاؤن کے مشرقی حصے کو آخری لگتا سب وے اسٹیشن جارویس ہے۔ فرنٹ اسٹریٹ کے بعد ہوا میں معلق ہائی وے گارڈینر ہے اور ہائی وے کے بعد اونٹاریو لیک ہے۔ سیکڑوں میل میں پھیلے پانی کی لیک کے دوسری جانب امریکا کی ریاست نیویارک لگتی ہے مگر ٹورنٹو سے دکھائی اس لیے نہیں دیتی کیونکہ جھیل کے کنارے سمندروں کی طرح دور دور تک پھیلے ہیں۔

یہاں سے جنوب میں تو ڈاؤن ٹاؤن ہے اور شمال میں مڈ ٹاؤن کا علاقہ ہے جہاں زیادہ تر رہائشی اپارٹمنٹ بلڈنگز ہیں۔

ٹورنٹو میں ڈاؤن ٹاؤن کو چھوڑ کر سب علاقے کم و بیش ایک جیسے ہیں۔ کچھ زیادہ اچھے اور کچھ کم اچھے۔ ہر علاقے میں کچھ دفاتر ہیں۔ گیس اسٹیشن (پیٹرول پمپ)، شاپنگ مال، ریسٹورنٹ، کیفے، بار اور کچھ بلند عمارتیں بھی ہوتی ہیں مگر ڈاؤن ٹاؤن کا مزاج، نظام اور رفتار باقی سب علاقوں سے یکسر مختلف ہے۔

ہم ٹرین اسٹیشن سے اتر کر کھڑے تھے اور سرجی نے نقشوں کو کس کر پکڑ رکھا تھا۔ اب ان کے سر پر پی کیپ آ گئی تھی۔ وہ ٹورسٹ سے زیادہ گائیڈ بنے ہوئے تھے۔ اسٹیشن پر رونق تھی اور خاصی چہل پہل تھی۔ آتے جاتے ہم کو سیاح سمجھ کر ایک نظر دیکھ کر گزرتے۔ ہمارے کندھوں کے بیگ نے ہمارا حلیہ بھی سیاحوں سا بنا دیا تھا۔

سرجی نے اسٹیشن پر کچھ سیڑھیاں چڑھیں، کچھ اتریں، کچھ پھلانگیں، کچھ لوگوں سے ٹکرائے بہت سوں کو سوری کہا اور ایک دو نے ان سے بھی سوری کہا۔ آج ان کی پھرتیاں قابل دید تھیں۔ ہم مسکراتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ایک گوری نے ٹکرانے کے بعد انہیں ذرا سا گھورا تو انہوں نے سلام داغ دیا۔ آخر وہ ہمیں جنوبی سمت جانے والی ٹرین پر بٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔

ہم ٹرین میں بیٹھے جنوبی سمت جا رہے تھے۔ خان قیصر کچھ سوچ کر بولا۔ ''معلوم تو ہوا آخر ہم دیکھنے کیا جا رہے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم نے کسی کنزنگٹن مارکیٹ کا نام سنا ہے؟''

''دیکھی نہیں۔''

''یہ ٹورنٹو کا ڈیڑھ دو سو سالہ بازار ہے لاکھوں سیاح ہر سال اسے دیکھنے آتے ہیں۔'' میں بولا۔

''گائیڈ میں ہوں کہ آپ ہیں۔ اگر سب خود ہی بتانا ہے تو یہ لو اپنے نقشے۔'' سرجی نقشے کے بدلے میری جانب اپنا بھاری بیگ پھینکنے والے تھے۔ میں نے سوری کہا اور خان قیصر سے بولا۔ ''جو بھی پوچھنا ہے سرجی سے پوچھیں۔''

خان سرجی اور ان کے بیگ کو دیکھ کر کھی کھی والی ہنسی ہنسنے لگا۔ اتنے میں سرجی اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے اگلے سب وے پر لائن بنا کر اترنا ہے۔

ہم سب وے سے باہر آئے تو چمکتے سورج اور نیلے آسمان کو سب نے دیکھا۔ گھومنے پھرنے کا مزہ بھی تب آتا ہے جب آسمان صاف ہو اور موسم مزاج کے موافق ہو۔ آج موسم بہت خوشگوار ہو رہا تھا۔ گرمی کو آنے میں کچھ ہفتے رہ گئے تھے۔ ویسے تو یہاں کے موسم کو بدلتے کوئی دیر نہیں لگتی ہے مگر اب کوئی برف باری ہونے کی توقع کسی کو نہ تھی۔

ہم کالج اسٹریٹ کے کارنر پر کھڑے تھے۔ دو رویہ سڑک پر ٹریفک رواں تھی۔ ٹریفک کتنی بھی زیادہ ہو مگر ہارن کی آواز ... بھی نہیں سنی۔

ہمارے سامنے کچھ جدید بلند قامت عمارتیں تھیں۔ اپارٹمنٹ بلڈنگ ٹورنٹو میں بکثرت پائی جاتی ہیں اور آنے والے سالوں میں کئی بلڈرز نے ڈاؤن ٹاؤن کے اندر لیک اونٹاریو کے سامنے بڑی بڑی اپارٹمنٹ بلڈنگز کھڑی کر لی ہیں۔ ہانگ کانگ اور مین لینڈ چائنا سے ڈالر منی لانڈرنگ ہو کر آیا اور ٹورنٹو میں پراپرٹی زمین سے آسمان تک جا پہنچی۔ پیسا باہر کا تھا اور بلند و بالا عمارتیں ٹورنٹو میں سر اٹھاتی چلی گئیں۔

مگر ایک عمارت جو ہمارے سامنے تھی جو قدیم تھی۔

سب نے کالے چشمے اور آئی کیپ پہنے اپنے گائیڈ کی جانب دیکھا جو نقشے میں الجھا کھڑا تھا۔

شہباز دونوں ہاتھ جیکٹ میں ڈالے سرجی سے بولا۔ ’’مجھے دلچسپی تو ذرے کی بھی نہیں ہے مگر یہ تو بتانا پڑے گا کہ یہ مندر کب بنا تھا۔‘‘

سرجی بھڑک کر بولے۔ ’’میں کیا علاقے کا کونسلر ہوں؟ جو مجھے سب عمارتوں کا پتا ہوگا۔‘‘

’’کونسلر کو تو نہیں مگر گائیڈ کو تو معلوم ہوتا ہے۔‘‘ مفتی بولا۔

سری جی نے مدد طلب نظروں سے میری جانب دیکھا۔ خان قیصر کہہ رہا تھا کہ ہم تب تک نہیں ہلیں گے جب تک اس بھوت بنگلے کے بارے میں سرجی کچھ بتاتے نہیں۔‘‘

میں نے دخل اندازی کی اور بولا۔ ’’گائیڈ کا اسسٹنٹ میں ہوں۔ یہ انٹرنیشنل گائیڈ ہے اور ہر ایک کو گھاس نہیں ڈالتا۔ میں ہی بتا دیتا ہوں۔‘‘

شہباز مصنوعی غصہ دکھانے لگا۔ ’’سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں لائنیں لگوانے والا گائیڈ خود چغد ہے۔ یہ ہی بتائے گا۔‘‘

سب کہہ رہے تھے کہ شہباز بھائی غصہ مت کرو۔ غصہ حرام ہے تو سرجی بولے۔ ’’ہانڈی ابلے گی تو اپنے ہی کنارے جلائے گی۔‘‘

مطیع اللہ بولا۔ ’’سرجی تم تو بولی تھی کہ آج کوئی محاورہ نہیں بولے گی۔‘‘

میں نے سب کو چپ رہنے کا کہا اور بولا۔ ’’یہ ڈانتا کریسنٹ کی عمارت ہے شروع میں گوتھک اسٹائل پر عمارتیں جو بنی تھیں یہ ان میں سے ایک ہے۔ معلوم نہیں کہ ڈیزائن کس نے بنایا مگر یہ 1875ء میں بنی تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں یہ فوجیوں کی بیرک کے طور پر استعمال ہوئی اور بعد میں اسپتال میں بدل دی گئی۔ آج کل یونیورسٹی آف ٹورنٹو نے فائن آرٹس کا ڈپارٹمنٹ بنایا ہوا ہے۔‘‘

شہباز بولا۔ ’’لگتا تو مندر ہے۔‘‘

میں نے جواب دیا۔ ’’کوئی مندر تین منزلہ اور اتنا پھیلا ہوا کسی نے دیکھا ہے؟‘‘

مطیع اللہ بولا۔ ’’سوات میں بھی نہیں ہے۔‘‘

میں سرجی سے بولا۔ ’’اب آپ ٹیم کو سنبھالیں اور آگے چلیں۔ سارا وقت تو یہاں پر ضائع ہو رہا ہے۔‘‘ اور جاتے جاتے میں نے سب کے گوش گزار یہ بات بھی کی۔ ’’یونیورسٹی آف ٹورنٹو یہاں سے کئی بلاک مشرقی سمت پھیلی ہوئی ہے۔ ایک پورا شہر ہے۔ پھر کبھی اسے دیکھنے سب اکٹھے آئیں گے۔‘‘

سرجی نے میرا کہا ان سنا کر دیا اور دائیں جانب ایک سڑک پر نقشہ کھولے بڑھ گئے۔

وہ آگے بڑھے تو میں نے سب کو روک کر کہا۔ ’’ابھی ہم نے ٹرپ شروع کیا ہے اور آپ سرجی کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اگر بگڑ گئے تو نقشے وغیرہ پھاڑ کر کہیں نکل جائیں گے۔‘‘

شہباز بولا۔ ’’قسم لے لو یہ سیاپا کہیں نہیں جائے گا۔ ہمارے اردگرد دور سے چکر لگاتا پھرے گا۔‘‘

میں نے خان سے کہا کہ شہباز کو تو ہی قابو میں رکھ سکتا ہے میرے ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔

خان نے بڑھ کر شہباز کو پکڑا اور بولا۔ ’’اگر تم نے سرجی کو تنگ کیا تو تمہیں ہم رات تک بھوکا رکھیں گے۔ اے شریف انسان۔‘‘ یہیں خان نے بات کاٹ دی اور ذرا دور کھڑے سرجی کو دیکھا جو نیکر پہنے ایک چینی لڑکی کو روکے کھڑے تھے۔ چہرہ ان کا کھلا تھا اور اپنا دائیاں ہاتھ اس کے منہ کے سامنے نہ جانے کیوں لہرا رہے تھے۔ خان لمبی سانس لے کر بولا۔ ’’شہباز تو اب میرے ہاتھوں سے آزاد ہے۔‘‘

شہباز قہقہہ لگا کر بولا۔ ’’ندیم بھائی خود ہی اپنے گائیڈ کا سیاپا بھگتیں۔‘‘

میں خود سر پکڑ کر کھڑا تھا۔ مطیع اللہ کہنے لگا۔ ’’سرجی اس کے سامنے یہ گانا گا رہی ہے۔ میں تیرے اجنبی شہر میں...‘‘

قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ سرجی نہایت سلیس اردو میں بات سمجھا رہے ہیں اور وہ موٹی چینی لڑکی خالص چینی زبان میں انہیں جواب دے رہی ہے اور دونوں اس طرح سے مطمئن کھڑے ہیں کہ جیسے اپنے جذبات سے ایک دوسرے کو مکمل آگاہ کر چکے ہیں۔

مجھے پاس دیکھا تو بولے۔ ’’ایک تو ہر وقت آپ لوگ بھی رنگ میں بھنگ ڈالنے پہنچ جاتے ہیں اور ہمیشہ عین وقت پر ہی پہنچتے ہیں۔‘‘

اس لڑکی نے چہرے پر بڑے نمبروں والی عینک چڑھائی ہوئی تھی۔ سفید شرٹ سے پیٹ کا گوشت ڈھلک رہا تھا اور ننھے پاؤں میں قینچی والی چپل تھی۔ ہم پانچ لوگوں نے گھیرے میں لیا تو وہ لڑکی ڈر گئی۔ سرجی کہنے لگے۔ ’’اس بیچاری پر تم لوگوں نے وحشت طاری کر دی ہے۔ لڑکی ذات کا تو احترام ہونا چاہیے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’یہ کیا اردو سمجھتی ہے جو اسے دل کا حال دے رہے ہیں؟‘‘

سرجی بولے۔ ’’میں کیا چینی جانتا ہوں جو اس کی ہر بات سمجھ رہا ہوں۔‘‘

پوچھا۔ ’’کیا کہہ رہے تھے؟‘‘

بولے۔ ’’کہنے کا موقع آیا ہی تھا کہ آپ دیگ کے چمچ بن کر چلے آئے۔‘‘

اتنے میں لڑکی نے اپنے تئیں ہمت دکھائی اور خان کے پاس سے پھسل کر نکل گئی۔ مطیع اللہ زور سے بولا۔ ’’کم بخت خان کی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکل گئی ہے۔‘‘ خان شرمندگی میں جھکا اپنے کھلے پاؤں دیکھنے لگا۔

مفتی نے سرجی کو بازو سے پکڑا اور سمجھاتا بجھاتا اپنے ساتھ لے چلا اور میں کھڑا سوچتا رہا کہ آج تو ہم نے ڈاؤن ٹاؤن ٹورنٹو دیکھنا ہی نہیں ہے۔ سرجی کنگسٹن مارکیٹ دکھانے ہمیں لے جا رہے تھے۔

ہم کالج اسٹریٹ سے بائیں ہاتھ آگسٹا ایونیو پر آئے تو ایسے لگا جیسے لاہور کی پرانی انارکلی میں چلے آئے ہوں۔ پیدل چلنے والوں کی وجہ سے پھنسی ٹریفک دونوں جانب فٹ پاتھ کے پیچھے چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ کئی ایک دکانداروں نے فٹ پاتھ کا کچھ حصہ بھی گھیر رکھا تھا۔ تقریباً ایک فٹ قطر کے لکڑی کے پول جن پر بجلی کی تاریں اوپر چلتی گئی تھیں۔ ایک رش سا مچا تھا جو فٹ پاتھ سے سڑک تک پھیلا تھا۔ گاڑیاں سڑک پر چلنے والوں کی وجہ سے رکی تھیں اور پیدل چلنے والی سواریوں کو آگے پیچھے سے کراس کرتے جاتے تھے اگر ہم کو تھوڑے فاصلے پر اونچی اونچی جدید عمارتیں نہ ہوتیں تو خود کو یاد دلانا پڑتا کہ ہم کینیڈا میں ہیں۔ دوسری بڑی وجہ ٹورنٹو میں ہونے کا پتا دیتی تھی وہ مختلف نسلوں کے لوگ تھے جو ہمارے اردگرد سے گزر رہے تھے۔ چین، ویت نام اور تائیوان کے لوگ زیادہ نظر آ رہے تھے۔ افریقی، انڈین اور غریب یورپی ممالک کے لوگ بھی آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔

سب سرجی کے اردگرد اکٹھے ہو گئے اور بولے۔ ’’ہمیں اس بوچڑ بازار کے بارے میں کچھ بتائیں۔‘‘

سرجی بولے۔ ’’ہمیں مہذب طرز گفتگو اختیار کرنا چاہیے تاکہ ملک کا نام روشن ہو سکے۔ دوسرا یہ کہ اس کا نام کنگسٹن مارکیٹ ہے۔‘‘ پھر سامنے بازار کی جانب اشارہ کر کے بولے۔ ’’یہ مارکیٹ ہی پورا ایک علاقہ ہے جو تین چار سڑکوں تک پھیلا ہوا ہے۔‘‘

شہباز بولا۔ ’’یہاں کھاتے ہیں کیا کیا ملتا ہے؟‘‘

سرجی بولے۔ ’’تم اپنا کھانا کیوں نہیں لائے؟‘‘ پھر سب سے مخاطب ہو کر بولے۔ ’’ٹھیک کہتے ہیں کہ چیل کے گھونسلے میں ماس نہیں ملتا۔‘‘

میں نے سنا تو سر پکڑ لیا اور کہا۔ ’’ہمارے پاس اتنا زیادہ وقت نہیں ہے، اگر سرجی محاورے بولیں گے تو شہباز کوئی نہ کوئی غلط یا صحیح مطلب نکال کر بول پڑے گا اور پھر دنگا فساد شروع۔‘‘

شہباز جو ایک پیلی چھتری تلے کھڑا بے حد پیلا لگ رہا تھا اور چہرے پر بے تحاشا پسینا تھا۔ وہ بولا۔ ’’میں اگر چیل ہوں تو سرجی کبوتر ہیں۔ چیل کے پاس گوشت نہیں ہوگا تو وہ کبوتر کھا جائے گی۔‘‘

مطیع اللہ فوراً شہباز سے بولا۔ ’’اچھے خاصے مرد ہو، یہ کہو کہ چیل کبوتر کھا جائے گا۔‘‘ شہباز سہارے کے لیے چھتری سے چمٹا اور بولا۔ ’’خوچہ کی گرامر مجھ پر ٹھیک ہو جاتی ہے۔‘‘ یہ کہنا تھا کہ چھتری نیچے آ پڑی۔

ہم سب ادھر متوجہ ہوئے ہی تھے کہ کہیں سے چاؤں چاؤں کرتی ایک چینی لڑکی برآمد ہوئی۔ چھوٹی سی اور منی سی ناک پر ماتھے کے سائز کی عینک دھری تھی۔ باقی کے نقوش وہی تھے جو ہمیشہ چینیوں کے ہوتے ہیں۔ قد وہی کہ سرجی کے برابر کھڑے یہ دیکھ رہے تھے کہ کون ان دونوں میں سے لمبا ہو سکتا ہے۔ سرجی کی سیاہ عینک کے پیچھے آنکھیں یقیناً مسکرا رہی ہوں گی کیونکہ ان کی مونچھیں اب پھڑک رہی تھیں۔ چینیوں کو غصہ بہت کم آتا ہے اور جب آتا ہے تو مرتے مارتے نہیں بلکہ ہلکا سا روٹھ جاتے ہیں۔ وہ بھی اب روٹھی کھڑی تھی۔ سرجی نے چھتری دوبارہ لگانے میں اس کی معاونت کی اور پھر اسی کے ہمراہ اس کے کپڑوں کی دکان میں گھس گئے۔ یہ خیال کیا کہ جاتے ہوئے تمام نقشے مطیع اللہ کو سونپ گئے۔ میں طیش میں آنے سے لمحہ پہلے کی کیفیت میں تھا۔ سرجی گئے تو وہ دو تھے، باہر آئے تو ایک تھے مگر ہاتھ میں سفید رنگ کی ایک بڑی ٹی شرٹ تھی جس پر بڑا بڑا لکھا تھا

“I Love China.”

سرجی دو ڈالر میں چینی کی محبت خرید لائے اور شرٹ اپنی سائز سے اتنی بڑی تھی کہ شہباز اپنے جسم پر رکھے یہ کہہ رہا تھا کہ اگر چوڑائی، لمبائی میں کاٹ دی جائے تو شاید مجھے پوری آجائے۔

ہم آگے بڑھے تو دیکھا دو عورتیں سیاہ برقعے میں چلی آرہی ہیں۔ ساتھ ہی ایک گوری لڑکی نے برائے نام لباس پہنا ہے۔ دو لڑکے تیزی سے سائیکل چلاتے ہم سے بغیر ٹکرائے نکل گئے۔ ایک چینی نے پنجرے میں دو کوے اٹھا رکھے تھے۔ ایک الجھے بالوں والا گٹار بجا رہا تھا اور فٹ پاتھ پر اس نے اپنی ہیٹ الٹی رکھی تھی جس میں چند سکے پڑے تھے۔

کنگسٹن مارکیٹ ٹورنٹو ڈاؤن ٹاؤن کا بہت پرانا علاقہ ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ ہر نسل کا تارک وطن ہر وقت آپ کو یہاں ملے گا۔ مختلف شکلیں، انداز، زبانیں، رنگ، نسل ہوتے ہوئے بھی وہ ایک ہی مقصد کے لیے یہاں اکٹھے رہتے ہیں اور مقصد یہ ہے کہ پیٹ کی دوزخ بھرنی ہے۔ ٹورنٹو میں 51 فیصد لوگ وہ ہیں جو کینیڈا میں پیدا نہیں ہوئے۔ اسی لیے مختلف النسل اقوام کا اکٹھے مل جل کر رہنا ایک مثالی امر ہے۔ ہر ایک اپنی بولی بولتا ہے۔ مذہب اور رسومات بھی علیحدہ ہیں مگر کوئی کسی اور کی زندگی میں دخل اندازی نہیں کرتا ہے اور نہ ہی کرنے کی اجازت ہے۔

دو سو سال پہلے یہاں میدان اور کھیت کھلیان تھے۔ یہاں فوجیوں کی پریڈ ہوا کرتی تھی۔ پہلے یہ جگہ ایک برطانوی کی ملکیت تھی۔ میلوں پھیلا علاقہ۔ یہاں سے لے کر سب وے تک اس کی دسترس میں تھا۔ یہاں نیبر کی قلت تھی تو اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ سے آئے باشندے یہاں آباد ہو گئے۔ ان کے لیے یہاں قطاروں میں وکٹورین طرز کے چھوٹے چھوٹے مکانات تعمیر ہوئے۔ یہ مکانات گو 1880ء میں تعمیر ہوئے تھے مگر اب بھی خاصی تعداد میں ویسے کے ویسے آباد کھڑے ہیں۔

لاکھوں سیاح ہر سال اس جگہ کو دیکھنے آتے ہیں اور سب سے زیادہ فوٹو گرافی بھی یہاں ہوتی ہے۔ اب تو اس علاقے کو کینیڈا کا تاریخی ورثہ قرار دیا جا چکا ہے پھر بیسویں صدی کے آغاز میں یہودی یورپ سے یہاں کھنچے چلے آئے۔ یہاں آکر انہوں نے گوشت کا کام شروع کر دیا۔ پھر یہ علاقہ یہودیوں کی وجہ سے مشہور ہو گیا پھر آہستہ آہستہ دوسرے تارکین وطن آتے گئے اور یہ مختلف نسلوں اور مذاہب کے لوگوں کا ٹھکانا بن گیا۔

جو گھر سڑک کے ساتھ تھے ان کے آگے وا... کمرے دکانوں میں بدل گئے بلکہ اگر آگے لان تھا تو ... شاپ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اب بھی اکثر دکانوں کے ساتھ گھر جڑے ہیں۔ سٹی گورنمنٹ نے انہیں روکا نہیں بلکہ ا... کی تشہیر کی اور اب سیاح یہ دیکھنے بھی آتے ہیں کہ گھر... کے آگے کا حصہ کس طرح سے دکانوں میں تبدیل کیا گیا... وہ ایسی دکانوں اور گھروں کی تصاویر اتارتے ہیں پھر ا... لوگوں نے یہ جسارت بھی کر لی کہ آدھے فٹ پاتھ... بھی قبضہ کر لیا۔ انہی فٹ پاتھوں پر شام سے... رکھ دی جاتی ہیں۔ ساتھ ریسٹورنٹ تھے اور لوگ اپنی... کھانا کھاتے ہیں، کافی پیتے ہیں یا تازہ گنوں اور مالٹوں... رس پی رہے ہوتے ہیں۔ فٹ پاتھ کے ساتھ سائیکلیں ا... موٹر سائیکل پارک ہوتی ہیں۔ گویا ایک طرح کا پاکستانی... ماحول دیکھنے کو ملتا ہے جو سیاحوں کے لیے بڑی عجیب با... بھی۔

لوگ مختلف ملکوں سے آئے تو انہی ملکوں... ریسٹورنٹ بھی یہاں کھل گئے۔ کوئی اٹلی والے ہیں تو کوئی یونان کے لوگ اپنا کھانا بنا رہے ہیں۔ چینی تو ہر چیز کو جا... سمجھ کر پکا بھی لیتے ہیں اور کھا بھی لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھلونے، کپڑے، الیکٹرونکس، جوتے، کچن کا سامان سب اشیاء نہایت ہی ارزاں نرخوں پر ملتی ہیں۔ سبزیوں اور پھلوں کے ٹھیلے چھتریوں تلے لگے ہیں۔ ہر قسم اور رنگ کا پھل اور سبزی دستیاب ہے۔ گوشت، مچھلی، جھینگے، ... سب زندہ مردہ دستیاب ہیں اور تو اور یہاں پہلی بار میں نے پنساری کی دکان بھی دیکھی اور دکاندار بھی اپنی شکل، جسامت، چہرے کے تاثرات سب سے پنسار دکھائی دیتا تھا۔ بوریوں میں کئی جڑی بوٹیاں یا بیج اور کیا کیا نہیں بھرا تھا اور اس کو ہر ایک کا نرخ اور فوائد از بر یاد تھے۔ سرجی اس کے ساتھ تا دیر سرگوشیوں میں بات کرتے رہے اور وہ متواتر اپنا سر ہلاتا رہا۔

کئی طرح کی بیکریاں تھیں۔ شہباز نے کچھ خریدنا چاہا مگر مطیع اللہ آڑے آ گیا کہ ان کے بسکٹ بھی حرام ہوتے ہیں۔ وجہ یہ بتائی کہ ان کی کھاد میں سور کی چربی ملی ہوتی ہے۔ کھاد سے گندم تیار ہوتی ہے۔ گندم سے میدہ، میدے سے بسکٹ اور اسی وجہ سے بسکٹ حرام ہے۔

اب ساؤتھ ایشیا، لاطینی امریکا، یورپ اور چند...

...بھی یہاں آکر آباد ہو چکے ہیں۔ میرے لیے یہاں ... کی وجوہات دو تھیں۔ ایک یہ کہ مختلف تہذیبوں کے ... مل سکوں گا اور دوسرا یہاں کے پرانے مکانات اور ... ہیں۔

تارکین وطن ایک دوسرے کی جگہ لیتے گئے اور آج ... یہاں آ گھسے ہیں۔

سڑک پر بہت سے ہینگر ایک راڈ سے لٹکے ہوئے تھے ... مردانہ شرٹس آویزاں تھیں۔ معلوم نہیں ان کے مرد ... چلے گئے تھے کہ سارا کاروبار چینی عورتوں نے سنبھالا ... تھا۔ مطیع اللہ نے ہینگر اتارے، شرٹ کو تنقیدی نظروں ... دیکھا۔ مفتی بھی اس کے ساتھ جا کھڑا ہوا اور ایک بحث ... چھڑ گئی۔ مطیع اللہ کہہ رہا تھا۔ ”یہ پرانا شرٹ ہے۔“

... اور مفتی جواب دے رہا تھا۔ ”نہیں یہ پرانی شرٹ ...“

مطیع اللہ سمجھا کہ مفتی کہہ رہا ہے کہ نئی شرٹ ہے مگر وہ ... پر نہیں بلکہ مفتی کے لہجے سے مطلب اخذ کر رہا تھا۔ ... اللہ نے کہا۔ ”یار تم دیکھتا نہیں کالر کو۔ یہ پرانا ہے۔“

”میں نہیں مانتا۔ یہ پرانی ہے۔“

”تم خوامخواہ میں بحث کرتی ہو، یہ پرانا ہے، نئے کا ... ایسے ہوتی ہے۔“

”جو بھی کہہ لو۔ یہ پرانی ہے۔“ مفتی مسکراتا بھی ... رہا تھا مگر مطیع اللہ بحث کے بعد ہلکا سا سرخ ہونا شروع ہو ... گیا مگر جب میں نے مطیع اللہ کو سمجھایا کہ یہی تو کہہ رہا ہے ... پرانی ہے تو تم جھگڑا کیوں کرتی ہو۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”میں مرد ہوں بولو کہ جھگڑا کیوں ... کرتے ہو۔“

چینی لڑکی ہمیشہ کی طرح ساتھ کھڑی حیران نظروں ... سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے یہ تصدیق کی کہ ہماری شاپ پر ... کپڑے سیکنڈ ہینڈ ہوتے ہیں تو شہباز نے نعرہ لگایا۔ ”یہ ... بازار ہے۔“ اور پھر بھی تیزی سے اس دکان میں جا ...

بہت سے پاکستانی ذہنی طور پر لنڈا خریدنے کے عادی ... ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو تفریح کے ... لنڈے بازار کا چکر لگاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی صورت ... تھی۔ خریدنا ہو یا نہ ہو، مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ لنڈے کا ... کاروبار یہاں کس طرح سے ہوتا ہے۔

یہاں فرق یہ تھا کہ مردانہ شرٹس، زنانہ اسکرٹس اور بچوں کے فراک تک ہر چیز ڈرائی کلین اور استری کی ہوئی تھی۔ بہت حد تک نئی نکور حالت میں یہ ملبوسات فروخت کے لیے لٹکے تھے۔ مجھے کئی ذرائع سے معلوم ہوا کہ اسی طرح نئے کپڑے بڑے شہر کی مارکیٹوں میں نئے کر کے بیچے جاتے ہیں اور قیمت بھی کئی گنا زیادہ چارج کی جاتی ہے۔

یہاں مردانہ جیکٹس بھی تھیں اور بہت ہی اچھی حالت میں اور اعلیٰ کوالٹی کی تھیں۔ یہ جیکٹس اسٹور پر ڈیڑھ دو سو ڈالر سے کم نہ ہوں گی مگر یہاں تیس ڈالر میں مل رہی تھی۔ مفتی جو دنیا کی ہر برتنے والی چیز میں نقص نکالنے میں مشہور ہے وہ بھی جیکٹس کے ٹیگ غور سے دیکھ رہا تھا۔

گو جیکٹس کا موسم گزر چکا تھا مگر خان ایک جیکٹ پسند کر کے اسے سونگھ رہا تھا۔ وہ چینی لڑکی انگریزی جانتی تھی۔ اس نے اتنے سارے گاہک اور وہ بھی پُرجوش دیکھے تو وہ بھی سرجی پر توجہ دینے لگی۔ سرجی پر اس لیے کہ وہ پہلے ہی بطور گائیڈ اپنا تعارف کروا چکے تھے اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ مختلف قسم کے سیاحوں کا گروپ پاکستان سے آیا ہے۔ وہ متواتر سرجی کو کہہ رہی تھی پاکستان فرینڈ (Friend) اور سرجی اس دوستی کو یاری میں بدلنا چاہتے تھے مگر وہ سرجی کے کھلے اظہار پر بھی کوئی واضح جواب نہ دے رہی تھی۔

شہباز نے دو شرٹس پسند کر لیں اور لڑکی بولی۔ ”یہ تو میں پچیس فیصد ڈسکاؤنٹ پر دے دوں گی کیونکہ بڑے سائز کی وجہ سے ایک سال سے گاہک کا انتظار کر رہی ہیں۔“

میں نے شرٹس اس لیے نہ لی کہ مجھے اندازہ تھا کہ کسی آؤٹ لیٹ اسٹور میں نئی حالت میں پانچ ڈالر مہنگی مل جائے گی۔ میں نماز جمعہ پڑھنے جب بھی IMO مسجد جاتا تو ساتھ ہی سپر اسٹور کا آؤٹ لیٹ تھا وہاں کا چکر ضرور لگاتا تھا اس لیے مجھے نئی شرٹس کی قیمت کا اندازہ تھا۔

اب سرجی آٹھ دس شرٹس اور ایک دو جیکٹس کے خریدار بن کر چینی لڑکی کو ایک کونے میں لیے محو گفتگو تھے۔ ان کا سر ہل رہا تھا اور وہ اس سے لگاتار پلیز پلیز کہے جا رہے تھے اور وہ شرم سے سر جھکائے نہ نہ کر رہی تھی۔ مطیع اللہ بولا۔

”سرجی اس سے کیا مانگ رہی ہے؟“

شہباز پریشانی سے بولا۔ ”کوئی نیا سیاپا ہی کھڑا نہ کر دے؟“

میں بولا۔ ”مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں مان ہی نہ جائے۔“

خان بولا۔ ”آدھی مانی تو دیکھنا کہ پوری بھی مان

جائے گی۔" مفتی کا چہرہ ایسے سرخ ہو گیا جیسے لیٹ نائٹ شو دیکھتے وقت ہوا کرتا ہے۔

سرجی اب اس کو ہمالیہ سے اونچی اور بحیرہ عرب سے گہری دوستی کے واسطے دے رہے تھے۔ آخر اس نے مسکرا کر ہاں کر دی۔ سب نے نعرہ بلند کیا۔ "ہاں ہو گئی۔ ہاں ہو گئی۔"

سرجی اب بولے۔ "یہ کیسے لے جائیں گے۔"

میں بولا۔ "آپ کا بیگ کب کام آئے گا۔"

بولے۔ "پھر تو یہ بھاری ہو جائے گا۔"

میں بولا۔ "پھر ٹیکسی کر لیتے ہیں۔"

اب سرجی چونک کر بولے۔ "آپ لوگ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

مطیع اللہ بولا۔ "اس گڑیا رانی کا بات ہو رہا ہے۔"

سرجی خفا ہو گئے۔ "سب کی ذہنیت ہی خراب ہے۔ اس معصوم نے ہنس کر مجھ سے بات کیا کر لی کہ لوگوں نے اس کا کریکٹر خراب کر دیا۔ میں تو شرٹس کا مول بھاؤ کم کروا رہا تھا اور آپ نے مجھے کیا سمجھ لیا ہے؟"

بڑی منت کے بعد مانے اور وہ بھی جب لڑکی کا واسطہ دیا پھر سارا سامان بیگ میں سما گیا۔ سب نے ایک نعرہ بلند کیا۔ "سرجی۔" جواب زور کا آیا۔ "زندہ باد۔"

شکر ہے بیگ کے پہیے بھی تھے تبھی سب باری باری اسے کنگسٹن مارکیٹ میں گھسیٹ رہے تھے۔

لوگوں کا رش بہت تھا۔ زیادہ تر گورے سیاح تھے جو یورپین ملکوں سے آ کر کنگسٹن مارکیٹ میں خوش و خرم گھوم رہے تھے۔ حالانکہ جن ممالک سے وہ آئے تھے وہاں کی عمارتیں، مارکیٹ وغیرہ تین تین سو سال سے بھی اصل حالت میں اپنا وجود رکھتی ہیں۔ آپ کسی بھی ملک میں سیر کے لیے جائیں اور وہاں کے قابلِ ذکر مقامات نہ دیکھیں تو دل و دماغ کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ میری دانست میں یورپین کے لیے یہاں ٹورنٹو میں دلچسپی صرف ڈاؤن ٹاؤن، لیک فرنٹ اور نیاگرا فال میں ہونی چاہیے۔ یورپ میں نارتھ امریکا کی طرح بڑے بڑے ڈاؤن ٹاؤن نہیں ہیں۔ اتنی بڑی بڑی جھیلیں بھی نہیں جو ٹورنٹو میں نظر آتی ہیں اور نیاگرا فال تو سب سے اہم مقام ہے جو دنیا میں بھی بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔

اور پھر سرجی سیاحوں کے ایک گروپ کو گھیرے کھڑے تھے۔ چند موٹی عورتیں اور کچھ پتلے مرد حضرات تھے۔ عورتوں نے بڑی بڑی نیکریں چڑھائی ہوئی تھیں جو انہیں چھوٹی پڑ گئی تھیں اور مردوں نے تنگ نیکریں پہنی تھیں جو انہیں بڑی دکھتی تھیں۔ سرجی نے اپنا تعارف ایک گائیڈ کے طور پر کروایا اور ہمیں ہمیشہ کی طرح سیاح بنا کر ایک فاصلے پر رکھ دیا۔ وہ لوگ حیران تھے اور سرجی سے بہتر انگلش نہیں بول سکتے تھے۔ انہوں نے سرجی کو گائیڈ مانا اور پھر سر کا ہاتھ اپنے گلگلے گلگلے ہاتھوں میں مسلتے اور سرجی کو قرار آ رہا تھا۔

مطیع اللہ بولا۔ "سرجی ان کنوؤں میں سے کون سا تیل نکالنا چاہتی ہے؟"

میں بولا۔ "رونق تو سرجی نے بہرحال لگائی ہوئی ہے۔ چلیں جا کر تیل دیکھتے ہیں اور تیل کی دھار بھی دیکھ لیں گے۔"

ہم نے جا کر ہاتھ ملائے اور پھر تعارف ہوا۔ ان میں سے ایک بتا رہا تھا کہ ہم سالوں سے کینیڈا آنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اس سال ہماری قسمت کھلی اور ہم اس خوب صورت ملک کو دیکھنے چلے آئے۔ وہ بتا رہے تھے کہ یہاں سے وہ کیوبک سٹی جائیں گے اور وہاں سے وہ لوگ امریکا داخل ہو کر نیویارک میں کچھ دن ٹھہریں گے۔ نیویارک کا سنا تو سرجی وہاں کے بھی مستند گائیڈ بن کر انہیں معلومات فراہم کر رہے تھے۔ سرجی میرے ہمراہ نیویارک کی سیر کر چکے تھے اور ان کے پاس تازہ تازہ معلومات بھی تھیں۔

وہ عورتیں معمر تھیں مگر پھر بھی آتی جاتی ساڑھیں ان کو پیچھے سے ٹکر مار کر گزر رہی تھیں۔ سرجی صرف تین عورتوں کو اخراماً اور بچ بچا کر فٹ پاتھ تک لائے اور ان سے اب پوچھنے لگے۔ "آپ نے نیاگرا فال دیکھی ہے؟"

حالانکہ وہ ابھی تک خود وہاں نہیں گئے تھے۔ وہ بولیں کہ ہم کل ہی دیکھ کر آئے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک اپنی دونوں ہتھیلیاں رگڑتی ہوئی آسمان کی جانب دیکھ کر بولی۔ "اف خدایا! کتنی خوبصورت جگہ ہے۔ واپس آنے کا دل ہی نہیں کرتا تھا۔"

اب سر ان کو ڈاؤن ٹاؤن کے ان مقامات کے بارے میں معلومات دینے لگے جو انہیں میں نے لکھ کر دی تھی۔ انہوں نے تو شہباز سے بھی لسٹ لے کر اپنے نوٹس بنائے ہوئے تھے۔

ان میں سے ایک سرجی کی منت کرتی ہوئی بولی۔ "اگر آپ کے گروپ کو برا نہ لگے تو ہم بھی آپ کی رہنمائی میں کنگسٹن مارکیٹ دیکھ سکتے ہیں؟"

سرجی کا رنگ فق ہو گیا۔ لڑکھڑائے اور پھر اپنے آپ کو سنبھالا۔ میں اسی دوران بولا۔ "اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔"

وہ انکار کرنے کا طریقہ سوچ ہی رہے تھے کہ شہباز بولا۔ "ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں بلکہ خوشی ہو گی جو آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔"

مطیع اللہ بولا۔ "ابھی تو ہم نے اسٹارٹ لیا ہے۔ دوسرے مقامات پر بھی ہمارے ساتھ آ سکتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "نہیں...... نہیں۔" پھر سرجی کی جانب تشکر کی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ان کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے۔ ہم اتنی زیادہ زحمت نہیں دے سکتے۔ یہ صرف ہمیں مارکیٹ ہی دکھا دیں۔"

اب سرجی میری جانب آئے۔ منمنا کر بولے۔ "آپ ہی اس سچویشن کو سنبھالیں۔"

میں نے کہا۔ "پھر پنگا کیوں لیا تھا؟"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ دیمک کی طرح چمٹ جائیں گی۔ اب کیا کروں اور شہباز نے بھی مجھے پھنسا دیا ہے۔"

میں نے پھر انہیں کچھ معلومات دیں اور کہا۔ "انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کرو گے۔ اچھے ہی بڑے گائیڈ کہلاؤ گے۔"

ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے اور وہ امید افزا نظروں سے ہماری جانب دیکھ رہی تھیں۔ ہمارے سب ہی ہلکی طور پر ہنس رہے تھے کیونکہ خان کی کھی کھی والی ہنسی نکل رہی تھی۔

مجھے بعد کے سالوں میں یہ اندازہ ہونے لگا تھا کہ یہ امریکن بیشتر سیاحوں کو آپ آسانی سے بے وقوف بنا سکتے ہیں۔ انہیں کچھ بھی بتاتے رہیں وہ بڑی توجہ سے سن کر سر ہلا دیتے ہیں۔ پاکستان میں آئے ہوئے یورپی اور امریکن سیاحوں کو ٹورسٹ گائیڈ گلیوں، محلوں میں رشتے دار کے گھر لے جاتے تھے۔ سیاح "واؤ......واؤ" کہتے داخل ہوتے اور یہی کہتے باہر نکلتے تھے۔ کچن میں چڑھی ہانڈی کو حیرت سے دیکھتے اور شوق سے چکھتے تھے۔ وہ کمروں میں جھانکتے اور جب ٹرنک پر ٹرنک رکھے دیکھتے تو ان کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ انہیں بتاتے کہ یہ طریقہ کار ٹرنک رکھنے کا ہزاروں سالوں سے چلا آ رہا ہے۔ وہ بت بنے ہاتھوں سے کپڑے دھوتے دیکھتے۔ گھر میں بیٹھے بزرگوں کی عزت تکریم کا مطالعہ کرتے اور پھر فوٹو گرافی شروع ہو جاتی پھر جاتے وقت گھر والوں کو کچھ تحفے تحائف دے جاتے۔

آج سرجی ایک نئی صورتِ حال سے دوچار تھے۔ میں نے ان کے گوش گزار کر دیا تھا کہ آج ان کی زبان رکنی نہیں چاہیے مگر ان کی زبان اس وقت بند ہو گئی جب ایک مرد نے یہ پوچھا کہ دکانوں کے پیچھے گھروں کی بناوٹ وکٹورین اسٹائل میں کیوں ہے؟ میں نے اشارہ کیا کہ کچھ بھی بول، خاموش مت ہونا۔

وہ گویا ہوئے۔ "وکٹورین طرز تعمیر کی وجہ یہ تھی کہ آرکیٹکٹ انگریز تھا اور اس نے انگریزوں کے لیے بھی گھر بنانے تھے اس کو نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے مکانات بنانے پڑے، ورنہ وہ تو اسلامک طرزِ تعمیر پر گھر بنا کر اس کی مخروطی چھتیں ڈالنا چاہتا تھا ویسے گھر بنانے کے بعد وہ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ بعد میں اس نے خودکشی کر لی۔"

یہ سن کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ سرجی کے علم اور معلومات دونوں سے متاثر نظر آ رہے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر سرجی کا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے میری جانب دیکھا اور آنکھ مار دی۔

سرجی نے انہیں ہانک کر آگے لگایا تو میں نے ان کے کان میں اس علاقے کے بارے میں دو لائن بول کر تاریخ ڈال دی۔ وہ بولے کہ اب وہ آگے سنبھال لیں گے۔

میں نے اپنے گروپ کو بتایا کہ اب سرجی رواں ہو گئے اور اب دیکھتے ہیں کہ وہ کیا گل کھلاتے ہیں۔

اب وہ ایک اٹالین ریسٹورنٹ کے سامنے مجمع لگائے کھڑے تھے۔ ہم سب فٹ پاتھ اور سڑک پر جمع تھے۔ آتے جاتے لوگ ہمیں تکتے اور پھر گزر جاتے تھے۔ سرجی فرمانے لگے۔ "ڈھائی سو سال پہلے جس جگہ ہم کھڑے ہیں۔ اس کے اردگرد سب کھیت تھے اور اس جگہ جہاں اٹالین ہوٹل ہے یہاں کنواں ہوتا تھا۔"

میں پریشان ہو گیا کہ برفانی علاقے میں کنواں کہاں سے آ گئے، میں نے اردو میں کہا۔ "سرجی کنویں سے باہر نکلیں۔" تو انہوں نے بات بدلی کہ یہاں میدان تھے، کھیت تھے فوجیوں کو ٹریننگ دینے کے علاوہ غداروں کو اس کنویں میں پھانسی بھی دیتے تھے۔"

اب جرمن عورتوں مردوں کے ہمراہ ہم بھی منہ کھولے کھڑے تھے۔ سرجی نے تو میدان مار لیا تھا پھر

انہوں نے کسی بھی طرف اشارہ کیا اور بڑی فصاحت سے بولے۔ ”پہلے وہاں پر کچھ مقامات انگریزوں نے بنائے مگر رات کو گیدڑ آجاتے تھے۔ انگریزوں نے پھر اور مکافات بنوائے تو گیدڑ آدھے رہ گئے۔ گھروں کی ایک لائن اور بنائی تو گیدڑوں نے اِدھر کا رخ بھی چھوڑ دیا۔“

کسی جرمن نے دانتوں میں انگلی دبائے پوچھا۔ ”گیدڑوں نے آنا کیوں چھوڑ دیا؟“

بولے۔ ”آپ نے فرنچ کی ایک کہاوت نہیں سنی، جس کا انگریزی میں ترجمہ ہے کہ گیدڑ صرف خودکشی کرنے شہر آتا ہے ورنہ جنگل میں رہتا ہے یہاں جب شہر بسنے لگا تو انہوں نے مرنے کا رسک نہیں لیا۔“

ہم سب مرعوب نظروں سے سرجی کو دیکھ رہے تھے جنہوں نے اسی دوران اپنا سیاہ چشمہ نہیں اتارا تھا۔

ایسی معلومات سننے کے بعد سب جرمن سرجی کو اپنے گھیرے میں رکھتے تھے اور ہمیں بھی ان کے قریب نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔

ایک جرمن عورت نے ان سے سوال کیا۔ ”آپ کینیڈا میں پیدا ہوئے تھے؟“

بولے۔ ”پیدا کیپ ٹاؤن میں ہوا تھا۔ وہاں پرائمری کرکے یہاں آگیا اور مڈل یہیں سے پاس کیا۔“

اب تو ہم اپنی ہنسی دبائے کھڑے تھے اور وہ ایسے کہ ہمیں لفٹ تک نہیں کرا رہے تھے۔ ان کا بیگ اب شہباز گھسیٹ رہا تھا اور یہ بھی کہتا جا رہا تھا۔ ”اگر ان جرمنوں سے سرجی نے ہمیں کھانا نہ کھلایا تو اس پورے سیاپے کا پول کھول دوں گا۔“ پھر ہم سڑک کے دائیں جانب مڑے تو یہاں بھی وہ ماحول تھا۔ سرجی نے اشاروں سے بتایا۔ ”پہلے یہودیوں کی چند دکانیں یہاں بنائی گئی تھیں۔ وہ گوشت اور ڈیری کا کاروبار کرتے تھے۔ دیسی مرغیاں پالتے تھے۔ انڈے خود نہیں کھاتے تھے بلکہ سارے کے سارے بیچ دیتے تھے۔“

پوچھا گیا۔ ”وہ کیوں نہیں کھاتے تھے؟“

جواب دیا۔ ”جب آسانی سے بک جاتے تھے تو کھاتے کیوں اور...... پھر یہودی کیوں کہلواتے۔“ یہ بات جرمن نہیں سمجھے مگر سمجھداری سے سر ہلاتے رہے۔

مطیع اللہ نے انگلش میں پوچھا۔ ”اسکولوں اور اسپتالوں کا نظام یہاں کیسے اور کب شروع ہوا؟“

اب مطیع اللہ کے مدمقابل آگئے۔ ہلکا سا ڈانٹ کر اسے آہستگی سے بتانے لگے۔ ”پہلے ان کے پاس حکیم تھے۔ حکیم وہ انڈیا سے لائے تھے۔ اتنی سردی میں حکمت کہاں چلتی ہے، اسی لیے انہوں نے حکیموں کو ڈاکٹر لکھنا شروع کر دیا۔ حکیم ڈاکٹر کہلوائے تو لوگ بھی بیماریوں سے ٹھیک ہونے لگے۔“ یہ کہہ کر تھوڑے سے طیش میں سرزنش کی۔ ”سمجھ میں آیا کہ نہیں؟“

مطیع اللہ اردو میں بولا۔ ”میں تو سمجھ گئی۔ ان فرنگیوں کو سمجھاؤ۔“ ہم لوگ اسی دوران ونڈو شاپنگ بھی کرتے جا رہے تھے۔ پھلوں کی دکانوں کے فروٹس اب فٹ پاتھ پر رکھی۔ میزوں پر پیٹیوں میں پڑے تھے۔ بڑے بڑے تربوز، کئی قسم کے خربوزے، آلو بخارے، کیلے، مالٹے، لیچی، انگور، چیری کے علاوہ اور بھی ست قسم...کا پھل جو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ شہباز کہہ رہا تھا۔ ”یہاں فروٹ اتنا زیادہ اور سستا ہے کہ کھانے کا بھی دل نہیں کرتا۔“

اس پورے علاقے میں لکڑی کے بلند قامت پول نہ جانے کب سے گڑے تھے جو بجلی کے کھمبوں کے طور پر استعمال ہو رہے تھے۔ اوپر الجھی تاریں لٹک رہی تھیں، سیاحوں کی نظریں الجھی تاروں میں بار بار الجھ رہی تھیں۔ وہ جرمن بھی بار بار اوپر دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ ایسے پول تو پورے ٹورنٹو میں لگے تھے مگر ہمارے گائیڈ انہیں صرف اس علاقے تک محدود کرتے نظر آرہے تھے۔ بات میں نے شروع کی اور ان سے پوچھا۔ ”یہاں پاور سپلائی کا نظام اتنا بوسیدہ کیوں ہے؟“

انہوں نے خشمگیں نگاہوں سے میری جانب اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں۔ ”یو ٹو بروٹس؟“ پھر جواب جرمنوں کے حوالے کیا اور بولے۔ ”یہ کھمبے ان دنوں کی یادگار رہیں جب کنگسٹن مارکیٹ آباد ہو رہی تھی۔ پورے شہر میں جدید نظام لایا جا چکا ہے مگر یہاں کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اسے صدیوں پرانی نشانی کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ پہلے تو یہاں کے کھمبے تبدیل کیے جا رہے تھے مگر چینی لوگ معترض تھے اور انہوں نے جلوس نکالے، آنسو گیس ان پر پھینکی گئی مگر ان پر تو کسی چیز کا اثر بھی نہیں ہوتا تھا۔ حکومت نے کہا کہ اب ہم ٹینک کے گولے برسانے سے تو رہے اور پھر انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا اور چینیوں نے حکومت کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔“

ہمیں اردگرد اتنے چینی نظر آرہے تھے کہ ہم خود کو بھی تھوڑا تھوڑا چینی سمجھنا شروع ہو گئے۔ ویسے تو یہاں دوسری اقوام بھی گھومتی پھرتی اور سودا سلف بیچتی دکھائی دیتی

یہاں اگر چینی کم بھی ہوں تو اپنی موجودگی کا احساس [illegible]رت سے دلاتے ہیں۔ اپنے کام میں مگن، سنجیدہ اور پریشان چہرہ، آنکھیں کسی سوچ میں ڈوبی ہوتیں اور [illegible] کنا، دکان دار مول کا بھاؤ تاؤ بہت کرتے ہیں۔

خان قیصر ایک کھلونوں سے بھری دکان میں داخل [illegible] باہر کھڑے رہے اور میں نے باقی کو کہا کہ اندر [illegible] نے کی ضرورت کیا ہے اسی لیے آپ باہر ہی رکیں۔ [illegible]ان کے ہمراہ اندر چلا گیا اور وہاں گمان ہو رہا تھا کہ [illegible] وہی ہے جو پچھلی دکان پر چھوڑ آئے تھے۔ دکان دار لڑکی [illegible] ہی تھی جیسی یہاں وہاں گھومتی نظر آرہی تھیں۔ وہی، وہی ماتھا، وہی آنکھیں، وہی چہرہ، ویسے ہی بال، [illegible] ہی ہر طرح کے کپڑے اور پاؤں میں چپلیں۔

خان نے ڈبے میں بند ایک کھلونا گن دیکھی تو اٹھا [illegible] کے بعد قیمت پوچھی تو سیٹی بجاتا جواب آتا۔ [illegible] (ففٹی)۔“

خان بولا۔ ”فائیو......“

اسے انتہائی صدمہ پہنچا اور حیرت سے بولی۔ ”پھائیو [illegible]؟“ پھر بولی۔ ”پورٹی پھائیو (فورٹی فائیو)۔“

ادھر خان ایک ڈالر بڑھاتا اور وہ پانچ ڈالر کم کرتی۔ [illegible] ڈائیلاگ چلتے رہے مگر میں نے پندرہ ڈالر میں سودا پکا [illegible]۔

وہ بولنے لگی۔ ”پھپھٹین (ففٹین) ویری لیس۔“

ادھر خان بھی پندرہ ڈالر پر جم کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑی [illegible] سے مانی ایسے کہ کوئی بڑی مجبوری اسے اتنا سستا بیچنے [illegible] کر رہی ہے۔ میں اسی دوران دکان کا جائزہ لیتا رہا اور [illegible] رہا تھا کہ جب اشیاء کی بھرمار ہو تو قدر بھی کم ہو جاتی [illegible] جب ہم چھوٹے تھے تو مٹی کے گھر بناتے تھے۔ [illegible] شاخیں توڑ کر غلیل بنالی، ایک کرچی رنگ کا پستول [illegible] میں ملتا تھا جو عید پر خریدا کرتے۔ لکڑی کے [illegible] میں بارود بھرے کارتوس ملتے، کارتوس کو نالی میں فٹ [illegible] کے زمین پر پھوکا دیتے کہ اچھی طرح سے نال میں فٹ [illegible]، پھر آنکھیں اور کان بند کر کے فضا میں ڈز کرتے [illegible] چل جاتا تو بارود کی خوشبو پھیل جاتی ورنہ عموماً ٹھس [illegible] تھا۔ کئی بار تو لڑکھڑانے پر بھی چل جاتا تھا۔ وہ پستول [illegible] لیے گھوما کرتے جس طرح محاذ پر جا رہے ہوں۔ یہی [illegible] کھلونے ہوتے تھے۔ بہنیں اپنے ہاتھ سے کپڑے [illegible] روئی بھر کر گڑیاں بناتیں اور پھر ان کی شادی کی ساری رسمیں ادا کی جاتی تھیں اور آج اتنے کھلونے کہ بچوں کو دلا دیں تو اگلے ہفتے انہیں توڑ کر یا دل بھر جانے پر دوسرا کوئی مانگتے ہیں۔ میرا بیٹا عمر ریسلر کے کھلونے لے کر پورا دن انہیں لڑاتا رہتا۔ خود ہی ایک کو شکست دے کر دوسرے دن کہتا۔ ”یہ کمزور ہو گیا ہے مجھے نیا ریسلر خریدنا ہے۔“

کسی سپر اسٹور پر اس کو لے جاتا وہاں پچیس ڈالر کا مہنگا ریسلر سیل پر آ کر بیس میں لگا ہوتا تو وہ یہ خریدنے کی ضد کرتا، میں جب یہ کہتا کہ یہ بہت مہنگا ہے تو جواب دیتا۔ ”آپ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ میں نے پانچ ڈالر کی بچت کی ہے۔“

میں پوچھتا۔ ”وہ کس طرح؟“

بڑی عقل مندی سے جواب دیتا۔ ”پچیس کا تھا اور میں بیس ڈالر میں خرید رہا ہوں۔“ وقت بدلا اور بچے بھی بدل گئے۔

خان نے کھلونا گن کا لفافہ اٹھا رکھا تھا اور اب وہ رازداری سے پوچھ رہا تھا۔ ”یہاں مساج بھی ہوتا ہے؟“

لڑکی سن کر ایک دم سکتے میں آگئی۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ میں خود پریشان ہو گیا کہ خان نے یہ جرأت کیسے کرلی۔

میں نے خان سے کہا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کسی کو اگر بلا لیا اس نے تو ہم دونوں کا مساج بغیر معاوضے کے کردیں گے۔ خان خود گھبرایا ہوا تھا اور بولا۔ ”اس لٹونی سے مساج ہی کا تو بولا ہے۔“

کملائی لڑکی پھر ذرا کھلی، پھیلی آنکھیں مسکرائیں اور بولی۔ ”فل باڈی مساج کروانا ہے؟“

ہم تو اس کی حالت دیکھ کر ڈر گئے تھے مگر اب وہ مہربانیاں نچھاور کر رہی تھی۔ میں بولا۔ ”مساج کہاں کرو گی؟“

وہ بولی۔ ”پیچھے گھر میں ایک کمرا اسی لیے بنایا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”نرخ کیا ہے؟“

اس نے ریٹس بتائے، خان نے پوچھا۔ ”ابھی تو تم مصروف ہو پھر ہم کب آئیں۔“

وہ بولی۔ ”باپ گھر پر ہے۔ وہ شاپ پر آجائے گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”اور کیا کیا کرتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”سر کے بالوں کی کٹنگ بھی کرتی ہوں۔ پانچ ڈالرز میں۔“

میں نے پوچھا۔ ”تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟“

اس نے بتایا۔ ”وہ کنگ فو سکھاتا ہے۔“
میں نے پوچھا۔ ”بوائے فرینڈ ہے؟“
وہ شرما کر بولی۔ ”ہاں۔“
خان بولا۔ ”اس لڑکی نے بھی رکھا ہوا ہے۔“
میں نے پھر اسے یقین دلایا۔ ”خان تمہارے پاس جلد آئے گا۔ بس اس کے ساتھ رعایت کرنا۔“
وہ اطمینان سے بولی۔ ”پیسے کم نہیں کروں گی لیکن پندرہ منٹ زیادہ دوں گی۔“
ہم باہر آئے تو جرمن کھمبوں سے ٹیک لگائے کھڑے تھے اور شہباز۔ مطیع اللہ برف کے گولے کھا رہے تھے۔ سرجی ان دونوں کو گھورے جا رہے تھے۔
ہم تو اپنے پاکستانیوں کو کوستے ہیں کہ وہ غیر قانونی کام کرتے ہیں مگر جب چینی باشندوں کو قریب سے دیکھا تو ان سے بڑھ کر فراڈیا میں نے کسی کو نہیں پایا۔ پھر غیر قانونی کام پر پیسا پھینکتے ہیں اور پیسا بٹورتے ہیں۔ وہ لڑکی مساج اور بالوں کی کٹنگ کیش پر کر کے ٹیکس بچاتی تھی۔ کیش سے وہ رعایتی نرخوں پر یہ کپڑے اور کھلونے خریدتے تھے۔ انہیں ارزاں نرخوں میں بیچ کر بھی وہ بہت کچھ بچا لیتے تھے۔
ہم پھر سے چلتی بھیڑ میں بہہ گئے۔ یہاں گاہک بھی خوش اور دکاندار بھی خوش۔ ہر ایک نے کچھ نہ کچھ بچایا ہوتا ہے۔ اتنے میں سائیکل سوار تیزی میں آیا اور سرجی سے ٹکراتا نکل گیا۔ سرجی پکے پھل کی طرح موٹی جرمن عورت کی گود میں گرتے گرتے بچے مگر اب اس سے لپٹے کھڑے تھے۔ فوراً ہی الگ ہوئے اور سوری سوری کرنے لگے۔
ان سب نے باری باری پوچھا۔ ”کوئی چوٹ تو نہیں لگی۔“
سرجی قدرے فخریہ انداز میں بولے۔ ”جب بھی کنگسٹن مارکیٹ آتا ہوں۔ کوئی نہ کوئی حادثہ میرے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔“
مطیع اللہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ توبہ کر رہا تھا۔ بولا۔ ”سرجی تو لمبا لمبا چھوڑتی ہے۔“
ہم آہستہ آہستہ اردگرد نظریں ڈالتے چل رہے تھے۔ کبھی سڑک پر سب آ جاتے اور کبھی رنگ برنگی چھتریوں تلے کھڑے ہو جاتے تھے۔ عورتیں اپنے بچے بھی اٹھا لائی تھیں۔ دو بچوں والی اسٹرولر میں بچے سوئے پڑے تھے۔ آرام سے گہری نیند میں ڈوبے بچے دیکھ کر اپنے بچے یاد آنے لگے۔

مفتی بولا۔ ”یہاں کے بچے آرام سے پڑے ہیں، مائیں شاپنگ کر رہی ہیں۔ ہمارے بچے تو زمین و آسمان پر اٹھا لیتے ہیں۔“
خان بولا۔ ”یہی وجہ ہے تم بچے نہیں بلواتے۔“
میں نے جواب دیا۔ ”دو میں سے ایک وجہ یہ ہے۔“
مطیع اللہ بولا۔ ”دوسری وجہ کون سی ہے؟“
برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔ ”وہ میری ذاتی وجہ ہے۔ اپنے پرسنل افیئرز میں کھلے عام ڈسکس نہیں کرتا۔“
شہباز بولا۔ ”معلوم نہیں ہمارے بچے کیوں اتنا زیادہ روتے ہیں؟“
میں نے کہا۔ ”ہم نے کبھی ان سے آرام اور سکون سے پوچھا ہے؟“
وہ کہنے لگا۔ ”بچے اگر بہت چھوٹے ہوں تو کیسے پوچھیں۔“
”پھر ماں کو زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ بچہ اگر بھوکا ہو گا، تھک جائے گا یا پھر ڈانٹ اور یا پھر پیٹ میں درد ہو گا تو تب روئے گا۔“ میں بولا۔
میرا بیٹا عمر ندیم جب چھوٹا تھا تو گاڑی میں ہم جیسے ہی اسے بٹھاتے وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگتا۔ اس کی کار سیٹ میری ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے ہوا کرتی تھی۔ اس کے رونے پر میں ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز نہ رکھ سکتا تھا۔ وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک بار ہمارا پڑوسی باہر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اس کے پوچھنے پر میں نے کہا کہ یہ بچہ تو گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے رونا شروع کرتا ہے اور جب تک ہم نیچے اسے نہیں اتارتے یہ روتا چلا جاتا ہے۔ اس نے گاڑی میں جھانکا اور پھر اس کی سیٹ درمیان میں کر دی۔ سیٹ درمیان میں ہوئی تو وہ خاموش ہو کر کلکاریاں مارنے لگا۔ وجہ سن کر ہم بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ میری سیٹ کے پیچھے ونڈ اسکرین اس کی نظر سے اوجھل ہوتی اور آسمان، سامنے کی سڑک اور آتی جاتی گاڑیاں اسے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ جب کچھ نظر نہ آتا تو وہ رونے لگتا۔ جب درمیان میں آیا تو سامنے کھلا آسمان اور مناظر تھے اور وہ بدلتے مناظر سے خوش ہو گیا۔ ماں کہتی کہ مکمل باپ پر عادتیں گئی ہیں۔ ایک معمولی بات بھی ہماری سمجھ میں نہ آ سکی کہ بچہ کیوں رو رہا ہے اور آخر کار گورے نے یہ مسئلہ لاجک کے ساتھ حل کر دیا۔

سامنے دیکھا تو سڑک پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ کوئی مردانہ آواز بھی آ رہی تھی۔
مطیع اللہ شہباز سے بولا۔ ”بندر والا مداری تماشا دکھا ۔“
خان بولا۔ ”کوئی طاقت کی دوائی بیچ رہا ہوگا۔“
شہباز بولا۔ ”ڈسپرین کی گولیاں بیچنے والے بھی تو ح مجمع لگاتے ہیں۔“
غرض ہر ایک نے اپنا اپنا تبصرہ کیا۔ جرمن سیاحوں ہ سرجی بھی ادھر ہی کھنچے چلے گئے تھے۔ قریب ہو کر کے دیکھا تو پتلی تماشا ہو رہا تھا۔
ٹ پاتھ پر ایک بڑا فریم لگا تھا۔ سامنے والے اوپر کو پردے سے ڈھانپ کر نیچے اسٹیج کو کھلا چھوڑ دیا گیا اکستان میں جس کو مداری بولتے ہیں یہاں وہ آپریٹر یک جن نما خول میں کھڑا ہمیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ نیچے چند پتلی کردار انگریزی میں باتیں کر رہے تھے۔ کسی لوک کہانی پر کھیل پیش کیا جا رہا تھا۔ کوئی بادشاہ تھا، کوئی ادر کوئی شہزادی۔ میں اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ پردے دو افراد تھے۔ ایک آپریٹر اور دوسری کوئی لڑکی تھی۔ ن کی کمال جنبش سے پتلیاں تھرک رہی تھیں۔ کہانی وہ ہی پرانی، کردار سب صدیوں سے وہی چلے آئے ہیں، ی آواز وہی جس سے شاید پتلیوں کے کان بھی پک گئے
جرمن یہ تماشا بڑی حیرت اور محویت سے دیکھ رہے سڑک پر رش تھا اور ٹورسٹ بچوں سمیت اس میں ل ہو رہے تھے۔
تخیل کی پرواز بہت تیز ہوتی ہے۔ لمحوں میں، میں ہاں پہنچا جہاں بڑی خالہ کا ایک کمرے کا چھوٹا گھر تھا اور ب بچے بڑے جمع تھے۔ میں غالباً دوسری کلاس میں ۔ محلے سے چند لڑکے اور عورتیں ہارمونیم اور ے لے کر پتلی تماشا دکھانے آئے تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ ر پائیاں سائیڈ پر اور ایک پیچھے کھڑی کر کے اس پر ی بچھا کر اسٹیج تیار کیا گیا تھا۔ اسٹیج کے فرش پر دری اور ریشمی لال پیلی چادریں بچھا کر سب کے لیے دلچسپی ا گئی تھی۔ ہم سب بچے آنکھیں پھاڑے یہ سب دیکھ تھے۔ کوئی رنگین اور سحر انگیز دنیا کی جو ہمارے سامنے تخلیق ہوئی تھی۔ سب کردار چارپائی کے اسٹیج پر ایک بیٹھے تھے جن کی جان مداری کی انگلیوں میں تھی۔

میں بھی چھوٹا تھا اور ذہن بھی محدود تھا۔ میری ساری کائنات سمٹ کر اسی اسٹیج میں سما گئی تھی۔ گو کوئی بھی اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتا مگر میرے ذہن کے پردے پر اس دن میں خود کو دیکھ رہا تھا۔ حیرت سے..... کھلی آنکھیں اور خوشی سے تمتماتا چہرہ، کردار وہی تھے جو ازل سے چلے آ رہے ہیں۔ سچائی اور برائی کے کردار، محبت اور نفرت کے کردار۔ میرے لیے تو وہ پتلیاں نہیں بلکہ جاندار لوگ تھے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ کوئی چارپائی کے پیچھے کھڑا اپنے انگوٹھے سے پتلی کا سر شہادت کی انگلی سے اس کے بازو اور باقی انگلیوں سے اس کا نچلا دھڑ ہلا رہا ہے۔ دونوں ہاتھ دو کرداروں کو محبت بھی کراتے ہیں۔ نفرت بھی، ظالم کو سزا بھی ملتی ہے اور مظلوم کو صلہ بھی۔ خوشی کا لمحہ آتا تو پیچھے بیٹھی عورتیں ڈھولک پر طربیہ گانا شروع کر دیتیں اور جب شہزادی اغوا ہوئی تو کوئی المیہ بول سن کر میرے آنسو نکل آتے تھے۔ شہزادی کو جب شہزادہ تلوار کے زور پر جن سے چھڑوا لایا تو میری تالیاں رکتی نہ تھیں۔ شہزادے نے جب شہزادی کو گلے لگایا تھا تو میری ماں نے احتجاج ریکارڈ کروایا کہ بچوں کو بے حیائی دکھائی جا رہی ہے۔ شہزادہ نوکری کے لیے ملک سے باہر چلا گیا تو شہزادی نے اس وقت کا مشہور گانا ”یہ وادیاں یہ پربتوں کی شہزادیاں“ گایا۔ اس گانے میں میرے دماغ میں لفظ پربت پھنس کر رہ گیا تھا۔ پربت کیا ہوتے ہیں، یہ مجھے معلوم نہ تھا مگر یہ تو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ ماں سے بولا کہ میرا نام پربت رکھ دو۔ مجھے زور کی ایک جھپ پڑی اور وہ بولیں کہ تماشا دیکھ کر میرا بیٹا ایک دن میں بے حیا ہو گیا ہے۔ میں چپ تو ہو گیا مگر پربت کو نہ بھولا۔ میں بڑا ہوتا چلا گیا اور پربتوں نے میرا لگاؤ بڑھتا گیا اور آج یہ سب لکھتے ہوئے سوچتا ہوں کہ پہاڑوں سے عشق تو میں ساتھ لے کر پیدا ہوا تھا۔ پہاڑوں پر میرا خیمہ لگا ہو، ساتھ جھیل ہو اور بہت ساری خاموشیاں مجھ سے گفتگو ہوں تو میں اپنے عشق کی انتہا پر ہوتا ہوں۔
میں ماضی کی دلگداز سوچیں لیے اس دن کنگسٹن مارکیٹ میں بیچ سڑک پتلی تماشا دیکھ رہا تھا۔ دیکھا کہ سرجی میری جانب کھسکتے چلے آ رہے ہیں۔ چہرے پر پریشانی تھی۔ آ کر کان میں بولے۔ ”گائیڈ بن کر تو میں پھنس گیا؟“
میرے پوچھنے پر بولے۔ ”یہ جرمن اب مجھ سے پتلی تماشا اور اس کی تاریخ پوچھیں گے۔ انہیں میں کیا بتاؤں گا؟“

میں نے ان کے گوش گزار اس کی مختصر تاریخ کر دی اور کہا باقی جتنا کھینچ سکتے ہو کہانی کو کھینچ لینا۔ وہ سر ہلاتے مطمئن ہو کر چلے گئے۔

وہ تماشا تمام ہوا تو ہر جانب سے تالیاں بجائی گئیں۔ کچھ نے نوٹ نچھاور کیے اور چند ایک نے سر جھکا دیے اور پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ جرمن سیاح ابھی تک پتلی تماشا کی گرفت میں کھڑے تھے۔ سر جی بھی اب ان کی گرفت میں آ گئے۔ میں بھی ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ایک نے سر جی سے پوچھا۔ ”بہت ہی عمدہ...... مگر تھا کیا؟“

”اس کو پپٹ شو یعنی پتلی تماشا کہتے ہیں۔“

انہوں نے دانشمندی سے سر ہلایا۔ سر جی اگلے سوال کا انتظار شدت سے کر رہے تھے۔ وہ کھڑے یہی گمان کر رہے تھے کہ سر جی آگے کچھ فرمائیں گے۔ الٹا سر جی نے سوال پوچھ لیا۔ ”یہ تماشا پہلے آپ نے کہیں دیکھا ہے؟“

جواب نفی میں آیا تو اب سر جی دلیر ہو گئے۔ انہوں نے معلومات کے دریا بہانے شروع کر دیے۔ ہماری ٹیم بھی قریب چلی آئی۔

”چینی مسلمان سیاح زینگ ھی۔ جب سیاحت کے لیے چین سے انڈیا داخل ہوا تو اس کا دماغ الجھا ہوا تھا۔ خچر اس کے ہمراہ تھا اور وہ بھی پریشان تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ وہ صحرہ گوبی سے گھومتا ہوا، قراقرم کو کراس کر کے ہنزہ پہنچا۔ وہاں دیکھا کہ اِدھر کوئی بھی پتلی تماشا نہیں کرتا تو بڑا مایوس ہوا۔ وہاں سے کسی نہ کسی طرح اسکردو پہنچا تو وہاں بھی نہ کوئی پتلی تماشا تھا اور نہ ہی اس تماشے کو کوئی جانتا تھا۔“

سر جی کیا بول رہے تھے کہ میں بھی حیران کھڑا تھا۔ میں نے تو صرف کہا تھا کہ چودھویں صدی کے شروع میں مسلمان چینی سیاح زینگ ھی جب انڈیا آیا تو اس نے پتلی تماشے کو سندھ کنارے بسنے والے لوگوں میں متعارف کروایا تھا مگر سر جی کہاں کی کہاں سنائے جا رہے تھے۔

وہ بڑے یقین کے ساتھ فرما رہے تھے۔ ”وہ سیاح پھر کارگل کے راستے کشمیر میں داخل ہوا۔ پورا کشمیر چھان مارا مگر کہیں بھی پتلی تماشا اس نے نہ پایا۔ وہ اور اس کا خچر دونوں بہت مایوس ہوئے۔ اسی مایوسی کی حالت میں وہ آزاد کشمیر میں بمشکل داخل ہوئے۔ وہاں سے جہلم کسی طرح پہنچے اور وہاں بھی انہیں مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ (وہ ساتھ ساتھ شہروں کا محل وقوع بھی بتا رہے تھے)۔ جہلم سے وہ چکوال پہنچے اور پھر تلہ گنگ سے ہوتے ہوئے میانوالی آئے۔ مایوسیوں سے نچڑے وہ دونوں براستہ چشمہ قدیم شہر بلوت پہنچے۔“

میں حیران تھا کہ یہ سارا روٹ انہیں کیسے معلوم ہے۔ پھر خیال گیا کہ وہ جب ڈیرہ اسماعیل خان میں ایکسین ہوا کرتے تھے تو اسی روٹ سے آتے جاتے تھے۔ جرمن سیاحوں کے علاوہ ہم بھی منہ کھولے کھڑے تھے۔ ان کا بیان جاری تھا۔

”یہ چودھویں صدی کے شروع کے سال تھے اور موسم بہار کا تھا۔ بلوت میں عرس کی تقریبات ہو رہی تھیں، میلہ لگا تھا۔ جھولوں پر بچے بڑے بیٹھے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس نے اپنا خچر کسی کھجور کے درخت تلے باندھا اور خود ایک جھولے پر جا بیٹھا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ چین کے ہر صوبے میں پتلی تماشا ہوتا ہے مگر یہاں کیوں نہیں ہو رہا۔ اسی سوچ میں وہ جھولے سے اترا۔ بھوک لگی تو پلاؤ کی آدھی پلیٹ کھائی، ساتھ زردہ بک رہا تھا اس کا ذائقہ بھی اسے اچھا لگا۔ پیاس لگی تو ساتھ کے ٹھیلے سے روح افزا کا ایک بڑا گلاس پیا۔“

میں نے انہیں ٹوکا۔ ”آپ پتلی تماشا کی بات کر رہے تھے۔“

میری جانب غصیلی نظروں سے دیکھ کر بولے ”روح افزا پینے کے بعد اس پر چھائی مایوسی ختم ہو گئی۔ وہ بلوت کے پیڑ کے پاس گیا۔ اپنا تعارف کروا کر پوچھا کہ آپ لوگ پتلی تماشا نہیں کرتے؟ اس سے پہلے پیر صاحبان تماشے کا لفظ سن کر آپے سے باہر ہوتے کہ اس نے ان کا غصہ بھانپ لیا۔ مزار پر پڑے صندوقچے میں کچھ صدقہ ڈالا اور بولا کہ آپ اپنی ایک داستان کو اسی طرح سے بڑی آسانی سے بیان بھی کر سکتے ہیں اور پھیلا بھی سکتے ہیں۔ پیروں کا غصہ صدقہ اور میدہ لینے کے بعد مدھم پڑ چکا تھا اور انہوں نے زینگ ھی سے تفصیل جانی۔ تفصیل جان کر پیر صاحب نے وہیں خواتین سے پتلیاں بنوائیں۔ راگ سجائے اور پہلی کہانی لیلیٰ مجنوں کی پتلیوں کے ذریعے دکھائی گئی۔ مجمع نے اسے بہت پسند کیا اور زینگ ھی کو کندھے پر اٹھا کر پورے بلوت کا گشت کروایا۔ اس طرح یہ وبا ہوتی ہوتی ڈیرہ جات پہنچی۔ وہاں سے تونسہ اور اسی طرح سرائیکی بیلٹ میں پھیل گئی۔“

سر جی نے بات کو کہاں سے کہاں جا پہنچایا اور واقعات کو آگے پیچھے کر کے ایک کہانی گڑھ لی مگر اثر یہ ہوا

کہ جرمن پوری توجہ سے سن بھی رہے تھے اور ایک نوٹ بک پر نوٹس بھی لیتے جا رہے تھے۔ اس کے بعد خوب فوٹو گرافی ہوئی۔ ہر تصویر میں سر جی درمیان میں سنجیدہ چہرہ لیے کھڑے ہوتے اور باقی تمام ارد گرد مسکرا رہے ہوتے۔

سر جی اپنے آپ کو شہباز کے سامنے تو ابھی تک نہیں منوا سکے تھے مگر وہ جرمنوں پر حاوی ہو چکے تھے۔ اب حالت یہ تھی کہ وہ آگے ہوتے اور گورے پیچھے پیچھے۔ وہ رکتے تو یہ سب بھی رک جاتے۔ وہ چلتے تو یہ سب بھی چل پڑتے۔ جدھر سر جی دیکھتے اسی جانب تمام جرمن بھی دیکھنے لگتے۔ میں نے سر جی سے کہا۔ ”جلدی کریں، ہم نے اور جگہوں پر بھی جانا ہے۔“ وہ کسی سمت بغیر دیکھ کر کچھ سوچتے۔ میرا کہا سن کر قدرے خفا ہو کر بولے۔ ”ایک تو آپ کسی ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں۔ جب تک کسی جگہ کی پوری تاریخ، جغرافیہ، کلچر اور مشغل معلوم نہ ہو جائیں میری پیاس نہیں بجھتی۔“

میں نے پوچھا۔ ”یہ مشغل کیا ہے؟“

وہ بولے۔ ”وہی جو دکانوں کے پیچھے گھروں میں ہوتا ہے۔“

ہم کسی سے ٹکراتے، کسی سے کنی کتراتے، کسی سے بچتے بچاتے آگے چلے جا رہے تھے۔ رفتار مدھم تھی کیونکہ رش بہت تھا۔ پھر وائلن اور گٹار کی عجب سی آوازیں آنے لگیں۔ سُر تو گٹار وائلن کی تھی مگر لگتا اس کی بیچ بہت کم تھی اور بھاری سریں آتی سنائی دے رہی تھی۔ ہمارے قدم انہی آوازوں کی سمت بڑھ گئے۔ دیکھا تو کئی کئی فٹ بلند یہ ساز و آلات فٹ پاتھ پر رکھے ہیں۔ عجیب و غریب جوکروں کے حلیے میں نوجوان انہیں بجانے کے ساتھ ساتھ کرتب بھی دکھاتے جا رہے ہیں۔ سیاحوں کو تو ہر چیز دیکھنی ہوتی ہے تو اسی لیے فٹ پاتھ کے سامنے رش لگائے کھڑے تھے۔ نیچے ایک ٹوکری پڑی تھی جس میں کوئی نہ کوئی آ کر سکہ پھینک جاتا تھا۔ ساون کی آوازوں سے زیادہ ہم کو ان سازوں کے سائز سے دلچسپی تھی۔ اس کے لیے ان کی حرکتوں میں دلچسپی تھی جو یہ ساز بجا رہے تھے۔ جرمن سیاحوں نے فوٹو گرافی شروع کر دی تھی۔ سر جی سے کچھ پوچھا تو انہوں نے میری جانب دیکھا اور میں نے نفی میں سر ہلایا کہ ان کے بارے میں کیا بتا سکتے ہیں۔ سر جی نے صرف ان سے یہ کہا کہ چین سے یہ آلات پچھلے ہفتے بن کر آئے ہیں اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔

میں نے سر جی کو اشارہ کیا۔ ”میرا تو سر پھٹا جا رہا ہے، آگے بڑھتے چلو۔“

وہ بڑھے تو سب ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

لوگوں کا رش بڑھتا چلا گیا تھا۔ کندھے سے کندھا ٹکرا رہا تھا۔ سیاحوں کے علاوہ ٹورنٹو کے رہائشی بھی بہت زیادہ تھے جو چھٹی کے روز مہینے بھر کا راشن سستے داموں خریدنے آتے تھے۔ ایک کچن کا سامان بیچنے والی دکان میں داخل ہوئے تو وہاں باورچی خانے کے استعمال کا اتنا زیادہ سامان بھرا پڑا تھا کہ عقل حیران رہ گئی۔ کیا سے کیا چیزیں لوگ کچن میں اپنی سہولت کے لیے استعمال کرنے لگے ہیں۔ چھریاں اتنی تیز کہ دکاندار نے پیاز پر رکھی تو ہلکا سا زور لگانے پر اس نے پیاز کے دو ٹکڑے کر دیے۔ گوشت کو ہڈی سمیت کاٹنے کے چھرے سے لے کر چھوٹی سی چھتری، سب ایک ہی باکس میں بند تھے۔ گارنٹی یہ بھی دے رہے تھے کہ کبھی کند ہو جائے تو پورا سیٹ واپس کر جائیں۔ قیمت انتہائی کم کہ مفتی بھی خریدنے پر تیار کھڑا تھا۔ خان نے اپنے گھر کے لیے ایک سیٹ خریدا تو سر جی بگڑ گئے کہ میرے بیگ میں یہ آلات قتل آپ نہیں ڈال سکتے۔ خان کچھ بولنے والا تھا کہ میں نے بھی یہ مشورہ دیا کہ ابھی ہمیں دور دور تک پیدل جانا ہے، کیونکر یہ بوجھ اٹھاتے پھریں گے۔ بیچنے والی چینی لڑکی تھی اور شکل بالکل وہی جس سے شرٹس خریدی تھیں۔ اس سے معذرت کی کہ ابھی ہم نے ڈاؤن ٹاؤن گھومنا ہے اور شام تک ہم اسے کہاں کہاں اٹھاتے پھریں گے۔ اس نے پوچھا کہ اگر آپ ٹورنٹو میں رہتے ہیں تو میں شپ (بذریعہ میل) بھیج دوں گی۔ میں تو سمجھا تھا کہ چھریوں سے زیادہ شپنگ کا خرچ ہو جائے گا مگر سن کر حیران ہوا کہ صرف چھ ڈالرز زائد دینے پر تین دن بعد یہ سیٹ آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔ بھاری تو وہ نہ تھا کیونکہ وہ ٹائٹینیم کی بنی چھریاں تھیں۔ خان نے چھ ڈالرز زائد ادا کیے اور تیسرے دن اس کے دروازے پر وہ سیٹ پڑا تھا۔

ایک سڑک دائیں جانب نکل رہی تھی۔ وہاں بھی رش تھا اور لوگ ارد گرد دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ سر جی بھی اپنی دھن میں اس طرح اسی سڑک پر مڑ گئے کہ جیسے ان علاقوں کے مدتوں سے باسی ہوں۔ دائیں جانب قدرے کشادہ سے فٹ پاتھ پر ایک لڑکی کانوں پر ہیڈ فون لگائے تھرک رہی تھی۔ وہ گانی بھی جاتی تھی اور آواز فٹ پاتھ پر رکھے دو اسپیکروں سے آ رہی تھی۔ اس نے چھوٹی سی نیکر اور بغیر بازوؤں کے کھلے گلے والی رنگین شرٹ پہن رکھی تھی۔ خوب

صورت اور جواں عمر تھی اور سونے پر سہاگا ناچ بھی رہی تھی۔ لہٰذا ہم سب اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ یہاں کون سی ایسی معلومات لینی تھیں کہ سرجی پر تکیہ کیا جاتا اور اسی لیے جرمن گورے سمیت ہم سب نے سرجی کو دھکیل دھکیل کر پیچھے کر دیا۔

مطیع اللہ نے متعدد بار لاحول پڑھا اور پھر بولا۔ ”کیا زبردست گانا گاتی ہے۔ دل کرتا ہے دیکھتے رہیں۔“

شہباز بولا۔ ”گانا سنا جاتا ہے، دیکھا نہیں جاتا۔“

مفتی نے خان قیصر کو دھکا دیا اور خود آگے آ گیا۔

خان غصے سے بولا۔ ”ناچتی لڑکی کبھی نہیں دیکھی؟“

”گا کر ناچتی لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔“ مفتی خان کی بات کو نظر انداز کرتے بولا۔

مطیع اللہ بولا۔ ”مفت ہی مجرا دیکھ رہے ہو پھر بھی ندیدہ پن دکھاتے ہو۔“

خان نے دو دو ڈالر کے سکے اس کے آگے اس طرح پھینکے کہ جیسے کوئی عیاش رئیس ترنگ میں آ گیا ہو۔ ڈالر نچھاور کر کے بولا۔ ”میں نے تو پیسے بھی دے دیے ہیں۔ مجھے تو حلال کرنے دو۔“

ایک یورپین نوجوان سیاح بھیڑ سے نکلا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر ناچنے لگا۔ اِدھر بھیڑ میں سے کچھ لوگوں نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

خان قیصر کب پیچھے رہنے والا تھا۔ اس نے پنجابی بھنگڑا انگریزی دھن پر ڈالنا شروع کر دیا۔ شہباز بھی ایک ڈالر کا سکہ پھینک کر میدان میں کود گیا، پھر تو دھما چوکڑی مچ گئی۔ لوگ جمع ہو گئے سبھی تالیاں بجا رہے تھے۔ تالیوں کے ساتھ ساتھ ڈالر دو ڈالر کے سکے بھی پھینکے جانے لگے۔ لوگ بہت پُرجوش تھے ہر چہرے پر مسرت تھی۔ سیاح تصویریں اتار رہے تھے۔ لڑکی نے آمدن بڑھانے کے لیے خان اور شہباز کے گلے لگ لگ کر تھرکنا شروع کر دیا تھا۔ شہباز کی بانہوں میں ہوتی تو خان کھینچ لیتا اور خان کے پاس آتی تو شہباز وہ ایک دوسرے کو پیچھے بھی دھکیل دیتے تھے۔ لڑکی ذرا سی چوکنا تب ہوئی جب دونوں لاہوریوں کے درمیان کھینچا تانی شروع ہو گئی۔ لیکن اب تو دیر ہو چکی تھی۔ اِدھر ڈالر برس رہے تھے اور وہ انہیں بھی جانے نہیں دینا چاہ رہی تھی۔ مجمع اب لڑکی کے ڈانس سے زیادہ بھنگڑے میں دلچسپی لے رہا تھا۔ لڑکی نے بھی اپنے آپ کو حالات کے حوالے کیا اور پھر چپک چپک کر ان دونوں کا ساتھ دینے لگی۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ ایک سردار جی بھی مجمعے میں موجود ہیں۔ انہوں نے جب گنگا بہتی دیکھی تو اشنان کرنے وہ بھی لنگوٹ کس کر دریا میں کود پڑے۔ پھر تو بھیڑ بڑھتی ہی چلی گئی۔ گاڑیاں رک گئیں جرمن بہت خوش تھے۔ ایسا ڈانس اور وہ بھی سر بازار انہوں نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ شہباز پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ سرجی ایک جرمن سیاح کے کان میں کچھ کہہ رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اسے یہ بتا رہے تھے کہ آپ کو یہاں کے نئے رنگ دکھانے کے لیے میں نے انہیں ناچنے کو کہا ہے۔ جرمن اپنا انگوٹھا بلند کر کے تعریف کیے جا رہا تھا۔ سرجی کو میں نے اشارہ کیا کہ شہباز کہیں گر نہ جائے اس لیے یہ ڈانس رکوا دو۔ وہ بڑھے اور مجمع سے مداری کی طرح داد لی اور شہباز کو پکڑ لیا۔ لڑکی بھی تھک کر ہانپ رہی تھی۔ خان بھی سرخ چہرے کے ساتھ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ لڑکی نے میوزک بند کر کے خان اور شہباز کو گلے لگا لیا۔

مجمع منتشر ہوا تو لڑکی خان سے بولی۔ ”میرا آج کا شو لاجواب تھا جیسا آج ہوا کبھی نہیں ہوا۔“

خان نے ہنس کر کہا کہ ہم خود ٹورسٹ ہیں اور پاکستان سے آئے ہیں۔ لڑکی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

مفتی نے مجھ سے کہا۔ ”ہم نے بیس بیس ڈالر خرچ کیے مگر ملک میں کسی کے اتنے قریب نہ ہوئے اور یہ دونوں مفت میں اتنی ملائم لڑکی کو بانہوں میں لیے رہے تھے۔“

مطیع اللہ بہت خوش تھا۔ کہنے لگا۔ ”پاکستان میں پنجاب کے لوگ زندہ دلی میں اوّل نمبر پر ہیں۔ دیکھا موقع پا کر اپنے آپ کو بھی خوش کر دیا اور لوگوں سے بھی تالیاں بجوائیں۔“

جرمن سیاح بھی دونوں سے ہاتھ ملا ملا کر خوش ہوتے تھے۔

جاتے جاتے دونوں دوبارہ لڑکی سے بغلگیر ہوئے اور پھر ہم انہیں دھکے لگاتے ہوئے وہاں سے نکال لائے۔

میں نے سرجی سے کہا کہ کہیں بیٹھ کر کچھ کھا پی لیتے ہیں۔ ذرا سا ستا بھی لیں گے اور پھر کسی اور جگہ چلیں گے۔ ذرا آگے فٹ پاتھ پر رکھی کرسیوں کے ساتھ ایک اٹالین ریسٹورنٹ تھا۔ ساتھ ہی کچھ اٹالین گٹار، ڈرم اور کچھ دوسرے موسیقی کے آلات لیے بیٹھے تھے۔ سیاح کرسیوں پر بیٹھے کھانا بھی کھا رہے تھے اور میوزک کے ساتھ گانا بھی سن رہے تھے۔ ایک نوجوان سیاہ چشمے لگائے کچھ گا رہا تھا۔

جرمن سیاحوں نے سرجی سے درخواست کی کہ آپ نے ہمیں کنگسٹن مارکیٹ کے اہم گوشے دکھائے اور اس پر تاریخی جائزہ بھی ہمیں بتایا تو آج کا لنچ آپ سب کو ہماری جانب سے ہوگا۔ سرجی شکریے کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھنے لگے تو وہ سمجھے کہ یہ انکار کر رہے ہیں۔ سرجی شکریہ یہ کہہ کر دراصل دعوت قبول کر رہے تھے اور وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ انکار کر رہے ہیں۔ ان کی تکرار جاری رہتی کہ خان نے بھڑک کر سرجی سے کہا۔ ”سیدھی طرح کہہ دے کہ دعوت قبول ہے۔ یہ ملا کھڑا کیوں لگا رکھا ہے۔“

خان کو بیٹھتے دیکھ کر ہم سب بھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ہمارے پاس اپنے کھانے کے لیے برگرز، شامی وغیرہ تھے۔ سرجی نے چنے چاٹ بھی بنائی تھی۔ میں نے کہا کہ آرڈر کرنے سے بہتر ہے کہ اپنا وہ کھانا کھائیں جو ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ مفتی بضد تھا کہ جرمن کیا کہیں گے کہ پاکستانی اتنے کنجوس ہیں کہ تازہ کھانا کھانے کی بجائے باسی کھانا کھا کر پیسے بچانا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ”ہمیں اپنا فائدہ دیکھنا ہے یا یہ دیکھنا ہے کہ کون ہمارے بارے میں کیا کہتا ہے۔“

مفتی ضد کرنے لگا اور آخر میں بولا۔ ”میں تو ریسٹورنٹ ہی سے آرڈر کروں گا۔ کتنا برا لگے گا کہ ان کے سامنے اپنے بیگ میں سے مرا تڑا باسی فوڈ نکالیں۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”میں ان لوگوں کی پرواہ نہیں کرتا ہوں مگر بات مفتی بھی غلط نہیں کہہ رہا ہے۔“

جرمن ہماری جانب دیکھ رہے تھے کہ کس قسم کی بحث میں ہم پڑ گئے ہیں؟

میں نے ان سے کہا۔ ”آپ لوگ اپنا آرڈر دیں۔ ہم ابھی سوچ رہے ہیں۔“

ایک بوڑھا سرجی کی جانب عقیدت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”انہوں نے اپنا قیمتی وقت ہمیں دیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اگر ہم معاوضہ دینا بھی چاہیں تو یہ نہیں لیں گے اس لیے آپ سب کا لنچ ہماری جانب سے ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”مگر ہم میں سے کچھ کے پاس اپنا لنچ ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور کھانے کی سب چیزیں میز پر رکھ دیں۔ شاپر میں قرینے سے رکھے برگرز تھے۔ ایک ہاٹ پاٹ میں شامی کباب اور سرجی کے چنے علیحدہ پیک تھے۔ ہاٹ پاٹ کھولا تو پاکستانی مصالحوں کی خوشبو اردگرد پھیل گئی۔ اُدھر خوشبو پھیلی اور اُدھر جرمنوں کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ وہ اب ہاٹ پاٹ میں جھانکنے لگے اور مرعوب ہو کر سر ہلانے لگے۔ انہوں نے پوچھا۔ ”یہ کس ریسٹورنٹ سے آپ نے خریدے ہیں۔“

خان فخر سے بولا۔ ”میری بیوی نے بنائے ہیں۔ وہ بہترین کک ہے۔“

ایک جرمن نے استعجاب سے پوچھا۔ ”آپ پاکستان سے کچن بھی اٹھا لاتے ہیں؟“

خان اپنی بات میں پھنس گیا اور بات بنا کر کہنے لگا۔ ”میری فیملی کسی کے گھر پے ایک گیسٹ ہے۔ ہم نے وہیں یہ سب بنایا ہے۔“ خان نے ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اٹھا کر لجاجت سے کہا۔ ”آپ ذائقہ چکھیں تو پاکستانی کھانوں کو کبھی نہیں بھولیں گے۔“

انہوں نے ایک شامی اٹھایا اور اس کے چھ حصے کیے۔ ذائقہ چکھا تو تعریفیں کرنے لگے۔ اب خان ان کے پیچھے پڑ گیا کہ یہ سب کباب اور برگرز آپ لوگوں نے ہی ختم کرنے ہیں مگر وہ اس احسان کا بار نہیں اٹھا سکتے تھے۔ آخر کار اس بات پر راضی ہوئے کہ وہ ہمارا کھانا تناول کر کے ریسٹورنٹ سے ہمارے لیے لنچ کا آرڈر وہ خود کریں گے۔

میں نے مفتی کی جانب دیکھا جو یہ کہہ رہا تھا کہ ان کے سامنے اپنا کھانا کھولنا بھی بے ادبی ہے۔ وہ سر جھکائے نظریں چرا رہا تھا۔

وہ کولڈ ڈرنک کے ساتھ برگرز اور شامی کھا رہے تھے۔ سرجی اور میں نے چنے کھائے اور میرے حصے میں بھی برگر اور کباب آ گیا۔ ساتھ میں تازہ نکلا ہوا اورنج جوس سونے پر سہاگا ثابت ہوا۔ ہمارے دوسرے ساتھی حلال نہ ہونے کی وجہ سے گوشت تو نہیں کھا سکتے تھے لہٰذا انہوں نے بیگن کے بھرتے جیسی کچھ سبزیاں منگوائیں۔ سب خان کو بیٹھے کوس رہے تھے جس نے اپنا کھانا جرمنوں کے سپرد کر دیا تھا۔

جرمن اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔ وہ بون سے آئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”بون تو سنا ہے کہ خوشبوؤں کی وجہ سے مشہور ہے۔ آپ کو خوشبوئیں آتی ہیں؟“

تین موٹی خواتین میں سے ایک فربہ خاتون گویا ہوئی۔ ”خوشبوؤں سے زیادہ ہمیں وہ اس لیے پسند ہے کہ بہت پُرسکون اور چھوٹا شہر ہے، موسم لاجواب ہے اور معیشت ترقی کر رہی ہے۔“

ایک جرمن نے ہم سب کو بون آنے کی دعوت دے ڈالی اور سرجی کی تو منتیں کرنے لگے۔ سرجی بولے۔ ”سوچ رہا ہوں وقت نکال کر یورپ کا تفصیلی ٹرپ لگاؤں۔ ایک دو

سال بعد شاید یہ ممکن ہو سکے گا۔“

ان میں سے ایک نے اپنا فون نمبر اور ای میل ایڈریس دیا۔ سرجی نے بھی رابطے کے تمام ممکنہ ذرائع ان کے حوالے کیے۔ اپنا گھر کا ایڈریس بھی دیا۔ بڑے تپاک سے رخصت ہوئے۔ سرجی کو عورتوں نے خوب گلے لگا کر شکریہ ادا کیا اور وہ شرم کے مارے سرخ ہوتے رہے۔

ہم واپس کالج اسٹریٹ پر آنے کے لیے کنگسٹن کی گلیوں سے نکلے۔ جتنا شور شرابہ بازاروں میں تھا۔ اتنی ہی ویرانگی اور خاموشی گلیوں میں چھائی ہوئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گھر اور اجڑا اجڑا ماحول۔ گلیاں بالکل خالی پڑی تھیں اور سب گھر والے کسی نہ کسی کاروبار سے جڑے کنگسٹن مارکیٹ میں پھیلے تھے۔ ڈاؤن ٹاؤن کہیں کا بھی ہو، اس کی گلیوں میں وحشت برستی ہے۔ کہیں کہیں گھر کی مختصر سی سیڑھیوں پر چینی بوڑھی عورتیں سبزی کاٹتی نظر آئیں۔ چند بچے بھی ان کے مختصر لان میں اچھلتے کودتے نظر آئے۔ مطیع اللہ بولا۔ ”چینی جب بچے ہوتے ہیں تو خوب صورت لگتے ہیں مگر جیسے ہی جوان ہوئے ان کی شکلیں بدل جاتی ہیں۔“

سرجی سے پوچھا۔ ”اب کہاں چلنے کا ارادہ ہے؟“

حالانکہ انہیں میں نے بتا دیا تھا کہ ہم کالج اسٹریٹ پر مغرب کی سمت چند بلاک جائیں گے تو الٹے ہاتھ پر اونٹاریو گورنمنٹ کی قانون ساز اسمبلی کی پرانی عمارت ہے اور ساتھ ہی قدیم ”کوئین پارک“ ہے۔ وہاں کچھ دیر بیٹھ کر ستا بھی لیں گے اور اسمبلی کی عمارت کے علاوہ سیاحوں کے جمگھٹے میں سیاحوں جیسی حرکتیں بھی کرلیں گے۔

سرجی نے نقشہ کھولا۔ بھنویں چڑھا کر بڑے غور سے نقشے کو دیکھا۔ پھر نوٹس نکال کر ان کا مطالعہ کیا اور بولے۔ ”میرا خیال ہے صوبائی اسمبلی کی عمارت دیکھی جائے۔“

ہم سب ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر نظروں ہی نظروں میں مسکرائے اور ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

ہمارے سامنے اب سربفلک جدید عمارتیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ہر عمارت کی زمین چھوٹی تھی مگر باتیں آسمان سے کر رہی تھیں۔ سب ایک دوسرے سے جڑی کھڑی تھیں۔ سی این ٹاور ہر جگہ سے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ ہم سب خاموشی سے یہ نظارہ کر رہے تھے۔

ہماری طرح بہت سے ٹورسٹ کشادہ فٹ پاتھ پر چلتے نظر آ رہے تھے۔ ہر ایک کی نگاہیں اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بیشتر سیاح یورپ سے تھے۔ امریکا سے ٹورسٹ کینیڈا کم آتے ہیں۔ کینیڈا آتے بھی ہیں تو صرف دور دراز کی جھیلوں اور جنگلوں کا رخ کرتے ہیں مگر یورپ سے آئے ہوئے ٹورسٹ وہاں کی سڑکوں کو ناپتے ہیں گویا وہ صرف پا پیادہ چلنے کو آتے ہیں۔ امریکا ہو یا کینیڈا دونوں ملک یورپ سے بہت مختلف ہیں۔ یورپ کے ملک قدیم ہیں مگر نارتھ امریکا (کینیڈا اور امریکا) پچھلے دو سو سال میں آباد ہوئے ہیں۔ یورپ کی سڑکیں، بازار اور گلیاں چھوٹی اور تنگ ہیں۔ عمارتیں زیادہ بلند نہیں اور قدیم بھی ہیں۔ گاڑیاں چھوٹی ہیں شہر چھوٹے مگر صاف ستھرے ہیں۔ ستر سال پہلے تک لندن اور پیرس کی گلیوں میں زیادہ تر باتھ روم کامن ہوتے تھے۔ گلی کی نکڑ پر بنے باتھ روم پورے محلے کی ضرورت پوری کرتے تھے۔ مکانات چھوٹے چھوٹے اور تنگ ہیں۔ نارتھ امریکا کو ایک جدید انداز سے تعمیر کیا گیا ہے۔ یورپ کی طرح سڑکیں ٹیڑھی اور بل کھاتی نہیں بلکہ سیدھی ہیں۔ ایک ایک انچ کی پیمائش کر کے میل میل لمبے بلاکس بنائے گئے ہیں۔ ترتیب سے بلندیوں کو چھوتی عمارتیں کھڑی کی گئی ہیں۔ عام سڑکیں بھی اتنی چوڑی ہیں کہ یورپ کی ہائی وے بھی اتنی کشادہ نہ ہوں گی۔ بڑے بڑے مکانات جیسے یورپ میں ولا ہوتے ہیں۔ یہاں گاڑیاں ایک سے ایک شاندار، بڑی اور آرام دہ ہوتی ہیں۔ یورپ میں پیٹرول امریکا کی نسبت بہت مہنگا ہے اور اسی لیے گاڑیاں وہاں چھوٹی بنتی ہیں جو پیسے کی فراوانی نارتھ امریکا میں ہے وہ یورپ میں نظر نہیں آتی۔ انگلینڈ سے جو بھی ہمارے ہاں آیا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ لندن میں جس گھر کے دو تین تنگ تنگ کمرے بھی ہوں تو وہ بڑا سمجھا جاتا ہے اور اِدھر ان گھروں سے چار گنا بڑا گھر بھی چھوٹا سمجھا جاتا ہے۔ دراصل امریکا، کینیڈا میں زمین اور وسائل بہت زیادہ ہیں۔ ایک ایک گھر کی زمین عموی طور پر ایکڑ زمین ہوتی ہے۔ نارتھ امریکا کھلا، کشادہ اور ترتیب میں ہے۔ امریکا یا کینیڈا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ڈرائیو کریں تو کم از کم تین دن لگتے ہیں۔ یورپ میں آپ اسپین سے صبح نکلیں تو فرانس، سوئٹزرلینڈ کو کراس کر کے شام سے پہلے جرمنی پہنچ جائیں گے اسی لیے یورپین سیاح نارتھ امریکا آ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ کینیڈا میں جانا انہیں زیادہ اس لیے بھی پسند آتا ہے کہ ڈالر یہاں کا سستا ہے اور یورپین لوگ امریکا کو اس کی رعونت کی وجہ سے زیادہ پسند بھی نہیں کرتے۔

ہم بھی کنگسٹن مارکیٹ کی سیر سے لطف اندوز ہو کر اب

ٹورنٹو کی اسکائی اسکریپٹر.... عمارتوں کو دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔

ہماری بائیں جانب یونیورسٹی آف ٹورنٹو تھی۔ وسیع اور خوب صورت اسے دیکھ کر ہم سب متحیر ہوتے تھے۔ زمین تو یونیورسٹی کی تھی اور وہاں خوب صورت لان تھے، درخت، پودے اور پھول کھلے تھے۔ کینیڈا کی سب سے بڑی اس یونیورسٹی میں پچھتر ہزار طالب علم اور پندرہ ہزار اسٹاف ہے۔ اس کے اندر خوب صورت، قدیم اور بارعب محلات ہیں جنہیں عطیہ کر کے یونیورسٹی کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کو گھوم پھر کر دیکھنے کے لیے پورا دن لگتا ہے۔ لہٰذا سرجی کے نوٹس میں یہاں کا جانا نہیں لکھا تھا مگر بعد میں اپنے امتحانات کی تیاری کے لیے میں یہاں ہر روز آتا رہا تھا۔ ان خاموش محلات کی پرانی اور چوڑی کرسیوں پر بیٹھ کر صبح سے شام تک پڑھتا رہا تھا۔ تھک جاتا تو ان محلوں میں بنی لائبریریوں سے باہر نکل آتا۔ اکثر چھٹی کے دن نئے شادی شدہ جوڑے ان قدیم عمارتوں کے پس منظر میں شادی کی فوٹو گرافی کروانے آتے تھے۔

اب ہمارے سامنے بائیں جانب انہی سبزہ زاروں میں اونٹاریو گورنمنٹ کی پارلیمنٹ بلڈنگ کھڑی نظر آ رہی تھی ساتھ ایک قدیم پارک ہے جو کوئین پارک کے نام سے مشہور ہے۔

ہم کوئین پارک میں آ بیٹھے۔ یہاں سیاحوں کا ہجوم تھا۔ کئی ایک گھوم پھر رہے تھے اور بہت سے گھاس اور بنچوں پر بیٹھے تھے۔ ہمارے سامنے صوبائی پارلیمنٹ کے سو سال سے زیادہ قدیم عمارت تھی جو اس پورے ماحول پر حاوی نظر آتی تھی۔ بڑے بڑے برج، محرابیں، شیشے کی پرانی طرز تعمیر کی کھڑکیاں اور بڑھے پھیلاؤ میں یہ عمارت ہر بیٹھے، کھڑے اور چلتے ہوئے سیاح کی نظر میں تھی۔ سلیٹی رنگ کی اس عمارت کی چھتیں مخروطی تھیں۔ یہ وکٹورین طرز تعمیر کا بہترین نمونہ تھا۔ ہم پارک میں نرم و ملائم گھاس پر بیٹھے تھے۔ شہباز اور مطیع اللہ لیٹے تھے۔ ہم سب سستا رہے تھے۔ میری نظریں پارک کے ان پختہ راستوں پر تھیں جہاں ہر رنگ کا سیاح نظر آ رہا تھا۔ عورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے۔ ہر ایک اپنی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ پارک چھوٹا تھا اور اردگرد کی سڑکوں پر گاڑیاں آتی جا رہی تھیں۔ پھولوں کی کیاریاں تھیں جن میں سفید اور لال پھول کھلے تھے۔ چھوٹے چھوٹے درختوں پر سبزہ اپنے پورے جوبن سے اتر آیا تھا۔ ایک ایک پتا، گل اور گھاس کا تنکا تک مٹی اور گرد سے صاف تھا۔ ایک خالص اور نکھرا ماحول تھا۔ چلتی ہوا میں خنکی تھی اور مجھے اپنی اسپرنگ جیکٹ میں ٹھنڈ محسوس ہونے لگی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے ہلکی جیکٹ پہن کر غلطی کی ہے۔

کوئین پارک کے لیے جگہ یونیورسٹی آف ٹورنٹو نے مستعار دی تھی۔ یونیورسٹی کی زمین کئی مربع کلومیٹر میں پھیلی ہوئی ہے۔ یونیورسٹی نے یہ وسیع رقبہ شہر کی خوب صورتی کے لیے ڈیڑھ سو سال پہلے دیا تھا۔ اب یہ مقام ٹورنٹو کا دل بن چکا ہے۔

ہمارے قریب کچھ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان کے قہقہے ہم تک چلے آ رہے تھے۔ سرجی خاموش تھے۔ خان قیصر کہنے لگا۔ ”انہیں جرمن سیاح یاد آ رہے ہیں کیونکہ وہ انہیں ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے۔“

شہباز نے ایک نظر ان خوب صورت لڑکیوں کی طرف دیکھا جو نیکریں پہنے، ٹانگیں پھیلائے آسودگی سے نیم دراز تھیں اور پھر سرجی کو دیکھا جن کا چہرہ لڑکیوں کی جانب تھا۔ سرجی کالا چشمہ لگائے ہوئے تھے اور پی کیپ کو الٹا پہن رکھا تھا۔

شہباز نے سرجی سے آنکھوں میں شرارت لیے پوچھا۔ ”آپ سوچوں میں اتنا مسکرا کیوں رہے ہیں؟“

نہ جانے ان کے دل و دماغ میں کیا سمایا تھا کہ جذب و کیف کے لہجے میں بولے۔ ”ہم تو اس وقت وصال کی لذتوں میں ہیں۔“

”تمہارے موٹے دماغ میں یہ نازکیاں کہاں سما سکتی ہیں؟“ خان لیٹتے ہوئے اپنی مخصوص ہنسی ہنسا اور مفتی لڑکیوں کی ٹانگوں پر ایک طائرانہ مگر بھرپور نظر ڈالتے ہوئے خان سے بولا۔ ”ہمیں زیادہ منہ نہ کھولنا چاہیے تاکہ اپنی اور دوسروں کی عزت کا بھی خیال رکھ سکیں۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”ہنسنے میں عزت کا جنازہ کہاں نکلتا ہے؟“ اور پھر سیدھا بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”عزت اپنی آنکھوں میں اور اپنے ہاتھوں میں ہوتی ہے بس یہ خیال رہے کہ کسی کو گھور گھور کر نہ دیکھیں، ندیدہ پن ظاہر ہوتا ہے۔“

مفتی ہنستے ہوئے بولا۔ ”ہر ایک اپنی نظر سے دیکھتا ہے۔ کوئی پھولوں کو دیکھتا ہے اور کوئی پھول جیسے چہروں کو اور ہم تو ٹورسٹ ہیں اور یہی سب دیکھنے کے لیے ہی تو آئے ہیں۔“

میں سب سے مخاطب ہوا۔ ”اسی لیے تو کہتا ہوں کہ

اپارٹمنٹ سے باہر بھی نکلا کریں۔ ٹھنڈی ہوا سے دل و دماغ کھلتا ہے اور اس لیے آج آپ سب ایسی نازک باتیں کر رہے ہیں۔" پھر مسکرا کر سرجی کو دیکھا اور پوچھا۔ "آج آپ بتا ہی دیں کہ کس کے وصال کی لذتوں سے آپ آج مخمور ہیں؟"

اداس بھرے لہجے میں بولے۔ "واہ وا کیا خوب صورت شعر کہا ہے۔ ذرا ایک بار پھر سے سنانا۔ اپنی بات مکمل کر کے بولا۔ "لگتا ہے سرجی کے دل پر گہری چوٹ لگی ہے۔ سرجی بتائیں کہ اصل اسٹوری کیا ہے؟"

"ہم تو عاشق جاں سوز ہیں جس پر ہمیں سرشاری کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔" سرجی لہرا کر بولے۔ میں بڑی دلچسپی سے سرجی کو دیکھ رہا تھا جنہوں نے اچانک اپنا روپ بدل لیا تھا۔

خان نے سرجی کو کھنگالنے کی خاطر کہا۔ "یہ سرشاری کی کیفیت لانے والی کون تھی؟ ہم دوست ہیں آپ کے ہمیں نہیں بتائیں گے تو کس کو بتائیں گے؟"

ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔ "ہم بھی آج کی طرح کبھی عاشقوں کی محفل کے میر مجلس ہوا کرتے تھے۔ وہ ہوتی اور ہم ہوتے تھے۔ سرِ شام کسی باغ کے گوشے میں بیٹھ کر گل داوری کے بقول سونگھا کرتے۔ آج ہم نے جیسے اس کے کسی ہم زاد کو دیکھ لیا ہو۔"

میں ہوشیار ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس کو دیکھ کر اپنی عاشقی نچھار کر رہے ہیں۔ ہمارے قریب تو وہی گوری لڑکیاں نیکروں میں اپنی ٹانگیں دکھلاتی بیٹھی تھیں۔

آخر ان سے پوچھ بیٹھا۔ "ان میں سے کوئی آپ کے عشق کی ہمراز تو نہیں ہے؟"

ایک بڑی گہری اداسی میں ڈوب کر اپنا سر ہاں میں ہلایا۔

مفتی نے اسی بہانے ہر لڑکی کا بغور جائزہ لیا اور سرجی کے کندھے کو زور زور سے ہلا کر پوچھا۔ "کون سی ہے؟"

"پوچھ کر کیا کریں گے؟" سرجی اپنے اداس چہرے سے بولے۔

شہباز بولا۔ "کریں گے کیا؟ بس اسے دیکھ کر آپ کی طرح ٹھنڈی آہیں بھریں گے۔"

سرجی شکست خوردہ لہجے میں بولے۔ "دوست ضد کرتے ہیں تو بتا دیتا ہوں۔"

پھر آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ "وہی نازنین جو میری جانب پاؤں کیے لیٹی ہے۔"

"پاؤں تو بہت سی لڑکیوں نے آپ کی جانب کیے ہوئے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

سرجی بولے۔ "وہ جس کی سرخ نیکر ہے اور موٹی ٹانگیں ہیں۔"

"وہ جو الٹی لیٹی ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"نہیں پہلے وہ سیدھی لیٹی تھی۔ الٹی تو وہ اب ہوئی ہے۔" سرجی بولے۔

مطیع اللہ چیخ پڑا۔ "تیرا بیڑہ غرق سرجی، وہ تو ان کا استانی لگتا ہے۔"

"میں بھی تو پندرہ سال پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت تو نہیں لگتی تھی۔" سرجی وضاحت دینے لگے۔

"آپ کو کیسے معلوم کہ پندرہ سال پہلے آپ کی محبت کی طرح یہ ہوگی۔" میں نے پوچھا۔

وہ بولے۔ "اس لیے کہ میری محبت اب بالکل اس جیسی ہے۔ میں ابھی اس سے مل کر آیا تھا جب وہ بیکری پر اپنے بچوں سمیت ڈبل روٹی خریدنے آئی تھی۔"

ہم سب کے فلک شگاف قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے۔ ہمارے زوردار قہقہے سن کر وہ الٹی لیٹی ہوئی پھڑک کر پہلے سیدھی ہوئی اور پھر بمشکل اٹھ کر ہمیں بری طرح گھورنے لگی۔

مطیع اس عورت نما لڑکی کو دیکھ کر سرجی سے بولا۔ "یہ تو خود بھی موٹی ہے۔ آپ تو کہتے تھے کہ صرف ٹانگیں موٹی ہیں۔"

خان قہقہہ لگا کر بولا۔ "سرجی! اچھی طرح سے سوچ لو آپ کا بدنصیب پیار کیا ہلکی ہلکی مونچھیں بھی رکھتا تھا۔"

سرجی خفا ہو گئے اور بولے۔ "اس لیے تو آپ لوگوں کو میں دل کا احوال نہیں بتاتا تھا۔ کوئی بات نہیں آپ ہم پر سنگ باری بھی کریں تو اسے ہم گل پاشی سے تعبیر کریں گے۔"

مطیع اللہ سنجیدگی سے بولا۔ "آپ کے اچھے شعروں کی وجہ سے تو اس مائی کی مونچھیں نکل آئی ہیں۔ اب کیا اس کی شیو بھی نکلوائیں گے؟"

"کسی کے پیار کا یا کسی بھی انسان کا ایسے مذاق نہیں اڑاتے۔ پیار کرنے والے دل دیکھتے ہیں، روح میں جھانکتے ہیں اور چہروں میں کیا رکھا ہے۔ آج چہرہ اگر جاذب نظر ہے تو کل کو ڈھلک بھی جانا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے

کہا۔ میری بات سن کر مطیع اللہ شرمندہ ہو گیا۔ میں نے بات بدلتے ہوئے سرجی سے پوچھا۔ "ذرا ہمیں بھی سنائیں ہوا کیا تھا؟"

محبت میں سرشار ہو کر بولے۔ "ہم تو کبھی وجد میں رہتے ہیں اور کبھی حال میں، کیوں ہمارے راز عیاں کرتے ہو۔"

"راز تو تب عیاں ہوتے جب ہم اس پاکیزہ خاتون کو جانتے، یہاں تو ایسی کوئی صورت حال نہیں ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ وہ سامنے بیٹھی لڑکی جو دوبارہ اسی حالت میں لیٹ چکی تھی اس پر نظریں گاڑے فرمانے لگے۔

"مجھے ایک دن معلوم ہوا کہ اس کو دل دے بیٹھا ہوں، جب میں نویں جماعت میں پاس ہوا تھا۔ وہ ہمارے محلے میں رہتی تھی۔ ہم وہاں نئے نئے شفٹ ہوئے تھے۔ ایک بار وہ گھر کی ڈیوڑھی دھو رہی تھی۔ اس کا بھائی اسے تنگ کر کے دروازے سے باہر گلی میں آیا تو پیچھے پیچھے اس کا جوتا بھی آیا تھا۔ اس سے پہلے وہ جوتا مجھے پڑتا مگر میں ہوشیاری سے وہیں تھم گیا تھا۔ وہ بھی شیرنی کی مانند دروازے پر آئی تو سامنے میں کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر شرمائی اور بولی کہ وہ جوتا تو ذرا پکڑا دیں۔"

ہم سب اپنی اپنی ہنسی دبائے بیٹھے تھے مگر شہباز ہنسی روکنے سے بری طرح لرز رہا تھا۔ خان حیرت و استعجاب کے ساتھ بیٹھا یہ واردات سن رہا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی دخل در معقولات کر کے سرجی کا ردھم نہیں توڑنا چاہتا تھا۔

سرجی بتا رہے تھے۔ "بدقسمتی سے وہ جوتا نالی میں گرا تھا۔ میں نے آستین چڑھائیں اور جوتا نکال لایا۔ وہ میری جانب تک رہی تھی مگر شرم کے باعث میں سر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ جوتا گندگی سے بھرا تھا اور اب میں سوچ رہا تھا کہ اس کے نازک ہاتھوں میں لتھڑا جوتا کیسے پکڑاؤں۔" سرجی ٹھنڈی آہ بھر کے اور پھر فرمانے لگے۔ "اس نے دوپٹا دانتوں میں دبائے ہوئے جھاڑو کو بائیں ہاتھ میں پکڑ کر دائیاں ہاتھ آگے بڑھایا اور مترنم لہجے میں شرما کر بولی۔ "یہ جوتا تو دے دیں۔"

سرجی لال بھبوکا چہرے سے کہانی آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں کبھی جوتے کو دیکھوں اور کبھی اس کے نازک و نرم ہاتھوں کو اور پھر میں نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "ہاتھ گندے ہو جائیں گے۔"

وہ شرما کر بولی۔ "اِدھر دوسرا پاؤں بھی تو گندا ہو رہا ہے۔"

میں نے بھی وہ پاکیزہ فلم والا ڈائیلاگ بولا۔ "اپنا پاؤں زمین پر نہیں رکھیے گا۔ میلا ہو جائے گا۔"

وہ اتنی شرمائی کہ شرماتے شرماتے جھاڑو ڈیوڑھی کے گیلے فرش پر پھینک دیا اور پانی کا پائپ باہر نکال کر بولی۔ "لائیے جوتا دھو لیتے ہیں۔"

اب میں گندا جوتا ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا۔ میرا ہاتھ بھی دھویا اور ساتھ جوتا بھی۔ پھر میں نے جوتا اس کے خوب صورت ننگے پاؤں کے سامنے رکھ دیا تو اس نے پاؤں سرعت سے اس میں ڈال دیا۔ جوتا پھر میلا ہو گیا اور پھر اس نے پائپ سے اپنا پاؤں دھویا۔

میں نے مسکرا کر اس کے دونوں پاؤں دیکھے۔ شلوار کے پائنچے ذرا اوپر چڑھے تھے اور دونوں پاؤں کبوتروں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ میری اس ادائے محبت پر وہ شرما کر اندر بھاگی اور میں ڈر کر اس لیے بھاگا کہ سمجھا کہ کوئی ہتھیار اٹھانے گئی ہے۔ دور جا کر کھڑا تھا مگر وہ واپس نہ آئی۔ یہیں مجھے محسوس ہوا کہ میرا دل تو پرایا تھا یہ تو اس کی امانت تھا اور سوچا کیوں نہ اسے لوٹا دوں۔

خان قیصر اب سب کو اشارے کر رہا تھا کہ خبردار کوئی ہنسا ہم سب ہنسی دبانے کی کوشش کر رہے تھے سرجی متواتر لڑکی کی ننگی ٹانگوں کو سیاہ چشمے پہنے اپنی نظروں میں رکھے ہوئے تھے۔

مطیع بولا۔ "یہ تو بالکل پھلمی (فلمی) اسٹوری ہے۔ پھر آگے کیا ہوا تھا؟"

"ایک تو آپ سب ہتھیلی پر سرسوں جمائے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ذرا سانس تو لینے دیں۔" سرجی نے یہ کہہ کر اپنے بیگ سے پانی کی بوتل نکالی اور غٹا غٹ چڑھا گئے۔ پھر دوبارہ سے اپنی نظریں لڑکی کی عریاں ٹانگوں پر دھیمے رکھیں اور کہانی آگے بڑھائی۔ "دوسرے دن میں گلی سے گزر رہا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ان کی ڈیوڑھی روزانہ گندی ہو جاتی ہے اور وہ ہر روز اسے دھوتی ہے۔ اتنے میں پانی کے پائپ کا رخ میری جانب ہوا اور پھر میں گیلا کھڑا گلی میں اس کی محبت سے بھیگ رہا تھا۔ اس بار میں نے اپنا جوتا اتارا تو وہ شرما کر بھاگ گئی۔"

"کیا لو اسٹوری ہے۔ ایسا پیار پہلے تو کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔" میں نے مرعوب ہو کر سب کی جانب دیکھا۔

شہباز مجھ سے بولا۔ "ایک تو سب اپنے اپنے تبصرے

کرتے رہتے ہو۔ کہانی میں اتنی بریکیں لگے گیں تو اختتام نہیں ہو پائے گا۔"

سرجی نے ایک نظر شہباز کو مشکوک نظروں سے دیکھا اور گویا ہوئے۔ "پھر ہر روز کوئی نہ کوئی ایسی ویسی حرکت ہونے لگی۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ "تم اسکول کیوں نہیں جاتیں؟"

شرمیلی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ "گرمیوں کی چھٹیوں میں تیرے ابا کے اسکول کھلے ہوتے ہیں۔"

اس کی حاضر جوابی پر میں فدا ہو جاتا۔ میرے سوالوں کے جواب اس نے اپنے ہونٹوں پر پہلے سے رکھے ہوتے تھے۔

میں پھر اسے خط لکھ لکھ کر دینے لگا۔ وہ پڑھتی اور خوش ہوتی تو چھت سے گلی میں گزرتے مجھے روڑے مارتی۔ اسی طرح دن بدن ہماری محبت پروان چڑھتی رہی۔ ایک بار میں نے گلی میں اِدھر اُدھر جھانک کر خط دیا تو لے کر غصے سے مجھے لوٹا دیا اور بولی۔ "ابھی پچھلا خط تو پڑھا نہیں اور تم دوسرا لکھ لائے۔" سرجی بولتے چلے جا رہے تھے۔

"گرمیوں کی چھٹیاں تمام ہوئیں تو وہ بھی اسکول جانے لگی معلوم ہوا کہ وہ اتنی لائق فائق ہے کہ مجھ سے ایک کلاس آگے دسویں میں پڑھتی ہے۔"

مفتی نے پوچھا۔ "کبھی باہر بھی ملے، کبھی اس کا ہاتھ بھی پکڑا؟"

سرجی بولے۔ "ایک بار اسے کنٹونمنٹ پارک لے گیا تھا جب میں دسویں میں آیا۔ وہیں ہم پھولوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے پھولوں کی موجودگی کو وجہ بنا کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔"

"پھر؟" مطیع نے پوچھا۔

مسکرا کر بولے۔ "مجھے پہلی بار چانٹا مار دیا تھا۔ گو ہاتھ نرم و نازک تھے مگر جب بھی چانٹا مارتی تو ہاتھ بہت بھاری پڑتا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا بہت نرم و نازک لڑکی تھی؟"

"نہیں ماشاء اللہ صحت بہت اچھی تھی۔ ماں ہر روز اسے حریسہ بنا کر کھلاتی تھی۔ تندرست اتنی کہ دو دو چار پائیاں ایک ساتھ اٹھا لیتی تھی۔ آدھے گھنٹے میں کمروں سمیت صحن کا فرش دھو ڈالتی مگر اف تک منہ سے نہ نکلتی۔ جو کھاتی فوراً ہضم ہو جاتا۔"

خان قیصر بولا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوتا کہ ہضم ہو گیا ہے۔"

بولے۔ "کیونکہ پھر سے کھانا شروع کر دیتی۔"

مفتی نے پوچھا۔ "اب بتائیں کہ انجام کیا ہوا تھا؟"

بولے۔ "کبھی پاکیزہ محبتیں بھی وصال کا ذائقہ چکھ سکی ہیں۔ یہی انجام ہماری محبت کا بھی ہوا۔"

میں بولا۔ "یعنی کہ کچھ نہیں؟"

وہ بولے۔ "ایک بار اس لیے ناراض ہو گئی تھی کہ اس دن میں اس کے لیے روز کی طرح چنے چاٹ نہ لا پایا تھا۔ دوسرے دن بھی خفا رہی۔ پھر میں نے ایک خط لکھا جس میں یہ شعر بھی لکھا تھا۔

یوں شکایت کا حق ہمیں حاصل نہ رہے
ایسا لگتا ہے کہ ہم آپ کے قابل نہ رہے

پھر وہ خط اس کے ابا جان کے ہاتھ لگ گیا۔ ابا جان کی پنساری کی دکان تھی۔ خشک میوے کھا کھا کر اچھی خاصی صحت بنائی تھی۔ دوسرے دن ہمارے دروازے پر تشریف لائے۔ کنڈا کھٹکھٹایا تو میں ہی باہر نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی پکڑ لیا اور وہیں گرا کر خوب دھنائی کی۔ میں بہت رویا مگر وہ اس دن نہ جانے کیوں بہت غضب ناک تھے اور میری آہ و زاری پر بھی کان نہ دھرے۔ میں نے بھاگ کر اپنی ننھی سی جان بچائی۔ رات کو میرے والد صاحب گھر آئے تو میری والدہ نے خط سے لے کر مار تک سب بتا دیا۔ یہ سن کر والد صاحب نے ابا جان سے زیادہ کٹ لگائی اور پھر اگلے مہینے محلہ بھی تبدیل کر دیا۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟" میں پوچھ بیٹھا۔

"ابھی بھی پوچھتے ہیں کہ کیا ہوا۔ جدائی نصیب میں تھی اور وہی میرا نصیب بنی۔ ڈر کی وجہ سے ان کی گلی سے کبھی نہیں گزرتا تھا بس کینیڈا آنے سے پہلے آخری بار اسے بچوں سمیت بیکری پر دیکھا۔

کہانی تو ختم ہو گئی تھی مگر ہنستے ہنستے ہماری حالت بری ہو گئی۔ سرجی بار بار پوچھتے کہ ہم ہنس کیوں رہے ہیں۔ میں ان سے بولا۔ "آپ کی خوش قسمتی پر ہنس رہے ہیں۔ آپ کو تو کئی بار مار پڑنی چاہیے تھی۔ خوش قسمت اس لیے ہیں کہ ایک باری ہی میں جان چھوٹ گئی۔"

خاصی دیر آنکھیں موندے خاموش پڑے رہے۔ سرجی کی کہانی کا سوچتے تو مسکان لبوں پر پھیل جاتی۔ سرجی واقعی بہت سادہ لوح تھے۔ معصوم اور بے ضرر شخصیت کے مالک

تھے۔ جو دل میں ہوتا وہی زبان پر لاتے۔ یہی سوچتے سوچتے کچھ لمحے بعد سب پر غنودگی چھا گئی۔

تقریباً ایک گھنٹا ہم گھاس کے بستر پہ لیٹے رہے۔ ٹھنڈک اور تازہ ہوائیں ہمیں اب کپکپاتی تھیں۔ میں ٹھنڈ کی وجہ سے بیدار ہوا ورنہ آس پاس کی چلتی ٹریفک کا شور بھی مجھے نہ جگا پایا تھا۔ دیکھا تو سب گھاس پر سکڑے پڑے تھے۔ شہباز تو باقاعدہ خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے مفتی کو اٹھایا تو وہ پہلے ہی سے جاگ رہا تھا۔ سرجی کے سر کے نیچے سے بیگ کھینچا تو وہ جاگے اور جاگتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ شہباز کو میں نے ٹانگ سے پکڑ کر دو تین فٹ گھسیٹا تو وہ بیدار ہوا اور کہنے لگا۔ "کیا سیاپا ہے چھٹی کے دن بھی نہیں سونے دیتے۔"

"ابھی اچھا خاصا دن پڑا تھا۔ سوچا کہ پارلیمنٹ کی عمارت اور کوئین پارک کو گھوم پھر کر دیکھ لیا جائے۔"

پارلیمنٹ بلڈنگ کی طرف گئے اور دیکھا کہ اونچے میناروں کے اوپر نیلا آسمان تنا کھڑا ہے۔ کہیں کہیں بادل جمے کھڑے تھے۔ بڑے بڑے برج محرابیں شیشوں سے سجی پرانی طرز کی گول و کٹوریں کھڑکیاں تھیں۔ مرکزی دروازہ آراستہ تھا۔

کسی نے سرجی سے پوچھا۔ "یہ عمارت کب بنی تھی؟"

بولے۔ "1893ء میں بنی تھی۔"

پوچھا گیا۔ "کتنے میں بنی تھی؟"

پوچھنے والے سے خفا ہو کر بولے۔ "جتنے میں بھی بنی تھی اور تمہیں کیا ہے کہ کتنے میں بنی تھی، تم عمارت دیکھو پیڑ کیوں گنتے ہو۔"

میں بولا۔ "سرجی! وہ آم تھا کہ پیڑ گننے کو تو تھے۔"

بولے۔ "ہم اہل زبان ہیں اپنے محاورے ہم خود بھی بنانے کا حق رکھتے ہیں۔"

"یہ تو بتا دیں کہ کتنی رقم خرچ ہوئی تھی اس عمارت کی تعمیر پر؟" میں نے مسکرا کر دوبارہ پوچھا۔

"بہت پرانی بات ہے۔ حساب کتاب کون رکھتا تھا لیکن خرچہ بہت ہوا تھا۔ آپ نے وہ محاورہ نہیں سنا کہ یا کھائے گھوڑا یا پھر کھائے روڑا۔"

مطلب ان کا یہ تھا کہ یا تو گھوڑا پالنے پر خرچ ہوتا ہے یا پھر مکان تعمیر کرنے پر۔

"یہ مستری کہاں سے آیا تھا؟" مطیع اللہ کا سوال تھا۔

"مستری اور مزدور تو دو جہاز بھر کر پاکستان سے لائے تھے۔" سرجی نے معلومات کے دفتر کھول دیے۔

شہباز بولا۔ "پاکستان تو بہت بعد میں بنا تھا۔"

سرجی نے پوچھا۔ "فیصل آباد اور ساہیوال کہاں پر ہیں۔"

سب نے جواب دیا۔ "پاکستان میں ہیں اور کہاں ہیں۔"

"سب مستری راج وغیرہ فیصل آباد اور ساہیوال سے آئے تھے تو مطلب ہے کہ پاکستان سے آئے تھے۔" وہ بولے۔ سرجی اتنے وطن پرست تھے کہ ہندوستان کا نام بھی لینا پسند نہ کرتے تھے۔

ساتھ جان میکڈونلڈ کا مجسمہ ایستادہ تھا۔ یہ کینیڈا کا پہلا وزیر اعظم گزرا ہے۔ اس نے 1867-1873 تک کینیڈا پر حکومت کی۔

پارک میں پھول بے تحاشا تھے۔ کیاریوں میں والہانہ انداز سے لہرا رہے تھے۔ کاسنی رنگ نمایاں تھے۔ گھاس ایسی دبیز اور ملائم کہ پاؤں دھنستے تھے۔ پارک میں درختوں کے نیچے بینچ رکھے تھے جہاں ٹورسٹ جوڑوں یا گروپس کی صورت براجمان تھے۔ کئی جوڑے دنیا ومافیہا سے بے خبر ایک دوسرے میں مدغم تھے۔

مطیع اللہ بولا۔ "یہ کھلے عام بوس و کنار کیوں کرتے ہیں۔ بند کمروں میں اپنا منہ کالا کیوں نہیں کرتے۔"

"ہم جن چیزوں کو منہ کالا ہونے کا سبب سمجھتے ہیں، وہ نہیں سمجھتے اور ان کی نظر میں یہ روابط وغیرہ ایسے ہی ہیں جیسے کسی کے لیے روزمرہ کا کھانا کھانا یا نیند لینا۔ ہم پردے کے قائل ہیں کہ جسم کو ڈھانپ کر رکھنا چاہیے۔ ان کے نزدیک سارا جسم ایسے ہی ہے جیسے منہ ہاتھ اور چہرہ وغیرہ۔ ان کے نزدیک زندگی آج ہے اور کل ختم اور ہمیشہ کے لیے ختم۔ نہ آخرت ہے اور نہ ہی کوئی محاسبہ۔" میں نے اپنی جانب سے مطیع کو سمجھایا۔

وہ بولا۔ "اگر آخرت اور حساب کتاب پر یقین رکھتے نہیں تو یہ کیوں خوش حال میں اور ہم اتنی پستی میں ہیں؟"

"انہوں نے صنعتی اور معاشی ترقی انتہائی تیز رفتاری سے کی ہے جس کو ہم نہیں کر سکے اور ہم روز آخرت کو جانتے ہیں مگر یقین شاید نہیں کرتے۔ اگر کرتے تو کرپشن نہ ہوتی اور پھر معاشی ترقی بھی ان ہی کی طرح کر جاتے۔ مسلمانوں کے معاشی مسائل اگر حل ہو جائیں تو ان سے مضبوط قوم شاید ہی کوئی ہو۔" مطیع اللہ میرا جواب سن کر دانشمندی سے سر ہلا رہا تھا۔

یہ پارک 1860ء میں کھولا گیا۔ پہلے بھی بتایا ہے کہ

زمین یونیورسٹی آف ٹورنٹو نے 1854ء میں دی تھی۔ پارک میں جگہ جگہ فائر فائٹرز، پولیس اور مرے ہوئے فوجیوں کی یاد میں کئی مجسمے لگے تھے۔

گھوڑے پر بیٹھے پرنس ایڈورڈ کا مجسمہ تھا جس نے 1860ء میں اس پارک کا افتتاح کیا تھا۔ پرنس ایڈورڈ کا یہی مجسمہ پہلے نئی دہلی میں لگا تھا۔ اسے 1869ء میں انڈیا سے کینیڈا لایا گیا تھا۔

پارک کے اردگرد اونچی عمارتیں ہیں جو ماحول میں ایک خوب صورتی بھر رہی تھیں۔ عمدہ تراشے ہوئے درخت ہیں، خوب صورت روشیں اور پختہ راستے جو پارک کو حسین بناتے تھے۔

سردیوں میں کئی بار میں یہاں سے گزرا۔ یہ پورا پارک برف سے ڈھکا ہوتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی یہاں کا حسن ہر موسم میں لاجواب ہوتا ہے۔

ہمیں بہت سے اور مقامات کی طرف بھی جانا تھا۔ اس لیے وہاں سے روانہ ہوئے۔ کچھ دیر کی نیند کے بعد سب تازہ دم تھے۔

ہم نے جاروس (Jaruis) اسٹریٹ کی جانب مشرقی سمت جاتی بس پکڑی، ایلین گاؤں کے سامنے اترے اور کچھ ہی دیر میں جنوبی سمت کی بس ہمیں مل گئی۔ ہم اسی دوران اونچی اونچی عمارتوں تلے کھڑے تھے۔ چلتی خنک ہوائیں اب مجھے بے آرام کر رہی تھیں۔ ڈاؤن ٹاؤن میں بلند عمارتوں کی بدولت سورج کی روشنی زمین پر کم پڑتی ہے۔ اس وجہ سے وہاں ٹھنڈک اور اس کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ میری اسپرنگ جیکٹ مجھے کپکپانے سے نہیں روک رہی تھی۔ میں پچھتا رہا تھا کہ کوئی گرم جیکٹ یا اونی ٹوپی بھی ساتھ لانی تھی اور پھر مجھے چھینکیں شروع ہو گئیں۔ میں نے اپنے آپ کو سردی سے نہیں بچایا تھا اور اب دیر ہو چکی تھی کنگسٹن مارکیٹ سے خریدے جتنے کپڑے مجھ پر پورے اترتے تھے وہ میں نے پہن لیے مگر یہ چھینکوں کو روکنے کے لیے ناکافی تھے۔ میری ناک بری طرح سے بہہ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ پانی کے فوارے چل پڑے ہیں۔ کسی ایک کی شرٹ کو میں نے رومال بنایا اور وہ ناک پر رکھ لیا۔

بس پر بیٹھ کر ہم ساؤتھ کی جانب گئے اور لیک اونٹاریو سے پہلے فرنٹ اسٹریٹ پر اترے۔ یہاں نئی نکور چمکتی ہوئی بلند عمارتوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ سورج کی شعاعیں عمارتوں کے گہرے رنگوں والے شیشوں پر پڑ کر منعکس ہونے کی بجائے جذب ہوتی تھی اور ان کے شیشے چمک رہے تھے ہمارے سامنے لارنس، مارکیٹ تھی اور اسی مارکیٹ میں ہمیں جانا تھا۔

میرے اور سرجی کے علاوہ کسی اور کو یہ معلوم نہ تھا کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ سرجی صرف اتنا جانتے تھے کہ کوئی فوڈ مارکیٹ ہے جہاں کھانے پینے کی مختلف اشیاء بکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی معلومات نہ تھیں۔

فرنٹ، جاروس، کنگ اور چرچ اسٹریٹ کے گرد کا یہ ایریا بھی مارکیٹ ڈسٹرکٹ کہلاتا تھا جہاں اس وقت [illegible] بلند قامت عمارتیں ایک ہجوم کی صورت نظر آ رہی [illegible] یہاں دو سو سال پہلے میدان تھا۔ بیچ میں ندی نالے بہتے تھے اردگرد کھیت کھلیان تھے۔ اس وقت یہاں کے لوگوں کو سال کی [illegible] فصل کاشت کرتے کبھی بھی یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ دو صدیاں [illegible] بعد اس مقام پر ساٹھ ستر منزلہ اور ایک دو اس سے بھی [illegible] عمارتیں کھڑی ہوں گی۔ سڑکوں کا جال بچھا ہوگا اور گاڑی [illegible] کی کوئی [illegible] ہزاروں کی تعداد میں ایک گھنٹے میں گزرتی [illegible] گی۔ تیزی سے وقت کو دیکھیے کیا سے کیا تبدیلیاں ہمارے سامنے لے آتا ہے۔ اس علاقے کو مارکیٹ ڈسٹرکٹ کہا جاتا ہے۔

مشرقی سمت پر ایک قلعہ ہوتا تھا جس کو کینیڈا امریکا کی جنگ میں امریکیوں نے توپ خانے سے تباہ کر دیا تھا۔ یہ انیسویں صدی کے آغاز کی بات ہے انگریزوں نے اس قلعہ کو دوبارہ تعمیر کر دیا تھا۔ اب بھی اس کی کچھ [illegible] ہیں۔

اب سب مجھ سے یہ پوچھ رہے تھے کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ میں انہیں یہ کہہ رہا تھا کہ سامنے فوڈ مارکیٹ کی براؤن رنگ کی عمارت جو نظر آ رہی ہے اسے دیکھنے آئے ہیں۔

پہلے تو وہ حیرت و استعجاب میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ آلو ٹماٹروں کی مارکیٹ میں ہم کیا لینے آئے ہیں؟ مطیع اب مجھ سے پوچھنے لگا۔ ”یہاں کیا مفت (مفت) چیز ملتی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”آپ لوگوں نے سنا نہیں کہ نارتھ امریکا میں کوئی بھی چیز فری نہیں ہے۔“

میں نے خان سے پوچھا۔ ”آپ تو چند بار پارک یونیورسٹی گئے ہیں وہ یہاں سے اندازاً کتنی دور ہوگی؟“

وہ چڑ کر بولا۔ ”کوئی تیس پینتیس کلومیٹر ہوگی۔ کیا اب [illegible] جانا ہے؟“

”یہ بتاؤ کہ دو سو سال پہلے وہاں کیا ہوتا ہوگا؟“ میں [illegible] شرارت سے پوچھا۔

”میری بلا سے کچھ بھی ہو مگر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو“ خان بھڑک اٹھا تھا۔

میں ہنس کر بولا۔ ”دو صدیاں پہلے وہاں فارم کھیت [illegible] کھلیان ہوا کرتے تھے۔“ یہ کہہ کر مجھے دوبارہ چھینکوں کا دورہ [illegible]

شہباز بولا۔ ”کیا سیاپا مچا ہوا ہے آپ نے اور سرجی [illegible] ٹھیک سے بتاؤ کہ اب کرنا کیا ہے؟“

”پارک سٹی کے کسانوں نے اپنی سبزیاں، پھل اور [illegible] ان کے علاوہ پنیر، دودھ، انڈے وغیرہ بیچنے کے لیے دو سو [illegible] سال پہلے یہاں اوپن مارکیٹ لگانا شروع کی تھی۔ وہ ہر ہفتے [illegible] دن آتے اور مال بیچ کر گھوڑوں اور گھوڑا گاڑیوں پر [illegible] واپس پارک سٹی چلے جاتے تھے۔ یہاں سے پارک سٹی تک [illegible] کھیت، باغات تھے اور نہریں بہتی تھیں۔“ میں نے انہیں [illegible] ابتدائی معلومات دیں۔

شہباز بولا۔ ”تو ہم کیا کریں۔ یہ سب باتیں ہم کیا [illegible] انہیں بتانے آئے ہیں؟“

”یہاں کنوئیں بھی ہوتے تھے جن سے کولہو کے بیل [illegible] پانی نکالا کرتے تھے۔“ اب سرجی نے بھی معلومات فراہم [illegible] کرنے کے لیے کمر کس لی۔

ہمارے اردگرد گزرتی گاڑیوں کا شور تھا ہم سے ٹھیک [illegible] طرح سے گفتگو بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔

”پہلے سڑک پار کر کے دوسری طرف چلتے ہیں۔ یہ [illegible] بازی بک بک وہیں کہیں کریں گے۔“ مطیع اللہ بھی زچ [illegible] ہو رہا تھا۔

ہم نے بتی سرخ ہونے پر کئی دوسرے لوگوں کے ہمراہ [illegible] سڑک پار کی۔ ایک ہجوم اس مارکیٹ کی جانب رواں تھا۔ [illegible] پارکنگ میں گاڑیاں نہیں بلکہ ٹینٹ لگے تھے اور آج لارنس، [illegible] مارکیٹ کے ساتھ ساتھ باہر فارمر مارکیٹ بھی لگی تھی۔

اب ہم ایک ٹینٹ کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں انہیں [illegible] بتا رہا تھا کہ 1803ء میں یہاں پبلک مارکیٹ لگنا شروع [illegible] ہوئی۔ پارک سٹی کے فارمرز نے خالی جگہ پر اپنا سامان یہاں [illegible] بیچنا شروع کیا تھا۔ دو سو سال میں تبدیلی یہ آئی ہے کہ اب دنیا [illegible] کی سب سے بڑی فوڈ مارکیٹ بن گئی ہے۔ لاکھوں سیاح جو [illegible] ٹورنٹو آتے ہیں وہ لارنس مارکیٹ کا چکر ضرور لگاتے ہیں۔

کھانے پینے کی اشیاء۔۔ دوسرے مقامات سے یہاں بہت سستی ہوتی ہیں۔ دو سو کے قریب فوڈ کمپنیوں کے لارنس مارکیٹ میں مستقل اسٹالز ہیں، ہوٹلوں والے اور ریسٹورنٹس والے یہاں سے آ کر گوشت وغیرہ خریدتے ہیں۔ یہ تو آپ کو اندر جا کر اندازہ ہوگا کہ آپ کیا کیا عجائبات دیکھ رہے ہیں۔

ان ٹینٹوں میں جھانک کر دیکھا تو سبزیوں، پھلوں اور کھانے کی دوسری اشیاء کے ڈھیر لگے تھے۔ وہاں رکنے کی بجائے میں انہیں لیتا سیدھا لارنس مارکیٹ کی جانب چلا آیا۔ باہر گھوم کر میں وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

ہم ایک بہت بڑے ہال میں کھڑے تھے جس کا فرش ٹائلوں سے چمک رہا تھا اور چھت تیس چالیس فٹ سے زیادہ اونچی ہوگی۔ چھت مخروطی تھی جس میں سے لوہے کے گارڈر، ہیٹنگ کے پائپ اور HVAC کا پورا انتظام جال کی طرح بچھا ہوا تھا۔ ہال اتنا وسیع تھا کہ اس میں راستے بنے تھے اور راستوں کی دونوں جانب بڑے بڑے اسٹالز تھے جو کسی ریسٹورنٹ سے کم سائز کے نہ ہوں گے۔ ہر اسٹال کے کاؤنٹر

دلاور فگار کی ایک نمکین غزل سے چند اشعار

میں نے کہا کہ شہر کے حق میں دعا کرو
اُس نے کہا کہ بات غلط مت کیا کرو

میں نے کہا کہ رات سے بجلی بھی غائب ہے
اُس نے کہا کہ ہاتھ سے پنکھا جھلا کرو

میں نے کہا کہ شہر میں پانی کا قحط ہے
اُس نے کہا پیپسی کولا پیا کرو

میں نے کہا کہ کار ڈکیتوں نے چھین لی
اُس نے کہا کہ اچھا ہے پیدل چلا کرو

میں نے کہا کہ کام اور کاروبار بند ہے
اُس نے کہا کہ شاعری پر ہی اکتفا کرو

انتخاب از: حنیف ادیب۔ لاہور

کے پیچھے تین یا چار ورکرز آسانی سے گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ کئی کیفے تھے جن کے آگے کرسیاں رکھی تھیں اور لوگ بیٹھے کچھ نہ کچھ کھا پی رہے تھے۔ ایک طرح کا بازار تھا جو ایک مضبوط چھت کے نیچے لگایا گیا تھا۔

ہم سب اشیاء کی فراوانی، رونق میلہ اور جم غفیر دیکھ کر حیران تھے کہ سو سے زیادہ بڑے اسٹال کس طرح سے آراستہ کیے گئے ہیں کہ ذرا بھی بے ترتیبی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ صفائی ایسی کہ فرش میں اپنا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ہماری نظریں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں اور دیکھنے کو اتنا کچھ تھا کہ نگاہیں کسی ایک مقام پر ٹھہرتی بھی نہ تھیں۔

ہم ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ چند میزیں کرسیاں اس کے آگے رکھی تھیں۔ مجھ کو سب نے کہا کہ اب چھینکوں کا علاج یہ ہے کہ گرم کافی پی لو۔ ان تیز اور متواتر چھینکوں نے مجھے سب کے سامنے تماشا بنا دیا تھا۔ میرے ساتھی مجھ سے دور دور کھڑے تھے اور آتے جاتے میری جانب ہمدردی سے دیکھتے تھے۔ مجھے اتنی شدید جھٹکے لگ رہے تھے کہ میرا پورا جسم جل رہا تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی کافی پینے کی ہامی بھر لی اور پھر ہم ان کرسیوں پر بیٹھے کافی کا انتظار کرنے لگے۔

وہ ایک درمیانہ ریسٹورنٹ تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ شوکیس میں کئی اقسام کے کیک، بسکٹ، مغز اور بیگلز رکھے تھے۔ حیرت انگیز طور پر چائے بھی مل رہی تھی۔ یہ مصالحہ دار چائے ہوتی ہے۔ گرم پانی میں ایک نوزل سے چائے ڈالی جاتی ہے۔ اس کو ایک شاٹ بولتے ہیں۔ اگر کڑاکے دار چائے چاہیے تو دو شاٹ ڈلوا لیں۔ بعد میں تو یہ چائے اسٹار بکس، کیفے اور دوسری مشہور کافی شاپس کے علاوہ ایئرپورٹس پر بھی ملنے لگی۔

سرجی سب کے لیے کافی اور اپنے لیے چائے لے آئے تھے۔ ساتھ پیکان پائی بھی لے آئے۔ یہ کیک کا ایک تکونا ٹکڑا تھا جس پر اخروٹ وغیرہ سجے تھے۔ ساتھ والی کرسیوں پر سیاح بیٹھے اس نئے ماحول سے خوش ہو رہے تھے۔ کافی کی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ آتے جاتے نظر آ رہے تھے انہوں نے بڑے بڑے تھیلے سامان سے بھرے اٹھائے ہوئے تھے۔

گرم کافی میرے اندر گئی تو رگوں میں خون کی جگہ شرارے دوڑنے لگے۔ باہر کی سرد ہوا کی جگہ یہاں کا گرم ماحول نصیب آیا تو جسم کی سلوٹیں بھی ڈھیلی پڑ گئیں۔ چھینکیں مدھم پڑیں تو دماغ کھلا اور گرد دیکھا تو زیادہ تر اسٹالز گوشت، مچھلی اور سمندری خوراک کے تھے۔ اس کے علاوہ ریسٹورنٹ، کیفے، کچن سے متعلق اشیاء اور پھلوں سے بھرے اسٹالز تھے۔ ہال کے اندر بنے راستوں کی دونوں جانب ان دکانوں کو بڑے قرینے اور سلیقے سے سجایا گیا تھا۔

ہم نے سوچا کہ یہاں کا ایک جائزہ لے لیا جائے۔ اس خیال سے اٹھ ہی رہے تھے کہ چار لڑکیاں مارکیٹ کے مرکزی دروازے سے داخل ہوئیں اور ہمارے ساتھ پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ یہ انہی لڑکیوں میں سے تھیں جو ٹین پارک میں ہم سے ذرا دور گھاس پر لیٹی تھیں اور ان میں سے ایک کو دیکھ کر سرجی کو اپنی محبت یاد آ گئی تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ان چاروں میں کھل کھل کرتی سرجی کی محبت کی کاپی بھی تھی۔ اب سرجی کبھی ہمیں دیکھتے اور کبھی اس کو۔ ہم سب بھی اس حسین اتفاق پر قدرے حیران تھے۔ انہوں نے بھی جب ہمیں دیکھا تو پہچان لیا۔ سرجی کی محبت کے علاوہ سب نے ہماری جانب مسکرا کر دیکھا اور ہم سب نے بھی اپنی مسکراہٹیں انہیں عنایت کیں۔

سرجی تو اس طرح سے چوکنے ہو گئے جیسے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہوں۔ میں نے سرجی سے کہا۔ ”لگتا ہے کہ قسمت میں آپ دونوں کا ملاپ لکھا ہے اور اس لیے آپ کی محبت کی کشش انہیں یہاں بھی کھینچ لائی۔“

سرجی گڑگڑاتے ہوئے آہستگی سے بولے۔ ”دوسیں گی تو ہمارے بارے میں کیا سوچیں گی۔ اب آپ لوگ مجھے سرِ عام رسوا تو نہ کریں۔“

شہباز بولا۔ ”سرجی! کہیں تو انہیں کافی کی دعوت دے دیں؟“

سرجی امید بھری نظروں سے ہمیں دیکھتے ہوئے بولے۔ ”مجھے معلوم ہے آپ لوگ مذاق کر رہے ہیں۔“

”مذاق تو نہیں مگر یہ سوچ لیں ویسے تو اسے کم فربہ سمجھ رہا تھا مگر یہ تو بہت زیادہ ہے۔“ شہباز بولا۔

سرجی نے بات بدلی اور منمنائے۔ ”بلانا چاہتے ہو تو بلا لیں۔ کافی میں پلا دوں گا۔“

یہ سنتے ہی شہباز کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اس کے چہرے پر شرارت رقصاں تھی۔ اس کی شرارت کبھی کبھی جان کو آ جاتی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا، وہ قدم بڑھاتا ان لڑکیوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

(جاری ہے)

راسِ امید

طارق عزیز

نئی دنیا کی تلاش میں مہم جو صدیوں سے سفر در سفر کرتے رہے ہیں۔ انہی معروف مہم جو میں سے ایک لمیوڈیاس بھی تھا جو کئی سو سال قبل نئی دنیا کی تلاش میں نکلا تھا مگر لوٹ کر گھر نہ آسکا۔

تاریخ کی کتابوں میں دفن ایک معروف مہم جو کا قصہ



515 قبل مسیح کا دور اختتام کی جانب گامزن تھا۔ برصغیر کی آبادی انتہائی کم تھی۔ بڑی آبادیاں دور دور بسی ہوئی تھیں۔ وہ سات سمندر پار سے آ رہا تھا۔ راستے میں اسے کئی بڑی سلطنتیں ملی تھیں مگر جب وہ ایران پہنچا تو وہاں کے بادشاہ دارا اوّل نے اسے بہت عزت دی۔ ایرانی اس کے خدوخال دیکھ کر مرعوب ہو گئے تھے۔ بادشاہ نے اسے اپنا مہمان ٹھہرایا تھا۔ خوب خاطر داری کی تھی۔ وہ اسے اپنے ملک میں ہی روکنا چاہتا تھا لیکن اسے ابھی اور آگے جانا تھا۔ اس کی خواہش کے احترام میں شہنشاہ دارا اوّل نے اسے زر و جواہر دیے اور وہ آگے چل پڑا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق یونانی سیاح

اسکائے لیکس آف کاریا ہی پہلا یورپی سیاح تھا جس نے ایران و افغانستان کے راستے درہ خیبر سے ہوتے ہوئے موجودہ پاکستان کی حدود میں قدم رکھا۔ یہاں کے لوگوں کی شکل و صورت، قد و قامت اسے حیران کررہی تھی۔ مقامی لوگوں کے لیے بھی وہ عجوبہ تھا کیونکہ وہ برصغیر کے لوگوں جیسا نہیں تھا۔

اسکائے لیکس اور اس کے ساتھیوں نے دو سال کے دوران شمال مغربی اور وسطی ہندوستان کی سیاحت کی۔ اس نے واپسی کے لیے سمندری راستے کا انتخاب کیا اور بحیرہ عرب کو پار کر کے خلیج عدن اور بحیرہ احمر سے ہوتا ہوا مصر واپس ہو گیا۔ اسکائے لیکس کی مہم کے نتیجے میں یونانی تاجروں کو نہ صرف ہندوستان تک رسائی کے خشکی کے راستے سے آگاہی ہوئی بلکہ انھیں اندازہ ہوا کہ جزیرہ نما عرب کے مشرق میں واقع بحیرہ عرب کو پار کر کے بھی ہندوستان پہنچا جاسکتا ہے۔

118 قبل مسیح میں ایک اور یونانی ملاح ڈوکسس آف سیزیس نے اسکائے لیکس کے اختیار کردہ سمندری راستے کی پیمائش کی۔ یہی راستہ پہلی صدی عیسوی میں رومن انڈیا روٹ کہلایا۔ یورپین تاجر چندرویں صدی عیسوی کے آخر تک یورپ سے ہندوستان تک رسائی کے اسی بحری راستے پر سفر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ پرتگالی جہاز راں ڈیا گو کیم نے 1482ء سے 1486ء کے دوران افریقا کی مغربی ساحلی پٹی کو دریافت کیا۔ تاہم وہ جنوب میں موجودہ نمیبیا کے ساحلوں سے آگے نہ جاسکا۔ ڈیا گو کیم کی مہمات نے یورپین کو ہندوستان تک رسائی کے ایک نئے بحری راستے کی امید دلائی۔ انہیں اندازہ ہوگیا کہ اگر وہ افریقا کی ساحلی پٹی کے ساتھ ساتھ مزید جنوب میں سفر کریں تو مشرقی سمندر (بحر ہند) میں داخل ہونے کے مقام تک پہنچ سکتے تھے۔ گو کہ یہ رومن انڈیا روٹ کے مقابلے میں ایک طویل بحری راستہ تھا لیکن اس زمانے میں دنیا کی دریافت کے حوالے سے یورپین طاقتوں کے درمیان چل رہی رسہ کشی کو دیکھتے ہوئے پرتگالیوں کو لگا کہ اگر انھوں نے جلد ہی ہندوستان تک رسائی کے نئے بحری راستوں کو دریافت نہ کیا تو دیگر یورپین اقوام یہ کارنامہ سرانجام دے کر ان علاقوں پر اپنا قبضہ جما سکتی تھیں۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں پرتگالی جہاز راں بارتو لیمیو ڈیاس (Bartolomeu Dias) نے بحر ہند تک رسائی کے نئے سمندری راستے کے دریافت کی مہم ترتیب دی۔

بارتو لومیو ڈیاس 1451ء کو لزبن کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کے بچپن کا زمانہ بحر اوقیانوس میں دریافتوں کا دور تھا۔ وہ 1468ء میں پرتگالی بحریہ میں شامل ہوا۔ اس نے 1475ء میں شادی کی جس کے نتیجے میں اس کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ 1470ء کی دہائی میں ڈیاس کا شمار قابل جہاز رانوں میں ہونے لگا تھا۔ 1481ء میں بادشاہ افانسو پنجم کی وفات کے بعد نئے پرتگالی بادشاہ جان دوئم (1455-1495) نے بارتو لومیو ڈیاس کی قیادت میں تین بحری جہازوں پر مشتمل ایک بیڑے کو جنوبی بحر اوقیانوس کی طرف روانہ کیا۔ ڈیاس نے اپنی اس مہم کے دوران خلیج گنی (Gulf Of Guinea) تک کا افریقی ساحلی علاقہ دریافت کیا، تاہم وہ کسی وجہ سے جنوبی بحر اوقیانوس میں داخل نہ ہوسکا اور واپس پرتگال چلا آیا۔ ڈیاس کی وطن واپسی کے فوراً بعد پرتگالی حکومت نے ڈیا گو کیم (1450-1507) کی قیادت میں جنوبی بحر اوقیانوس تک رسائی کے لیے ایک اور مہم روانہ کی۔ ڈیا گو کیم نے 1482ء سے 1486ء میں سرانجام دی گئیں۔ اپنی دو مہمات کے دوران خلیج گنی سے نمیبیا تک کا ساحلی علاقہ دریافت کیا، تاہم وہ جنوبی افریقا تک پہنچنے میں ناکام رہا۔ ڈیا گو کیم کی مہمات کے نتیجے میں پرتگالی حکومت کو افریقی براعظم سمیت جنوبی بحر اوقیانوس کی وسعت کا اندازہ ہوا۔ پرتگالی بادشاہ جان دوئم نے 10 اکتوبر 1486ء کے دن منعقد کیے گئے ایک اعلیٰ سطح کے اجلاس میں بارتو لومیو ڈیاس کو حکم دیا کہ وہ جنوبی بحر اوقیانوس کو پار کر کے بحر ہند تک رسائی کی کوشش کرے۔

اگست 1487ء میں بارتو لومیو ڈیاس نے دو بڑے... کیراول بحری جہازوں فلیگ شپ ساؤ کرسٹووا ؤ اور ساؤ پنتالی آؤ اور ایک چھوٹی کشتی کے ساتھ لزبن سے اپنی تاریخی مہم کا آغاز کیا۔ اس کے بیڑے میں شامل ارکان کی کل تعداد 240 تھی جن میں پیرو ڈی ایلین کوئر، جوآؤ انفانٹے ایلوارو مارٹن، جوآؤ ڈی سان ٹیاگو اور بارتو لیو کا چھوٹا بھائی پیرو ڈیاس نمایاں تھے۔

پرتگالی بیڑے نے شمالی بحر اوقیانوس میں جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے سینی گال کے ساحلوں پر واقع کیپ ورٹ تک رسائی حاصل کی۔ انہوں نے یہاں سے خوراک جمع کی اور جنوب کی طرف بڑھے۔ ان کے بحری جہازوں نے لائی بیریا کے قریب خط استواء سے 5 ڈگری شمال کے خط پر اپنا رخ مشرق کی طرف کردیا۔ انہوں نے اکتوبر کے وسط میں خط استواء پار کر کے جنوبی بحر اوقیانوس میں رسائی حاصل کی اور دریائے کانگو کے دہانے پر لنگر گرائے۔ جسے ڈیا گو کیم 1482ء میں دریافت کرچکا تھا۔ مقامی قبائلیوں نے بارتو لومیو کو خوش آمدید کہا۔

دسمبر 1487ء میں بارتو لومیو کے بحری جہاز، نمیبیا کے ساحلوں پر واقع خلیج والوس میں داخل ہوئے، جو اس وقت تک پرتگالیوں کے ہاتھوں دریافت شدہ آخری جنوبی مقام تھا۔ پرتگالیوں نے سفر جاری رکھا یہاں تک کہ 3 فروری 1488ء کے دن انھوں نے خط استواء سے 34.10 ڈگری جنوب اور 18.30 ڈگری مشرق کے خط پر واقع ایک براعظمی نوک کا نظارہ کیا۔ بارتو لومیو نے خشکی کے اس سرے کو ”راس طوفان“ (Cape of Storms) کا نام دیا۔ اس نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اب جنوبی افریقا کی ساحلی لکیر کا رخ جنوب مشرق کی طرف تھا، اپنا سفر جاری رکھا۔ اس نے 5 فروری کے دن راس امید سے 150 کلومیٹر جنوب مشرق میں خط استواء سے 34.48 ڈگری جنوب اور 20.3 ڈگری مشرق کے خط پر ایک اور براعظمی نوک، راس اگلہاس کو دریافت کیا۔ اگلہاس کا پرتگیزی زبان میں مطلب سوئی ہے۔ یہ براعظم افریقا کا انتہائی جنوبی کنارہ ہے جس کے مشرق میں بحر ہند اور مغرب میں بحر اوقیانوس واقع ہے۔ پرتگالی بیڑہ آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ 12 مارچ 1488ء کے دن انھوں نے خط استواء سے 34.06 ڈگری جنوب اور 22.22 ڈگری مشرق کے خط پر واقع خلیج موسل تک رسائی حاصل کرلی۔ پرتگالی بحری جہاز اب بحر ہند میں داخل ہوچکے تھے۔

بارتو لومیوں نے اپریل کے دوران جنوبی افریقا میں قیام کیا اور اپنے ساتھیوں کو شمال مشرق میں ہندوستان تک رسائی کے لیے اکسایا۔ تاہم جہازوں کے عملے نے اس کی بات ماننے سے انکار کرتے ہوئے وطن واپسی کا مطالبہ کیا۔ بارتو لومیو نے ان کی بات مانتے ہوئے واپسی کا سفر شروع کیا۔ اس نے مئی کے آغاز پر ”راس طوفان“ کے گرد چکر لگایا اور شمال میں بحر اوقیانوس کے کھلے سمندر کی طرف بڑھا۔ پرتگالی بحری جہازوں نے چھ ماہ پر مشتمل واپسی کے سفر میں نمیبیا، انگولا، کانگو اور لائی بیریا میں قیام کیا اور دسمبر 1488ء میں لزبن واپس پہنچ گئے۔

بارتو لومیو ڈیاس نے اپنی مہم کے دوران کل 22 ہزار کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ اس نے جنوبی افریقی ساحلوں پر نمیبیا سے خلیج موسل تک کی 2 ہزار کلومیٹر طویل ساحلی پٹی کو دریافت کیا۔ وہ پہلا یورپین تھا جس نے جنوبی افریقا کے گرد گھوم کر بحر ہند تک رسائی حاصل کی۔ اپنی مہم کے اختتام پر بارتو لومیو ڈیاس نے پرتگالی بادشاہ سے ملاقات کی اور اسے جنوبی افریقا کی دریافت کے بارے میں بتایا۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ بحر اوقیانوس اور بحر ہند کے ملنے کا مقام دریافت ہوچکا تھا اور ہندوستان تک رسائی کے نئے سمندری راستے کی دریافت اب کامیابی کے قریب تھی۔ جان دوئم نے راس طوفان کو ہندوستان تک رسائی کی اُمید میں راس اُمید کا نیا نام دیا۔ اس نے جنوبی افریقا کی ملکیت کا دعویٰ کیا۔ پرتگالی حکومت نے جنوری 1489ء میں اپنے ایک بیڑے کو یہ حکم دے کر اس کو جنوبی افریقا روانہ کیا کہ وہ راس اُمید کے علاقے کی سخت نگرانی کریں اور کسی بھی یورپین خاص کر ہسپانوی بحری جہاز کو اس راستے سے بحر ہند میں داخل ہونے نہ دیں۔ راس اُمید پر کنٹرول کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ پرتگالی حکومت ہندوستان تک رسائی کی مہم کو فوراً روانہ کردیتی تاہم ان کی تیاریاں منصوبہ بندی سے آگے نہ بڑھ سکیں یہاں تک کہ 1492ء میں کرسٹوفر کولمبس نے اسپین کے پرچم تلے بحر اوقیانوس کو مغرب کی طرف سے پار کر کے امریکا دریافت کرلیا۔ اس دوران 1494ء میں پرتگال اور اسپین کے درمیان طے پائے دنیا کی تقسیم کے معاہدے کے مطابق ہندوستان سمیت دنیا کے مشرقی حصے میں پرتگال جبکہ امریکا سمیت مغربی حصے میں اسپین کا حق مہم جوئی تسلیم کرلیا گیا۔

1495ء میں پرتگالی بادشاہ جان دوئم کے انتقال کے بعد نئے بادشاہ مینوئل اوّل (1469-1521) کی ہدایت پر بارتو لومیو ڈیاس نے ہندوستان روانہ کرنے کے لیے بیڑے کی تیاری کے کام کو تیزی سے شروع کروایا۔ اس نے 1497ء میں واسکو ڈی گاما کی ہندوستان جانے والی مہم کے ساتھ وابستہ ہو کر شمالی بحر اوقیانوس میں کیپ ورڈے کے جزائر تک کا سفر کیا۔ وہ 1499ء میں پرتگال واپس پہنچا۔ جہاں ہندوستان روانہ کرنے کے لیے دوسری مہم کی تیاری عروج پر تھی۔ 1500ء میں پیڈرو ایلوریس کیبرل کی قیادت میں 13 بحری جہازوں پر مشتمل بیڑہ ہندوستان روانہ ہوا تو بارتو لومیو ڈیاس بھی مہم میں شامل ایک بحری جہاز کا کپتان تھا۔ جنوبی بحر اوقیانوس میں داخل ہونے سے پہلے کیبرل کے بحری جہاز ایک سمندری طوفان میں گھر کر جنوب مغرب میں برازیل کی طرف نکل گئے۔ کیبرل نے اپنے ایک بحری جہاز کو نئے علاقے کی دریافت کی خوشخبری دے کر پرتگال روانہ کیا اور خود باقی کے 12 بحری جہازوں کو لے کر جنوبی افریقا کی طرف بڑھا۔ 29 مئی 1500ء کے دن کیبرل کے 4 بحری جہاز راس امید کے گرد چکر لگاتے ہوئے ایک سمندری طوفان میں پھنس کر راستہ بھٹک گئے۔ بدقسمتی سے ان چاروں میں سے ایک کا کپتان بارتو لومیو ڈیاس تھا، جسے دوبارہ خشکی پر لوٹنا نصیب نہ ہوا۔



قسط نمبر: 16

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہوگیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہوگئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ ذنیرہ کے ساتھ اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر الٹ دیتا۔ ابھی وہ مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی فہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہتا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر باتیں کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ فہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا میسج آگیا کہ اس کا پارٹ ٹوٹ گیا ہے۔ اگلے دن ذنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سنے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آگئے۔ ان میں عزیز خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیز خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنرز ہیں پر ہو ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں ستار ہا تھا کہ کالیا کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ عارف مچھندر جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آگیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او دلاور خان آرہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر آئی تھی اور فہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آکر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہوا تھا۔ فہیم کے تھپڑ نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ وہ تھپڑ مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے معاملے میں ملوث عزیز نظر آگیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبیہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہ اٹھ آیا۔ رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گلوخلاصی کرا دی جس کے ٹرک نے ذنیرہ کی کار کو ہٹ کیا تھا۔ گھر آیا تو کاشف میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی اغوا کا سن کر پریشان ہوگیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آجا۔ روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو گلشن حدید میں نہیں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سیٹھ ستار سے اپنی بہن لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کہا سچ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے بھی زخمی کر دیا۔ ساتھیوں سے نمٹ کر میں نے سیٹھ سے اگلوایا کہ عاصمہ کو کہاں رکھا ہے اسے باحفاظت نکال لایا پھر روزی کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ یہ اس کی بہن کا فلیٹ تھا۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر باہر سے آواز آئی۔ ”کیبل والا، بل لے کر آیا ہوں۔“ روزی نے دروازہ کھولا تو کیبل والے کو دھکا دے کر دو مسلح شخص اندر آگئے۔ ان سے نمٹ کر میں نے انسپکٹر کامران کو فون پر کہا کہ روزی کی حفاظت کے لیے دو پولیس والے بھیج دو۔ پھر میں اور کالیا کے ساتھ باہر آگیا۔ کامران کی معرفت کئی ایک کو گرفتار کرایا پھر ذنیرہ کے گھر پہنچا۔ کچھ ضروری باتیں کر کے میں باہر نکلا تھا کہ ایک ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھا کہ اس ٹیکسی میں بیٹھا ایک شخص اتر کر ذنیرہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں ہوشیار ہوگیا اور بھاگتا ہوا ذنیرہ کے پڑوس والے گھر میں داخل ہوگیا اور وہاں سے ذریعے ذنیرہ کے گھر میں اتر گیا۔ ٹھیک اسی وقت نیچے سے گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ تب تک میں سیڑھیوں تک پہنچ گیا تھا۔ اندر سے ذنیرہ پستول تھامے دھمکی دیتی ہوئی نکلی۔ اس کے پیچھے خالہ نجو کھڑی چیخ رہی تھیں۔ میں نے زخمی پر قابو پا کر خالہ سے رسی لانے کو کہا۔ ہم نے اسے دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ محلے کے لوگ آگئے تھے کچھ دیر بعد پولیس بھی پہنچ گئی۔ اسے پولیس کے حوالے کیا اور وہاں سے چل پڑا۔ ابھی گھر آیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اسپتال سے بتایا گیا کہ فہیم مل گیا ہے۔ میں اسپتال پہنچا فہیم نے بتایا کہ کچھ لوگ اس پر بے پناہ تشدد کرتے تھے۔ اس کی ٹانگیں بھی توڑ دی گئی تھیں۔ سیٹھ ستار الگ کالیا کو قتل کرنے پر تلا ہوا تھا کیونکہ وہ مجھ کے قتل کا بدلہ لینا چاہ رہا تھا۔ استاد بھا بھا نے مشورہ دیا کہ خود کو چھپا کر رکھوں۔ لیاری کا بچہ بچہ ٹی لے کر ہمیں ڈھونڈ رہا ہوگا ہم نے میک اپ کیا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچے تو اندر دشمن موجود تھے۔ ہم نے ان پر قابو پایا پھر اگلے روز جب اڈے پر پہنچا تو انور شاہ نے بتایا کہ حاجی مہران آیا تھا اور دھمکیاں دے کر گیا ہے۔ میں اپنے دوست فرقان کے دفتر گیا جو بندرگاہ میں واقع ہے وہاں پہنچا تو بن رائد سے سامنا ہوگیا۔ اس کا پیچھا کرتا ہوا میں کنٹینروں کے درمیان پہنچا تو کسی نے مجھے مارنے کے لیے گرایا۔ میں تو بچ گیا مگر ایک دوسرا شخص دب کر ہلاک ہوگیا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں کئی پارٹیاں ہیں جو ایک دوسرے سے الجھ رہی ہیں۔ میں بن رائد کے جہاز کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر سائیں داد کے ساتھ ساحل پر آگیا تھا کہ وہ مجھے نظر آگیا۔ میں اس کے تعاقب میں آگے بڑھ رہا تھا کہ

ہوگیا۔ اس نے پستول نکالنا چاہا تھا کہ میں نے اس پر جست لگا دی۔ مگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ میں اور کالیا رانا بشیر کے ہاں پہنچے تو شاہ میر کے آدمیوں نے کور کر رکھا تھا۔ ہم نے ان آدمیوں پر قابو پایا۔ رانا بشیر نے پولیس بلوائی۔ پولیس کے سامنے شاہ میر کے آدمیوں نے بیان دیا کہ لوگ شاہ میر کو نہیں جانتے۔ ہم وہاں سے نکلے تو فوزیہ کا فون آگیا کہ کچھ کرو۔ میں نے چاچا انور سے بات کی۔ انہوں نے فکرمندی کا انداز اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ انور شاہ ایسی کیا بات کرنا چاہتے ہیں پھر وہ مجھے ساتھ لے کر نکل پڑے راستے میں بولے کہ عطا محمد انکار کرتا ہے کہ لوگ برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے ہیں گھر پہنچ کر میں نے عاصمہ کو بتایا اسی وقت دستک ہوئی۔ باہر پولیس والے تھے۔ وہ بولے کہ تمہیں ثمر کے اغوا کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ مجھے تھانے لایا گیا۔ وہاں انسپکٹر رجب علی تھا۔ ذنیرہ نے ضمانت کرائی کالیا کے ساتھ آرہا تھا کہ راکا سے کسی نے ہمیں گھیرنے کی کوشش۔ فائرنگ کی آواز پر بھیڑ جمع ہوگئی ہم کسی نہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ عاصمہ کی ضد پر اگلے دن ہم عطا محمد کے گھر گئے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ہم گھر آئے۔ اگلے دن کالیا پہنچا ہی تھا کہ جمی کا فون آگیا۔ اسے ہم نے ثمر کی حفاظت کے لیے رکھا تھا۔ جب وہاں پہنچے تو جمی نے بتایا ثمر مر چکا ہے۔

اب آگے پڑھیں

ہم دونوں ہی سناٹے میں آگئے۔

”ابے...... لے......!“ کالیا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میری طرح اس کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو گیا۔ ”جمی...... کیا بک رہا ہے تو جمی؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں استاد!“ جمی بدستور چہرہ لٹکائے بولا۔

”دلل...... لیکن...... وہ...... کک...... کیسے مر گیا۔ اچھا بھلا ہم اسے یہاں چھوڑ کر گئے تھے تمہارے پاس......؟“

میرے منہ سے بھی اٹکتے ہوئے الفاظ برآمد ہوئے۔

”آپ لوگ اندر آجاؤ پہلے......“ جمی نے یہ کہتے ہوئے ہمیں راستہ دیا۔ میں اور کالیا گم صم سی کیفیات تلے اندر آگئے۔

”کدھر ہے وہ؟“ کالیا نے لاؤنج میں آتے ہی ادھر ادھر دیکھا۔ حالانکہ میری طرح وہ بھی جانتا تھا کہ ثمر کو کمرے میں مقید رکھا گیا تھا۔ میں نے کالیا کو آج پہلی بار اس قدر حواس باختہ دیکھا تھا۔ اگرچہ خود میری بھی یہی حالت تھی۔

”اس کمرے میں۔“ جمی نے اسی کمرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ کالیا تیر کی طرح اسی طرف بڑھا۔

ہم مذکورہ کمرے میں داخل ہوئے اور ٹھٹک گئے۔ کمرے کے ننگے فرش پر ثمر کا بے سدھ وجود آڑا ترچھا پڑا تھا۔ میں اور کالیا ہونقوں کی طرح منہ کھولے اسے دیکھنے لگے۔ اس کے پہلو سے خون بہہ بہہ کر فرش میں سرخ تالاب بنا ہوا تھا۔

”ابے لے......! اسے تو کسی نے گولی ماری ہے۔“ کالیا کے منہ سے نکلا۔ ”کس نے اسے گولی ماری ہے؟“

”میں نے......“ جمی نے سر جھکا کر کہا اور کالیا کا ایک دم ہی سیدھا ہاتھ حرکت میں آیا اور کمرے کی دم بہ خودی فضا میں چٹاخ کی زوردار آواز ابھری۔

”ابے یہ کیا غضب کر دیا تو نے...... جمی! ذلیل آدمی! جانتا ہے تو نے ہمیں کتنی بڑی مشکل میں ڈال دیا۔“ کالیا اس پر پھٹ پڑا۔ اس کا تھپڑ جمی کے گال پر اس زور سے پڑا تھا کہ وہ سرخ ہوگیا تھا لیکن جمی چند قدم لڑکھڑا کر اسی طرح نادم سا سر جھکائے کھڑا رہا۔

”دلل...... لیکن تم نے اسے گولی کیوں ماری؟“

”اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔“ جمی نے لٹکے ہوئے منہ سے جواب دیا اور اپنا متورم گال ایک ہاتھ سے سہلانے لگا۔

”فرار ہونے کی کوشش کی تھی؟“ کالیا نے دہرایا۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا جمی کی بات پر۔

”یہ تو بندھا ہوا تھا۔ فرار ہونے کی کیسے کوشش کی تھی بھلا اس نے۔“ کالیا کے ساتھ میرے سوالوں کا سلسلہ بھی جاری رہا لیکن دوسرے ہی لمحے جانے کیا ہوا کہ میرا جی الٹ گیا۔ دل مالش کرنے لگا۔ ثمر کو خون کے تالاب میں دیکھ کر مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی تھی۔ مجھے چکر سا آگیا۔ کمرے میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ حالانکہ میں پہلے بھی کئی بار ایسے حالات سے گزر چکا تھا لیکن جب کسی بڑی پریشانی اور تشویش کے باعث ایسا منظر کوئی دیکھے تو اس کی یہی حالت ہوتی ہے، جو میری ہوئی تھی۔

میں لڑکھڑاتے قدموں سے پلٹا، میں کمرے سے نکل جانا چاہتا تھا، اسی وقت مجھے قے ہوگئی۔ کالیا نے ہی مجھے سنبھالا تھا۔

ہم لاؤنج میں آگئے۔ کالیا نے جمی کو پانی لانے کا کہا اور مجھے واش روم لے گیا۔ وہاں میں نے اپنے چہرے پر پانی کے

چھینٹے مارے اور اس کے بعد کالیا مجھے اسی طرح سہارے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں لے آیا۔

"چھوڑ یار میں ٹھیک ہوں۔" میں نے بیڈ پر گرتے ہوئے اس سے کہا۔ کالیا سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں جمی پانی کا گلاس لے آیا۔ میں نے تھوڑا پانی پیا اور آدھا بچا گلاس واپس جمی کو تھما دیا۔

میرا دل زور زور سے دھک...... کر رہا تھا اور سانسیں یوں پھول رہی تھیں جیسے میں کئی میل کا سفر پیدل طے کر کے آرہا ہوں۔

"یہ اچھا نہیں ہوا کالیا! بالکل بھی اچھا نہیں ہوا۔" میں نے اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے کالیا سے کہا۔

جمی بھی وہیں ایک کرسی پر منہ لٹکائے بیٹھ گیا تھا۔ باقی صراحت سے آگاہ کرتے ہوئے اس نے یہی بتایا تھا کہ ثمیر نے پہلے کچھ کھانے پینے کے لیے ہاتھ کھلوائے تھے اس کے بعد اس نے رفع حاجت کے لیے پاؤں بھی کھلوائے۔

جمی اپنے کام سے اور اپنی اس اہم ذمہ داری سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ پہلے بھی یہی کچھ کرتا رہا تھا ثمیر کے ساتھ لیکن اس کا خیال تھا کہ دوبارہ اس کے ہاتھ باندھتے وقت اس سے کوئی چوک ہوگئی تھی اور رسی ڈھیلی رہ گئی تھی۔ جسے ثمیر نے بعد میں تھوڑی سی کوشش سے کھول لی اور موقع پا کر وہ جمی پر اچانک حملہ کر کے فرار اختیار کرنے لگا تو مجبوراً جمی نے گولی داغ دی۔ جو ثمیر کے پہلو میں لگی۔ وہ گر پڑا جمی اسے سنبھالنے کو لپکا۔

جمی نے بتایا کہ اس نے اس کا خون روکنے کی کوشش کرنا چاہی تھی اور وہ چند منٹوں کے لیے زندہ بھی رہا تھا مگر اس کے بعد دم توڑ گیا۔

"ابے اس کی ٹانگ پر گولی چلانا تھی...... اوپر اور سیدھا فائر کیوں کیا؟ اس اناڑی پن کی تجھ سے توقع مجھے نہ تھی جمی!" کالیا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں اسی بات پر تو شرمندہ ہوں استاد! بلکہ میں تو خود حیران ہوں۔"

"ابے تیری حیرانی سے یہ کیا زندہ ہو جائے گا؟ تف ہے تجھ پر......" کالیا جھلا کر بولا۔

"کالیا جو بھی ہوا بہت برا ہوا۔" میں نے درمیان میں کہا۔ "ہمیں سب سے پہلے اب ثمیر کی لاش کو ٹھکانے لگانا ہوگا۔ شاہ میر نے اپنے گماشتے اس کی تلاش میں چھوڑ رکھے ہیں۔ ایسا نہ ہو وہ یہاں پہنچ کر یہ حقیقت جان لیں اور پھر آگے کا تصور کر کے ہی مجھے ہول آرہا تھا۔

درحقیقت اس نازک صورت حال پر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ خود کالیا جیسا جغادری آدمی بھی گھبرایا ہوا بوکھلایا ہوا نظر آرہا تھا۔

"ابے لے...... جگری! لاش کو تو ٹھکانے لگانا ہی پڑے گا مگر اب یہ بتا کہ شاہ میر نے ہم سے رابطہ کیا تو اسے کیا جواب دیں گے؟" کالیا میری طرف دیکھ کر فکر مندی سے بولا۔ "اور...... اگر...... رابطہ کرنے پر اس نے ہم سے اس کے بیٹے سے بات کروانے کا کہا تو؟"

اس کی بات پر میرے سینے میں ایک ہول سا اٹھا اور میں بولا۔ "اسے ابھی جواب دینا کوئی ضروری نہیں۔" میں نے اپنا ہی دماغ استعمال کرتے ہوئے کچھ سوچ کر کہا۔ "یہ ضروری نہیں کہ وہ ہم سے دوبارہ رابطہ بھی کرے اور اگر رابطہ کر بھی لیتا ہے تو ہم اسے کیا یہ بتائیں گے کہ اس کا بیٹا ہماری کسٹڈی میں مارا گیا ہے؟"

"مگر وہ تو بضد ہو سکتا ہے ناں کہ اس کی بیٹے سے بات کرواؤ؟"

"ہم اسے ٹالنے کے انداز میں کہہ دیں گے کہ اس معاہدے کی آڑ میں ہم سے دھوکا کیا اور اپنے آدمیوں کے ذریعے ہم پر حملہ کروا دیا۔"

"فرحانہ تو گئی جگری!" کالیا نے سر پکڑ لیا۔ "رانا بشیر ہم پر چڑھ دوڑے گا۔ اس وقت وہ ہمارے سارے رازوں سے واقف ہے۔ ان حالات میں اس کی دوستی سے دشمنی بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔"

"استاد! میرا خیال ہے اس وقت سب سے پہلے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا سوچ لو۔" ہمیں آپس میں الجھتا دیکھ کر جمی درمیان میں بول پڑا۔

"اگر خدانخواستہ پولیس نے یہاں چھاپہ مارا تو ہم گئے کام سے۔"

"ابے! عقل کے گھوڑے! میرا تو جی کرتا ہے سب سے پہلے تجھے گولی مار کے ہر قسم کے کاموں سے آزاد کر کے اوپر رخصت کر دوں۔"

کالیا غصے سے دانت پیس کر اپنے ساتھی سے بولا۔ "سارا بیڑہ غرق تیرا ہی تو کروایا ہوا ہے۔"

اس کی ڈپٹ پر جمی دبک سا گیا۔ میں نے کالیا سے سنجیدگی سے کہا۔ "کالیا! میرا خیال ہے کہ جمی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں پہلے اس لاش سے چھٹکارا پالینا چاہیے، اس کے بعد ہی آرام سے بیٹھ کر اس گمبھیر مسئلے پر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کر لیتے ہیں۔"

کالیا نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا پھر جمی سے بولا۔ "فوراً ایک بوری کا بندوبست کر، اس کے بعد ہم دونوں مل کر یہ خون اور دیواریں اچھی طرح صاف کرتے ہیں تاکہ پولیس کو یہاں فنگر پرنٹ بھی کسی کو نہ مل سکیں۔ جلدی کر۔"

"یہ کام میں بھی تم دونوں کے ساتھ انجام دوں گا۔ میں ثمیر کی یہاں سے ہر طرح کی نشانیاں مٹانا ہوں گی لیکن پہلے لاش کو ٹھکانے لگانا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ابے تو گھوڑے کی طرح منہ نکال کر اب میری طرف کیا دیکھ رہا ہے؟" کالیا نے ہونق سا چہرہ لیے کھڑے جمی کے پیچھے دولتی سی جھاڑ ڈالی۔ "کہا ناں تجھے، جا کر ایک بوری کا بندوبست کر۔" وہ بری طرح پریشان اور جھلایا ہوا تھا۔

"استاد! بوری تو چھت پر پڑی ہے، یہ کون سا مشکل کام ہے، ابھی لایا۔" جمی کالیا کے تیور بگڑتے دیکھ کر جلدی سے بولا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

کالیا سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ "کالیا! تو بہت ٹینس ہو رہا ہے۔ آرام سے بیٹھ رہ میں اور جمی۔"

"ابے لے جگری! میں کیسے آرام سے بیٹھ جاؤں؟ میرا تو بعد کے حالات کے تصور سے ہی دل میں ہول اٹھ رہا ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے یار تجھے کالیا؟" میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تو تو خود مجھے ایسے حالات میں تسلیاں اور دلاسے دیا کرتا تھا۔ اب تو خود اس قدر اپنا دل چھوٹا کیے ہوئے ہے؟"

"ادھر بیٹھ...... آ...... لگتا ہے تجھے ابھی ان حالات کا اندازہ نہیں ہو پایا ہے جہاں تک میرا دماغ پہنچا ہوا ہے۔" اس نے کہا تو میں اس کے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

وہ بولا۔ "دیکھ جگری! شاہ میر نے پولیس کو اور خاص کر اس راشی افسر انسپکٹر رجب دین کو ساری حقیقت بتا دی ہے۔ بے شک پولیس کے پاس کوئی ثبوت نہیں، لیکن تم تھانے میں ثمیر کے اغوا کے حوالے سے پولیس کی ہسٹری شیٹ میں آچکے ہو۔ یہ بات یہاں تک رہتی تو اب آگے سنو!" وہ ذرا سانس لینے کو رکا پھر آگے بولا۔ "رانا بشیر کو جب یہ پتا چلے گا تو وہ اپنی بیٹی فرحانہ کی زندگی کی طرف سے بالکل ہی مایوس ہو کر رہ جائے گا اور سارا نزلہ ہم پر گرائے گا۔ چوں کہ اسے معلوم ہے کہ ثمیر کو ہم نے ہی یرغمال بنایا تھا، پولیس بالخصوص اس قسائی مارکہ رجب دین جو پہلے ہی اپنے بہنوئی اور سالے دلاور خان کی وجہ سے تجھ پر بری طرح خار کھائے بیٹھا ہے، رانا بشیر کی ہمارے خلاف گواہی کافی ہوگی۔ ضمانت تو ویسے ہی تیری کمزور ہے، پھر آئندہ بھی ضمانت ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر رہ جائیں گے۔ تو گیا جیل میں، شاہ میر، رانا بشیر کو بیٹی کے حوالے سے بلیک میل کرے گا کہ وہ گواہی دے کر جو ظاہر ہے سچی ہوگی، تجھے پھانسی کے تختے پر پہنچا کر دم لے، چاہے بعد میں اس کی بیٹی کو شاہ میر زندہ چھوڑے یا نہیں لیکن تو تو گیا ناں! سمجھا اب بھی میری بات یا نہیں...... جگری؟"

پیش آیند حالات کا تجزیہ کرتے کرتے کالیا کی جوش سے سانس پھول گئی۔ خود میں بھی پریشان تو تھا ہی مگر کالیا کا آئندہ کے ان حالات کا خوفناک نقشہ کھینچ کر میری تفکیر اور تشویش سوا ہونے لگی۔ تاہم پھر بھی میں نے کالیا نے کہا۔

"کالیا! جو باتیں تو کہہ رہا ہے، میں اسے جھٹلا تو نہیں سکتا مگر خدا کے لیے اس طرح دل تو مت ہار تو ہمت ہار دے گا تو میں تو پھر گیا کام سے۔"

"ابے لے......" اپنے مخصوص انداز میں یہ کہتے ہوئے کالیا نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ دیا اور بے تاثر سی مسکراہٹ سے بولا۔

"یار! مجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے۔ تیری فکر کھا رہی ہے مجھے۔ شاید اسی لیے میرا دل بوجھل سا ہونے لگا تھا۔ اللہ مالک ہے۔ ہماری نیت اللہ جانتا تھا کہ ہم ثمیر کو ہلاک نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ اس کے بدلے میں فرحانہ کو اس درندہ صفت آدمی سے آزاد کرانا ہمارا مقصد تھا۔ یہ غلطی بھی ثمیر ہی کی تھی کہ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ خیر...... کچھ سوچ لیں گے اس مسئلے کا حل، بیٹھ کر۔"

میں نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ کالیا کا اعتماد بحال ہونے لگا۔

اسے معمول پر آتے دیکھ کر میں نے کمزور سے لہجے میں ایک اُمید افزاء خیال کے اظہار میں کالیا سے کہا۔

"کالیا! ہم رانا بشیر کے متعلق جیسا سوچ رہے ہیں ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو، میرا مطلب ہے، یہ صرف ہمارا خدشہ ہو کہ وہ ثمیر کی موت کا سن کر ہمارا دشمن ہو جائے؟"

"کیوں؟" کالیا نے مجھے گھورا۔ "تیرے دماغ میں یہ

خوش فہمی کیونکر سمائی؟"

"اس کی وجہ ہے۔" میں نے کہا۔ "دیکھ کالیا! رانا بشیر کا مفاد یوں بھی ہمارے ساتھ نتھی ہے۔ وہ شاہ میر سے بہر صورت انتقام تو لے گا ہی...... اس کے لیے اس کی ہم سے دشمنی مہنگی پڑے گی۔"

"کیا ہو گیا ہے جگری! تجھے......" کالیا میری بات کاٹ کر بولا۔ "جب معاملہ اولاد کا آتا ہے ناں، تو انسان جذبات میں اندھا ہو جاتا ہے۔ ثمیر کی موت کی صورت میں... ردعمل کے طور پر شاہ میر اپنی خوفناک دھمکی پر عمل کر ڈالے گا اور رانا بشیر اپنی بیٹی پر ہونے والے ظلم پر سب سے پہلے ہمیں ہی ذمہ دار ٹھہرائے گا۔ ٹھیک ہے، تیری بات بھی ممکن ہے ایسا ہو ہی نہیں، اسی لیے ابھی یہ سب باتیں چھوڑ بعد میں کچھ سوچتے ہیں۔" اس کی بات پر میں اپنے حلق سے ایک گہری ہنکاری خارج کر کے رہ گیا۔

جمی چھت پر بنے اسٹور سے کینوس کی ایک بوری لے آیا تھا۔ ہم نے پہلے پانی وغیرہ پیا، جمی نے چائے بنائی۔ آدھے گھنٹے بعد اعصاب پر طاری موجود صورت حال کی کشا کشی اتری تو ہم تینوں اسی کمرے میں آ گئے جہاں ثمیر کی لاش، خون کی چھپڑی میں پڑی ہوئی تھی۔

ثمیر کی جتنی بھی... چیزیں تھیں وہ سب اس کے لباس کی جیبوں میں ٹھونس دی گئیں اس کے بعد اس کی لاش کو ایک چادر میں لپیٹا۔ پھر پیروں کی طرف سے ڈوری باندھ دی۔ یہی کچھ اس کے سر والی جگہ کے ساتھ کیا۔ ثمیر کی لاش اب پوری طرح ایک خود ساختہ سے کفن میں لپیٹ دی گئی تھی۔

کمرے میں اس کی لاش اس طرح پڑے دیکھ کر میرے دل میں ایک بار پھر ہول سا اٹھنے لگا۔ حقیقت یہی تھی کہ مجھے ثمیر کی اس طرح موت کا بے حد دکھ تھا۔ میں اسے بھلا کب جان سے مارنا چاہتا تھا۔ میں تو بدلے کے طور پر اس کی ٹانگ پر بغدا بھی نہیں مار سکا تھا اس لیے نہیں کہ میں شاہ میر سے ڈرتا تھا، ہرگز نہیں۔ بس، میں ایسی خونی فطرت کا آدمی نہیں تھا، اگر میرے دشمن مجھے اس راستے پر چلانے پر مجبور کر رہے تھے تو دوسری بات تھی۔

بہرکیف...... لاش کو باندھنے کے بعد ہم نے اسے بوری میں ڈالا اور اس کا بھی سرا اوپر سے ایک مضبوط ڈوری سے اچھی طرح باندھ دیا۔

رات تک کے انتظار میں ہم نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اس وقت کافی دن نکل آیا تھا۔

جمی اور کالیا کا یہی خیال تھا کہ رات کا انتظار کیا جائے اور تب تک باقی کے حالات کے بارے میں کوئی ٹھوس لائحہ عمل تیار کر لیا جائے، لیکن مجھے اس سے اختلاف تھا۔

میں جلد از جلد اس لاش سے چھٹکارا پا لینا چاہتا تھا کیونکہ شاہ میر کے تینوں (اب دو) ہرکارے ثمیر کی تلاش اور ہمارے خلاف حرکت میں آ چکے تھے۔

میں راکا کی سیماب صفت سفاک فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ ایک چھلاوا تھا، نچلا بیٹھنے والا انسان تھا ہی نہیں وہ...... کل رات والے واقع کی وجہ سے ممکن ہے وہ کچھ دیر کے لیے محبوس ہو کے بیٹھ رہنے پر مجبور ہو گیا ہو مگر فوراً وہ دوبارہ حرکت میں آنے والا تھا پھر انسپکٹر رجب دین بھی تھا۔ جو پہلے ہی مجھ پر دانت کچکچائے تیار بیٹھا تھا۔

چنانچہ میں نے کالیا کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"کالیا! اس کام میں بالکل بھی دیر نہیں ہونی چاہیے۔ گاڑی موجود ہے، ہم اسی وقت لاش کار کی ڈکی میں ڈال کر ہاکس بے، یا دور کسی ساحل پر جا کر لاش کو ایک بھاری پتھر سے باندھ کر سمندر میں پھینک آتے ہیں۔"

"اگر پولیس نے راستے میں روک کر کار کی چیکنگ کر لی تو؟" کالیا نے سوال اٹھایا۔

"تو کیا رات کو پولیس ہماری کار کو چیک نہیں کر سکتی؟ بلکہ رات کو اس بات کا زیادہ امکان ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ رسک تو ہمیں لینا ہی پڑے گا کالیا!"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر......" کہتے کہتے وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔

"ٹھیک ہے یار! پر تو ادھر ہی بیٹھ، یہ کام میں اور جمی نمٹا آتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے فوراً انکار کرتے ہوئے اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔ "جمی ادھر رہے گا اور میں تمہارے ساتھ چلوں گا، اس میں مزید بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لاش سے جان چھڑائیں گے تو شاید ہمارے دل و دماغ کو بھی کچھ سکون پہنچے گا اور ہم آئندہ کے بارے میں بھی کچھ غور کر سکیں۔"

بالآخر یہی طے پایا، لیکن جمی کو بھی ساتھ لے لیا گیا تھا۔ مکان کو تالا لگا دیا گیا۔

اٹھسٹھ کے ماڈل کی سلور کلر ٹویوٹا ڈاٹسن کار میں ثمیر کی بوری بند لاش ڈال دی گئی۔ کار مکان کے صحن میں ہی کھڑی تھی۔ پاس ہی لوہے کا جنگلا نما گیٹ تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد کار مکان سے نکل کر سڑک پر فرانٹے بھرنے لگی۔

☆......☆

کار کی ڈرائیونگ سیٹ کالیا نے سنبھالی ہوئی تھی۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ جمی عقبی سیٹ پر جما بیٹھا تھا۔

ہمارا ارادہ ہاکس بے یا سی ویو کے کسی ویران ساحلی گوشے میں لاش کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ آخر فیصلہ کیا گیا کہ اسے ہاکس بے کے کسی دور دراز اور ویران ساحلی مقام تک لے جا کر کسی بھاری پتھر سے باندھ کر لاش کو تہہ آب کر دیا جائے۔

ہاکس بے تک کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طے ہوا اور وہاں سے مزید ایک گھنٹا ایسا مقام دیکھنے میں لگا جہاں گرد و پیش میں سناٹا ہو کر کراچی کے ساحل اس قدر دراز اور بارونق ہونے لگے تھے کہ کہیں نہ کہیں کوئی اوپن ایئر ہوٹل، خوانچہ فروش، ہٹس اور تفریحی یا پکنک کے لیے آئے ہوئے لوگوں کا زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت جمگھٹا لگا ہی رہتا تھا۔

ہم اِدھر اُدھر ساحل کے قریب بنی سڑک پر کار دوڑاتے رہے۔ چور اپنے سائے سے بھی محتاط ہوتا ہے، یہی ہمارا حال تھا۔ جہاں کہیں بھی ایک ذی نفس نظر آ جاتا ہم وہاں سے کار آگے بھگا لے جاتے۔

یوں اس ویرانے میں پولیس پیٹرول چیکنگ کا بھی خطرہ بڑھ جاتا تھا۔ اب تو کراچی کے حالات کے مطابق شہر کے گنجان علاقوں میں بھی پولیس اور رینجرز گاڑیوں کو روک کر اس کی تلاشی لینا شروع کر دیتی تھی۔ یہ تو پھر ویران علاقے تھے۔

"ابے لے......" اچانک کالیا کے منہ سے نکلا۔ میں ٹھٹکا۔ آج کل اس کا یہ تکیہ کلام مجھے کچھ زیادہ ہی چونکا دیا کرتا تھا۔

"کیا ہوا......؟"

"پولیس کی ایک موبائل آ رہی ہے ہمارے پیچھے۔" کالیا نے بیک ویو مرر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بے اختیار میں نے ہی نہیں عقبی سیٹ پر بیٹھے جمی نے بھی گردن موڑ کر بیک اسکرین سے دیکھا۔

پولیس کی ایک موبائل دوڑی چلی آ رہی تھی۔

"رفتار بڑھاؤ استاد! ورنہ ہم گئے۔" جمی کی لرزتی آواز ابھری۔

کالیا ڈبل ٹاپ گیئر ڈالنے ہی والا تھا کہ میں نے فوراً کہا۔

"ہرگز نہیں...... اب یہ بے وقوفی مت کرنا کالیا! رفتار یہی رہنے دو۔ ضروری نہیں کہ پولیس ہمارے ہی پیچھے آ رہی ہو، لیکن ہماری کار کی رفتار بڑھتے دیکھ کر انہیں شبہ ہو جائے گا۔"

"سوچ لے جگری! کام رسکی ہے۔" کالیا بولا۔ "اگر پولیس نے روک لیا تو کار کی تلاشی ضرور لیں گے۔"

"دیکھا جائے گا۔ مگر خود سے آ بیل مجھے مار...... والا کام کیوں کریں۔ رفتار یہی رہنے دو۔" میں نے کہا۔

کار اسی رفتار سے دوڑتی رہی۔ میں بھی اب بیک ویو مرر میں پیچھے آتی پولیس موبائل کو تکے جا رہا تھا۔ کہیں کہیں سڑک ناپختہ ہونے کے باعث فضا میں گرد و غبار کے مرغولے بھی اٹھ رہے تھے۔

پولیس موبائل لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ ہم سب کے چہروں پہ سناٹوں کا ڈیرا تھا۔ موبائل قریب آئی اور میں نے کالیا کو مزید تھوڑی رفتار آہستہ کرنے کا کہا۔ مجھے ایک تسلی ہوئی تھی کہ پیچھے آتی پولیس موبائل نے ہمیں "ڈپر" نہیں دیا تھا اور نہ ہی ہوٹر بجایا تھا، جس کا مطلب یہی ہوتا کہ وہ ہمیں روکنا چاہ رہی ہے۔

پولیس کی موبائل ہمارے قریب سے گزرتی چلی گئی اور آگے نکل گئی۔ ہم نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔

"ابے لے...... جگری! مان گئے تجھے۔" کالیا کے منہ سے نکلا۔ "اگر ہم کار دوڑاتے تو جاتی مصیبت کو روک لیتے۔"

"کالیا...... ! کار کی رفتار مزید آہستہ کر لو۔" میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ میری نظریں بدستور ونڈ اسکرین سے پار دور جاتی پولیس موبائل پر جمی ہوئی تھیں۔

آگے ایک موڑ آ رہا تھا۔ موبائل کی رفتار دھیمی پڑی اور موڑ کاٹ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"کار روک لو کالیا!" میں نے اچانک کہا اور کالیا نے بریک لگا دی۔ کار ایک خفیف سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ ہلکے سے گرد و غبار کے مرغولے نے ہمیں نرغے میں لیا اور پھر چھٹتا چلا گیا۔

ہمارے دائیں جانب بنجر علاقہ تھا اور بائیں طرف ساحل۔

"اب کیا کرنا ہے؟" کالیا نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"پولیس کی موبائل آگے نکل جانے دو ذرا......" میں نے کہا اور گردن موڑ کر جمی سے بولا۔

"جمی! تم نیچے اترو اور ساحل پر چلے جاؤ اور اچھی طرح جائزہ لو کہ یہ مقام ہمارے لیے کس قدر مناسب ہوسکتا ہے؟"

"ٹھہرو! میں خود جا کر جائزہ لیتا ہوں۔" کالیا نے کہا اور کار کے انجن کا دروازہ بند کرکے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا ساحل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ ہم گردن موڑے کھڑکی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ ہماری جانیں ہنوز جیسے سولی پر اٹکی ہوئی تھیں۔ ہماری کوشش یہی تھی کہ جلد سے جلد لاش سے پیچھا چھڑالیں۔

کالیا اب ساحل پر گشت کرتا ہوا ہماری نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا۔ اسے گئے کافی دیر ہوگئی۔ میری بے چینی سوا ہونے لگی تھی۔ جمی بھی پیچھے بیٹھا خاصا متفکر نظر آرہا تھا۔

اچانک میں اچھل پڑا۔ یہ وقت ہی ایسا تھا۔ میرے سیل کی بیل بجی تھی۔ میں نے چونک کر سیل نکالا، یہ کالیا کی کال تھی۔

"جگری! اسی سڑک سے کار آگے لے جاؤ، جدھر سڑک مڑ رہی ہے، اس طرف موڑ کاٹتے ہی ایک کچا ڈھلانی راستہ ساحل کی طرف اتر رہا ہے، میں وہیں کھڑا ہوں۔ ادھر پتھریلے ٹیلے نظر آئیں گے۔ وہاں کار روک دینا۔ موقع اور جگہ شاندار ہے۔ جلدی آجاؤ۔" کالیا نے کہا اور میں نے فوراً اسے اثباتی جواب دینے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

کار اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھادی۔ موڑ قریب آرہا تھا۔ میں نے رفتار ذرا آہستہ کرلی اور پھر جیسے ہی میں نے موڑ کاٹا، مجھے یک دم اپنا پاؤں بریک پیڈل پر رکھنا پڑ گیا۔ کار کے پہیے ہلکے سے چرچرائے کیونکہ موڑ کاٹتے وقت کار کی رفتار آہستہ ہی تھی۔

بریک مارنے کی وجہ وہ پولیس موبائل تھی جو ذرا ہی فاصلے سے سڑک کے کنارے کھڑی تھی اور چار پانچ پولیس اہلکار باہر اترے کھڑے نظر آرہے تھے۔ حالانکہ بہ ظاہر میرے بریک لگانے کی کوئی وجہ نہیں تھی لیکن شاید یہ میرے اندر کا "چور" خوف تھا کہ پولیس کو دیکھ کر مجھ سے یہ غیر ارادی حرکت سرزد ہوگئی تھی۔

اسی وقت سڑک پر کھڑے پولیس اہلکاروں میں سے ایک دونے ہاتھ کھڑے کرکے مجھے کار روکنے کا اشارہ کیا۔ میرا دل پہلے ہی انہیں دیکھ کے اچھل کر حلق میں آن اٹکا تھا۔

اب جو انہیں اشارہ کرتے پایا تو میرا چہرہ دھواں دھواں سا ہونے لگا۔

مجھے اس کی بالکل توقع نہ تھی کہ موڑ کاٹتے ہی اچانک پولیس سے سامنا ہوجائے گا۔ یہ مجھے وہی موبائل لگی تھی جس نے کچھ دیر پہلے ہمیں کراس کیا تھا۔ یہ پھر شاید کسی خرابی یا دوسری کوئی وجہ سے یہ موڑ کاٹتے ہی رک گئی تھی۔ جبکہ ہم یہی سمجھے تھے کہ موڑ کاٹتے ہی پولیس کافی دور جاچکی ہوگی۔

"پھنس گئے استاد! کار دوڑا دو......" پچھلی سیٹ پر بیٹھے جمی نے ممناتی ہوئی سی آواز میں مجھ سے کہا۔ مجھے اسے جواب دینے کا کہاں ہوش تھا۔ میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔

میں نے کار آگے بڑھائی اور پھر آہستہ آہستہ ان کے قریب لے جا کر روک دی۔

"کہاں جارہے ہو تم لوگ؟" ان میں سے ایک نے کھڑکی پر جھک کر مجھ سے دریافت کیا اور ساتھ ہی عقبی سیٹ پر بیٹھے جمی کی طرف بھی دیکھا۔

"بس! ایسے ہی تفریح کررہے تھے، کیا کوئی خرابی ہوگئی ہے جناب؟" میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے جبراً مسکرا کر کہا۔

میرے سینے میں دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا جیسے ابھی پنجرہ توڑ کے باہر آپڑے گا۔

"اچھی بات ہے۔" اہلکار خلاف توقع خوش اخلاقی سے بولا۔ مگر ابتدا میں اس کے لہجے میں مجھے روایتی رعب ضرور جھلکتا محسوس ہوا تھا لیکن پھر شاید میری آخرالذکر بات درست ثابت ہوئی تھی، اس بناء پر وہ کچھ مسکرایا تھا۔

"تمہارا اندازہ درست ہے، ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ ہماری موبائل خراب ہوگئی ہے۔ خرابی ایسی ہے کہ اسے مکینک کے سوا کوئی دور نہیں کرسکتا اسی لیے تمہیں زحمت تو ہوگی مگر اچھے شہری کا ثبوت دیتے ہوئے ہماری گاڑی کو ذرا "ٹوچین" (گاڑی کے پیچھے گاڑی باندھ کر کھینچنا) کرکے ذرا آگے تک چھوڑ دو" ایک پولیس اہلکار نے کہا۔

اس کی بات سن کر میں نے بے اختیار اندر ہی اندر سکون کی سانس لی تھی مگر خطرہ ٹلا نہیں تھا اور لٹکتی تلوار بن کر کسی وقت بھی گردن پر پڑسکتا تھا، ایسے میں پولیس کو انکار کرنا بھی مناسب نہ تھا۔ انکار کرتا تو وہ کوئی مسئلے والی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کرتے، کالیا میرا منتظر تھا۔

اس نے شاید لاش کو ٹھکانے لگانے کا کوئی قریبی محفوظ

تلاش لیا تھا، اسی لیے ہمارے پاس آنے کی بجائے اس وہیں کھڑے ہو کر مجھے فون کھڑکا دیا تھا۔ میں اب اسے بتاتا کہ یہاں یہ گھمبیر صورت حال ہوگئی ہے، وہ تو مزید پریشان ہوجاتا۔

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا۔ میں اسے ایس ایم ایس تو کرسکتا تھا۔

میرے ہاں کہنے کے بعد پولیس والے ہماری کار کے ساتھ اپنی موبائل کو "ٹوچین" کرچکے تھے۔

کار کی ڈگی میں لاش پڑی تھی اور میں پولیس والوں سے جلد از جلد چھٹکارا پانے کی فکر میں تھا۔ پولیس والوں کی مدد کرنے سے یہ فائدہ ہوسکتا تھا کہ کوئی ہماری کار کی تلاشی نہیں لے سکتا تھا۔

دو پولیس والے میری کار میں براجمان ہوگئے۔ ان میں ایک ایس آئی تھا۔ وہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ میں نے کار آگے بڑھائی اور مناسب رفتار پر رکھ کر میں ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ تھامے دوسرے ہاتھ سے جلدی جلدی کالیا کو میسج کرنے لگا۔

میسج "سینڈ" کرنے کے بعد میں نے یونہی دکھاوے کے لیے "فیک کال" کرڈالی۔

"ہاں! رضیہ! میں بات کررہا ہوں۔ مجھے تھوڑی دیر ہوجائے گی۔ میری کار خراب ہوگئی ہے، تم ایسا کرنا بچوں کو ٹیکسی میں لے جاؤ امی کے ہاں، کار ٹھیک ہوتے ہی میں بھی وہیں آجاؤں گا۔" اس کے بعد میں نے سیل فون جیب میں رکھ لیا۔

"لگتا ہے بیوی سے ڈرتے ہو۔" بڑی بڑی مونچھوں والے ایس آئی نے مسکرا کر کہا۔

"ہر شریف آدمی اپنی بیوی سے ڈرتا ہے جناب! اب گاڑی کی خرابی کا بہانہ بنانا تو ضروری تھا۔" میں نے بھی اس کو جواب دینا ضروری سمجھا۔ وہ ٹھٹھا مار کے ہنسا۔

"آپ کی گاڑی میں خرابی کیا ہوگئی تھی؟" میں نے بات سے بات نکالی تاکہ وہ عادتاً مجھ سے ہی کچھ پوچھنے نہ لگ جائے۔

"خرابی کا ہی تو نہیں پتا چل رہا ورنہ تو اپنا ڈرائیور الطاف حسین بھی کسی کاریگر سے کم نہیں تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"ہاں جی! یہ بات تو ہے۔" میں نے مختصراً کہا۔ سفر جاری رہا۔ جو نصف گھنٹے تک محیط رہا۔

میں دل ہی دل میں یہی دعائیں مانگ رہا تھا کہ خدا کرے کالیا کا فون نہ آجائے، نیز یہ کہ میرا میسج اس تک پہنچ گیا ہو اور وہ اسے پڑھ کر ساری صورت حال سمجھ گیا ہو۔ وہ ہوشیار آدمی تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ایسا نہیں کرے گا لیکن ایک بات میرے لیے ہنوز اچنبھے کا باعث بنی ہوئی تھی کہ کالیا نے میسج کا ابھی تک جواب کیوں نہیں دیا۔ کم از کم "اوکے" کا ہی ریپلائی کردیتا؟

اچانک میرا دل دھڑک گیا۔ میرے سیل کی بیل گنگنائی تھی۔ میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا۔ کوئی "ان نون" نمبر تھا۔ میں نے کال اٹینڈ کرنا، کم از کم اس وقت تو ضروری نہیں سمجھا، البتہ یونہی دکھاوے کے لیے اس کی رنگ بیل سائیلنٹ کرکے کان سے لگالیا اور "فیک" گفتگو کرنے لگا۔

"ہاں، رضیہ! کیا بات ہے؟ تم نے ٹیکسی کروالی......؟ او......اچھا ٹھیک ہے، میں مٹھائی یا فروٹ لیتا آؤں گا، تم بس بچوں کو لے کر سیدھا امی کے گھر پہنچ جاؤ، راستے میں کچھ لینے کے لیے اتر نا مت......" یہ کہہ کر میں نے فون دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

"بیگم کیا اپنے میکے جارہی ہے؟" ایس آئی نے پھر پوچھ لیا۔ شکر تھا کہ اس کی گفتگو کا موضوع ایک ہی رہا۔

"ہاں جناب!" میں نے کہا۔ "اب میں آپ کو چھوڑنے کے بعد سیدھا گاڑی وہیں بھگا لے جاؤں گا۔"

"ویسے کمال ہے۔ تمہاری بیگم کا میکے جانے کا پروگرام تھا اور تم یہاں دوستوں کے ساتھ تفریح کے لیے آئے ہوئے تھے؟" بالآخر کم بخت کی پیشہ وارانہ رگ پھڑک ہی اٹھی۔ میں نے بغیر کسی گھبراہٹ کے فوراً جواب میں کہا۔

"بس جناب! کیا بتاؤں، میں تو خود سسرال کے ہاں آنے جانے سے تنگ آیا ہوا ہوں۔ کوئی اچھا لگتا ہے، ہر دوسرے تیسرے روز جانا اسی لیے میں بیگم سے کہہ دیتا ہوں، جانا ہے تو خود چلی جایا کرے اور اپنی ماں سے مل آیا کرے۔"

"ہوں ں......" ایس آئی کے منہ سے نکلا۔ وہ شاید اپنے علاقے کا تھانہ انچارج تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ اس کی "ہوں ں......" مجھے عجیب سی لگی تھی۔

ہمیں اس مختصری عمارت کے قریب پہنچنے میں آدھے سے پون گھنٹا تو لگ ہی گیا تھا۔ تھانہ کیا تھا، بادی النظر میں کوئی چوکی ہی نظر آتی تھی۔ یہ لوگ کار سے نیچے اتر آئے۔ مجھ پر پھر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ میں دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ جلد از جلد یہ اپنی موبائل کو میری کار سے الگ کرلیں اور

میں یہاں سے فوراً رفو چکر ہو جاؤں۔

دفعتاً میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ وہ موچھیل سا ایس آئی بڑے غور سے میرے چہرے کی طرف گھور رہا تھا۔

''یہ اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے مجھے؟'' میرے دھک دھک کرتے سینے میں اچانک ہی یہ سوال ابھرا اور آنکڑے کی طرح گویا حلق میں اٹک گیا۔

''تمہاری کار کی ڈگی کھلی ہوئی ہے۔'' اچانک جیسے موچھیل انسپکٹر نے میری سماعتوں میں دھماکا کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون یکلخت منجمد ہو گیا ہو۔

''اوہو......اچھا؟'' میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی سعی چاہی اور گردن موڑے ہوئے کار کے عقبی حصے کی طرف قدم بڑھائے۔ موچھیل انسپکٹر وہیں کھڑا ہوا تھا اور میں نے دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا کہ اس کی تیز سی نظریں کار کی ڈگی پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

قریب پہنچ کر میں نے دیکھا۔ وہ واقعی تھوڑی سی کھل کر اونچی ہو گئی تھی۔ مجھے تشویش آمیز سی حیرت تو ضرور ہوئی تھی کہ یہ کم بخت کیسے کھل گئی؟

میں ایک لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر آگے بڑھا اور اس کی کھلی ہوئی چوڑی درز کو دیکھا۔ شکر تھا کہ اندر پڑی ہوئی لاش والی بوری کی جھلک نہیں دکھائی دیتی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے جسم کا وزن ڈال کر ڈگی بند کر دی۔

پیچھے مڑا تو موبائل کی زنجیر کھول دی گئی تھی۔ میں اب آزاد تھا۔ میں اسی موچھیل انسپکٹر کی طرف مڑا۔ جو ہنوز وہیں کھڑا تھا۔

''جناب! مجھے اب اجازت دیں۔''

''تمہاری بڑی مہربانی۔'' اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بولنے کا انداز اور لہجہ ایسا ہی تھا جیسے حکم چلا رہا ہو۔ ''چائے وائے نہیں پیو گے؟''

''نہیں جناب! شکریہ!'' میں نے جلدی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں اب چلوں گا، آپ کو تو پتا ہی ہے کہ مجھے کہاں پہنچنے کی جلدی ہے؟'' کہتے ہوئے میں دانستہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''سسرال......!'' وہ بھی مسکرایا۔ مگر اس کی مسکراہٹ سپاٹ تھی۔

''جی جناب!'' میں نے کہا۔

''تمہاری کار کی ڈگی پھر کھل گئی ہے۔'' موچھیل انسپکٹر نے دوبارہ کہا اور مجھے اس کے الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اپنے کانوں میں پڑتے محسوس ہوئے۔ میں پلٹا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ ڈگی دوبارہ تھوڑی سی کھل گئی تھی۔ معلوم نہیں قدرت کو کیا منظور تھا۔ ڈگی کیوں اس طرح بار بار کھل رہی تھی۔ ایک لمحے کو تو مجھے عجیب سا خوف بھی محسوس ہوا۔ خود کار اسپرنگ کی وجہ سے اس کا بونٹ اٹھ جا رہا تھا۔

''لگتا ہے اس کا لاک خراب ہو گیا ہے، ابھی ہمارا ڈرائیور دیکھ لیتا ہے۔'' اس موچھیل انسپکٹر نے کہا اور پھر کسی کو پکارا۔

''خدا بخش! ذرا آنا......اس ڈگی کو دیکھ، کیا خرابی ہو گئی ہے؟''

میری نبضیں دوڑنے لگیں، یوں لگا جیسے پوری کائنات گھوم رہی ہو۔ پیروں تلے زلزلہ آ گیا ہو۔ سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھماکے ہونے لگے۔ ایسا لگا جیسے اب تب میں غش کھا کے گر پڑوں گا۔ میرا حلق سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔

''نن......نہیں انسپکٹر صاحب! مجھے دیر ہو رہی ہے، میں راستے میں کسی مکینک کو دکھا دوں گا، شکریہ آپ کا' اچھا چلتا ہوں۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ قریب موبائل کے کھڑے چند اہلکاروں میں سے ایک ذرا موٹا سا آدمی انسپکٹر کے آواز دینے پر ادھر ہی آ رہا تھا۔ میں تب تک کار میں بیٹھ گیا۔ اس کا انجن میں نے اسٹارٹ ہی رہنے دیا تھا، مبادا دوبارہ اسٹارٹ ہونے میں تنگ نہ کرے۔ پرانے ماڈل کی جو کار تھی۔

ذرا ہی دیر بعد میں اپنے راستے پر تھا۔

''بال بال بچے یار جمی!'' میں نے سکون کی ایک سانس لیتے ہوئے پیچھے بیٹھے جمی سے کہا اور اسے ساری بات بتائی۔

''تمہاری ایسی اچانک حرکت اس موچھیل پولیس انسپکٹر کو شک میں مبتلا کر سکتی تھی۔'' جمی نے تبصرہ کیا۔

''تو اور کیا کرتا میں یار؟ وہاں سے جلدی بھاگنے کی پڑی ہوئی تھی مجھے۔ پتا نہیں اس کم بخت ڈگی میں کیا خرابی ہو گئی تھی کہ بار بار بند کرنے کے باوجود کھل جا رہی تھی۔'' میں نے جھلا کر کہا۔

''اس کا لاک خراب ہو گیا ہے شاید۔'' اس نے پیچھے گردن موڑ کر یونہی دیکھا۔ ''کار کی رفتار بڑھا دو، استاد ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔''

میں نے کار کی رفتار پہلے ہی بڑھا رکھی تھی۔ ایک ہاتھ سے موبائل نکال لیا۔ اسے سائلینٹ سے کال پر کیا، دیکھا تو ایک اور کال آئی ہوئی تھی۔ یہ پہلی والی کال کی طرح انون نمبر نہیں تھی۔ اس نمبر کے ساتھ ایک نام اسکرین پر ابھر رہا تھا۔ جسے دیکھ کر میں چونکا تھا۔

یہ کیماڑی کے ایک متعلقہ تھانے کے انچارج انسپکٹر دلشاد خاں کا تھا۔

''اسے کیا ہو گیا۔ یہ کیوں مجھے کال کر رہا ہے؟'' میں زیرِ لب بڑبڑایا۔

''کیا ہو گیا استاد؟ کس کی کال آ رہی ہے؟'' پیچھے بیٹھے جمی نے میری بڑبڑاہٹ سنتے ہی پوچھ لیا۔ ''استاد'' کہنا اس کی عادت تھی۔ وہ کالیا کو تو استاد کہتا ہی تھا اب مجھے بھی کہنے لگا تھا۔ شاید یہ کالیا کی صحبت کا اثر تھا کہ میں بھی کچھ ایسا ہی بننے لگا تھا۔ یوں بھی جمی میرے اب تک کے ''کارناموں'' سے واقف ہی تھا۔

''ہاں! کسی کی کال آئی ہوئی ہے جب میں نے اپنا فون سائلینٹ پر لگا رکھا تھا۔'' میں نے جلدی سے کہا اور کالیا کا نمبر ملانے لگا۔

''یار اسے دیکھ، پکڑ موبائل پتا نہیں کیوں، کال ہی نہیں ریسیو کر رہا ہے کالیا!''

کافی دیر تک رنگ جاتی رہی تو میں نے سیل فون ہاتھ پیچھے کر کے جمی کو تھما دیا۔

راستہ ناپختہ اور تنگ تھا پھر کچھ گھبراہٹ بھی طاری تھی، میں نے دونوں ہاتھوں سے اسٹیئرنگ تھامے رکھا تھا۔

''نجانے کیا بات ہے، استاد فون ہی نہیں اٹھا رہا ہے؟'' جمی نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

''اب اسے کیا ہو گیا ہے؟ مصیبت تو ہم پر آن پڑی تھی۔'' میں زچ ہو کے بڑبڑایا۔ ''میرے مسیج کا بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔''

''ارے استاد! کیا بات ہے فون ہی نہیں اٹھا رہے؟'' اچانک جمی کی آواز ابھری اور میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔ وہ کالیا سے بات کر رہا تھا۔

اس کے بعد اس نے جلدی جلدی کالیا کو سب بتا دیا۔ دورانِ گفتگو پتا چلا کہ کالیا کے سیل فون کی بیٹری کم ہو گئی تھی اور وہ بار بار آف ہو جا رہا تھا۔ اب اس نے ایک راستہ بتایا تھا جو ہم نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

دس منٹ کے اندر اندر ہی میں نے کار اس راستے پر موڑ کر قدرے نشیب میں اتار لی۔

سامنے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ آسمان پر دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ کالیا وہاں کھڑا نظر آ گیا۔ ہم تینوں کے علاوہ اور کوئی ذی نفس اطراف میں دور دور تک نظر نہیں آتا تھا۔

کار ایک جگہ روک کر میں اور جمی نیچے اتر آئے۔ کالیا نے ایک بڑے سے پتھر کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ جمی کو ہم نے گرد و پیش کی نگرانی میں لگایا جبکہ میں اور کالیا ڈگی سے ثمیر کی بوری بند لاش نکالنے لگے۔

لاش کو ڈنڈا ڈولی کی طرح اٹھا کر ہم اسے لیے سمندر کے نزدیک پہنچے۔ پتھر کالیا نے وہیں سرکا کے رکھا ہوا تھا۔ پھر پتھر کو لاش کے ساتھ باندھ کر ہم اسے لڑھکاتے ہوئے گہرے پانیوں تک لے گئے اور پھر تہہ آب کی تسلی کرنے کے بعد ہم پلٹے۔

جمی کار کے پاس کھڑا اطراف میں نظریں دوڑانے میں مصروف تھا۔ اس کے بعد ہم جلدی سے کار میں آ کر سوار ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ کالیا نے سنبھال لی۔ اس کے بعد ہم نے واپس صفورا والے مکان میں پہنچ کر ہی دم لیا۔

ہمارے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ اگرچہ لاش سے چھٹکارا پانے کا بوجھ ہم نے کامیابی سے اتار پھینکا تھا لیکن اب پیش آئند عفریت کا خوفناک منہ پھاڑے ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

ہم سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

میں نے کالیا سے ابھی انسپکٹر دلشاد کی کال کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اگرچہ مجھے اس کی جانب سے بھی ایک نئی فکر ذہن میں سوار ہونے لگی تھی۔

ہم موجودہ مسئلے کے بارے میں سوچتے رہے۔

بالآخر ہمیں اس کے سواء اور کوئی حل نظر نہ آیا کہ...... ثمیر کی موت کے بارے میں اس کے باپ شاہ میر کو تو مطلع کرنے کا ویسے بھی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جبکہ رانا بشیر سے بھی ابھی یہ بات راز ہی میں رکھی جائے اور تب تک خود سے فرحانہ کی رہائی کے سلسلے میں کوششیں تیز کر دی جائیں۔

ثمیر کی صورت میں ہمارے پاس شاہ میر کے خلاف ایک بڑا ہی اہم ترپ کا پتا ہاتھ لگا تھا، مگر بدقسمتی سے وہ جمی کی بے وقوفی کے باعث اب نہ صرف ضائع چلا گیا تھا بلکہ الٹا اس نے ہمیں ایک نئی اور بڑی گھمبیر قسم کی خطرناک مصیبت میں ڈال دیا تھا۔

اس بات پر کالیا نے ایک بار پھر طیش میں آ کر جمی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ وہ اس قدر پریشان اور غصے میں تھا کہ صاف نظر آتا تھا کہ وہ جمی پر برسنے کے ساتھ ساتھ اسے

دو ایک ہاتھ بھی دکھا دے گا۔ جبھی بے چارہ کونے میں بھیگی بلی کی طرح دبکا بیٹھا تھا۔ میں نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کالیا کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش چاہی تھی۔

"سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اب اس خبیث شاہ میر سے کس برتے پر بات کی جائے؟" کالیا بولا۔

"تو ہم کون سا اسے اس کے بیٹے کی حقیقت بتا رہے ہیں؟"

"پھر بھی یار جگری! کبھی تو کوئی ایسا موقع آئے گا ہی ناں، جب اس کے بیٹے کی اصل حقیقت کھلے گی کہ وہ اب اس دنیا میں ہی نہیں رہا۔"

"تب تک ہم کچھ کرلیں گے۔" میں نے کہا تو مجھے خود اپنے الفاظ کا کھوکھلا پن صاف عیاں ہوتا محسوس ہوا۔

"ہاہا....ہاہا....تب تک ہم کچھ کرلیں گے......"

اچانک کالیا نے قہقہہ لگا کر میرے الفاظ دہرائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کالیا نے اس طرح میری بات کا مذاق اڑایا تھا۔ اس سے کالیا کی ذہنی کیفیات کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔ میں گھبرا سا گیا۔

"یار کالیا! کیا ہوگیا ہے تجھے؟ یہ......یہ تو پاگلوں کی طرح کیوں قہقہے لگا رہا ہے؟"

"دل تو میرا رونے کو کر رہا ہے جگری! تیرے بہلاوے سن کر۔"

"میرا دماغ ان حالات سے زیادہ تیری حالت دیکھ دیکھ کر پریشان اور اس سے زیادہ حیرت زدہ ہو رہا ہے۔" میں نے قدرے خفگی سے کہا۔ کالیا ہنس پڑا اور خفیف سا ہو کے مجھ سے معذرتاً بولا۔

"یار جگری! معاف کرنا۔ تو صحیح کہہ رہا ہے، میں واقعی پریشان ہوں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ میں آج تک ایسے الجھے ہوئے، خوفناک اور گھمبیر حالات سے نہیں گزرا۔ ٹھیک ہے۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ شاہ میر کو فون کرو اور اسے دباؤ میں لانے کی کوشش کرو، جیسا کہ میں نے تمہیں کہا تھا۔"

میں نے اسی وقت اپنے سیل فون سے شاہ میر کے نمبر پر کال کی۔ یہ اس کا وہی نمبر تھا جو رانا بشیر کے سی ایل آئی پر آیا تھا۔ جب اس نے کسی اماراتی ریاست سے رانا بشیر کو کال کی تھی اور مجھے بھی۔

میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ کال دوسری جانب سے ریسیو کرلی گئی تھی اور شاہ میر کی آواز ابھری۔ اس نے فقط ہیلو کہا تھا۔

اسی دوران کالیا نے مجھے سیل فون کا اسپیکر "وا...ۓ" کرنے کا اشارہ دیا۔ میں نے ایسا ہی کیا تھا۔

میں بولا۔

"شاہ میر! اگر تمہاری یہی حرکتیں رہیں تو ایک ہی کا(م) ہوسکے گا، تمہارے کتے منہ کی کھاتے رہیں گے اور تمہارا (بیٹا) ہماری قید میں پڑا تڑپتا رہے گا، وہ ناز و نعم کا پلا ہوا ہے اور یہاں (و)ہ مچھروں اور گھٹن زدہ کمرے میں پڑا ہے۔"

دوسری جانب سے یکلخت خاموشی سی چھائی رہی اس کے بعد شاہ میر کی کھرکھراتی آواز ابھری۔

"معلوم نہیں تم کیا بکواس کیے جارہے ہو؟ کن لوگوں کو میں نے بھیجا ہے؟"

"اپنا لہجہ درست رکھو شاہ میر!" میں نے بھنا(تے) ہوئے لہجے میں اسے سرزنش کی۔

"راکا اور اس کے دو ساتھی شوپر اور ارغان یہاں (ک)ھاک چھاننے آئے ہیں؟"

میں نے دانستہ ان کے نام بھی لے دیے تھے۔ شاہ میر کو ایک دم چپ لگ گئی۔ وہ ضرور چونکا ہوگا کہ میں ان کے بھیجے ہوئے کتوں کے ناموں تک سے بھی واقف ہوگیا تھا۔

"تمہارا ایک کتا پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔ ان تینوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔"

بالآخر اس کی ایک گہری ہنکاری خارج کرنے کی آواز سنائی دی اور وہ اس بار صاف گوئی پر مجبور ہوتے ہوئے بولا۔

"دیکھو نعمان! تمہارے اور میرے درمیان میں جو جنگ چل رہی ہے۔ اس میں سب جائز ہے۔ اگر میں اپنے بیٹے ثمیر کو تمہاری گرفت سے آزاد کرانے کی کوئی خفیہ کوشش کرسکتا ہوں تو کیا تم فرحانہ کے سلسلے میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہو؟"

"فرحانہ جائے بھاڑ میں......" میں نے چالاکی سے بے پروایانہ انداز میں کہا۔ "مجھے صرف تم سے غرض ہے۔"

"اوہ......خاصے چالاک بن رہے ہو۔" اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "رانا بشیر ہی تو تم لوگوں کی پشت پناہی کر رہا ہے ورنہ تم میرے آگے اتنی دیر تک کہاں ٹکنے والے تھے اور میں اس حقیقت سے بھی واقف ہوں کہ جب تک رانا بشیر کی بیٹی فرحانہ میری گرفت میں رہے گی، رانا بشیر اور تمہارا مفاد مشترک رہے گا۔"

"تو پھر میرے اور رانا بشیر کے آپس کے گٹھ جوڑ میں تمہارا ہی ہاتھ ہوا۔ اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں؟"

"ایک ہی بات ہے۔" اس نے غیر متعلق بات کہی۔

"ایک بات نہیں ہے شاہ میر!" میں نے زہر خند لہجے (میں) کہا۔ "اس میں تمہارا اپنا ہی نقصان ہے۔" میں نے اس (ا)س کی اہمیت کے بارے میں اسے ... مقصد کی بات کہہ (دی)۔ "اس کی بیٹی کو اس کے حوالے کر دو، میرا اور رانا بشیر کا (مسئ)لہ ختم ہوجائے گا۔"

"ہرگز نہیں۔ تم دونوں کے گٹھ جوڑ میں ہی میرے بیٹے (کی) جان ہے۔" اس نے بڑی گہری بات کہی تھی، جسے سن (کر) اس بار مجھے چند ثانیے کے لیے چپ سی لگ گئی۔

اس نے وہی بات کی تھی جس کی تشویش مجھے اور (کال)یا کو باؤلا کیے ہوئے تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ شاہ میر کس قدر (عیا)ر، شاطر اور گرگِ باراں دیدہ آدمی تھا۔ اس کی بات غلط نہیں (تھ)ی۔ ثمیر ہماری کسٹڈی میں مرجاتا (جیسا کہ ہو چکا تھا) تو رانا (بشی)ر ہمارا دشمن بن جاتا اور گھر کا بھیدی ہوتے ہوئے ہماری لنکا (ڈھ)ا دیتا۔ ادھر راجا دلاور کا دوسرا روپ اور شاہ میر کا راتب خور (بن ک)ر جب دین پہلے ہی مجھ پر دانت نکوسے تیار بیٹھا تھا۔ شاہ میر کے حوالے سے قطع نظر بھی وہ میرا جانی دشمن بنا (ہو)ا تھا۔ وجہ اس کا دُہرے رشتے کا حامل راجا دلاور تھا جو بیک وقت اس کا سالا اور بہنوئی بھی لگتا تھا۔ جبکہ ثمیر کی موت رانا بشیر کو اپنی بیٹی کے حوالے سے باؤلا کر ڈالتی۔

رانا بشیر ہمارے خلاف قدم نہ بھی اٹھاتا تو بھی شاہ میر اس کی بیٹی کو زندہ رکھتے ہوئے رانا بشیر کو ہمارے خلاف قانونی کارروائی پر اکساتا اور تب تک اکساتا رہتا جب تک کہ مجھے اور کالیا کو قانون پھانسی یا کڑی سزا نہ دے دیتا۔ یوں گویا ہمارا اندازہ درست تھا کہ "بلیک میلنگ" کا توازن برابر کا نہیں بلکہ یک طرفہ تھا۔ یعنی پلڑا پھر بھی شاہ میر کا ہی بھاری تھا۔ (اب ثمیر کے مرنے کے بعد تو ہمارا پلڑا بالکل ہی خالی ہو کر رہ گیا تھا۔)

"ہاہا......ہاہا......غور کر رہے ہو ناں میری بات پر......"

مجھے کچھ ثانیوں کے لیے خاموش اور سوتا پا کر دوسری جانب سے اس کا فتح سے لبریز قہقہہ ابھرا۔ "اسی لیے بار بار کہہ رہا ہوں میں کہ میرے بیٹے کا خیال رکھنا، اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہوگیا تو نعمان میں تو تمہاری لٹیا ڈبو ہی دوں گا، پہلے قانون کا پھندا تمہارے گلے میں پڑے گا، اس کے بعد تمہارے ادھورے بھائی فہیم کا اس سے بھی زیادہ عبرت ناک حشر کروں گا اور تمہاری خوبصورت جوان بہن کو تو میں عبرت کا نشانہ ہی

بتادوں گا۔“
”کمینے! اپنی زبان کو لگام دے۔“
اس کی غلیظ دھمکیاں سننے کی مجھ میں شاید تاب نہ رہی تھی۔ اپنے بھائی کو اس کا حقارت آمیز انداز میں ”ادھورا“ کہنے اور بہن عاصمہ کے بارے میں اس کی گندی دھمکیوں نے میرے دماغ کی نسیں تک کھولا دی تھیں لیکن ایک نامعلوم سے خوف کے سبب میرا اندر سے دل بھی لمحہ بھر کو خوف کے پنجے نے دبوچا تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ ثمیر مر چکا تھا۔
”نانا...... نانا...... نومی میاں! یہ غصے کا نہیں سوچ سمجھ کے میرے خلاف قدم اٹھانے کا وقت ہے اور میرا بیٹا تمہارے پاس امانت ہے۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ اس کا خیال رکھنا۔ یہ میرا بیٹا نہیں بلکہ تمہارے لیے ایک ایٹم بم ہے۔“
وہ بولے جا رہا تھا، اس کا پُر طمانیت لہجہ میرے اعتماد کی دیواریں متزلزل کر رہا تھا۔ کیا واقعی اسے کوئی پروا نہ تھی یا پھر وہ ایسا بننے کی کوشش کر رہا تھا۔
”کان کھول کر سن لو شاہ میر!“ بالآخر میں نے اعتماد اور حوصلے سے کہا۔
”اپنی گیدڑ بھبکیاں اپنے تک محدود رکھو اور اپنی گندی زبان کو بھی قابو میں رکھنا۔ مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہے۔“ میں نے بھی جواب میں یہی وتیرہ اختیار کیا۔
”فرحانہ کے ساتھ تم جو چاہے کرو، لیکن تمہارے بیٹے کو اسی حال میں ہی میرے پاس رہنا ہے جس حال میں ایک یرغمالی رہتا ہے۔ ضرورت پڑی تو میں تمہیں وہ بھی کر کے دکھا دوں گا جس کی گیدڑ بھبکیاں دے رہے ہو۔“
”کیا چاہتے ہو تم مجھ سے......“ اس نے اس بار قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ بالآخر میری جوابی کارروائی نے اس بار اس کے گھمنڈ پر کاری ضرب لگائی تھی۔
میں...... نے غیر مرعوب لہجے میں اور ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔
”تمہارا پولیس کو وہ بیان چاہتا ہوں میں جس میں تم یہ اعتراف کرو گے کہ میرے باپ کو پھانسی بے گناہ دی گئی، رفعت خانم کے قاتل تم تھے اور میرے بھائی فہیم کے ساتھ جو بربریت آمیز کھیل تم نے کھیلا اس کا بھی اعتراف...... بس! پھر تمہاری اور میری جنگ ختم۔“
”تم خوابوں کی کون سی دنیا میں رہنے لگے ہو نعمان! جہاں تمہیں ہر طرف ہری ہری سوجھ رہی ہے۔“ وہ اہانت آمیز انداز میں ہنسا۔ ”اب میں فون پر تمہیں اس بات کا کیا جواب دوں، اسی لیے میرے اسی جواب سے ہی مطلب ... لو۔ ہم اپنا اپنا کھیل ایک دوسرے کے خلاف کھیلتے رہیں ... جو جیتا وہ سکندر...... ہاں! ایک بات پھر کہوں گا، میرے ثمیر کا خیال رکھنا اور میری وہ ایٹم بم والی بات بھی یاد ... کیونکہ ثمیر، شاہ میر کا بیٹا ہے۔“
یہ کہنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔
”ابے لے جگری! یہ تو اب ہم پر سوا سیر ہونے ... ہے۔“ کالیا نے خاموشی مگر غور کے ساتھ میری اور شاہ میر کی ... ساری گفتگو سننے کے بعد مجھ سے کہا۔
”میں نے ایک، حتمی اور آخری فیصلہ کر لیا ہے کا ...“ دفعتاً ہی میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن سے کہا۔
”کیسا فیصلہ؟“
”شاہ میر کے پیچھے جانے اور اسے موت کے گھ... اتارنے کا۔“ میں نے جواب دیا۔ میری پُرسوچ نظریں ... مرکزی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔
”یہی حل ہے اب اس کا، میں تیرے ساتھ ہوں ...“ کالیا نے فوراً کہا۔
”سالا سوچ سوچ کر دماغ کی لسی بن گئی ہے ... راستے کے سوا اب ہمارے پاس اور کوئی راستہ بچا بھی نہ... ہے۔“
”اب بس! اس کے سوا اور کچھ نہیں سوچنا ہے کالیا!“ میں نے دوبارہ اسی انداز گمبھیر تا میں کہا۔ ”کیونکہ ہم ... ایک فاش اور خطرناک غلطی ہو چکی ہے۔ شاہ میر ٹھیک ہی ... رہا ہے، ہم نے اس کے بیٹے کو نہیں بلکہ ایک ایسے ایٹم ... اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا جس کے پھٹنے کے بڑے خطرناک ... برآمد ہونے والے ہیں۔“
”ہم...... میں سمجھ رہا ہوں۔ کب چلنا ہے؟“
”میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہی نہیں بلکہ پورا لائحہ عمل تشکیل پا رہا ہے۔ ہمیں رانا بشیر سے ملنا ہوگا۔ اسی وقت ...“

☆......☆

ہمارے رابطہ کرنے سے قبل ہی رانا بشیر کا فون آ... تھا۔ میرے سیل پر ہی اس نے رابطہ کیا تھا۔ اس نے آج شام چھ بجے تک اپنی رہائش گاہ پر بلایا تھا۔
اب ہم اس کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کی وجہ ... پریشان اور سخت تشویش زدہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ آج ... اسے شاہ میر کا فون آیا تھا دفتر کے نمبر پر۔ اس نے دھمکی ... انداز میں رانا بشیر سے صرف اس قدر کہا تھا کہ اس کے ...

...ذرا بھی بال بیکا ہوا تو فرحانہ کو اس کے لیے عبرت کا نشان ... دے گا۔ وہ زندہ رہے گی مگر رانا بشیر اپنی بوڑھی آنکھوں سے ساری عمر نگاہ عبرت سے دیکھتا رہے گا۔ یہاں تک کہ وہ ... رے گا کہ اس کی بیٹی کو اس عذاب سے نجات دلا دوا سے ... سے مار دو، وغیرہ۔
ایک باپ کے لیے یہ ایک بڑی خوفناک دھمکی تھی۔
”آپ نے پھر اس کی دھمکی کے جواب میں اس سے ... کہا؟“ میں نے کسی خیال کے تحت اس سے پوچھا۔
”میں بھلا اور کیا کہتا اس خبیث سے، سوائے اس کے ... وہ اپنے بیٹے کے بدلے میں میری فرحانہ کو چھوڑ دے۔“
”کیا جواب دیا پھر اس نے؟“ میں نے آنکھیں سکیڑ کر ... نظروں سے رانا بشیر کے چہرے کی طرف دیکھا۔
”اس نے وہی کہا جو کہتا آ رہا ہے کہ پہلے میرا بیٹا ... حوالے کرو۔ اس کے بعد وہ میری بیٹی کو چھوڑ دے گا مگر ... جانتا ہوں وہ دغاباز فطرت کا آدمی ہے۔“
”ہاں ہم اس کے اس جھانسے میں تو کبھی نہیں آئیں ...“
”مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کیا اسے اپنے بیٹے کی فکر ... ؟“ رانا بولا۔
”اسے زعم ہے اپنی طاقت پر اور گھمنڈ ہے اپنی دولت پر ... نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اس کا خیال ہے کہ وہ اپنے ... پالتو کتوں کے ذریعے اپنے بیٹے ثمیر کو ہمارے چنگل سے ... لے گا اور اس مقصد کے لیے اس نے اپنے تین کتوں ... بھیج رکھا ہے، جن کا ہمارے ہاتھوں حشر بھی وہ اب ... ملاحظہ کر چکا ہے۔“
”میرا سب کچھ لے لو بچو! مگر خدا کے لیے میری بیٹی کو ... درندہ صفت آدمی سے چھڑا لاؤ۔ میں بڑھا تمہارے آگے ... جوڑتا ہوں، بولو تو تم دونوں کے پاؤں بھی پکڑ لوں۔“
رانا بشیر اچانک نہایت دل گیر اور کرب ناک لہجے میں ... ہوئے میرے اور کالیا کے پیروں پہ گرنے کے لیے ... جھکا ہوا مگر کالیا نے اسے دلاسہ دینے کے انداز میں فوراً ... لیا اور پھر صوفے پر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔
”رانا صاحب! آپ فکر نہ کریں۔“ میں نے ازراہِ تشفی ... کہا۔
”آپ کا فون آ گیا ورنہ تو ہم خود ہی یہاں اسی سلسلے ... آپ کے پاس آ رہے تھے کہ شاہ میر کا قضیہ جلد از جلد نمٹا ... دیں۔“
”ثمیر تو خیریت سے ہے ناں؟ دیکھو اسے کوئی گزند نہیں پہنچنا چاہیے ورنہ...... ورنہ وہ درندہ میری...... معصوم سی بچی کو روند ڈالے گا۔“ رانا بشیر نے مجھ سے کہا۔
میں نے بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ بھی لیا تھا۔ چند دنوں میں ہی اس کا چہرہ ستا کر رہ گیا تھا۔ بیٹی کی فکر نے اسے غم و پریشانی سے ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کی صحت بھی متاثر ہو رہی تھی۔
تاہم جب اس نے ثمیر سے متعلق مجھ سے یہ بات کہی۔ ”وہ خیریت سے ہے ناں“ تو غیر ارادی طور پر میری اور کالیا کی نظریں دزدیدہ انداز میں چار ہوئی تھیں۔ شکر تھا کہ ہماری آنکھوں کا ”چور“ رانا بشیر نہیں پڑھ سکا تھا۔
میں نے ہولے سے کھنکار کر رانا بشیر سے کہا۔
”آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں، بہ حقیقت ہم بھی اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ جب تک شاہ میر کا بیٹا ثمیر ہمارے پاس ہے وہ آپ کی بیٹی کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا لیکن یہ بات ٹھیک ہے کہ ہمیں جلد از جلد اس گمبھیر مسئلے کو حل کر لینا چاہیے۔“ اتنا کہہ کر میں نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور آگے بولا۔ ”میں نے اور کالیا نے شاہ میر کے تعاقب میں جانے اور فرحانہ کا کھوج لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔“
”میں نے کہا ناں بچو! میرا سب کچھ لے لو۔ بس! میری پھول سی بچی کو اس درندہ صفت آدمی کے چنگل سے چھڑا لاؤ۔“ وہ ملتجی لہجے میں بولا۔ اس بار کالیا نے اس سے کہا۔
”رانا صاحب! اپنے تین خطرناک آدمیوں کا ہمارے ہاتھوں حشر دیکھنے کے بعد بھی شاہ میر کو گھمنڈ ہے کہ وہ اپنی چال میں کامیاب رہے گا کیونکہ اس نے ہمیں بھی فون کیا تھا۔“ کہتے ہوئے کالیا نے میری اور شاہ میر کی ٹیلی فونک گفتگو کے بارے میں اسے بتا دیا جس میں اس نے علی الاعلان ہم سے کہہ ڈالا تھا کہ اپنا اپنا زور لگاؤ۔ جو جیتا وہی سکندر لیکن کالیا نے ثمیر سے متعلق اس کی خوفناک دھمکی کے بارے میں رانا کو نہیں بتایا ورنہ وہ پریشان ہو جاتا۔
”رانا صاحب! نومی اور میں نے شاہ میر کی کھٹیا کھڑی کرنے کے لیے اس کے تعاقب میں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ اس وقت امارت کی کسی ریاست میں دبکا بیٹھا ہے۔ ممکن ہے ابوظہبی یا بحرین میں ہو۔ اس کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ وہ ایک جگہ کہاں تک کر بیٹھتا ہے۔“ بالآخر کالیا نے اس سے مقصد کی بات کرتے ہوئے کہا اور آگے بولا۔

"ہمیں اس سلسلے میں سفری کاغذات کی تیاری سمیت خاصی رقم بھی درکار ہوگی۔"

"تم لوگ اس کی کیوں فکر کرتے ہو۔" رانا بشیر بہ یک ترنت بولا۔ "میں یہ سب بندوبست کردوں گا لیکن شاہ میر کا کھوج لگانا اور اس تک پہنچنا اس قدر آسان ہوگا؟"

"نہیں۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ رانا بشیر اور کالیا بیک وقت میری طرف تکنے لگے۔ "میرے ذہن میں جو لائحہ عمل ہے اس کے مطابق ہم پہلے اس کے ساتھی یا دست راست بن رائند کا کھوج لگانے کی کوشش کریں گے کیونکہ فرحانہ کو اسی نے ہی اٹھوایا ہے اور اس کا ساتھی راکا بھی اس میں پوری طرح ملوث ہے، ہماری پہلی کوشش یہی ہوگی کہ راکا کو دبوچا جائے اور اس پر تشدد کرکے یہ سب اگلوانے کی کوشش کی جائے۔"

"تم بالکل ٹھیک پلاننگ بنا رہے ہو۔" رانا بشیر ایک دم پُراُمید ہوکے بولا۔

"لیکن اگر تمہیں بیرونِ ملک کا سفر بھی کرنا پڑا تو اس کی فکر مت کرو، پیسوں سمیت جن جن چیزوں کی تمہیں ضرورت پڑے گی اس کا بندوبست میں فوراً کردوں گا۔"

"ٹھیک ہے پھر......" میں نے گفتگو کا اختتام کرنے کی غرض سے کہا۔ "ہم آپ کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار کرنے آئے تھے۔ اب چلتے ہیں۔"

"میں ایک بات بتانا بھول گیا۔" اچانک رانا بشیر نے مجھ سے کہا اور میں اپنی جگہ سے اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔

"شاہ میر مجھ پر اپنے ایک کام کے لیے بھی دباؤ ڈال رہا ہے، یہی وہ معاملہ ہے جو میرے اور اس کے درمیان عرصے سے وجہ نزاع بنا ہوا ہے۔"

"کون سا کام؟ اور کیسا معاملہ؟" میں نے بھنویں سکیڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"معاملہ وہی ہے جو اصل میں اس سارے فساد کی جڑ ہے۔" رانا نے کہا۔

"وہ دوسری طرف اپنے اسی معاملے کی وجہ سے بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ جس میں اس کی نوکری، پیسا اور اس کے درپردہ وہ سارے منصوبے جو کالے راستوں پر چل کر اس کی دولت کے اہراموں میں اضافہ کیے ہوئے ہیں، سب داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ شاہ میر کا اصل مسئلہ ہم نہیں بلکہ یہی ہے جس کے لیے اس رذیل اور سنگ دل انسان نے میری بیوی رفعت خانم کا قتل کیا تھا۔"

اپنی مقتولہ و مرحومہ بیوی کا ذکر کرتے ہوئے رانا کے چہرے پر غم اور اداسی کے تاثرات مزید گہرے ہوگئے۔

"آپ کی مراد اس معاہدے سے ہے جو گلفو آئل اور وڈ ورتھ انٹرنیشنل آئل کے درمیان حال ہی میں ہوا تھا؟" کالیا نے تصدیق چاہنے کے انداز میں کہا۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے، اس سلسلے میں مجھے معلومات سدو بھائی نے دی تھیں، یوں سدو بھائی کی معلومات نے باضابطہ نہ سہی مگر حقیقتاً میں رفعت خانم سے پردہ چاک کیا تھا۔ لہٰذا جب میرے ذریعے یہ بات رانا بشیر کے علم میں آئی تو وہ میرا دم بھرنے لگا تھا۔

"ہاں! تم بالکل ٹھیک سمجھے نعمان!" وہ بولا۔ "اسی مقصد کے تحت اس بار اس رذیل نے میری بیٹی فرحانہ کو اپنی بربریت کے نشانے پر رکھ لیا تاکہ مجھے جھکا سکے۔ آفرین تم پر اور تمہارے اس دوست کالیا پر کہ تم دونوں بروقت کارروائی کرتے ہوئے شاہ میر کے بیٹے ثمیر کو اٹھوا کر توازن برابر کردیا۔ رانا بشیر ایک ثانیے کے لیے رکا اور بولا۔

"اسی لیے میں پُرزور الفاظ میں یہ کہوں گا کہ جب تک میری بیٹی فرحانہ اس درندے کی گرفت سے آزاد نہیں ہو جاتی، اس کے بیٹے ثمیر کو ہرگز مت چھوڑنا۔"

ثمیر کے بار بار ذکر پر اور موجودہ نازک اور حساس حالات کے پیشِ نگاہ اس کی اہمیت پر میرے اندر متوقع اندیشناک اور وسوسہ آمیز خدشات کا سے سنپولوں کی طرح اٹھانے لگتے تھے اور میرے اندر ایک ہول سا اٹھنے لگتا تھا۔ اس کے ذکر پر غیر ارادی طور پر میں کن انکھیوں سے کالیا کے چہرے کی طرف بھی ایک نظر ڈالتا تو وہاں بھی مجھے کچھ ایسے ہی تاثرات دیکھنے کو ملتے تھے۔

"آپ ثمیر کے سلسلے میں بے فکر رہیں رانا صاحب!" کہتے ہوئے مجھے اپنی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔ "ہم اس کی اہمیت سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔"

میں نے فوراً رانا کو اس موضوع سے ہٹاتے ہوئے اول الذکر موضوع پر لے آیا اور آگے بولا۔

"میرے ذہن میں جو منصوبہ ترتیب پا رہا ہے وہ اسی معاہدے کے حوالے سے ہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کی بات ماننے پر اس سے اپنی رضامندی کا اب اظہار کر ڈالیں۔"

"کیا؟" رانا بشیر میری طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے بولا۔

"ہاں رانا صاحب! کبھی کبھی درندے کا شکار کرنے کے لیے اس کے آگے چارا ڈالا جانا ضروری ہو جاتا ہے۔"

"ولل......لیکن اس طرح میری کمپنی کی ساکھ متاثر ہونے کا خطرہ ہوگا، ذلت و رسوائی، جیل اور قید الگ میرا مقدر ہوگی۔"

"رانا صاحب! آخر وہ معاہدہ ہے کس نوعیت کا؟" اس بار کالیا نے اس سے سوال کیا۔

یہ سوال میرے لیے بھی اس وقت سے جواب طلب تھا جب سے سدو بھائی مرحوم نے مجھے اس سے آگاہ کیا تھا۔

رانا بشیر نے جواب میں ایک گہرا سانس خارج کیا اور بولا۔

"گلفو آئل دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ گئی تو اسے سنبھالنے کی ذمہ داری شاہ میر کو سونپ دی گئی۔ شاہ میر کم سے کم لاگت میں اس مذکورہ بین الاقوامی آئل کمپنی کی کل شرائط کو پورا کرتے ہوئے ایک طرف اپنا نام بنانے کی کوشش میں تھا اور دوسری طرف بہت سا سرمایہ بھی کما کر گلفو آئل کی گرتی عمارت کو سنبھالا دینا چاہتا تھا، ساتھ ہی اپنی تجوری بھی بھرنا چاہتا تھا، بہ عین اسی طرح انہی دنوں میرا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار عروج پر تھا اور میری اچھی ساکھ بنی ہوئی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب شاہ میر نے مجھے جرمنی اور جاپان سے تیل کی کھدائی کے سلسلے میں ایسی جدید مشینری درآمد کرنے کا ٹھیکا دیا۔ جن میں ہیوی ڈیوٹی مشینری کے علاوہ زلزلہ پیما اور ارضیاتی تجزیوں میں کام آنے والے آلات سب ہی شامل تھے۔ جب سب کچھ طے پا گیا اور اس سلسلے میں کاغذی کارروائیاں بھی تقریباً پوری کرلی گئیں تو ایک دن شاہ میر نے بن رائند کے ساتھ آکر میرے گھر پر ایک خفیہ نوعیت کی ملاقات کی جسے میں میٹنگ ہی کہوں گا، کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ جعلی واؤچرز کے ذریعے لاکھوں ڈالرز کی مشینری کو جاپانی اور جرمن ہی سے درآمدہ بتایا جائے گا جبکہ وہ ہوں گی چائنا کی......اس میں تیس فیصد میرا حصہ رکھا گیا تھا۔

ڈالرز کی کرنسی کے حساب سے میرا تیس فیصد حصہ پاکستانی کرنسی میں بھی کروڑوں میں بنتا تھا لیکن میں نے ان کی اس جعل سازی اور دھوکے فراڈ کی اس خفیہ ڈیل کو بہ یک جنبش رد کردیا۔ وہ مجھے لالچی سمجھ کے میرا حصہ بڑھانے لگے مگر میرا جواب مسلسل انکار میں پا کر انہیں سخت مایوسی ہوئی تو مجھ سے کہا گیا کہ وہ یہ معاہدہ ہی کینسل کردیں گے، اس میں میرا نقصان تھا کیونکہ کاغذی کارروائی اور دیگر مد میں، میں کافی پیسا خرچ کرچکا تھا اور وقت بھی۔

ہم کاروباری اشخاص کا وقت بھی دولت ہی کی طرح ہوتا ہے۔ میں نے ان کی فائل دبالی۔ اس فائل میں سروے رپورٹ بھی تھی۔ گلفو آئل کمپنی کے ہی نہیں بلکہ وڈ ورتھ آئل کے ماہرین، نقشہ نویس اور کوالٹی کنٹرول آفیسرز کے ریمارکس تھے۔ جو میری کمپنی کے حق میں جاتے تھے۔ یوں بھی اب براہِ راست ڈائریکٹرز اور ایکسپرٹیز کے زیرِ متعلق ہو چکا تھا اور "بی آف ڈی" (بورڈ آف ڈائریکٹرز) سے رابطے میں رہنے لگا تھا۔

شاہ میر اور بن رائند کی حیثیت تو چوروں کی سی تھی۔ فائل کی حصول کی خاطر میری ان سے دشمنی کی ابتداء ہوئی۔

رانا بشیر نے اس کی صراحت بیان کرنے کے بعد خاموشی اختیار کرلی۔

اپنے کاروبار کی دیانت داری سے متعلق رانا بشیر کا مؤقف شک وشبہ سے عاری تھا۔ میں نے کہا۔

"رانا صاحب! تب پھر کالیا کی بات صحیح ہے، ہمیں شاہ میر جیسے درندے کو پھانسنے کے لیے اس فائل کو چارے کے طور پر استعمال کرنا پڑے گا۔"

"تمہارا خیال ہے کہ میں وہ اہم فائل اس کے حوالے کردوں؟" رانا صاحب پریشان کن سے لہجے میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہم فائل اس کے حوالے ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔" میں نے اس کی تشفی کی خاطر کہا۔ "فائل کا چارا ڈالیں گے صرف۔ وہ اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھے گا اور ہمارا بچھایا ہوا جال اس کا منتظر ہوگا۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ اس فائل کا ایشو اب پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔" رانا بشیر نے جواب دیا۔ "بجز اس کے کہ اس میں وہ جعلی واؤچرز شامل کیے گئے تھے کیونکہ میں گلفو آئل کمپنی کو اپنے مروجہ اصولوں اور قواعد کے مطابق مذکورہ مشینریز کی سپلائی جاری رکھے ہوئے ہوں۔"

"وہ جعلی واؤچرز شاہ میر کی طرف سے دیے گئے تھے؟" میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"ہاں!" رانا بشیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا ان واؤچرز سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں شاہ میر اور اس کے ساتھی بن رائند کی دھوکا دہی شامل ہے؟" یہ سوال کالیا نے کیا تھا۔

”نہیں۔“ رانا بشیر نے نفی میں سر ہلایا۔

”تو پھر یہ کیسے ثابت ہوگا کہ شاہ میر اور بن رائدل کر کمپنی کے ساتھ یہ فراڈ کر رہے ہیں؟“

”میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔“ رانا بشیر نے تفہیمی انداز میں کہا۔”فائل میں ایسا کچھ نہیں ہے کہ جس سے وہ دونوں عیار پھنستے ہوں۔ اصل کمزوری ان کی یہ ہے کہ وہ معاہدے کی فائل ہے اور میں ان کی بات سے انکار کر چکا ہوں، جب ان دونوں نے دیکھا کہ ”بات“ نہیں بنی ہے تو انہوں نے مجھے فائل لوٹانے اور معاہدہ کینسل کرنے کا دباؤ ڈالا تھا۔ چوں کہ میں نے ان کا ”کہا“ نہیں مانا تھا، یوں وہ کسی اور طرح کے ”معاملات“ طے کرنا چاہتے تھے مگر میں نے کمپنی کی مذکورہ شرائط کے مطابق انہیں سپلائی شروع کردی ہے اور وہ مجھ سے پوری طرح خوش اور مطمئن ہیں۔“

”ہوں ں...... ٹھیک ہے۔“ میں نے خیال انگیز انداز میں کہا۔

”میرا خیال ہے فائل کے معاملے کو اسی طرح ہی آپ جاری رکھیں۔ ہمیں اس سے ہٹ کر کچھ سوچنا اور کرنا ہوگا۔“

یہ کہہ کر ہم وہاں سے رخصت ہوگئے۔ آخر میں رانا نے مجھ سے اتنا ضرور کہا تھا کہ کوئی بھی حتمی پلاننگ طے کرنے کے بعد میں اس کے بارے میں ان سے ڈسکس ضرور کروں۔ ممکن ہے ان کے پاس آسان راستہ ہو۔

مجھے ان کی اس بات نے چونکا دیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ایسا کچھ راستہ پہلے ہی سوچے بیٹھا تھا۔

☆......☆

ثمیر کی ہلاکت کے بعد حالات ہمارے لیے بہت گھمبیر ہوگئے تھے۔ فرحانہ کا معاملہ جلد از جلد نمٹانے کا متقاضی تھا۔

میرے ایماء پر ایڈووکیٹ زنیرہ نے متعلقہ تھانے سے معلومات حاصل کرلی تھیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس روز والے خوں ریز واقعے کے بعد دشمنوں کا جو ساتھی پولیس کے ہتھے چڑھا تھا۔ اس کا نام ارغمان ہے مگر مشتعل لوگوں نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا، وہ پولیس کسٹڈی میں اسپتال داخل ہے تاہم اس نے پولیس کو یہی بیان دیا ہے کہ وہ ایک تاجر ہے اور دبئی سے یہاں آیا تھا۔ اسے کچھ افراد لوٹنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس نے جواب میں ان کا مقابلہ کیا تو غلط فہمی میں مشتعل لوگوں نے اسے دھر لیا۔ اس کے پاس سے جو کاغذات پولیس کو ملے ہیں ان سے یہی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ کھجوروں کا بیوپاری ہے۔ وغیرہ۔“

ابھی میں ہونٹ بھینچے اسی کے متعلق ہی سوچ رہا تھا کہ جمی کی کال آگئی۔

کال کالیا کے سیل فون پر آئی تھی۔ اس نے چونکا دینے والی خبر دی۔

کالیا اس سے بات کر رہا تھا پھر اسے کچھ ہدایت دینے کے بعد مجھ سے بولا۔”ابے لے جگری! یہ سالا راجا دلاور خان کا دوسرا روپ انسپکٹر رجب دین پوری طرح ہمارے خلاف حرکت میں آچکا ہے۔“

”کیوں کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”جمی بتا رہا ہے کہ وہ اپنے چند ساتھی اہلکاروں کے ساتھ ایک پولیس موبائل میں صفورا والے مکان میں چھاپہ مارنے کے لیے آیا ہوا ہے۔“ اس انکشاف نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔

”تو کیا جمی اس کی حراست میں چلا گیا تھا؟“

”حراست میں ہوتا تو مجھے فون کیسے کرتا؟“ کالیا بولا۔ ”خوش قسمتی سے جمی پولیس کے پہنچنے سے ذرا دیر پہلے ہی مکان کو تالا لگا کر سگریٹ اور پان لینے کے لیے ایک قریبی کیبن کی طرف چلا گیا تھا۔ جب واپس مکان کی جانب پلٹا تو پولیس کو دیکھ کر وہیں کہیں دبک گیا اور فون کر کے اس صورتِ حال سے فوراً آگاہ کر دیا۔“

”کیا پولیس اب بھی وہیں موجود ہے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت کالیا سے پوچھا۔

”ہاں“ کالیا نے جواب دیا۔”پولیس مکان کی تلاشی لینے کے لیے کسی کے آنے کا انتظار کر رہی ہے۔ آثار یہی نظر آرہے ہیں کہ پولیس تالا توڑ کر مکان کی نہ صرف تلاشی لے گی بلکہ سیل بھی کر جائے گی۔“

”مکان کس کا ہے اور کس کے نام ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”استاد بھابھا کا ہے، جو اس نے میرے حوالے کر رکھا تھا۔“ کالیا نے جواب دیا۔

”میں نے جمی کو ہدایت کردی ہے۔ وہ استاد بھابھا کے اڈے پر ہی جائے گا، مگر ابھی تھوڑی دیر وہیں رکے گا کہ پولیس کرتی کیا ہے؟“

”کالیا! پولیس کو اس مکان سے کوئی ایسی نشانی ملنے کا خدشہ تو نہیں ہے ناں...... جس سے ثمیر کی وہاں موجودگی وغیرہ کا شبہ ہوسکے؟“

”ابے لے جگری!“ وہ بولا۔”سب کچھ تیرے سامنے کیا گیا تھا بلکہ ہم تینوں نے مل کر ہی وہ قضیہ نمٹایا تھا۔ بعد میں جمی نے مکان اچھی طرح سے دھوڈالا تھا۔ ثمیر کی لاش بھی ٹھکانے لگادی ہم نے، اب بھلا پولیس کے لیے وہاں کیا رکھا ہوگا؟“

کالیا کی بات پر مجھے کچھ تسلی ہوئی تھی مگر جرم، بہرحال جرم ہوتا ہے۔ چھپتا نہیں ہے۔ مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ دیکھا جاتا تو یہ خونی جنگ شاہ میر نے ہی ہم پر مسلط کی تھی۔ میں تو اپنے بھائی کا بدلہ بھی نہیں لے سکا تھا۔ حالانکہ یہ میرے بس میں بھی تھا مگر میں ثمیر کے ساتھ ایسی بربریت انگیزی کا کھیل اس کے ساتھ نہیں کھیل سکا تھا جو اس کے باپ شاہ میر نے میرے بھائی فہیم کے ساتھ کھیلا تھا۔

یوں اس دوران مجھے انسپکٹر دلشاد خاں کی کال کے بارے میں بھی اسے بتانے کا خیال آگیا، جو میں اٹینڈ نہیں کر سکا تھا۔

”ابے لے یہ اب کون سا نیا کھڑاگ پیدا کرنے کے چکر میں ہے؟“ کالیا قدرے چونک کر پریشان کن لہجے میں بولا۔

”پتا نہیں یار!“ میں نے بیزاری سے کہا۔”کہوں تو کال کرلوں اسے؟“

”ابھی کرلے پتا نہیں وہ کیا سمجھے گا، اگر کال نہ کی تو؟“ کالیا نے کہا۔

میں نے اسی وقت انسپکٹر دلشاد سے رابطہ کیا اور اس سے پہلے معذرت کی کہ میں کسی مجبوری کی بناء پر اس کی کال نہیں اٹینڈ کر سکا تھا۔

”میں نے دوبارہ بھی تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر دوسری اور تیسری بار رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔“ دوسری جانب سے اس کی گھمبیر آواز ابھری۔

”معذرت خواہ ہوں، اسی لیے موقع ملتے ہی میں نے آپ سے رابطہ کرلیا انسپکٹر صاحب! ویسے خیریت تو ہے ناں؟“ میں نے ایک بار پھر معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”تھانے میں خیریت؟“ وہ بولا۔ مجھے اس کی آواز میں بیک وقت زہریلا طنز اور تہدید کی چھپی محسوس ہوئی۔

”جی انسپکٹر صاحب! بولیے؟“ میں نے اس بار کھنڈی ہوئی متانت سے کہا۔

”فوراً تھانے پہنچو...... باقی بعد میں......“ اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کردیا۔

”کیا کہہ رہا تھا یہ باگڑ بلا؟“ کالیا نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔“ میں نے اپنی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

”ابے لے...... ایسا ہے تو اس کے روبرو پیش ہونے سے پہلے ایک فون تو انسپکٹر وجاہت سیال کو بھی کھڑکا دے۔“ کالیا نے مشورہ دیا۔

”نہیں۔“ میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔”پہلے جا کر دیکھنا پڑے گا کہ معاملہ کیا ہوا ہے۔“

”ابھی چلیں؟“

”بعد میں...... پہلے جہاں جا رہے ہیں اس کام کو نمٹائیں۔“ میں نے کہا اور کالیا نے پُرخیال انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

میں نے اور کالیا نے یہی راکا کو چھاپنے کا فیصلہ کیا اور ڈیفنس والی شاہ میر کی رہائش گاہ کا رخ کیا۔ ظاہر ہے راکا وہاں ہمارے انتظار میں تو نہیں بیٹھا رہ سکتا تھا۔ اب تک اسے بھی اندازہ ہو ہی چکا ہوگا کہ ہم اس کے دونوں ساتھیوں سمیت پاکستان میں موجودگی سے نہ صرف آگاہ ہوچکے ہیں بلکہ ان سے دو دو ہاتھ بھی کر چکے تھے۔

ڈیفنس والی رہائش گاہ پر صرف چوکیدار موجود تھا۔ جس کے ہاتھ میں ماؤزر تھا۔

شام ہو چلی تھی۔ سردیوں کا عروج تھا مگر کراچی کی سردیاں تو بس برائے نام کی ہی پڑا کرتی تھیں۔ تاہم موسم کی مناسبت سے سرِ شام ہی رات کا گمان ہونے لگا تھا۔

ڈیفنس کراچی کا پوش علاقہ تھا۔ یہاں یوں بھی سناٹا ہی رہتا تھا۔ شاہ میر کی کوٹھی کا جائزہ لیتے ہوئے ہماری مشاق نظروں نے اس کے اندر کے غیر معمولی سناٹے اور مدھم سی روشنی کو دیکھتے ہی بھانپ لیا تھا کہ اس بھاری بھرکم چہار دیواری کے اندر کوئی موجود نہیں ہے۔ یہ سوچا جا سکتا تھا کہ مکین کہیں گئے ہوئے ہوں۔

سدو بھائی اور زیدی اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ کالیا اور میں نے استاد بھابھا کے اڈے کا رخ کیا۔ وہاں جمی کالیا کی ہدایت کے مطابق پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ کالیا نے اس کو کچھ ہدایت دینے کے بعد ڈیفنس والی کوٹھی روانہ کردیا۔

استاد بھابھا کے علم میں ثمیر والی بات نہیں لائی گئی تھی البتہ اتنا ضرور بتا دیا تھا کالیا نے کہ وہاں کسی وجہ سے پولیس آئی

ہوئی ہے اور وہ اس صورتِ حال کو خود ہی سنبھالے۔

کالیا اور میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اب بھول کر بھی صفوراوالے مکان کا رخ نہیں کریں گے۔

میں اب گھر جانا چاہتا تھا۔ میرا ذہن اس وقت بے پناہ مسائل کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ایک طرف فوزیہ کا رشتہ نہ ملنے کا دکھ تھا، دوسری جانب ثمیر کی اچانک ایسے نازک حالات میں ہلاکت، راکا جیسا درندہ اور چھلاوا صفت خونی ہرکارے دانت نکوسے میرے خلاف میدان میں اترنا۔ یہ سارے وہ عوامل تھے جنہوں نے اعصابی طور پر مجھے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

ایسے میں کالیا جیسے یارِ بے بدل کا ساتھ میرے لیے بلاشبہ نعمتِ غیر مترقبہ ہی تھا۔ یہی تو وہ ایسا شخص تھا جس کی سنگت نے میری ہمت باندھے رکھی تھی۔

جب میں نے کالیا سے گھر جانے کا کہا تو اس نے فوراً کہہ دیا کہ وہ بھی میرے ساتھ جائے گا۔ وہ ان حالات میں ایک پل کے لیے بھی مجھ سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔

لیکن گھر جانے سے پہلے ہم سیدھا کیماڑی کے اس تھانے میں پہنچے جہاں کا انچارج ایس ایچ او دلشاد خاں تھا۔

وہ میرا ہی منتظر تھا۔ کالیا کو اس نے باہر ہی رکوا دیا تھا۔ صرف مجھے ہی ایک سنتری لے کر اس کے کمرے میں پہنچا تھا۔

سامنے ہی اپنی میز کے پیچھے ایک گھومنے والی بڑی سی کرسی پر انسپکٹر دلشاد بیٹھا میری طرف گھورنے کے انداز میں چند ثانیے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی میری جانب مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا اور مجھے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا بھی اشارہ کر دیا۔

میں شکریہ کہہ کر کرسی پر براجمان ہو گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

”شکورے کی خالہ اور اس کے چاچا جھومر نامی شخص نے تمہارے خلاف شکورے کے قتل کی رپورٹ کردی ہے۔“ دلشاد خاں نے جیسے میری دھڑکتی سماعتوں میں دھماکا کر دیا۔

”کیا؟ لل...... لیکن اس بات کا غفور گواہ ہے کہ شکورا......“

”ایک منٹ......“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش ہونے کا کہا اور مجھے لانے والے سنتری کو مخصوص اشارہ کیا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ دو افراد کو لے کر دوبارہ اندر داخل ہوا۔ یہ دونوں میرے لیے اجنبی تھے۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر کا مزدور ٹائپ شخص تھا جبکہ دوسری ایک بوڑھی خاتون تھی۔ اندازہ

...... تو مجھے ہو ہی گیا تھا کہ یہ دونوں کون ہو سکتے تھے۔

”یہی ہے انسپیٹر (انسپکٹر) صاحب! یہی وہ شخص ہے جس کے ساتھ میرا معصوم بھتیجا شکورا لانچ لے کر... اس مینارہ والے جزیرے پر گیا تھا۔“ مجھے دیکھتے ہی وہ بوڑھا ایک دم انسپکٹر دلشاد سے بولا۔ اس بوڑھے کے اس سفید جھوٹ پر مجھے حیرت ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے میرا دماغ بھی غصے سے بھنا کر رہ گیا اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے؟ میں تمہیں جانتا تک نہیں، تمہاری صورت بھی میں ابھی دیکھ رہا ہوں۔“

”انسپیٹر صاحب!“ وہ بوڑھا بڑی مکاری سے ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”مسٹر نعمان! ٹیک اٹ ایزی۔ تم اسے تھانے میں اس طرح ہراساں نہیں کر سکتے۔“ انسپکٹر دلشاد خاں نے مجھے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”ہراساں؟“ میں یہ کہتا ہوا اس کی جانب مڑا اور اس مکار بڈھے کی طرف اپنی انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے دلشاد خاں سے بولا۔

”یہ تھانے میں اتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہا ہے، آپ کا خیال ہے میں اس کی تردید بھی نہ کروں؟“

”اڑی بھاگی! تو بھی کچھ بول ناں...... چپ کیوں ہو گئی ہے اپنے صاحب کے آگے۔“ وہ مکار بڈھا اپنے ساتھ کھڑی ادھیڑ عمر عورت کو کھدیڑتے ہوئے بولا۔

”ہا...... ہاں...... ی...... یہ چھوکرا اس روز میری جھونپڑی میں بھی آیا تھا...... شش...... شکورے کا پوچھنے“ وہ عورت بولی۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا لیکن فوراً مجھے کسی سازش کی بو محسوس ہوئی۔ ایسی سازش جیسے کوئی پردے میں رہتے ہوئے کٹھ پتلیوں کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت دے رہا ہو۔ حالانکہ جلد طیش میں آجانا میرا وتیرہ نہ تھا نہ ہی مزاج مگر اس طرح کے حالات میں اپنے جوش پر قابو پانا بھی میرے لیے مشکل ہو جاتا تھا۔ لہٰذا اس بار میں نے ان دونوں جھوٹے بڈھا بڈھی سے الجھے بغیر براہِ راست ایس ایچ او دلشاد سے مخاطب ہو کے بولا۔

”انسپکٹر صاحب! یہ دونوں بالکل سفید جھوٹ بول رہے ہیں۔ نہ میں ان دونوں کو پہلے سے جانتا ہوں اور نہ ہی شکورے سے بھی میری کوئی جان پہچان تھی۔ آپ غفورے کو یہاں کیوں نہیں بلوا لیتے؟ اس کا بیان ان دونوں کے

سفید جھوٹ کا پول کھول کر رکھ دے گا۔“

”غفورے کو تم بہت پہلے سے جانتے ہو، وہ تو تمہارا ٹھیک ٹھاک دوست بھی بن چکا ہے، جاں نثار دوست۔“ جواب میں دلشاد نے ذومعنی لہجے میں مجھ سے کہا۔ اس کے بدہیت ہونٹوں پہ عجیب سی مسکراہٹ عود کر آئی تھی اور میں اس کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔

”پھر تو یہ دونوں جھوٹے انسان میرے کسی دشمن کے کہنے پر بھی ہو سکتے ہیں انسپکٹر صاحب؟“ میں نے کہا۔

”غفورے کا بیان بھی لے لیتے ہیں۔“ وہ یہ کہتا ہوا اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا تو جی چاہا کہ کہہ ڈالوں، ”تم خود بھی تو بکاؤ مال بن سکتے ہو۔“ مگر مصلحتاً ضبط کیے خاموش کھڑا رہا۔

میں پہلے ہی دو تھانوں میں ”ٹومینیٹ“ تھا۔ جوش اور غصے سے کام خراب ہو سکتا تھا۔ ثمیر کا معاملہ الگ اندر ہی اندر کسی خوابیدہ آتش فشاں کی طرح ابلنے اور پھٹنے کو تھا۔ ایسے میں مجھے بہت احتیاط اور سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا تھا۔

”یہ اسی لانچ کا مالک ہے، چاچا جھومر نام ہے اس کا۔“ دلشاد اس بڈھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تعارفاً مجھ سے بولا۔ ”اور...... یہ مائی بھاگی مقتول شکورے کی ماسی ہے۔ میں نے ابھی ان کے بیان کے مطابق کوئی ایف آئی آر نہیں کاٹی ہے۔ ہاں این سی ضرور کاٹنی پڑے گی۔“

”ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب! آپ اپنا کام کیجیے۔“ بالآخر میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا اور ان دونوں جھوٹے بڈھا بڈھی کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں دھڑکایا۔

”میں بھی عدالت میں ان کے خلاف جھوٹی گواہی اور ہتک عزت کا مقدمہ کر ڈالوں گا، دیکھتا ہوں یہ وہاں خود کو کیسے بچاتے ہیں، کیونکہ مجھے ہی نہیں بلکہ ان دونوں کو بھی پورا یقین ہے کہ یہ دونوں جھوٹے ہیں۔“ میں نے یہ الفاظ اس قدر مستحکم اور اعتماد بھرے انداز میں ادا کیے تھے کہ حسبِ توقع...... بوڑھا جھومر اور مائی بھاگی خوف زدہ نظر آنے لگے اور چور سی نظروں کے ساتھ کچھ یوں انسپکٹر دلشاد خاں کی طرف دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں۔

”سائیں! یہ تو آپ نے ہمیں پھنسا ہی دیا۔ اب بچاؤ ہمیں۔“

”ٹھیک ہے پھر۔“ دلشاد بھی ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے قریب کھڑے سنتری کو اشارہ کیا۔ اس نے فوراً اسے ایک سیلیوٹ جھاڑا اور جھومر اور مائی بھاگی کو اپنے ساتھ لیے کمرے سے نکل گیا۔

”تم اپنی ضمانت کا بندوبست کروالو...... تمہارے خلاف گواہوں کی پوزیشن مضبوط ہے۔ میں انسپکٹر وجاہت سیال کی وجہ سے اتنی رعایت تمہیں دے سکتا ہوں یا پھر یہ معاملہ ادھر ہی ختم کر ڈالو۔“

میں اس کی بات پر چونک گیا۔ میری سلگتی ہوئی کنپٹیوں میں بری طرح سائیں سائیں ہونے لگیں۔ مجھے فوری فیصلہ کرنا تھا۔ ایسے جھوٹے گواہ غفورے کے ساتھ مل کر میں بھی پیدا کر سکتا تھا۔ شاہ میر کا آدمی جو میرے ہاتھوں زخمی ہوا تھا اور جس نے فرحانہ کو اغوا کیا تھا۔ اس ”تیار شدہ“ صورتِ حال کے بعد وہ مکر سکتا تھا۔ میں خوامخواہ مصیبت میں پڑ جاتا جبکہ میرے کئی اہم کام رکے ہوئے تھے اور شاہ میر کی قبر کھودنے کا بھی مجھے اپنے ہاتھوں موقع مل رہا تھا، اگر کالیا ہوتا تو وہ بھی مجھے یہی مشورہ دیتا۔ جس کا میں اب فیصلہ کرنے جا رہا تھا۔ لہٰذا ہتھیار ڈالنے والے انداز میں بولا۔

”آپ کیا چاہتے ہیں انسپکٹر صاحب؟ مجھے صاف صاف بتا دیں۔“

میری بات پر اس کے چہرے پر تراوٹ سی آگئی۔ فوراً خوش اخلاقی سے بولا۔

”بیٹھو آرام سے میں نے تم سے صاف ہی کہہ دیا ہے کہ......“

”ٹھیک ہے انسپکٹر صاحب!“ میں نے اس کی بات درمیان میں کاٹ کر گویا اسے ”قندِ مکرر“ سے بچا لیا۔

میں وہاں سے فوراً مکتی ہوگئی۔ میں باہر آیا اور تھانے کی حدود سے دور جانے کے بعد میں نے کالیا کو سب بتا دیا۔

”اگر ہم دیگر ضروری پھڈوں میں نہ پڑے ہوتے تو شاہ میر کے گلے میں یہ پھندا ڈالنے کی کوشش کرتے۔“ کالیا حسبِ توقع بولا۔ ”لیکن اب اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ ماسوائے وقت ضائع کرنے اور لمبی پھڈیک میں پڑنے کے، تو نے بالکل صحیح فیصلہ دیا۔ لیکن جگری! یہ بات اپنی اس وکیل صاحبہ کے سامنے مت کرنا، ورنہ ......“ اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور میرے ہونٹوں پہ غیر تاثر سی مسکراہٹ عود آئی۔

ہم گھر آگئے۔ فہیم اور عاصمہ بالکل خیریت سے تھے۔ کالیا کے مسلح ساتھی بدل بدل کر وہاں بدستور پہرہ دے رہے تھے۔ اسی طرح رانا بشیر نے بھی میری اور کالیا کی ہدایت پر اپنی

پرائیوٹ سیکیورٹی کا خاطر خواہ بندوبست کر رکھا تھا۔

راکا اور اس کے تین خونخوار ساتھی میدان میں اترے ہوئے تھے جبکہ شاہ میر ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اس پورے منظر نامے سے دانستہ غائب تھا۔اس نے اپنا ایک خطرناک مہرہ سرکا دیا تھا۔ مجھے اور کالیا کو اسے گھیر کر پھانسنا تھا لیکن تازہ ترین "مارا ماری" کے بعد وہ فی الحال غائب تھا۔ شاید اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ ہم اتنے تر نوالہ نہیں تھے۔

ڈیفنس والی کوٹھی سے اس نے اپنا بوریا بستر گول کر دیا ہوگا، نہ صرف یہ بلکہ ان کے مکینوں کو بھی کہیں اور منتقل کر دیا ہوگا، کوئی بعید نہ تھا کہ شاہ میر نے بیوی اور بیٹی کو واپس اپنے پاس بلوا لیا ہو۔وہ ایک پرائیوٹ جہاز کا بھی مالک تھا۔جانے کتنے بحری جہاز اس کی گود میں ہلکورے لیتے ہوں گے۔اس کے لیے ایک ملک سے دوسرے ملک کوچ کرنا کیا مسئلہ تھا۔

کھانا ہم سب نے اکھٹے کھایا۔اس کے بعد میں اور کالیا اپنے کمرے میں آبیٹھے۔عاصمہ ہمارے لیے دو کپ چائے لے آئی۔

میں اور کالیا آپس میں باتیں کرنے لگے۔ ہمارا سارا زور شاہ میر کے تعاقب میں جانے کا تھا۔اس سے پہلے کہ ثمیر کی موت کا راز انکشاف ہو ہمیں شاہ میر کو ٹھکانے لگانا ضروری تھا، یا پھر کم از کم فرحانہ کو اس کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کرتے کہ اگر رانا بشیر کی دوستی دشمنی میں بدل گئی تو میرے لیے ایک لانیحل سی دشمنی پیدا ہو سکتی تھی اور بہ قول گرگ باراں دیدہ کالیا کے......ہم ان نازک اور خطرناک حالات میں کم از کم رانا بشیر کی دشمنی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

بہرکیف، اب دونوں صورتوں میں ہی ثمیر کی موت کی وجہ سے پیدا ہونے والے بحران کا حل ممکن تھا ورنہ اس راز کے طشت از بام ہونے کے بعد بہ قول کالیا کے حالات ہمارے حق میں اس قدر غیر موافق ہو جاتے کہ قابو سے باہر بھی ہو سکتے تھے۔

بہت غور و خوض کے بعد یہی طے پایا گیا کہ شاہ میر کی تلاش میں بحرین یا ابوظہبی کا رخ کیا جائے۔

رانا بشیر کی اخذ کی گئی معلومات کے مطابق گلفو آئل کا ہیڈ آفس بحرین میں اور ابوظہبی میں مین برانچ تھی، لیکن یہ اصل میں کالا سونا والے میگا پروجیکٹ کی کیمپنگ برانچ ہی کہلاتی تھی۔ان کا کالا سونے والا منصوبہ انھی کے قرب و جوار میں واقع "صرائفہ" میں زیر تکمیل تھا۔

یہ دونوں کمپنیوں کا مشترکہ طور پر ایک میگا پروجیکٹ تھا۔شاہ میر نے وہاں کیا "گڑبڑ" کر رکھی تھی اس کی تفصیل رانا بشیر نے نہایت صراحت کے ساتھ بتا دی تھی۔

میں اور کالیا رات گئے تک عرب کے تپتے صحراؤں کی اس متوقع مہم جوئی کے لیے سر جوڑے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔رات کے بالکل آخری پہر میں اچانک میرے اور کالیا کے درمیان ایک بات پر سخت اختلاف ہو گیا جب ہم نے اپنے لائحہ عمل کو ٹھوس اور حتمی شکل دی۔

"ہرگز نہیں، میں تجھے اس خطرناک مہم پر اکیلا ہرگز نہیں جانے دوں گا۔" کالیا اڑ گیا۔

"اچھا! تو پھر یہاں عاصمہ بہن اور فہیم بھائی کے پاس کون ہوگا؟" میں نے اسے گھورا۔

"چاچا انور شاہ جو ہے، پھر استاد بھا بھا کی ذمہ داری لگاؤں گا اور وہ وکیل صاحبہ زنیرہ بھی تو ہے۔" کالیا نے کہا مگر اس کی آواز اور لہجہ کمزور محسوس ہوا مجھے۔

"یہ لوگ اپنی جگہ، لیکن تمہاری بات اور ہے کالیا!" میں نے بڑی رسانیت سے جواب دیا۔ "تو ادھر ہوگا تو میں یہی سمجھوں گا کہ میں یہاں پر موجود ہوں۔ بہ صورت دیگر اگر تو بھی میرے ساتھ چلا تو مجھے یہاں کی فکر کھا جائے گی، وہاں میں کچھ نہیں کر پاؤں گا، لیکن تیری یہاں موجودگی پر میں یکسوئی سے اپنی مہم پر توجہ مرکوز رکھوں گا۔"

کالیا کے دل کو میری یہ بات "ٹھک" سے لگی تھی۔اس نے اداسی سے میرے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور پھر اپنا سر ہلا دیا۔

☆......☆

اگلے دن ہم دیر سے جاگے۔عاصمہ نے ناشتا بنایا تھا۔وہ اور فہیم ناشتا کر چکے تھے۔میں نے عاصمہ کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"میری بیروزگاری کی وجہ سے تمہیں دوبارہ ناشتا بنانا پڑتا ہے ورنہ تو ہم سب صبح سویرے جاگتے تھے تو اکھٹے ہی کر لیتے تھے۔"

"نہیں بھائی جان! تو کیا ہو گیا؟ مجھے آپ کے اور کالیا بھائی کے لیے دس بار بھی ناشتا بنانا پڑے تو خوشی سے بناؤں گی اور میں ہر نماز میں آپ کی اچھی سی نوکری کے لیے بھی دعائیں مانگتی ہوں۔"

"یہ ہوا ناں اچھی بہنوں والا جواب، واہ بھئی جیتی رہو بہنا!" کالیا نے مسکرا کر عاصمہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔"ماشا اللہ یارا جگری! تم بہت خوش قسمت ہو، بلکہ میں بھی کہ ہمیں

بھائی نے عاصمہ جیسی بہن عطا کی۔اللہ تمہیں خوش رکھے بہنا!"

ہم دونوں مسکراتے ہوئے ناشتے میں مصروف ہو گئے۔ جب چائے پینے لگے تو فہیم وہیل چیئر پر بیٹھے کمرے میں داخل ہوا۔

"ارے فہیم! آؤ......چائے بناؤں تمہارے لیے؟" میں نے چھوٹے بھائی کو دیکھتے ہی کہا۔

"نہیں بھائی جان! میں سب کھا پی چکا۔" وہ اپنی خودکار وہیل چیئر قریب لاتے ہوئے بولا۔ "آپ کہیں جا رہے ہیں ابھی؟"

"فوری طور پر تو کہیں نہیں جا رہے ہیں۔تم بتاؤ۔کوئی بات کرنی ہے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی بھائی جان!" اس نے ہولے سے جواب دیا۔

"کہو، میں سن رہا ہوں؟"

"بھائی جان! وہ کاشف کے ابو ارشد بیگ صاحب کا فون آیا تھا میرے سیل پر......شادی کی تاریخ مانگ رہے تھے۔آپ کو فون کیا تھا انہوں نے مگر کسی وجہ سے شاید آپ ان کی کال ریسیو نہیں کر سکے تھے۔"

میں اس کی بات پر چونکا۔اچانک مجھے خیال آیا کہ کل شام میں ثمیر کی لاش ٹھکانے لگانے کے دوران ایک انون نمبر سے کال آتو رہی تھی۔کہیں یہ انہی کی نہ ہو۔جب میں نے وہ نمبر کنفرم کیا تو وہ ارشد بیگ کا ہی نکلا، وہ میں نے اسی وقت انہی کے نام سے سیو کر لیا۔

"بھائی جان! آپ بڑے ہیں ہمارے اور آپ ہی بہتر سوچ سکتے ہیں، مگر اب تاخیر ٹھیک نہیں ہے، ہمیں ان لڑکے والوں کو تاریخ دے ہی دینا چاہیے۔چاہے فون پر ہی سہی۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا فہیم!" میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

اپنی متوقع مہم پر روانگی کے بارے میں سوچتے اور فیصلہ کرنے کے دوران ہی میں نے عاصمہ کی شادی کی تاریخ طے کرنے کا سوچ لیا تھا۔اگرچہ ابھی تک مجھے کاشف نے اپنے اس جواب سے آگاہ نہیں کیا تھا جو سوال میں نے اس سے اس روز اپنے دفتر (لاری اڈے) پر بلا کر پوچھا تھا لیکن اب ثمیر کے مرنے اور شاہ میر کا قضیہ جلد نمٹانے کے منصوبے کے بعد میرا وہ سوال ہی نہیں بلکہ اس کا جواب بھی غیر مؤثر ہو کر رہ گیا تھا۔

میں نے پندرہ دن بعد کی تاریخ طے کر دی اور اسی وقت فون پر چاچا انور شاہ سے بھی تبادلہ خیال کر لیا۔عاصمہ کی شادی کی تیاری تو بہت پہلے سے کر رکھی گئی تھی۔باقی رسمیں تھیں۔وہ بھی بالترتیب تھیں۔

"بھائی جان! پھر آپ اپنی مبارک زبان سے خود ہی بیگ صاحب کو فون کر کے تاریخ بتا دیں، وہ بہت بے چینی سے آپ کے فون کے منتظر ہیں۔" فہیم نے خوش ہو کر کہا اور میں نے اسی وقت بیگ صاحب کو فون کر کے پہلے معذرت کی کہ میں کسی مجبوری کی بناء پر اور ان نون نمبر کے باعث ان کی کال نہیں اٹینڈ کر سکا تھا، اس کے بعد میں نے ان سے کہا کہ آج شام تک میں آپ کو شادی کی حتمی تاریخ سے آگاہ کر دوں گا۔

وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور مجھے مبارکباد دی۔

میں نے زنیرہ کو میسج کیا کہ وہ عاصمہ بہن کو یہ تاریخ بتا دے۔ہماری ماں ہوتی تو یہ تاریخ وہی بیٹی کو بتاتی۔

بہرطور زنیرہ نے فوراً "اوکے" اور "مبارک باد" کے ریپلائی کے ساتھ جواب دیا کہ وہ دوپہر تک مجھے میسج کر کے بتا دے گی، تو میں نے اگلا میسج کیا کہ ہو سکتا ہے بعد دوپہر تک میں اور کالیا بھی تھوڑی دیر کے لیے اس کے گھر آئیں۔

اس نے "ویل کم" اور "بچشم براں" کا دوبارہ میسج کیا اور بے اختیار میرے ہونٹوں پہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

دوپہر ہونے میں ایک دو ہی گھنٹے تھے۔

بعد دوپہر میں اور کالیا اسی وقت گھر سے نکلے اور رانا بشیر کے دفتر آن آدھمکے تھے۔جبکہ میرا ارادہ زنیرہ کے ہاں جانے کا تھا۔ میں اسے اپنی روانگی کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ میری مکمل ضمانت کا بندوبست کروا سکے کیونکہ ثمیر کے اغوا کا میرے خلاف جس تھانے میں شاہ میر نے پرچہ کٹوایا تھا اس کے انچارج انسپکٹر رجب دین نے مجھے پابند کیا تھا کہ میں دو سو کلومیٹر کی حدود کے اندر رہوں گا اور کسی اشد ضرورت کے لیے مجھے اگر مقررہ حد سے باہر جانا بھی پڑا تو مجھے اس کے لیے خصوصی اجازت درکار ہوگی۔اسی دوران رانا بشیر کا فون آگیا۔کل ہونے والی ملاقات کے بعد ہی اس نے میرے آیندہ کے لائحہ عمل کا اندازہ لگا لیا تھا۔یہی پوچھنے کے لیے اس نے مجھے آج صبح ہی فون کھڑکا دیا تھا۔میں نے فون پر جب اسے اپنے کل کے ارادے کے حوالے سے توثیق کر ڈالی تو اس نے فوراً ہی مجھے چند ہدایت دیتے ہوئے اسی وقت اپنے دفتر پہنچنے کا کہا۔

لیکن اس نے مجھے جس ہدایت پر عملی تصویر بنا کے دفتر پہنچنے کا کہا تھا اس پر مجھے تھوڑی حیرت ہوئی تھی۔جب میں

نے کالیا سے اس کا اظہار کیا تو وہ معنی خیز مسکراہٹ سے اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”لگتا ہے اس بڈھے کھاڑنے پہلے ہی تیری راہ ہموار کرنے کا کچھ سوچ رکھا ہے۔“

میں اس کی بات پر ہنس دیا اور اسی لہجے میں بولا۔ ”ذرا ادب سے میرے یار! اب وہ ہمارا ایک طرح سے باس ہے۔“

”ابے لے..... جگری! باس کہاں سے کب سے ہو گیا؟“ کالیا یک دم چونک کر بولا۔ ”باس تو ہم ہیں اس کے۔“

”کچھ بھی سہی وہ ہماری مدد میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔“

”سب مفادات کا چکر ہے، میرے معصوم جگری!“ کالیا بولا۔ ”اگر آج اسے پتا چل جائے کہ ثمیر ہماری کسٹڈی میں ہلاک ہو چکا ہے تو وہ شاہ میر سے بھی اپنی دشمنی بھلا کر ہمارے گلے کو آ جائے گا۔“

”اب چھوڑو ان باتوں کو ثمیر کے ذکر سے مجھے پریشانی اور تشویش لاحق ہونے لگتی ہے۔ چلو اب......“ میں نے جھنجلا کر کہا۔

یوں تھوڑی دیر بعد ہی میں اور کالیا اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ میرے ہاتھ میں ایک فائل تھی جو میں رانا بشیر کی ہدایت کے مطابق تیار کر کے لایا تھا۔ اس میں میری تعلیم اور تجرباتی اسناد وغیرہ کی تفصیل تھیں۔ میری پاسپورٹ سائز تصاویر بھی تھیں۔

رانا بشیر کو میں برسبیل تذکرہ کل ہی بتا چکا تھا کہ میں نے لاری اڈے کی نوکری چھوڑ (جو چھڑا دی گئی تھی) دی ہے۔ لہٰذا اب میں بیروزگار بھی ہوں۔ اس پر رانا بشیر نے کچھ سوچتے ہوئے عجیب سے انداز میں مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ کیا میں نوکری کرنا چاہتا ہوں؟ میرا جواب ظاہر ہے اثبات میں تھا۔

اسی لیے مجھے شبہ ہوا کہ معاملہ کچھ اور بھی ہے۔

ہمارے وہاں پہنچتے ہی رانا بشیر نے اپنی سیکریٹری کو انٹر کام پر کسی کو اندر نہ بھیجنے کی ہدایت بھی کر دی تھی اور ہمارے لیے کافی منگوائی تھی۔ میں نے انہیں دوبارہ اپنے حتمی فیصلے سے بھی آگاہ کر دیا۔

اس کے بعد اس نے میری فائل لی اور چند منٹوں تک اسے دیکھنے کے بعد بند کر دی اور اپنی آنکھوں سے سیاہ فریم والا چشمہ اتار کر میز پر رکھا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے خوشی ہوئی ہے نعمان میاں! کہ تم بالآخر سنجیدگی کے ساتھ ایک فیصلے پر پہنچ گئے ہو۔ دیکھا جائے تو یہ ایک متفقہ فیصلہ ہی تھا اور..... تمہارا یہ فیصلہ بھی مجھے اچھا لگا کہ تم اس مہم میں اکیلے ہی جانے کا ارادہ رکھتے ہو اسی لیے میں نے تمہیں یہ فائل تیار کروا کے لانے کی خاص طور پر ہدایت کی تھی۔“ وہ اتنا کہہ کر رکا۔ میں اور کالیا سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تکتے رہے۔ اس نے دوبارہ سیاہ فریم والا چشمہ اپنی آنکھوں پر چڑھایا اور بولا۔

”میں تمہیں اس سلسلے میں پورا تحفظ فراہم کروں گا نعمان! جس سے ایک طرف تمہیں اپنی اس مہم کو سر کرنے میں آسانی ہوگی اور دوسری جانب تمہاری بیروزگاری کا بھی مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں ابھی اپنی کمپنی میں تمہاری، بزنس منیجر کے عہدے کا تقرری لیٹر ٹائپ کروا رہا ہوں۔ میری بات غور سے سننا۔“ اس نے شاید میرے ہونٹوں کی سوالیہ جنبش کو بھانپتے ہی کہا اور یوں میں بدستور مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ آگے کہنا شروع ہوا۔

”یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں عارضی نوکری دے رہا ہوں۔ ہرگز نہیں، تم آج سے باقاعدہ اس کمپنی کے ملازم ہو۔ ازاٹ کلیئر؟“ یہ کہتے ہوئے رانا نے گویا مجھے سوال پوچھنے کا موقع دیا۔

مجھے بے شک ایک حیرت آمیز خوشی ہوئی تھی۔ یوں میری نوکری کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا اور مستقل طور پر میں رانا بشیر کا ملازم بھی بن گیا تھا لیکن پھر بھی ہونٹوں پہ آنے والے ایک سوال کا اظہار میں نے بھی کر ڈالا۔

”اس مہربانی کے لیے میں آپ کا مشکور ہوں رانا صاحب! لیکن مجھے اس طرح کے بزنس کا تجربہ کم ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ پڑھے لکھے ہو، تجربہ کار ہو۔ باقی ہم سکھا دیں گے۔“ رانا بولا۔

”رانا صاحب! کیا نعمان کی اس نوکری سے اس کی امارات والی مہم کا کوئی خاص تعلق ہے؟“ کالیا نے سوال داغا۔

”بالکل ہے۔“ رانا بشیر نے ہلکی مسکراہٹ سے کالیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نعمان کوئی گوریلا یا کمانڈو نہیں ہے، نہ ہی وہ کسی ایسی جنگ پر جا رہا ہے کہ عرب کے تپتے ہوئے صحراؤں میں مجنوں کی طرح منہ پھاڑ کپڑے جھاڑ وہاں خاک چھانتا رہے۔“

”درحقیقت اس کی مہم کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ میں چاہتا ہوں اسے پردیس میں کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ قانونی طور طریقے اختیار کر کے ایک مضبوط حیثیت کے ساتھ یہ وہاں جائے گا۔“

میں اور کالیا بڑے غور سے اس کی بات سنتے رہے۔

''غور سے آگے سنتے رہو۔'' وہ میری محویت کو بھانپتے ہوئے بولا۔

''گلفو آئل کمپنی کے ایگزیکٹیو مینیجمنٹ کے شعبے سے تعلق رکھنے والا ایک آدمی مسٹر بہرام خان سے میری اچھی خاصی شناسائی ہے، وہ ایک انڈین نژاد آدمی ہے۔

شاہ میر اور بن رائند کی بدبختی کے بعد مسٹر بہرام خان سے ہی اب میری مستقلاً بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ وہ بی آف ڈی اور ایکسپرٹیز کے خاص نمائندے کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ آپریشنل فیلڈ مینیجر ہے۔ میری اس شخص سے اچھی خاصی انڈراسٹینڈنگ ہو چکی ہے اور اسی لیے میں نے اشاروں کنایوں میں اس قسم کے شبہات کا اظہار کیا تھا۔ وہ یہاں کاروباری دورے پر پاکستان بھی آ چکا ہے اور میرے پاس ہی ٹھہرا تھا۔ بہت سی باتیں ہوئی تھیں میری اس کے ساتھ، باقی وہ تم سے کرے گا..

وہ ایک ایمان دار اور قدر نواز آدمی ہے۔ میں تمہیں اس آدمی کے بارے میں کبھی نہیں بتاتا لیکن چوں کہ اب تم نے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو سمجھو تمہارا ابھی میں نے پہلے سے ہی وہاں بندوبست کر دیا ہے۔ تمہارا ایک مددگار اور دوست پہلے سے وہاں موجود ہے۔ تمہیں اسی کے پاس ہی بھیجوں گا۔ تم میری کمپنی کے حوالے سے ایک کاروباری دورے پر جاؤ گے تاکہ تمہیں وہاں کوئی کاغذی یا دوسری قانونی پیچیدگیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔''

وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئے۔

ایک لمحہ کے لیے میری اور کالیا کی نظریں چار ہوئیں۔ میری آنکھوں میں تو خوشگوار سی حیرانی تھی لیکن کالیا کی آنکھوں میں الجھن تیرتی محسوس ہوتی تھی۔

رانا بشیر خاصا عقل مند اور زیرک ثابت ہوا تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

''رانا صاحب! اگر ایسی بات ہے تو کیا یہ آپ کے لیے خطرے کا سبب نہیں بن سکتی یعنی شاہ میر یا بن رائند تو آپ کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے پھر تو سمجھو سارا معاملہ ہی چوپٹ۔''

''بشرطیکہ انہیں یہ حقیقت معلوم ہو جائے۔'' وہ خفیف سی مسکراہٹ سے بولے۔

''بہرام خان کمپنی کا ایک وفادار ملازم ہی نہیں ایک سلجھا ہوا اور سمجھدار آدمی ہے۔ اس نے ابھی ایسا کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا ہے۔ تاہم وہ میرا مشکور ہے کہ میں نے ان کے درمیان موجود کالی بھیڑوں کی نشاندہی کر دی ہے۔ وہ اب نہ صرف اس اہم راز کو راز میں رکھے گا بلکہ اس کا حل بھی سوچ رہا ہے۔ تازہ ترین صورتِ حال کے بعد کل رات ہی میں نے اس سے تمہارے سلسلے میں بھی بات کر لی ہے۔ تم ایک اسائنمنٹ لے کر جاؤ گے۔ یہ طریقہ اسی نے ہی بتایا ہے مجھے۔ تم ان کے درمیان رہو گے اور بہرام خان کے ساتھ مل کر شاہ میر اور بن رائند کی بیخ کنی کرو گے۔''

''یہ تو نعمان کے لیے بہت خطرناک ہو جائے گا۔'' کالیا نے پُرتشویش لہجے میں رانا سے کہا۔ ''یہ تو آ بیل مجھے مار والی بات ہو جائے گی۔ نعمان خود کو بھیڑیوں کی کچھار کے سپرد نہیں کر رہا اس طرح، رانا صاحب؟''

''ہرگز نہیں۔'' رانا صاحب نے عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے کالیا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اس سے زیادہ خطرہ نعمان کو یونہی منہ اٹھائے بحرین یا ابوظہبی جانے میں ہوتا۔ وہاں یہ کیا کرتا؟ کس کا منہ دیکھتا؟ شاہ میر یا بن رائند اس کے انتظار میں تو نہیں بیٹھے ہوں گے وہاں؟ لیکن اس طرح ایک کمپنی کے ملازم اور کمپنی بھی وہ جو گلفو آئل کمپنی کے اسائنمنٹ میں شامل ہے، یعنی میری کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے اس کے لیے کام آسان ہو جائے گا۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک پلاننگ جوڑی ہے رانا صاحب! اس میں میرے لیے بہت سی آسانیاں ہیں اور میں بڑے اطمینان سے اپنا کام انجام دے پاؤں گا۔''

میں نے فوراً جوش سے تمتماتے ہوئے لہجے میں کہا لیکن جانے کیوں کالیا مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا یا پھر شاید وہ اس جلیبی کی طرح کی منصوبہ بندی کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

رانا صاحب نے اسی وقت میری تقرری کا لیٹر ٹائپ کروا دیا۔ یہ اپائنٹمنٹ لیٹر ''بیک ڈیٹ'' کا تھا۔ مجھے بزنس مینیجر کی جاب بھی مل گئی اور کمپنی کی طرف سے میری پوزیشن اور حیثیت بھی قانونی طور پر مستحکم ہو گئی تھی۔ رانا صاحب نے آخر میں یہ بھی کہا تھا کہ بہرام خان مجھے وہاں رہنے کے دوران ہر طرح کی مکمل سپورٹ فراہم کرے گا۔ میری اس مہم کی ابتداء بحرین سے ہونا تھی۔ مجھے باضابطہ طور پر ایئرپورٹ پر گلفو آئل کے ایک معتبر نمائندے کی حیثیت سے بہرام مجھے ریسیو کرنے بھی آئے گا اور مجھے اسی کے ساتھ جانا ہو گا۔

میرے ویزے اور پاسپورٹ کے سلسلے میں رانا صاحب نے مجھ سے تصاویر اور دیگر کاغذات لے کر اپنے پاس رکھ لیے۔ (جنہیں ساتھ لانے کی وہ ہدایت دے چکا تھا۔)

ان اوّل الذکر کاغذات کی تیاری کے لیے رانا بشیر نے کم از کم پندرہ دنوں سے ایک ماہ کی مدت بتائی تھی اگرچہ وہ یہ سب ارجنٹ بنوانے کے لیے کوشاں تھے، نیز انہوں نے ایک ضروری ہدایت سے بھی مجھے نوازتے ہوئے اس بات کا پابند کیا کہ میں اس دوران پابندی کے ساتھ آفس آتا رہوں اور ضروری دفتری امور کے علاوہ بحرین کے ''دورے'' سے متعلق بریفنگ بھی لیتا رہوں۔

یوں اثنائے گفتگو میں نے عاصمہ کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اس مہم پر جانے سے پہلے عاصمہ کے فرض سے سبکدوش ہو جاتا۔

رانا بشیر نے حسبِ توقع پہلے تو مجھے مبارک باد دی اس کے بعد کہا کہ میں انہی دنوں میں یہ اہم ذمہ داری نمٹا سکتا ہوں، دو چار دن اوپر نیچے بھی ہو جائیں تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ تاہم میں نے رانا بشیر کو ابھی یہ بات نہیں بتائی تھی کہ میرا ہونے والا بہنوئی یعنی کاشف بھی گلفو آئل میں ملازم تھا اور آج کل چھٹیوں میں یہاں آیا ہوا تھا۔ یونہی میں نے ابھی اس بات کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

ہم نے وہاں سے زنیرہ کے گھر کا رخ کیا۔ تاریخ کے سلسلے میں ابھی تک زنیرہ نے مجھے کوئی میسج نہیں کیا تھا۔ شاید وہ ہماری آمد کی منتظر تھی۔

☆......☆

''تم! بحرین جا رہے ہو؟ مگر کیوں؟'' زنیرہ کے چہرے پر حیرت سوار تھی اور آنکھوں سے تشویش سی مترشح ہو رہی تھی۔ میں نے اسے یہی بتایا تھا۔ کالیا بھی میرے ساتھ تھا۔

''کمال ہے تم نے مجھے نوکری ملنے کی مبارکباد نہیں دی۔ اتنی اچھی اور بڑی کمپنی میں مجھے نوکری ملی ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کا دل بہلانے کی غرض سے کہا۔ حقیقت یہی تھی کہ میں نے ابھی تک اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ نہ یہ کہ نوکری مجھے رانا بشیر کی فرم رانا ٹریڈرز میں ملی تھی اور نہ ہی یہ کہ میں بحرین کس ''مقصد'' کے لیے جا رہا ہوں۔ البتہ اس کو میں نے کمپنی ہی کے کام سے اور انہی کی طرف سے اس دورے کا ذکر کیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ پریشان ہو اور مجھے کسی لمبے چوڑے چکر سے نوازنا شروع کر دے۔

''خوشی تو مجھے ہوئی ہے لیکن......لیکن لوی! یہ تمہارا

بابا ثناء اللہ زونمیر

بابا فاضل زونیمری کی اولاد سے تھے اور اپنے جدامجد خواجہ مسعود سے مستفید ہوئے تھے۔ خواجہ مسعود کی وفات کے بعد شیخ محمد اشرف فتح کدلی کی طرف رجوع کیا۔ ان کی تعلیم و تربیت نے مرد کامل اور شیخ اکمل بنا دیا۔ 18 ذوالحجہ 1235 ہجری میں بہ عہد مہاراجا رنجیت سنگھ انتقال کیا اور محلہ زونیمری میں دفن ہوئے۔

شیخ میر محمد منور حطمی

شاہ فرح الدین متو المعروف قلندر کے مشہور خلفاء میں سے تھے۔ بغیر آیات کلام اللہ و احادیث شریف یا اقوال سلف صالح کے دوسرا کلام زبان پر بہت کم لاتے تھے ان کی بزرگی اور پرہیزگاری بہت مشہور ہے۔ 18 ربیع الاول 1238ھ کو بعہد مہاراجا رنجیت سنگھ انتقال کیا اور اپنے مرشد کے مقبرے میں دفن ہوئے۔

شیخ فاروق نارو

حضرت فاروق قلندر کے بہت مرید تھے اور عموماً ہر طریقے میں کسی نہ کسی مرید کو دخل تھا۔ شیخ فاروق جو اپنے مرید کے ہمنام بھی تھے۔ صاحب وجد و حال تھے۔ ان کی ساری عمر رقص و سماع اور سرود میں بسر ہو گئی۔ وہ عجیب حالت میں رہا کرتے تھے اور کسی کو ان کے سامنے بولنے کی تاب نہ تھی۔

درویش محمد اشرف

آپ کا دوسرا نام چمن شاہ تھا۔ یہ بھی قلندری مریدوں میں تھے۔ ان کی بھی ساری عمر وجد و حال میں بسر ہو گئی۔ جس قدر نذر نیاز ان کو آتی تھی اپنے سامنے لٹا دیتے تھے۔ ان کا مزار موضع گاڈرہ پرگنہ لعل میں ہے۔

شیخ غلام نبی مصری

معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بزرگ مصر سے آئے تھے انہوں نے اپنے چچا مولوی محمود مصری سے علم حدیث حاصل کیا۔ اپنے وقت کے برگزیدہ عالموں میں سے تھے۔ علم کو سینے میں نہیں رکھا بلکہ خلق خدا کو بہت فائدہ پہنچایا۔ ایک مدت تک حضرت خواجہ شاہ نیاز نقشبندی کے گھر مقیم رہے۔ جب انتقال کیا تو محلہ مرجان پورہ میں دفن ہوئے۔

مرسلہ: اختر احمد۔ ملتان

نوکری ملتے ہی اچانک بیرونِ ملک کا سفر اور پھر عاصمہ کی شادی؟"

"سب ہو جائے گا۔" میں نے کہا اور بات بدلنے کی غرض سے پوچھا۔

"تم نے ابھی تک مجھے عاصمہ کے جواب سے آگاہ نہیں کیا؟"

"میں تمہیں میسج کرنے لگی تھی، پھر خیال آیا تم خود ہی آرہے ہو تو بتادوں گی، وہ کہہ رہی تھی کہ یہی تاریخ ٹھیک ہے۔"

"اچھا! ایک منٹ، میں ذرا بیگ صاحب کو بتادوں وہ میرے فون کا انتظار کررہے ہوں گے۔" میں نے جلدی سے کہا اور اسی وقت یہ کام نمٹادیا۔ اس کے بعد زنیرہ سے مخاطب ہوکے بولا۔

"ایک کام اور کرنا ہے تمہیں...... تم ذرا عاصمہ کو کمپنی دے دو۔ اس نے کچھ ضروری شاپنگ وغیرہ کرنا ہوگی لیکن ذرا احتیاط ہوکے، غیر ضروری باہر مت نکلنا عاصمہ کے ساتھ۔"

"اس کی تم کیوں فکر کرتے ہو، عاصمہ تو میری سب سے پیاری سہیلی بھی ہے اور بہن بھی۔ یوں بھی آج کل تو ساری شاپنگ آن لائن ہی ہوجاتی ہے، گھر بیٹھے۔ حالات کو دیکھ کر یہ سب کام انجام دینا ہوں گے ہمیں۔" وہ بولی۔

"لیکن تم نے مجھے ایک عجیب سے مخمصے میں ڈال دیا ہے، لگتا ہے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کررہے ہو۔"

"کچھ بھی نہیں چھپارہا، یہ تمہارا وہم ہے۔" میں مسکرایا۔

"اللہ کرے میرا وہم ہو۔" اس نے ایک ہمکاری لی۔

"اچھا اب ایک ضروری بات بھی سن لو۔ وہ میری مستقل ضمانت کا بندوبست کرلو، اس کے بغیر میں بحرین نہیں جاسکتا۔ پلیز! میری نوکری کا سوال ہے۔"

"میں اس کی تیاری کرچکی ہوں۔ بےفکر رہو۔ کام ہو جائے گا لیکن اس آدمی کا کیا بنا جسے کیماڑی تھانے میں تم نے فرحانہ کے اغوا کے کیس میں دے رکھا ہے؟"

"میں اب سیدھا وہیں جارہا ہوں۔" میں نے رخصت ہونے کے لیے یہ کہتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ کالیا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ زنیرہ سے ایسا میں نے ٹالنے کی غرض سے کہا تھا۔

"ارے! کہاں چل دیے؟ بیٹھو تو سہی......" کہتے ہوئے وہ بھی کھڑی ہوگئی۔

"نہیں، میں چلوں گا، بہت سے اہم کام نمٹانا ہیں۔" میں نے کہا اور ہم دونوں وہاں سے رخصت ہوگئے۔

☆......☆

میں نے بحرین جانے کا فیصلہ تو کرلیا تھا اور اپنے تئیں بہن کی اہم ذمہ داری کا بوجھ بھی اتار کر جانے والا تھا، لیکن ایک تلخ حقیقت تو یہ بھی تھی کہ میں اپنے دل پر ہی نہیں بلکہ اپنی روح پر بھی ایک بہت بڑا بوجھ لیے جارہا تھا۔

ہاں! یہ بوجھ، میری محبت کے اس دکھ کا تھا جس کا پہلا چرکا مجھے اس کے باپ عطا محمد کے اس کا مجھے رشتہ دینے سے انکار نے لگایا تھا۔ میں تو جیسے ایک ہی چرکے میں ڈھیر ہو گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ میں نے تقدیر سے بہت سی توقعات باندھ لی تھیں۔

مجھے راہِ الفت کے ان سرد و گرم راستوں پہ چلنے کا کوئی تجربہ تو کیا ہوتا، اندازہ تک نہ تھا۔ بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے یقین تھا کہ عطا صاحب فوزیہ کا رشتہ دینے میں کم از کم مجھے تو انکل ہی انکار نہیں کریں گے اور بھلا انکار کی مجھے کوئی ایسی ذرا سی گنجائش بھی تو نہیں محسوس ہوتی تھی۔ لیکن...... لیکن وہ، مجھے "بیٹا" اور "برخوردار" کہتے نہیں تھکتے تھے یوں مجھے دھتکار دیا کہ دوبارہ میں ان کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں قرار پایا۔

فوزیہ کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی بھی صورت جاتی رہی تھی اب تو نوکری تک سے نکال دیا گیا تھا مجھے اور وہ بھی اس نوکری سے جس کے ہوتے ہوئے میں نے اپنی جان پر کھیل کر اور بڑے بڑے لینڈ مافیائی ڈان جیسے مجرموں کی دشمنی مول لے کر میں نے عطا محمد کی روزی کا یہ اڈا ہی نہیں بچایا بلکہ اور غریب لوگوں کو بھی بیروزگاری اور مصیبتوں سے بچایا تھا۔

اس لحاظ کا بھی عطا صاحب میں کوئی پاس نہ رہا تھا۔

میں اور کالیا زنیرہ کے ہاں سے نکلے تو میرا چہرہ فوزیہ کو یاد کر کے ایک دم اداس سا ہوگیا۔ دل چاہا اسے فون کروں کہ اب فقط اس کی مدھر بان آواز، مترنم لہجہ اور کھنکتے الفاظ کے موتیوں کی مالا ہی پہنتا رہوں۔ کیا خبر ظالم تقدیر یہ بھی مجھ سے چھین لے۔

بائیک میں گھر پہنچنے سے پہلے...... میرا دل فوزیہ کی یاد اور اس کے مہین تصور خیال سے اس قدر بے قرار و بے چین ہوا کہ میں نے اسی وقت ایک ذرا سائیڈ میں ہوکے فوزیہ کے سیل پر رابطہ کرنا چاہا۔ کچھ ایسی ہی تڑپ اس وقت میرے دل میں فوزیہ کے لیے ابھری تھی۔

کالیا میرے قریب کھڑا تھا اور محتاط نظروں کو گردش دیے ہوئے تھا۔

مجھے حیرت آمیز پریشانی ہوئی کہ فوزیہ کا نمبر بند جارہا تھا۔

"کسے فون کررہا تھا تو جگری؟" کالیا نے مجھے سیل فون دوبارہ جیب میں ڈالتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"ایسے ہی بس! چل آگے بڑھ۔" میں نے ٹالنا چاہا۔

"ٹھہر جا جگری!" کالیا نے میرے بڑھتے قدم روک لیے۔ وہ بہ غور میرے چہرے اور آنکھوں میں جیسے اتر کر تکے جا رہا تھا۔

"فوزیہ کو فون کررہا تھا؟" اس نے پوچھ لیا۔ وہ میرے چہرے کے گھٹے گھٹے پن اور اداسی کو تاڑ گیا تھا۔

"ہاں!" میں نے ہولے سے سر جھکا کر کہا۔

"کیا کام سے!" کالیا کے منہ سے جیسے بے اختیار نکلا۔

"کیا کہا؟" میں نے اسے گھورا۔

"ایک کچھ نہیں جگری!" وہ بڑی رسانیت آمیز مسکراہٹ سے میری طرف تکتے ہوئے بولا۔

"یہ سالی محبت چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔ کسی موذی بیماری کی طرح لگ جاتی ہے انسان کو، نہ ملے تو کھا ہی جاتی ہے۔ پر یار جگری! تو میرے ہوتے ہوئے فکر کیوں کرتا ہے۔ بےغم ہوجا، جب تک تیرا یہ یار زندہ ہے فوزیہ کو تجھ سے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ چل! اب اپنا موڈ ٹھیک کرلے۔"

میں اس کی بات سن کر ایک روتی ہوئی سی ہنسی ہنس دیا۔

☆......☆

ہفتے بھر میں باقی ماندہ تیاری بھی مکمل کرلی گئی۔ شادی کی تاریخ قریب آتی جارہی تھی۔ دل خوش بھی تھا اور بہن کے وداع ہوجانے کے روایتی احساس تلے اداس بھی ہوا جارہا تھا۔ خوشی اپنی جگہ تھی۔

دن قریب آرہے تھے۔ گھر شادی کے روایتی ہنگاموں سے لبریز تھا۔ زنیرہ کا تو اب زیادہ وقت ہمارے ہی گھر پر گزرتا تھا۔ کالیا کے اسلحہ پوش ساتھی نظروں میں آئے بغیر گھر کے گرد پھیرے میں لگے رہتے تھے۔ راکا سے تازہ ترین ٹکراؤ اور اسے میری طرف سے لگنے والے کاری وار کے بعد سے مجھے نہیں لگتا تھا کہ وہ اتنی جلدی دوبارہ میرے مقابلے میں آئے گا۔ یوں بھی بہ قول کالیا کے وہ یہاں ہم سے لڑنے مرنے کم اور ثمیر کی کھوج نکالنے کے لیے زیادہ آیا تھا۔ لہٰذا اس سلسلے

میں پہلی ہی بار ناکامی اور ہم سے منہ کی کھانے کے بعد شاید وہ عارضی طور پر نچلا ہو بیٹھنے میں مجبور تھا۔

یوں بھی اسے کیا ملنا تھا؟ ثمیر اب تک بحرہ عرب کی تہہ میں مچھلیوں کی خوراک بھی بن چکا ہوگا اور را کا اپنا سر ٹا پتا ہی رہتا۔

ممکن تھا میری بحرین روانگی کی بھنک پڑتے ہی (جو ایک یقینی امر تھا) اسے بھی میرے تعاقب میں لگا دیا جاتا کیونکہ اب میں ہی ان کے لیے "ضروری" بن چکا تھا۔

لگتا کچھ ایسا ہی تھا کہ تقدیر اس بار میرا ساتھ دینے پر تلی بیٹھی تھی۔ سارے کام بہ احسن وخوبی طے پا رہے تھے۔ نیرہ نے میری حتمی ضمانت کروالی تھی اور امید بھی دلائی تھی کہ کیس بھی ختم ہو جائے گا کیونکہ ثمیر کے اغوا کے حوالے سے اب تک پولیس کو کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔

میں ادھر دل مسوس کر یہ سوچ رہا تھا کہ کاش! فوزیہ کو بھی میں بہن کی شادی میں شرکت کی دعوت دے سکتا۔ وہ بھی اور لڑکیوں بالیوں کی طرح سج سنور کر اور نت نئے ملبوسات میں یہاں، میرے گھر آتی۔ میں اسے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھا رہتا اور وہ مجھے، یوں ہم دونوں میں ایک ملاقات بھی ہو جاتی۔ مجھے افسوس ہوا کہ اگر میں بہن کی شادی کے بعد ہی رشتہ لینے جاتا، کم از کم تب تک عطا محمد سے تعلقات تو قائم رہتے۔

عاصمہ کی رخصتی سے صرف دو روز قبل رانا بشیر نے فون پر مجھ سے رابطہ کر کے بتایا کہ میرے سفری کاغذات تیار ہیں۔ صرف ٹکٹ کنفرم کرنا ہے، وہ ظاہر ہے میں ہی کر سکتا تھا کہ میں نے کب بحرین روانہ ہونا ہے۔

رانا صاحب کو بھی میں نے بہن کی شادی میں آنے کی دعوت دی تھی۔

بالآخر عاصمہ کو وداع کرنے کا بھی لمحہ آن پہنچا۔ وہ سرخ عنابی عروسی جوڑے میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میں اور فہیم اس کے سر پر باری باری ہاتھ رکھ رہے تھے۔ فہیم تو بے چارہ معذور تھا۔ رخصت ہوتے وقت.... عاصمہ ہم سے باری باری لپٹ کر رو پڑی۔ بلاشبہ بڑا کڑا وقت ہوتا ہے یہ۔ مجھے دکھ کے ایک شدید احساس نے آن لیا تھا جب مجھے امی اور ابو کی یاد آنے لگی۔ آج وہ زندہ ہوتے تو کس قدر خوش ہوتے۔

شادی اپنی حیثیت کے مطابق دھوم دھام سے کی گئی تھی۔ اب تو مجھے نوکری بھی مل گئی تھی جو بہر حال...... لاری اڈے کی نوکری سے بدرجہ بہتر تھی۔

عاصمہ کے پیا دیس وداع ہو جانے کے بعد گھر سونا سونا محسوس ہونے لگا۔

ایک عاصمہ بہن ہی تو تھی جو فہیم کے ساتھ رہتی تھی اور یوں ایک ایسے بھائی کا دل بھی بہلا رہتا تھا جو بے چارہ چلنے سے معذور تھا۔

اب چند روز بعد میں خود بھی بحرین روانہ ہونے والا تھا۔ وہاں مجھے جانے کتنے دن لگ جاتے۔ فہیم تو بالکل تنہا ہو کر رہ جاتا۔ تاہم اس کے ساتھ کالیا نے رہنا تھا۔ عاصمہ بھی ظاہر ہے آتی جاتی رہتی۔ میں نے سب کو یہی بتایا تھا کہ مشرق وسطیٰ کا میرا یہ دورہ کمپنی کی طرف سے تھا اور میں انہی کے ایک کام سے جا رہا تھا۔ وغیرہ۔

میں نے اس دوران فوزیہ کو کئی بار کال کی تھی مگر اس کا نمبر بدستور بند جا رہا تھا۔

مجھے اب تشویش لاحق ہونے لگی۔ کالیا سے میں نے اس بات کا اظہار کیا تو وہ بولا۔

"صاف سی بات ہے، اس کے باپ کا غصہ اب تک نہیں اترا۔ اس روز تیرے اور چاچا انور شاہ کے ساتھ ناروا برتاؤ کے باوجود بھی، حتیٰ کہ تمہیں نوکری سے بھی بے دخل کر دیا اور اب اپنی بیٹی کو بھی اسی نے ہی ایسا کرنے کو کہا ہوگا۔"

"لیکن فوزیہ ایسی نہیں ہے یار!" میں نے دل مسوس کر کہا۔ "وہ باپ کے ہزار بار منع کرنے کے باوجود مجھے فون ضرور کرتی۔ مجھے لگتا ہے اس کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔"

"سیدھی سی بات ہے۔ ہو سکتا ہے اس سے سیل فون ہی چھین لیا ہو۔" کالیا نے خیال ظاہر کیا۔

"یہ جہالت ہوگی پھر...... ایک باپ کا اپنی بیٹی سے یہ رویہ ظالمانہ ہی کہلائے گا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کون یہ دیکھتا ہے۔ کہو تو اس کی خیریت کا کوئی سبب ڈھونڈا جائے؟" کالیا نے اچانک معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیسے؟" میں نے پرامیدی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ سوچ لیتے ہیں۔ ویسے یار جگری! اچھی بات ہے کہ مجھے وہاں کسی گڑبڑ کی بو آرہی ہے۔" کالیا نے آخر میں کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ یہی میرا خیال بھی تھا۔

میرے دل کو فوزیہ کی طرف سے ایک عجیب سی بے چینی لگ گئی اور میں فوراً اس سے ملنے کو بیقرار سا ہونے لگا۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(خالدہ شیخ چنیوٹ کا جواب)

شیخ عنایت............چنیوٹ

نفرت سے شہر والے ملے اس سے سارے دن
کیا کرتا گاؤں لوٹ گیا رات ہو گئی

سدرہ بانو ناگوری............کراچی

ناامیدی ہے دیدنی اس کی
جس کو اپنا بھی انتظار نہ ہو

(ناصر اشرف ملتان کا جواب)

نزاہت افشاں............مہورہ فتح جنگ

میں کہ رہتا ہوں بصد ناز گریزاں تجھ سے
تو نہ ہوگا تو بہت یاد کروں گا تجھ کو

آفاق حیات............سرگودھا

میں اب کے سال بڑی آفتوں کی زد پہ ہوں
حصار ٹوٹ رہے ہیں مری دعاؤں کے

(خالدہ شیخ چنیوٹ کا جواب)

ڈاکٹر ادیب الغنی شکیل............ملتان

میں تمہیں کیسے بتاؤں کیا کہو
کم کہو، اچھا کہو، اپنا کہو

شیر نواز گل............پشاور

فاختہ کی مجبوری یہ بھی کہہ نہیں سکتی
کون سانپ رکھتا ہے اس کے آشیانے میں

(عبدالجبار رومی قصور کا جواب)

فلک بخت عبدالندیم............حیدرآباد

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا

(ادریس خان کراچی کا جواب)

عبدالستار............ساہیوال

اس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

غضنفر عباس مرزا............اسلام آباد

اے جذبہ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے

(الطاف حسین چنیوٹ کا جواب)

نزاہت افشاں............فتح جنگ

مجھ کو دھوکا دے گیا میرا ذوق انتخاب
جو لوگ میرے نہ تھے مجھے وہی اچھے لگے

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

عبدالحکیم شمر............کراچی

گئی جو یکا یک ہوا پلٹا نہیں میرے دل کا قرار
کروں غم والم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے

نائلہ امداد حسین............لاہور

گلستاں کا ہر پھول اترا رہا ہے
کوئی بہر گل گشت، کیا آرہا ہے

انیس الحق............سکھر

گلستان بھی تیرا بیاباں بھی تیرا
تو ہے معتبر نامور تو ہی تو ہے

(سدرہ بانو ناگوری کراچی کا جواب)

اسد علی............شیخوپورہ

امیر زادوں سے دلی کے مت ملا کر میر
کہ ہم غریب ہوئے ہیں انہی کی دولت سے

منشی عزیز مگے............وہاڑی

ابتداء میں ہر مصیبت پہ لرز جاتا تھا دل
اب کوئی غم امتحانِ عشق کے قابل نہیں

(شبیر شاہ گڈو بیراج کشمور کا جواب)

نیلوفر شاہین............اسلام آباد

حسن کیا ہے، عشق کے حسنِ نظر کا نام ہے
چاندنی خورشید عالمتاب کا انعام ہے

(ذیشان افسر کراچی کا جواب)

غضنفر عباس مرزا.........اسلام آباد

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

آفتاب حسین.........لاہور

یہ گھر ہے کس کا ہے کون مالک
مکاں پہ تختی لگی نہیں ہے

(نورین فاطمہ کا جواب)

شبیر شاہ.........گنڈ وبیراج کشمور

اس باغ میں اک پھول کھلا میرے لیے بھی
خوشبو کی کہانی میں میرا نام تو آیا

(عباس بٹ لاہور کا جواب)

نسیم منظر.........بفرزون کراچی

رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصر
تم نے یہ دولت بیدار کہاں سے پائی

(عبدالحکیم شمر کراچی کا جواب)

ارباب شیخ.........چنیوٹ

وقت کا مانی و بہزاد ہوں لاریب مگر
کیا کروں جب تری تصویر بنائے نہ بنے

محمد معیز.........لاہور

وجہ رسوائی نہ بن جائے ضرورت میری
مجھ کو نیلام نہ کر دے کہیں غربت میری

زاہد علی.........کراچی

وقت کا فیصلہ ضروری ہے
مجرموں کو سزا ضروری ہے

اشفاق احمد.........دینہ جہلم

وظیفوں اور انعاموں کی دعوت تھی مگر عشرت
ہم اپنی شاعری کا رنگ درباری نہ کر پائے

شکیل اختر.........لاہور

وہ آ کے دفعتاً جو ہم آغوش ہو گئے
جتنے گلے تھے دل میں فراموش ہو گئے

(شبیر شاہ گنڈ وبیراج کا جواب)

عباس شاہ.........سکھر

یکہ رنگیوں کے ساتھ وہ رہتا نہ تھا کبھی
بیگانہ تھا کبھی تو وہ تھا آشنا کبھی

معین الحسن.........ملتان

یہ دہشت تو اس دور کی دین ہے
وراثت نہیں ہے یہ اجداد کی

(ہادیہ ایمان، ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)

شکیل احمد.........کراچی

اے دور بے ہنر یہاں تسکینِ ذوق میں
گر ہاتھ بھی قلم ہو تو حیرت نہیں کرو

افسر خاں.........پشاور

اپنی قسمت سے تھی منسوب تباہی آخر
ان کے سر کوئی بھی افتاد نہ آنے پائے

(اقبال علی شجاع آباد کا جواب)

عبدالستار.........ساہیوال

کوئی رہبر نہ کوئی راہ نہ منزل کوئی
قافلہ دیکھیے کس سمت روانہ ہو گا

(عبدالستار ساہیوال کا جواب)

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان.........فورٹ عباس

فقیہ شہر نے تہمت لگائی ساغر پر
یہ شخص درد کی دولت کو عام کرتا ہے

(سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا کا جواب)

انعام الحسن.........لاہور

اسی رنگ کا پھول اس نے چنا
جو اک رنگ میری وفا میں نہیں

توحید احمد.........سرگودھا

اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا باغ

امیر حمزہ اشرف.........ملتان

تمہیں بھولنے کا سوچیں گے
جب کبھی دل پہ اختیار ہوا

نصیر ہمدم.........سیالکوٹ

اب آس نہیں کوئی شناسا کوئی ہمدم
اک زخم شناسائی کی تقدیر ہوا ہے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔



...رے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

...م: ....

...تا: ....

....

...انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

...سی ایک پر ☑ کیجیے۔

...پن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 مئی 2018ء تک علمی آزمائش 148 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

مقابلہ بیت بازی

...قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

...نام ....

....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کر لیں (شعر الگ کاغذ پر ہے) 110

مقابلہ بیت بازی۔
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش-148

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک صفحی سرگزشت" کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت طلب فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 مئی 2018ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

13 جون کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ سیاست میں آئے تو برصغیر کے مقبول لیڈر بن گئے ہوئے۔ حکومت میں بھی شامل رہے اور اپوزیشن لیڈر کے طور پر بھی شہرت حاصل کی۔ کراچی میں مدفون ہیں۔

علمی آزمائش 146 کا جواب

اس بار تاریخ پیدائش اور تاریخ انتقال کو گڈمڈ کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا گیا پھر بھی قارئین نے صحیح جواب تلاش کر لیا۔ جواب یوں ہے۔ "اکبر الٰہ آبادی الٰہ آباد کے سیشن جج تھے۔ اسی شہر میں 16 نومبر 1846ء کو پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ اتنا کچھ کہا کہ شعراء کی فہرست میں سب سے اوپر ان کا نام لکھا جانے لگا۔ اپنے دور کے نامور شاعر مانے گئے آج بھی ان کی شاعری کو لوگ پسند کرتے ہیں الٰہ آباد میں ہی 15 فروری 1921ء میں انتقال ہوا۔"

انعام یافتگان

1۔ اکبر جلال، لاہور　　2۔ فصیح اللہ، پشاور　　3۔ نثار میمن، سکھر

4۔ ابرار مجیب، کراچی　　5۔ افتخار الدین، الیاس احمد، کراچی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نگار مصطفیٰ، نشاط فاطمہ، آفتاب حسین، انیس اختر، محمد شعیب، باسط حسن، ندیم عشرت، مہر خورشید، مسعود، وجاہت وکیل عثمان خان، مشعل جہاں، نسیم منظر، شمیم احمد، ناعمہ تحریم، اختر حمید، حیات محمد، محمد علی حسرت، علی، ملک نواز حسن، ذیشان احمد، محمد قاسم، شفیق احمد، زاہد رانا۔ لاہور سے نیاز بٹ، شفیق احمد، شاہینہ بتول، محمد طارق، احمد تارا، ابن حسن، میجر (ر) حسن علی دلشاد، ابوالجلال، اظہر حیات، سیف علی خان، آذر علی، انیق احمد، آرزو وحید،

راجہ الطاف، آصف جعفری۔ ملتان سے باسط سلطان، اطہر علی اطہر، اشرف حسن خان، اکبر حیات خان، نوازش یقین رند، عنبرین چشتی، محمد معین چشتی، آغا علی حیدر۔ مردان سے نعمان۔ بہاولپور سے مومنہ کشف، سید محمد لئیق، لئیق، احمد صدیقی، محمد عثمانی۔ بہاولنگر سے آفتاب کریمی، رضا علی سید، خلیل خان کانپوری، ابراہیم حسن۔ پشاور سے ...رانی، الطاف سعید، وحید جان (ارمڑ پایان)۔ حیدرآباد سے مسکان بھٹو، ظفر ندیم وہرہ، ماہ رخ، تنویر حسین، ابومحمد، ...ئی، نصیر احمد، مدثر حیدر، اصغر شاہ، احسان صدیقی، نعمان بھٹو۔ راولپنڈی سے ملیحہ نقوی۔ نورعین، افتخار خان، زبیر ...ین خان اچکزئی، طارق حبیب، سید عباس رضا رضوی، ڈاکٹر سعادت علی خان، حسین شاہ، ظفر علی خان، ناصر حسن، ...یہ کائنات علی، تہمینہ علی۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ رحیم یار خان سے شاہد خان، ملک سرفراز، اخلاق احمد، سالک ...۔ ساہیوال سے زین الایمان احمد قریشی، عبدالستار، ادریس احمد، ارشاد الحق۔ لاڑکانہ سے فرحت جوکھیو، ...الحق، اسماعیل جمالی، انیس احمد۔ آزاد کشمیر سے محمد فہیم بھگت (بھمبر)، نصیر احمد (چناری) فراز گلِ (مظفر آباد)۔ ...سے عنایت علی، سعد بھٹو۔ حافظ آباد سے نظر محمد، اسلام احمد۔ کشمور سے شبیر شاہ، ذیشان علی، عیسیٰ خیل سے نصرت ...۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے اشرف علی، کمالیہ سے نیاز الدین، نرجس خاتون۔ تنویر الحسن، صغدر شیرازی، نسرین اشرف، ...بانو، رانا فتح یاب، زاہد عباسی۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، ممتاز احمد، کشور جہاں، توصیف احمد، صدیقی الرضی، ...اللہ خان، خضر حیات عباس، نیاز اللہ، شاہین اشفاق، سعید اختر، ردا ممتاز، انور یوسف زئی، شہناز فیضی، محمد متین، ...ری، محمد شہزاد، بیدری اکرم۔ ملتان سے محمد بلال اقبالی، محمد سعید چشتی، نورین افشاں، ایاز سومرو، زندان خان، کلیم ...انی، ذیشان ملک، فرحت مغیر، قدوس بخش، سعیدہ جلال، فاضلی خان اچکزئی، لبنیٰ ظہیر، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، محمد ...فرزانہ ملک، زینب چوہان، قدوس بخش، جہلم سے ارباز خان، ملک سرفراز، ندیمہ امتیاز۔ فیصل آباد سے محمد زاہد، ...عبدالعزیز (سنتدری)۔ جھنگ سے عطا مصطفیٰ۔ گجرانوالہ سے الف اے کھوکھر۔ چکوال سے رمضان وٹو، ...حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک۔ منڈی بہاؤالدین سے خرم جہانزیب۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا ...) ایم شفیق قدسی (مسلم بازار)۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، ...ان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قتیل سید پوری، تقی چنگیزی، نگار بٹ، صالح بشیر، نصرت چنگیزی۔ ...سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزماں، عظمیٰ اکملی ٹوانہ، خلیق ...، مظفر حیات۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، فہیم اللہ، نصیر جتوئی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید ابشام اشرف ...۔ حیدرآباد سے احمد انصاری، بابر خان، طہٰ یاسین، اعجاز زہرا۔ میرپور خاص سے مجاہد علی ایس بھٹی۔ کھاناں سے ... کامریڈ۔ پاک پتن سے علی محمد (حسن پورہ)۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ چھچھ برہ زئی سے ذوالفقار افضل ...ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ حاصل پور سے نعمان ادریس۔ ڈی جی خان سے موسیٰ خان۔ بہاولپور سے قاضی احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک۔ پاک پتن سے ذیشان مصطفیٰ۔ لیہ سے سحرش ملک، ادریس شاہ۔ چکوال ...ناز خان، فرحت حسن، ذیشان اشرف ملک۔ وہاڑی سے محمد ریاض، نصیر احمد۔ حضرو اٹک سے علی اصغر، فیاض ...ٹک سے ناصر حسین، عباس سید، نعمان علی، انیس حیدری، فرحت بخاری۔ جہلم سے ظہیر خان، خادم عباس، ...۔ فیصل آباد سے قیام الدین، منظر ندیم، مصطفیٰ علی، زہرہ نعیم۔ میرپور خاص سے فصیح علی کیف، ابرار الحق، ...ن، نشاط بیگم، نعمان الحسن۔ کوئٹہ سے احمد شاہ، لیاقت حسین، اعلیٰ علوی، محمد ذیشان۔ سکھر سے زاہد جوکھیو، تبسم ...احسن نواب۔ پاک پتن سے ظہیر احمد، انیس محمد، جعفر رضا۔ میانوالی سے وقار حسن، علی احمد، الیاس احمد، ...رحمن۔ خوشاب سے زر ولی خان، گل محمد، کوثر شریف، ملک احمد۔ شجاع آباد سے افتخار الحسن، فیض محمد۔ بہاولنگر ...علی، ناہید علی سید، ندیم الرحمن۔ نوشہرہ سے عنایت علی، عشرت علی۔ خانیوال سے محمد اقبال۔ اسلام آباد سے ...نگار، غضنفر عباس مرزا، انور یوسف زئی، نیلوفر شاہین، محمد عباس جعفری، مصطفیٰ حسن الیاس۔ ڈیرہ اسماعیل ...سے افنان علی عبداللہ۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری چکڑالوی۔

ممالک غیر سے امداد حسن، شریف الحسن (دبئی)، نیاز کرمانی (العین) ماسٹر عباس۔ عنایت رضوی (...)۔ اشرف ممتاز دانے والا (موزمبیق)۔

زبان کا زہر

جناب مدیراعلیٰ
سلام مسنون
ایک ایسی عورت کی سچ بیانی ارسال کررہی ہوں جس نے اپنے ساتھ بہتوں کی زندگی اجیرن کردی تھی، اگر غور سے اطراف کا جائزہ لیں تو اسی خصلت کے بہت سے کردار مل جائیں گے جو دوسروں کی زندگی میں خوامخواہ کی دخل اندازی اپنا حق سمجھتے ہیں۔

کرن صدیقی
(کراچی)

''یہ…… یہ کیسا پراٹھا ہے تمہیں کیا پراٹھا پکانا بھی نہیں آتا۔'' رقیہ بیگم نے بہو کو گھورتے ہوئے کہا، ابھی سبین جواب دینے کے لیے منہ کھول ہی رہی تھی کہ احمر بالوں کو تولیے سے خشک کرتا ہوا امی کے کمرے میں داخل ہوا۔

''کیا ہوا امی صبح صبح اتنے غصے میں ہیں؟'' ارشد نے ماں سے پوچھا تو وہ بولیں:

''ارے غضب خدا کا اس کی ماں نے اس کو پراٹھا تک بنانا نہیں سکھایا آخر اس کو آتا ہی کیا ہے؟ بس بن سنور کے باہر گھومنا۔''

رقیہ بیگم کے طنز کی تاب نہ لا کر سبین پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ احمر بھی بے مزہ سا ہو کر رہ گیا۔ ''آخر ہوا کیا ہے مجھے صرف یہ بتا دیں؟''

رقیہ بیگم کو اور تاؤ آگیا۔ ''یہ دیکھو یہ…… یہ پراٹھا ہے، اسے پراٹھا کہتے ہیں؟''

احمر نے تحمل سے کہا۔ ''تو اس میں کیا مسئلہ ہے؟''

رقیہ بیگم نے غصے سے کہا۔ ''ایسے پکتے ہیں پراٹھے، نہ اچھی طرح سنکے ہوئے نہ ہی صحیح گول ہیں اوپر سے گھی بھی کم ہے۔''

''بس اسی لیے آپ اتنا چلا رہی ہیں؟''

''مجھے ڈھنگ کا ناشتا بھی نصیب نہیں اور تم کہہ رہے ہو کہ میں چلا رہی ہوں، کیا میں اچھے ناشتے کی بھی حقدار نہیں۔''

احمر اپنی ماں کو بکتا جھکتا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل [illegible] کیونکہ یہ ایک دن کا قصہ نہیں تھا۔ ہر روز کی کہانی تھی۔ [illegible] سبین، رقیہ بیگم کی باتوں کو حتی المقدور نظر انداز کرتی تھی [illegible] پھر بھی رقیہ بیگم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی تھیں اور [illegible] کسی بات کو بہانہ بنا کر زبان سے گولہ باری شروع کردیتیں۔ کبھی کبھی جب سبین کا ضبط جواب دے جاتا [illegible] بھی کچھ نہ کچھ کہہ دیتی مگر اس نے تہذیب کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ صرف اپنے اوپر لگائے گئے الزامات [illegible] صفائی پیش کردیتی ورنہ زیادہ تر تو وہ خاموش ہی رہا [illegible] مگر اب وہ یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اس کی برداشت [illegible] ہو رہی ہے۔ پہلے بچے چھوٹے تھے وہ دادی کی تیز آواز [illegible] سہم کر خاموش ہو جاتے یا رونے لگتے تھے مگر اب تو وہ بھی چیخ پکار کے عادی ہو گئے تھے مگر سبین محسوس کر رہی تھی [illegible] کے مزاج میں عجیب سا جارحانہ پن در آیا ہے۔ رقیہ بیگم [illegible] رویے کی وجہ سے خود اس کے اعصاب بھی بہت کشیدہ [illegible] لگے تھے۔ اسے یوں لگتا تھا کہ گویا کسی دن اس کا اعصابی [illegible] اس حد تک پہنچے گا کہ اعصاب ٹوٹ جائیں گے اور دماغ [illegible] رگیں پھٹ جائیں گی۔ موت کے دامن میں پریشانیوں [illegible] الجھنوں سے نجات مل جائے گی۔

سبین کوئی جاہل عورت نہیں تھی۔ ماسٹرز کر رکھی [illegible] اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ ساس بہو کا رشتہ ہی [illegible] کہ دونوں کی کبھی بن نہیں سکتی۔ وہ اپنے گھر کی اکلوتی [illegible] لہٰذا بے حد لاڈلی تھی۔ اسے تو کبھی ڈانٹ تک نہیں پڑی [illegible]

یہ کہ صبح سے شام تک ساس کے ہاتھوں ذلیل ہونا۔ اچھی بات یہ تھی کہ احمر سبین کے ساتھ بہت اچھا تھا لیکن رقیہ بیگم کو برداشت کرنا بے حد مشکل کام تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتی ہوئی کچن کے کام نمٹاتی رہی، اس مسئلے کا کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ رقیہ بیگم کی ہر وقت کی چیخ پکار نے گھر کا سکون تباہ کر دیا تھا مگر انہیں تو اس بات کا احساس ہی نہ تھا۔ وہ تو اپنی دانست میں سبین کو نیچا دکھا دیا کرتی تھیں۔ وہ تو کہیے کہ بیٹا سعادت مند اور بہو سلجھی ہوئی تھی اگر یہ لوگ جاہل ہوتے تو ان کا تماشا پورا محلہ دیکھتا۔

"احمر کو آفس بھیج کر سبین نے پورے گھر کی صفائی کروائی ماسی کو کپڑے دھوتا چھوڑ کر ڈرتے ڈرتے رقیہ بیگم کے کمرے کی طرف آئی۔ اس نے دھیرے سے آواز دی۔ "امی!" اور جھانک کر دیکھا مگر رقیہ بیگم جس کروٹ پڑی تھیں پڑی رہیں۔ سبین نے انہیں دو تین مرتبہ پکارا پھر جواب نہ پا کر لوٹ گئی۔ وہ رقیہ بیگم سے دوپہر کے کھانے کا پوچھنے گئی تھی ان کے جواب نہ دینے پر سبین نے اپنی مرضی سے پکانے کا فیصلہ کیا۔ وہ صبح کی بدمزگی کو ختم کرنا چاہتی تھی اسی لیے اس نے رقیہ بیگم کی مرضی سے کھانا پکانے کا سوچا تھا مگر اس کی صلح کی یہ کوشش بھی ناکام گئی۔ اس وقت مٹر پلاؤ پکا لیتی ہوں، جلدی بھی پک جائے گا۔ بچے بھی شوق سے کھا لیتے ہیں، شام کو چکن قورمہ بنا لوں گی سب کو پسند ہے۔"

اس نے جلدی جلدی ہاتھ چلانا شروع کیا۔ بچے پونے دو بجے تک گھر آجایا کرتے تھے۔ شزاء اور زین قریب ہی کے ایک اسکول میں پرائمری کلاسز میں تھے اور وین سے اسکول آتے جاتے تھے۔ بچوں کے آنے سے پہلے ہی کھانا تیار تھا۔ کھانے کے لیے رقیہ بیگم کو بھی بلایا گیا مگر انہوں نے سب کو ڈانٹ کے بھگا دیا کہ کوئی ان کے کمرے کی طرف نہ آئے۔ عجیب بدمزگی کے عالم میں سب نے کھانا کھایا۔ سبین کو اتنا مزیدار پلاؤ حلق سے اتارنا مشکل ہو رہا تھا۔

کھانا کھلا کے بچوں کو سلانے کے لیے لٹایا کیونکہ تھوڑی ہی دیر میں قاری صاحب کو آجانا تھا۔ سبین کو اندازہ تھا کہ رقیہ بیگم کا موڈ آنے والے کئی دنوں تک ایسا ہی رہے گا۔ اس کی شادی کو پندرہ سال ہو رہے تھے۔ شادی کے تین سال بعد جب تک سبین کی گود ہری نہ ہوئی تو رقیہ بیگم نے گویا اسے نشانے پر ہی رکھ لیا تھا۔ صبح سے شام تک وہ کون سا لمحہ تھا جب وہ بے اولادی کے طعنے نہ سنتی۔ بانجھ ہے، ٹنڈ شاخ ہے، میرا خاندان ادھورا رہ گیا، ایسے الفاظ نشتر کا کام کرتے مگر چو... سال اللہ نے اسے صاحب اولاد بنا دیا تو سبین نے سمجھا شاید اب اسے سکون سے رہنا نصیب ہوگا مگر یہ اس کی خا... خیالی تھی۔ اللہ نے اوپر تلے زین اور شزاء جیسے پیار... پھولوں سے اس کے گھر کو مہکایا تھا مگر رقیہ بیگم کو ان کی ہدایا... اور ہر چیز پر اعتراض تھا اور اب تو ان سب باتوں کو بردا... کرتے ہوئے اسے پندرہ سال ہو گئے تھے۔

برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ گھر کے بگڑتے ہو... ماحول اور بچوں کی تربیت و اخلاق تباہ ہوتے دیکھتے ایا... دن دونوں میاں بیوی سر جوڑ کے بیٹھے۔ ہوا یہ تھا کہ اس ... زین اور شزاء کے اسکول سے شکایت آئی کہ ان دونوں ... اسکول میں ایک دوسرے سے لڑائی کی اور چیخ چیخ... بددعائیں و کوسنے دیے۔ جب ٹیچر نے دونوں کو سمجھایا اور... کہ ایسی زبان استعمال کرنا غلط ہے، اچھے بچے ایسا نہیں... کرتے تو دونوں نے دلیل پیش کی کہ دادی بھی تو ایسے ہی ... ہیں۔

پرنسپل نے سبین اور احمر کو بلا بھیجا۔ جب یہ بات ا... کے علم میں آئی تو دو بے حد شرمندہ ہوئے۔ اگرچہ پرنسپل خاصے مہذب اور نرم انداز میں بات کی تھی مگر پھر بھی دونو... شرم سے گویا زمین میں گڑتے جا رہے تھے۔ پرنسپل نے وا... کر دیا کہ ایسی باتوں سے ان کے اسکول کا ماحول خراب ہوگا اور وہ لوگ کوشش کریں کہ دوبارہ یہ سب نہ ہو ورنہ اسکو... اس معاملے کو خود دیکھے گا۔ اس بات کا مطلب وہ اچھی طر... سمجھ گئے یعنی پھر کوئی ایسی بات ہوئی تو بچوں کو اسکول نکال دیا جائے گا۔

گھر آکر بھی دونوں دیر تک گم صم رہے۔ احمر آ... جانے کے بجائے گھر میں ہی ٹھہر گیا۔ سبین کھوئی کھوئی سی گھ... کے کام کر رہی تھی۔ بار بار اس کے ذہن میں یہی خیال آتا تھا کہ اس کی تربیت میں کہاں کوتاہی رہ گئی ہے۔

نجانے کتنے دن ایسی کیفیت میں بیت گئے۔ گھر ... فضا بہت کشیدہ ہو رہی تھی۔ سبین اور احمر کے درمیان بھی ... کام کی بات ہوا کرتی۔ بچوں کو بھی اس دن کی شکایت ... سبب جو پھٹکار پڑی تھی تو وہ بھی خاموش خاموش سے تھے۔ ... ایک شخصیت تھی جواب بھی جوالا تھی۔ وہ تھیں رقیہ بیگم۔ ان کی زبان حسب دستور طنز کے نشتر برسانے میں مصروف تھی۔ ... دن سے سبین محسوس کر رہی تھی کہ جیسے احمر اندر ہی اندر ... الجھن میں مبتلا ہیں۔ سبین نامعلوم سے خوف کا شکار تھی ...

...نے کیا بات ہو اور بالآخر ایک دن اس کی شکل میں سامنے آ ...گیا۔

اس دن احمر خلاف معمول صبح سے کچھ زیادہ ہی ...ش تھا۔ اتفاق سے وہ ہفتہ وار تعطیل تھی۔ آج احمر نے ...ہ کو گھر پر بلایا تھا۔ احمر اور فاخرہ دو ہی بہن بھائی تھے اور ...ہ کی شادی خالہ زاد سہیل سے ہوئی تھی۔ اس کے تین بیٹے ...۔ فاخرہ کو احمر نے صبح سے بلایا ہوا تھا۔ اس کے شوہر کو شام ...آنا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ رات کا کھانا کھا کے وہ لوگ ...تے۔ فاخرہ تقریباً بارہ بجے تک آئی۔ دونوں گھرانے سحر خیز ...لہٰذا صبح جلدی آنے جانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ احمر رسمی ...داری کے بعد بہن کو امی کے کمرے میں لے گیا۔ رقیہ ...بیٹی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ فاخرہ کا آنا کم کم ہوتا تھا ...لیے رقیہ بیگم نے بیٹی کو بہت دنوں بعد دیکھا تھا۔ تھوڑی ...حال احوال پوچھا پھر احمر نے بات شروع کی۔ "آپا آپ ...تا ہے آج میں نے آپ کو کیوں بلایا ہے؟"

فاخرہ نے ناسمجھی کی سی کیفیت میں بھائی کو دیکھ کے نفی ...سر ہلایا۔

احمر نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ "سمجھ میں ...یں آرہا کہ کیسے بات شروع کروں لیکن بات یہ ہے کہ امی کا ...و انتہائی ناقابل برداشت ہو گیا ہے اور دل پر پتھر رکھ کر یہ ...لہ کرنے پر مجبور ہوا ہوں کہ اب امی کو یہاں سے رخصت ...ر دوں۔"

کمرے میں جیسے بم پھٹا۔ کتنے ہی منٹ تک کسی کے ...سے کوئی آواز نہ نکلی پھر فاخرہ نے ہی زبان کھولی بلکہ زبان ...ن کیا کھولی وہ تو جیسے پھٹ پڑی تھیں۔ "تم ہوش میں تو ہو؟ ...نتے بھی ہو کہ کیا کہہ رہے ہو؟"

احمر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "جی اچھی طرح جانتا ...ں اور نہ جانے کتنے دنوں کے سوچ بچار کے بعد اس نتیجے ...پہنچا ہوں کہ موجودہ صورت حال میں اس سے اچھا فیصلہ ...ئی اور نہیں ہو سکتا۔"

رقیہ بیگم جو ابھی تک صم بکم تھیں۔ ایک دم جیسے ہوش ...میں آگئیں۔ "دماغ خراب تو نہیں ہو گیا تمہارا؟ میں کیوں ...ں اور جانے لگی۔"

احمر نے کہا۔ "اس لیے کہ جو کچھ آپ کرتی رہی ہیں۔ ...نے نہ صرف میرے گھر کا ماحول، سکون بلکہ میرے بچوں ...خلاق بھی تباہ کر دیا ہے۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا اس دن ...میں کس قدر شرمندگی کا شکار ہوں، جس دن سے پرنسپل

روٹی اور ڈبل روٹی کی تاریخ

از منہ قدیم ہی سے فلسطین میں گیہوں اور جو بہت بڑی مقدار میں پائے جاتے تھے، یہیں سے روٹی کی ابتداء ہوئی، اس کی تائید ان آثار قدیمہ سے ہوتی ہے جو فلسطین اور اس کے گردونواح کی کھدائی سے حاصل ہوئے ہیں۔ فرعونوں کے مقبرے سے بچی کچھی روٹیوں کے پائے جانے والے چورے سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ روٹی میں خمیرا، استعمال کرنے والی وہ پہلی قوم تھی۔ اہرام مصر کے تہہ خانوں سے جو مخطوطات ملے ہیں، ان آثار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون ڈبل روٹی کی تین اقسام سے واقف تھے۔ گول، تکونی اور مچھلی کی شکل میں!! ان آثار قدیمہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم مصری ٹیکس کے طور پر باریک آٹا اور دانے ادا کرتے تھے۔ رومیوں کے مقابلے میں یونانیوں میں گیہوں اور خمیر والی ڈبل روٹی کا استعمال قدرے بعد میں ہوا کیونکہ وہاں پر گیہوں اور تنوروں کا استعمال 170 قبل از مسیح میں شروع ہوا۔

روم کے امراء گری اور تل وغیرہ سے مزین ڈبل روٹی استعمال کرتے تھے۔ اہل روم صقلیہ، سارڈینیا، اسپین، شمالی افریقا اور بالخصوص مصر سے گیہوں درآمد کرتے تھے۔ شہنشاہ روم کی خورونوش کی تو ایک تہائی ضروریات صرف گیہوں سے پوری کی جاتی تھیں۔ از منہ وسطیٰ تک اہل یورپ کو گیہوں کی ڈبل روٹی کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا۔

انگلستان میں خمیر والی ڈبل روٹی کی ابتداء زمانہ وسطیٰ میں ہوئی۔ البتہ امریکی باشندے اس وقت تک ڈبل روٹی سے قطعی ناآشنا تھے۔ جب تک کہ کولمبس "نئی دنیا" میں داخل نہیں ہو گیا۔ میکسیکو میں لوگ مکئی کے باریک آٹے کی پکی روٹی کھاتے تھے جو آج بھی کھائی جاتی ہے۔ یہ روٹی اس وقت بھی گول شکل کی تھی جسے "ٹورٹیلا" کہتے تھے۔

مرسلہ: نثار علی فاروقی۔ جھنگ

نے ان بچوں کے خراب رویوں اور گندی زبان کی شکایت کی ہے۔ وہ یہ سب کہاں سے سیکھتے ہیں، کیا میں اور سبین اپنی اولاد کی ایسی تربیت کررہے ہیں۔ آج یہ بچے چھوٹے ہیں لیکن ان کی تربیت کی بنیاد تو ابھی سے پڑتی ہے اور وہ بہت غلط پڑ رہی ہے۔"

فاخرہ کو سارے معاملے کا علم تھا لیکن یہ مسئلہ اتنا گھمبیر تھا کہ وہ کچھ کہہ بھی نہ پارہی تھی۔ رقیہ بیگم کے کوسنے، طنز و تشنیع اور بددعائیں پوری رفتار سے جاری تھیں۔ انہوں نے سارا الزام سبین پر لگادیا کہ اس کی وجہ سے ان کے بیٹے نے اتنی بڑی بات کہی۔ احمر یہ بات خاموشی سے سنتا رہا اور پھر بولا۔

"میں نے فیصلہ کرلیا ہے جو کسی قیمت پر نہیں بدلوں گا۔ آپ کو آپا کے ساتھ رہنا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں آپ کو الگ گھر ارینج کردوں گا مگر اب آپ کے ساتھ ہمارا گزارہ ناممکن ہے۔"

جب رقیہ بیگم نے دیکھا کہ ان کی کسی بات کا اثر بیٹے پر نہیں ہورہا تب انہوں نے عورتوں کے روایتی اور آزمودہ ہتھیار یعنی آنسوؤں کا سہارا لیا۔ احمر اور فاخرہ ماں کے زار و قطار رونے سے بے چین ہورہے تھے مگر یہ بھی جانتے تھے کہ اگر ایک لفظ بھی نرمی کا زبان سے نکالا تو اب تک کی کہی گئی تمام باتیں بے اثر ہوجائیں گی۔ کسی زمانے میں بخار کا علاج کونین سے کیا جاتا تھا جو کڑوی تو بہت ہوتی تھی مگر بخار اور ملیریا کا خاتمہ کردیتی تھی۔ آج بھی اکثر ان امراض کا علاج نشتر سے کیا جاتا ہے جن پر دوائیاں اثر نہیں کرتیں۔

رقیہ بیگم اپنی غلطی ماننے کو تیار نہ تھیں۔ احمر نے دل پر پتھر رکھ کر ماں کو بہن کے گھر بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کچھ بھی ہوجائے رقیہ بیگم سبین کے ساتھ کبھی بھی اچھی طرح نہیں رہ سکیں گی۔ اسے بیٹی تو درکنار بہو کا درجہ بھی کبھی نہیں دیں گی۔ نہ جانے انہوں نے روز اول سے ہی کیوں سبین سے بیر باندھ لیا تھا حالانکہ وہ ان کے اکلوتے بیٹے کی بیوی تھی اور بہت خوبیوں کی مالک تھی۔ نہ صرف گھر کو اچھی طرح چلا رہی تھی بلکہ ساس کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرنے کی کوشش کرتی تھی، یہ اور بات کہ رقیہ بیگم اس کی ایسی ہر کوشش کو ناکام بنادیتی تھیں۔

بہت بدمزگی کے عالم میں بادل نخواستہ رقیہ بیگم فاخرہ کے ساتھ رخصت ہوئیں لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ احمر کے گھر میں تو وہ ملکاؤں کی طرح رہ رہی تھیں مگر سہیل، احمر جیسا نہیں۔ حالانکہ وہ داماد ہونے کے علاوہ سگا بھانجا بھی تھا مگر اس کا مزاج بہت لیے دیے رہنے والا تھا۔ راستے بھر ماں بیٹی دونوں چپ رہیں۔ بات کرنے کو تھا بھی کیا۔ رقیہ بیگم ابھی بھی خود کو مظلوم اور سبین کو تمام فساد کی جڑ سمجھ رہی تھیں۔ فاخرہ کے گھر پہنچ کر بھی وہ گم صم بنی رہیں اور اگلے کئی دن ... رہیں مگر رفتہ رفتہ جب رقیہ بیگم صدمے سے باہر نکلیں ... گرد کے ماحول کو محسوس کرنا شروع کیا۔ فاخرہ کے دو ... لڑکے بڑے تھے۔ چھوٹا والا انٹر میں تھا اور بڑا انٹر ... پروفیشنل انسٹی ٹیوٹ میں کورس کررہا تھا۔ لہٰذا دونوں ... کا زیادہ تر وقت باہر گزارتے تھے۔ پہلے پہل تو رقیہ بیگم ... کے گھر کا معمول خاموشی سے دیکھتی رہیں۔ صبح ... گھر کی طرح فاخرہ کے یہاں بھی افراتفری کا منظر ... سہیل اور دونوں لڑکے ناشتے کے لیے جلدی جلدی ... مچاتے۔ فاخرہ کو جلدی جلدی ہاتھ چلانا پڑتا تھا۔ رقیہ بیگم کو نہار منہ چائے پینے کی عادت تھی مگر فاخرہ اتنی مصروف ... تھی کہ اکثر تو وہ ماں کو چائے دینا بھی بھول جاتی یا ... چائے دینے کی فرصت ہی نہیں ہوتی تھی۔ تین افراد ... ناشتے اور لنچ کا انتظام کرنا اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ رقیہ ... نے حسب عادت اس چھوٹی سی بات کا بھی بہت برا ...

"ارے صرف میرا ہی چائے کا کپ دینا فاخرہ کو بھاری ... ہے، میاں اور بچوں کے تو بھاگ بھاگ کے کام کرتی ..." وہ جی ہی جی میں کڑھتیں پھر بھی کسی لمحے انہیں سبین یاد آجاتی جو صبح اٹھ کے سب سے پہلے ان کو چائے دیتی بعد میں ... کرتی۔ کچھ دن تو رقیہ بیگم خاموش رہیں مگر عادت ... ایک دن انہوں نے بیٹی کو ٹوک ہی دیا۔ "ارے ... تمہیں ماں کو چائے کا کپ دینا اتنا بھاری لگتا ہے۔"

فاخرہ جو سبزی کاٹ رہی تھیں ایک دم چونکیں۔ "... سمجھی نہیں امی۔"

رقیہ اپنی مخصوص طنزیہ ہنسی ہنسیں۔ "ارے اب ... بھولی بھی مت بنو۔"

فاخرہ الجھ گئیں۔ "امی میں واقعی آپ کا مطلب ... سمجھی۔"

رقیہ بیگم نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ "کیوں ... نہیں معلوم ہے کہ میں صبح سب سے پہلے چائے پیتی ہوں ... بعد میں ناشتا کرتی ہوں۔"

فاخرہ شرمندہ سی ہوگئیں۔ "مجھے معلوم کیوں نہیں ... مگر آپ تو جانتی ہیں بلکہ خود دیکھتی ہیں کہ صبح کتنی افراتفری ہوتی ہے۔ میں بھول جاتی ہوں اتنے کام ہوتے ہیں ... میں۔ اچھا آئندہ کوشش کروں گی کہ یہ غلطی نہ ہو۔"

رقیہ بیگم نے برا سا منہ بنایا۔ "ہونہہ رہنے دو، غلطی نہ ..." انہوں نے فاخرہ کی نقل اتاری۔ "سب پتا ہے مجھے ... نظر میں اب ماں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

نقل اتارے جانے پر تو فاخرہ کو ہنسی آگئی مگر پھر آخری ... کر وہ سنجیدہ ہوگئی۔

"آپ خود ایک ماں ہیں تو بتائیے اپنے بچوں سے ... کر کیا ہوسکتا ہے۔ مجھے بھی صبح اپنے بچوں کی فکر سب سے ... ہوتی ہے۔ سہیل سے بھی زیادہ کہ میرے بچے پیٹ بھر ... کھائیں، بھوکے باہر نہ نکلیں اور یہ دن میں بھی بھوکے نہ ... اس لیے میرا دھیان کسی اور طرف جاتا ہی نہیں۔ سچ ... جب ہم بچے تھے تو آپ کو ہر چیز سے زیادہ ہماری فکر ... نہیں؟" فاخرہ نے ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

... بیگم نے تنک کر کہا۔ "تو اس کا مطلب ہے کہ اور ... کو نظر انداز کردیں۔"

"اچھا امی غلطی ہوگئی اب معاف کردیں آئندہ اگر میں ... بھولوں تو آپ مجھے یاد دلا دیجیے گا اب ٹھیک ہے نا۔" فاخرہ ... ماں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی آخری کوشش کی مگر نہ جی ایسا ... ممکن تھا۔ یہ رقیہ بیگم تھیں جن کو ہرانا مشکل ہی نہیں ... بھی تھا۔ خواہ وہ ان کی اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

پھر یوں ہونے لگا جیسے ہی فاخرہ کچن میں داخل ہوتیں ... بیگم کی صدا آتی "چائے بن گئی؟" فاخرہ کا جواب ہوتا "ابھی بس دو منٹ میں" اور کبھی یوں ہوتا کہ بچوں یا شوہر کے ... کام میں مصروف ہوجاتی اور چائے دینے میں تاخیر ہو ... رقیہ بیگم کا جو اس بات سے موڈ آف ہوتا تو پورا دن گزر ... ان کی پیشانی کے بل نہ جاتے۔ ہر کسی سے منہ پھلائے ... ویسے بھی انہیں داماد اور نواسوں سے بہت شکایتیں ... کہ وہ لوگ رقیہ بیگم کو وہ اہمیت نہیں دیتے جس کی وہ حق ... ہیں۔ داماد جو سگا بھانجا بھی ہے اس نے کبھی خالہ کے ... بیٹھ کر باتیں نہیں کیں۔ بس حال چال، خیر خیریت یا یہ ... چیز کی ضرورت تو نہیں؟ اور لڑکے...... وہ تو مصروف ... ہوتے تھے کہ انہیں نانی سے تفصیلی بات کرنے کا وقت ... نہیں ملتا تھا اور اگر وقت ملتا بھی تو وہ نانی سے کیا بات ... تے؟ وہ جتنی دیر گھر میں ہوتے تو نانی کی ڈانٹ ڈپٹ اور ... گفتگو ضرور سنتے۔ ان کے انداز پر اعتراض تھا کبھی ان ... ہیئر اسٹائل تو کبھی لباس پر۔ رقیہ بیگم کو فاخرہ سے یہ شکوہ ... رہتا کہ اس نے بچوں کی تربیت اچھی نہیں کی۔ ان کو کسی بات کی تمیز نہیں سکھائی۔ ان کی سمجھ میں یہ بات ہی نہ آتی کہ وہ نئے دور کے بچے تھے۔ وہ پچاس پچپن سال پہلے کے دور والے معیارات سے نہ تو واقف تھے نہ انہیں اپنا سکتے تھے۔ طرہ یہ کہ رقیہ بیگم کو ان کے کھانے پینے کے آداب، اوقات اور انداز پر خاصا اعتراض ہوتا تھا۔ لڑکے چائے کے بہت زیادہ عادی تو نہیں تھے لیکن اگر کبھی بہت تھکے ہوئے ہوتے یا رات کو دیر تک جاگ کر پڑھنا ہوتا تو چائے پیتے۔ رقیہ بیگم دیکھ لیتیں تو چیختیں۔ "ارے چائے خون جلاتی ہے کیوں پی رہے ہو، اے میں نے کہا مت پیو۔"

لڑکے بہت برا مانتے مگر رقیہ بیگم کو جو کہنا ہوتا وہ کہہ کے رہتیں۔ یا یہ کہ "گیم میں کیوں لگے ہوئے ہو بیٹھ کے کچھ پڑھ لو۔" لڑکے ماں سے شکایت کرتے۔ کیا ہم کچھ وقت کے لیے تفریح بھی نہیں کرسکتے؟

یہ سب کچھ سہیل بھی دیکھ رہے تھے مگر انہوں نے رقیہ بیگم سے براہ راست ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا مگر ان کے بدلے ہوئے تیور فاخرہ کے لیے ضرور خطرے کی گھنٹی بجارہے تھے۔ ان کی دعا تو یہی تھی کہ جو بھی ہو مگر ان کے شوہر کا ماں سے تصادم نہ ہو کیونکہ سہیل خاصے خشک اور سخت مزاج تھے۔ خصوصاً اپنی ذات، گھر اور بچوں کے حوالے سے تو کچھ بھی سننے کے روادار نہ تھے مگر رقیہ بیگم کو جیسے پروا ہی نہ تھی کہ جو کچھ وہ کہہ جاتی ہیں اس کا دوسرے شخص پر کیا اثر ہوگا۔ ایک دن سہیل نے فاخرہ سے بات کرنے کی ٹھانی۔ رات کو کھانے کے بعد کچن نمٹا کے جب فاخرہ، سہیل کے لیے گرم دودھ کا گلاس لے کے کمرے میں گئیں تو سہیل کسی گہری سوچ میں تھے۔

"خیر تو ہے اس طرح گم صم بیٹھے کیا سوچ رہے ہیں؟" فاخرہ نے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"خالہ کے مزاج میں نرمی اور لچک ذرا بھی نہیں ہے، ان کی کسی سے نبھنا بڑا مشکل ہے۔" سہیل نے بلاتمہید ہی سب کچھ کہہ ڈالا۔

فاخرہ جس لمحے سے ڈر رہی تھیں وہ لمحہ آہی گیا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں، امی کی سب سے بن جاتی ہے۔" فاخرہ نے دھیمے انداز میں کہا۔

"اچھا اگر ایسی بات نہیں تو سبین سے کیوں نہیں بنی، پندرہ سولہ سالوں میں؟ کم از کم میں نے تو نہیں دیکھا۔"

"بات یہ ہے کہ امی کا قصور نہیں۔ اس عمر میں آکر انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کم ہونے لگتی ہیں جسمانی و

ذہنی صلاحیتیں بھی کم ہو جاتی ہیں۔ دماغ بھی اس طرح کام نہیں کرتا۔ انسان چڑچڑا تو ہوگا نا۔" فاخرہ نے ماں کی طرف سے صفائی پیش کی۔

"چڑچڑا اس حد تک کہ اگلے کی زندگی عذاب بنا دے۔ یہ تو ناقابل برداشت ہے۔" سہیل گویا آج سارے بدلے اتارنے پر تلے تھے۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔" فاخرہ نے دوٹوک بات کی۔

"صرف یہ کہ اب میں گھر میں بچوں کے حوالے سے کوئی تنقید نہ سنوں۔ مجھے اپنے بچوں کی تربیت پر پورا اعتماد ہے اور ان کے کھانے پینے کی عادات بھی ناپسندیدہ نہیں پھر ہر وقت ان کا پیچھا لیے رکھنے کا مقصد؟" سہیل نے اب قدرے غصے سے کہا۔

"میں نے آپ کو بتایا تو ہے۔"

"ہاں تم نے بتایا، میں نے سن بھی لیا لیکن جو کچھ میں نے کہا وہ بھی نہ صرف کان کھول کے سنو بلکہ اپنے دماغ میں بھی بٹھا لو۔ اب میں کسی قسم کی تنقید نہ سنوں ورنہ بصورت دیگر مجھے وہ فیصلہ کرنا پڑے گا جو بہت تلخ ہوگا۔" سہیل نے اپنی بات ختم کی لیکن فاخرہ کے سر پر گویا چھت گر پڑی۔

وہ سہیل کی کہی گئی تمام بات سمجھ گئی تھیں اور جو کچھ سہیل نے نہیں کہا وہ بھی سمجھ گئی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں سہیل نے انہیں گویا یہ تنبیہہ کردی تھی کہ وہ اب رقیہ بیگم کی تنقید یا گھر کے معاملات میں مداخلت برداشت نہیں کریں گے اور بصورت دیگر جو کچھ ہوتا وہ فاخرہ سوچنا بھی نہیں چاہ رہی تھیں مگر وہ سمجھ گئی تھیں کہ اس صورت میں رقیہ بیگم کو اس گھر سے جانا پڑے گا۔ فاخرہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھیں کہ رقیہ بیگم اپنی زبان پر قابو رکھیں اور اب کوئی ناخوشگوار صورت حال پیش نہ آئے مگر ایسا کہاں ممکن تھا اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ رقیہ بیگم اپنی عادت سے مجبور تھیں۔ اس دن فاخرہ کا بڑا بیٹا علی کئی دن بعد ٹی وی لاؤنج میں آ کے بیٹھا تھا۔ اس کے فائنل ایگزامز چل رہے تھے اور وہ کئی دن سے اپنی پڑھائی میں مصروف تھا۔ گھر والوں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بھی نہیں بیٹھتا تھا اور سہیل کا کہنا تھا کہ اسے ڈسٹرب کرنے کی ضرورت نہیں کھانا کمرے میں ہی دے دینا۔ بہرحال امتحان ختم ہوئے تو اس بے چارے کو بھی کچھ سکھ کا سانس لینے کا موقع ملا۔ کئی دن بعد وہ اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ امتحان کا بوجھ سر سے اترنے پر وہ خود کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ریموٹ اٹھا کے چینل سرفنگ شروع کردی اور ساتھ ہی سہیل سے باتیں بھی کر رہا تھا جو اسے لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کے خود بھی وہیں چلے آئے تھے اور اب اس کے پاس بیٹھ کر اس سے پیپرز اور آگے کے پلان کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اتنے میں رقیہ بیگم بھی لاؤنج میں داخل ہوئیں اور علی کی طرف لپکیں چیل کی طرح جھپٹا مار کر اس کے ہاتھ سے ریموٹ چھینا اور ایک انڈین چینل لگا لیا جہاں سے ان کا پسندیدہ ڈراما آنے والا تھا۔ علی ہکا بکا ان کی شکل ہی دیکھتا رہ گیا۔ اسے نانی کا یوں ریموٹ چھیننا اچھا نہیں لگا تھا۔ سہیل کی پیشانی پر بھی ناگواری کے بل آ گئے مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ فاخرہ سمجھ گئیں کہ رقیہ بیگم کی یہ حرکت انہیں پسند نہیں آئی مگر خیر گزری کچھ دن سکون سے گزرے کیونکہ فاخرہ حکمت عملی سے رقیہ بیگم کی حرکتوں پر پردہ ڈالے رہتیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ رقیہ بیگم کو سمجھانا ناممکن تھا اور جو کچھ ان کی فطرت میں تھا اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات سہیل کو بھی معلوم تھی اس لیے وہ رقیہ بیگم سے نالاں تھے۔

برسات کے دن تھے۔ دو دن سے لگاتار بارش ہو رہی تھی۔ رقیہ بیگم کا دل مچل گیا۔ ان کے نزدیک پکوڑوں کے بغیر برسات کا موسم ادھورا تھا اور اتفاق سے گھر میں بیسن نہیں تھا۔ محلے کی کریانے کی دکان بھی بند تھی۔ اب کیا کیا جائے؟ ان کے تیز دماغ نے جھٹ پٹ مسئلے کا حل نکالا اور علی کے چھوٹے ایاز کو بیسن لینے دوڑایا۔ بے چارہ جانا تو نہیں چاہ رہا تھا مگر وہ رقیہ بیگم ہی کیا جو اپنی من مانی نہ کریں۔ ڈانٹ ڈپٹ کر کے آنکھیں دکھا کر اسے برستی بارش میں باہر بھیجا۔ فاخرہ احتجاج ہی کرتی رہ گئیں۔ علی سو رہا تھا ورنہ شاید اس کی شامت آتی۔ جگایا تو پہلے رقیہ بیگم نے اسی کو تھا مگر اس کی طبیعت خراب تھی۔ اس وقت بھی دوا کھا کے بے سدھ سو رہا تھا۔ اتنا جھنجوڑے جانے پر بھی اس کی آنکھ نہ کھلی تو ایاز کی شامت آ گئی۔ اس کو نکلنا ہی پڑا، فاخرہ دعائیں مانگ رہی تھیں کہ سہیل کے آنے سے پہلے پہلے ایاز گھر لوٹ آئے مگر ایسا نہ ہوا۔ بارش کی وجہ سے سہیل بھی جلدی گھر آ گئے۔ دروازہ فاخرہ نے ہی کھولا اور سہیل کی شکل دیکھتے ہی اس کی روح فنا ہو گئی۔ سہیل فاخرہ کے ہوائیاں اڑتے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اندر آ گئے۔ فاخرہ دعا مانگنے لگی کہ "اللہ بچوں کا نہ پوچھیں کیونکہ وہ حالات خراب ہوں یا موسم، بچوں کا باہر نکلنا قطعی پسند نہیں کرتے تھے اور یہ بارش بھی طوفانی تھی۔ تھوڑی ہی دیر پہلے فاخرہ نے موسم کی صورت حال

جاننے کے لیے ٹی وی لگایا تو نیوز ریڈر نے بتایا کہ طوفانی بارش کے باعث متعدد افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جگہ جگہ پانی جمع ہے۔ کہیں گھٹنوں تک کہیں کمر تک۔ بجلی کے تار ٹوٹ کے گرنے سے پانی میں کرنٹ آیا جس کے سبب لوگ ہلاک ہوئے اور اکثر مقامات پر مین ہول کے ڈھکن نہ ہونے کے باعث کتنے ہی موٹر سائیکل سوار زخمی ہوئے۔ فاخرہ یہ سب سن کے ہول گئیں۔ ایاز بائیک چلاتا بھی تیز تھا اور اس وقت تو وہ نانی کی زبردستی کے باعث گیا بھی بہت غصے میں تھا۔

فاخرہ کمرے میں گئیں۔ "کھانا کھائیں گے یا آرام کریں گے؟" انہوں نے سہیل سے پوچھا۔

"ہاں کھانا لگا دو کیا پکایا ہے؟"

"آلو قیمہ۔" فاخرہ مختصر جواب دے کر کمرے سے نکل گئیں۔ وہ چاہ رہی تھیں کہ ان کا اس وقت سہیل سے سامنا کم سے کم ہو مگر آج فاخرہ کی شامت آ گئی تھی۔ سہیل کھانے کی میز پر آئے تو رقیہ بیگم سامنے ہی تھیں اس وقت یا تو داماد کی محبت زیادہ جوش مار رہی تھی یا وہ بہت ترنگ میں تھیں۔ فاخرہ سے بولیں۔ "ارے ابھی سے کھانا دے دیا کچھ دیر تو رک جاتیں پکوڑے تل جاتے تو ایک ساتھ دسترخوان لگ جاتا۔"

سہیل نے بڑے خوشگوار موڈ میں کہا۔ "ارے خالہ! تو لے آئیں نا پکوڑے بھی۔ میں جب تک آہستہ آہستہ کھانا شروع کرتا ہوں۔"

"اے لو میاں! ابھی کہاں پکوڑے؟ ابھی پہلے بیسن تو آ جائے۔" انہوں نے ہاتھ جھٹکا۔

"بیسن؟ کہاں سے آئے گا بیسن؟" سہیل نے حیرت سے پوچھا۔ داماد نے اتنے عرصے بعد ان سے ذرا اچھے انداز میں بات کی تو رقیہ بیگم بھی پُرجوش انداز میں اپنی کارگزاری بتانے کے موڈ میں آ گئیں اور فاخرہ کے اشارے نظر انداز کر دیئے جو وہ انہیں چپ کرنے کے لیے کر رہی تھیں۔ فاخرہ نے انہیں سہیل کے آنے سے پہلے ہی سختی سے سمجھا دیا تھا کہ وہ ایاز کو باہر بھیجنے کا تذکرہ سہیل کے سامنے ہرگز نہ کریں۔ سہیل بچوں کے معاملے میں بے حد حساس تھے۔ رقیہ بیگم سے ان کی ناپسندیدگی اور بحث مباحثے بچوں کے ہی سلسلے میں ہوتے تھے مگر اس وقت رقیہ بیگم کو کچھ بھی یاد نہ رہا اور انہوں نے بڑے فخر سے ایاز کو باہر بھیج کر بیسن منگوانے کا قصہ کہہ سنایا۔ فاخرہ اندر ہی اندر کانپ رہی تھیں۔ سہیل کے پل پل رنگ بدلتے چہرے کو دیکھ کے انہیں لگا کہ شامت بس آئی ہی آئی اور یہی ہوا۔ فاخرہ کا خدشہ سچ ثابت ہوا۔ سہیل ہاتھ کا نوالہ پلیٹ میں پٹخ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"حد ہوتی ہے، خالہ آپ کو اس خوفناک بارش میں بچے کو باہر بھیجتے ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔ آپ مجھے کہہ دیتیں میں آفس سے آتے ہوئے بیسن لیتا ہوا آتا مگر آپ سے ذرا صبر نہ ہو۔"

رقیہ بیگم بھی اپنی پرانی جون میں آ گئیں۔ "اے لو میاں اگر تمہارے بچے کو ذرا سا باہر کیا بھیج دیا تم تو اس قدر دہاڑنے لگے یہ بھی کوئی بات ہے۔ ہائے کیا لوگ باہر نکلتے نہیں ہیں ایسے موسم میں۔ آخر تم بھی تو آ گئے ہی ہو نا ایسے موسم میں۔ اور لوگ کیا باہر نہیں نکلے ہوں گے؟"

سہیل نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”خالہ اگر کوئی ضروری کام سے باہر نکلا ہے تو الگ بات ہے۔ یہ بیسن لینا اس قدر ضروری کام تھا کہ آپ نے ایاز کو ایسی تیز بارش میں باہر بھیج دیا؟“

”ہاں تو کیا ہوا ابھی آجائے گا بیسن لے کے۔“ رقیہ بیگم نے بے نیازی سے کہا۔

سہیل نے ان سے مزید گفتگو کرنا فضول سمجھا فاخرہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”کب بھیجا تھا ایاز کو؟“

فاخرہ کا خون خشک ہوگیا۔ ”وہ ابھی جھٹ...... تھوڑی دیر پہلے۔“ انہوں ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

سہیل کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگے۔ مزید کچھ وقت گزرا سہیل کا غصہ اور فاخرہ کا خوف بڑھتا گیا۔ رقیہ بیگم البتہ اپنے کمرے میں جا کے لیٹ گئی تھیں اور جاتے جاتے فاخرہ کو ہدایت کرنا نہیں بھولی تھیں کہ بیسن آجائے تو انہیں بلا لیا جائے۔ اس بات نے تو سہیل کے غصے کو اور بھڑکا دیا تھا۔ جب ایاز بہت دیر تک واپس نہ آیا تو سہیل نے خود اس کی تلاش میں جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے رکے اور فاخرہ کو دیکھ کے فیصلہ کن انداز میں بولے۔ ”میں ایاز کی تلاش میں جارہا ہوں۔“

فاخرہ کیا کہتیں۔ سہیل کمرے سے باہر نکل گئے۔ سہیل کے جانے کے بعد سے وہ مسلسل جلے پاؤں کی بلی کی طرح اِدھر سے اُدھر گھومتی رہیں۔ ایک بار جو تپ چڑھی تو رقیہ بیگم کے کمرے میں گھس گئیں۔ رقیہ بیگم لیٹی ہوئی تھیں۔

”امی آپ کو کیا ضرورت تھی سہیل کے سامنے یہ سب کہنے کی؟“ فاخرہ نے تیز لہجے میں کہا۔

”ارے تو کیا قیامت آگئی تمہارا میاں کیا تھانیدار لگا ہوا ہے اس کے آگے اتنا دب کے رہیں۔“ رقیہ بیگم نے اس سے بھی تیز لہجے میں کہا۔ فاخرہ تو جھنجلا ہی گئی۔

”دیکھ لیا نا آپ نے کہ سہیل کو کتنا غصہ آگیا تھا۔ میں آپ کو منع کررہی تھی۔ اتنا سمجھایا تھا مگر آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔“ رقیہ بیگم بھی دبنے والی تو نہ تھیں ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھیں۔ آخر فاخرہ ہی تھک ہار کر کمرے سے نکل گئی۔ شام سے رات ہوگئی پھر آدھی رات ہوئی فاخرہ نے ڈرتے ڈرتے سہیل کے نمبر پر کال کی تو نور بلاتی۔ آخر صبح کے قریب سہیل گھر میں داخل ہوئے۔ سخت تھکے ہوئے لگ رہے تھے اور غم و غصہ بھی ان کے چہرے سے نمایاں تھا۔ علی بھی رات گئے تک جاگا اور وہ بھی یہ سارا قصہ سن کر بھائی اور والد کے لیے پریشان ہوگیا تھا۔ صرف ایک رقیہ بیگم تھیں جو اس ساری بات کو بہت نارمل لے رہی تھیں اور یہ کہہ کر آرام سے سوگئی تھیں کہ ”دیر سویر یہ لوگ آہی جائیں گے۔“

ساری رات فاخرہ دروازے سے لگی رہیں۔ علی بھی ماں کو تسلیاں اور دلاسے دیتا رہا جیسے ہی صبح دم دروازے کی گھنٹی بجی فاخرہ ایک دم لپکیں اور دروازہ کھولا سہیل کو دیکھ کے ان کی جان میں جان آئی۔ ”کہاں ہے ایاز؟“ انہوں نے بے تابی سے سوال کیا۔

”اسپتال میں۔“ سہیل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اس...... اسپ...... اسپتال۔“ فاخرہ کا لہجہ لڑکھڑایا۔

”اسپتال میں کیوں ہے، کیا ہوا اسے کس اسپتال میں ہے۔ مجھے بھی لے چلیں۔“ فاخرہ نے ایک سانس میں اتنی باتیں کہہ دیں۔

سہیل کی خاموشی پر انہوں نے ان کا بازو جھنجوڑ ڈالا۔ ”بتائیں ناں آپ بتاتے کیوں نہیں؟“

سہیل نے فاخرہ کو دیکھا پھر چند ثانیوں بعد بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”شکر کرو کہ اسے زیادہ کچھ نہیں ہوا ہے ورنہ تمہاری ماں نے تو میرے بیٹے کی جان لینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔“

علی بھی متفکر سا ماں کے ساتھ کھڑا ساری گفتگو سن رہا تھا۔ آوازیں سن کے رقیہ بیگم بھی کمرے سے نکل آئیں انہیں دیکھتے ہی سہیل کی آنکھوں میں شعلے بھڑکنے لگے۔ وہ ان کی طرف بڑھے اور عین ان کے سامنے جا کے ٹھہر گئے۔ ”آپ کو کیا دشمنی تھی میرے بچے سے، کیوں کیا آپ نے ایسا اس کے ساتھ؟“

”آئے واہ یہ اچھی رہی ارے میں نے کیا کرا ہا تمہارے بیٹے کے ساتھ؟“ رقیہ بیگم نے چمک کے کہا۔

”میں آپ سے کچھ اور نہیں کہنا چاہتا مگر جو کچھ آپ نے یہاں رہ کے کیا ہے وہ اب مزید میرے لیے قابل برداشت نہیں۔“ سہیل نے بہت ٹھہر ٹھہر کے ایک ایک لفظ ادا کیا۔

علی اور فاخرہ نے سہیل کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”چھوڑیں بابا آپ ایاز کا بتائیں وہ کہاں ہے۔“ علی نے باپ کو متوجہ کیا۔ فاخرہ نے بھی یہی سوال کیا۔

سہیل نے ایک نظر سب پر ڈالی اور بہت واضح الفاظ میں کہا۔ ”ایاز کی بائیک ایک مین ہول میں گر پڑی اس جگہ پانی گھٹنوں تک تھا جیسے ہی ایاز کی بائیک کا اگلا پہیا مین ہول

میں پھنسا ایاز بھی اچھل کر بائیک سے گر پڑا۔ پانی اتنا گہرا تھا کسی کو پانی میں پڑا ہوا نظر بھی نہ آتا اگر وہاں سے کچھ لوگ نہ گزر رہے ہوتے انہوں نے ایاز کو بائیک سے گرتے دیکھ لیا تھا۔ بائیک کا ہینڈل ایاز کے سر پر لگا جس سے وہ بے ہوش ہوگیا۔ وہی لوگ اٹھا کے اسے اسپتال لے گئے۔ گرنے کی وجہ سے اس کا موبائل بھی پانی میں گر گیا جیب میں اس کی شناخت کی کوئی چیز بھی نہیں تھی۔ یہ تو میں رات بھر اسپتالوں میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرا ہوں حتیٰ کہ پولیس اسٹیشن جا کے ایف آئی آر بھی کٹوا دی۔ آخر یہ مجھے سول اسپتال کی ایمرجنسی کے ایک کونے میں پڑا مل گیا۔ بارش کی وجہ سے راستے بھی پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میری بائیک کتنی دفعہ بند ہوئی۔ پھر میں نے وہیں قریبی اسپتال میں اسے داخل کروا دیا ہے۔ اس کی حالت بہت حد تک سنبھل گئی ہے۔ وہ ہوش میں ہے مگر زخم بہت گہرا ہے میں تم لوگوں کو بتانے آیا تھا اور اب واپس اس کے پاس جارہا ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ جانے کو مڑے سب پتھر کے بت بنے کھڑے تھے۔ سہیل رقیہ بیگم کی طرف پلٹے۔ ”میرے آپ سے دو رشتے ہیں خالہ اور ساس کا۔ مگر جو کچھ آپ نے کیا وہ بہت زیادہ ہے۔ آج تک میں نے آپ کی ہر زیادتی ہر حرکت خاموشی سے برداشت کی آپ کی چیزیں اِدھر اُدھر ہو جاتی تھیں۔ آپ کہیں رکھ کے بھول جاتی تھیں لیکن الزام ہمیشہ میرے بچوں پر لگاتی تھیں کہ انہوں نے آپ کی چیزیں چرا کے استعمال کرلیں یا آپ کو تنگ کرنے کے لیے آپ کی چیزیں چھپالیں آپ نے میرے بچوں کو بدتمیز گنوار کہا کہ انہیں ادب تمیز اور طور طریقے نہیں آتے۔ یہ آپ انہیں نہیں میری تربیت کو برا بھلا کہہ رہی ہوتی تھیں۔ میں نے آپ کو کبھی کچھ نہیں کہا۔ میرے بچے تعلیم اور تہذیب میں سینکڑوں نہیں ہزاروں میں ایک ہیں۔ جب سے آپ یہاں آئی ہیں۔ میرے گھر کا سکون خراب ہوگیا ہے اور اب میں اچھی طرح جان گیا ہوں کہ آپ نے کس طرح یمین کا جینا حرام کیا ہوگا اور مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ بس اتنا کہوں گا کہ اب میں آپ کو مزید برداشت نہیں کرسکتا۔ آپ کی وجہ سے میرے گھر کا ماحول، میرے بچوں کا ذہنی سکون تباہ ہورہا ہے۔ بہتر ہے آپ اب اپنا ٹھکانا کہیں اور کرلیں ورنہ مجبوراً مجھے آپ کو اولڈ ہوم چھوڑ کر آنا پڑے گا۔“

یہ کہہ کر تو سہیل تیزی سے نکل کر چلے گئے مگر فاخرہ پر سکتہ طاری ہوگئی۔ انہیں خدشہ تھا کہ ایک نہ ایک دن انہیں اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ رقیہ بیگم بھی اس صورتِ حال سے اتنی حیرت زدہ ہوئیں کہ ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ فاخرہ کو علی تسلی دیتا ہوا کمرے میں لے گیا۔ نانی سے اس نے بھی بات نہ کی اسے بھی ایاز والی بات کا غصہ تھا۔ اُدھر سہیل نے احمر کو فون کرکے گھر آنے کا کہا۔ وہ اسپتال ہی میں تھے مگر یہ بات احمر کو نہ بتائی۔ جب سے رقیہ بیگم فاخرہ کے یہاں تھیں۔ احمر اور یمین کا یہاں آنا بہت کم ہوگیا تھا۔ سہیل کم ہی بات کرتے تھے مگر ان کی کال سے احمر کو اندازہ ہوا کہ کوئی سیریس بات ہے۔ اس نے شام کو آنے کا کہا۔ ادھر فاخرہ کی حالت درست نہیں تھی۔ علی سارا دن بھوکا پیاسا ماں کی پٹی سے لگا بیٹھا رہا۔ کسی نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ رقیہ بیگم کو بھوک نے بہت ستایا تو انہوں نے کل کا رکھا ہوا سالن رات کی روٹی سے کھالیا اور جا کے لیٹ گئیں۔ سہ پہر کو فاخرہ کے پاس گئیں مگر وہ شدید ذہنی دباؤ سے سر درد میں مبتلا تھی۔ وہ تھوڑی دیر بیٹی کے پاس بیٹھ کر اس کی خیریت پوچھ کر کمرے سے نکل آئیں۔ فاخرہ نے ماں کی ہر بات کا جواب ہوں ہاں میں دیا۔ اس میں بات کرنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ شام کو سہیل ایاز کو لیے گھر میں داخل ہوئے۔ علی نے دن میں باپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے کہا کہ وہ گھر آکر بات کریں گے۔ اب جو ایاز کو دیکھا تو سب کی جان میں جان آئی۔ اگرچہ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ سر پر پٹی بھی بندھی تھی اور چال میں لنگڑاہٹ مگر اسے دیکھ کر فاخرہ جیسے جی اٹھی تھیں۔ رقیہ بیگم بھی ایاز کا نام سن کر وہیں آگئیں۔ کل سے ان سے کوئی زیادہ بات نہیں کررہا تھا۔ فاخرہ ہی کچھ بات کرلیتی تھی۔ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ دروازے کی بیل بجی علی دروازہ کھولنے گیا۔ سامنے احمر اور یمین تھے۔ بچے بھی ساتھ تھے۔ اندر آکر وہ ایاز کو دیکھ کے حیران بلکہ پریشان ہوگئے۔ ”یہ کیا ہوا آپ نے ہمیں بتایا کیوں نہیں؟“

”کب ہوا کیا حادثہ ہوا تھا؟“ احمر اور یمین پے در پے سوال کرنے لگے۔

”رک جاؤ بتاتا ہوں۔“ سہیل نے کہا اور پھر شروع سے آخر تک تمام قصہ کہہ سنایا۔ آخر میں اپنا فیصلہ بھی سنا دیا کہ اب وہ رقیہ بیگم کو مزید اپنے یہاں نہیں رکھ سکتے وہ کل انہیں ایدھی ہوم چھوڑ آئیں گے۔

یہ سنتے ہی کمرے میں موجود تمام خواتین نے رونا دھونا مچا دیا۔ رقیہ بیگم کے طعنے اور شکوے نان اسٹاپ جاری ہوگئے۔ ”ارے تم نے تو غیروں سے بدتر کام کیا، تم تو اپنا خون

تھے تمہیں بھی سبین کا اثر آیا ہے۔ کیا ہو گیا جو ایک ذرا سی چیز لینے بچے کو بھیج دیا تھا۔ قیامت تو نہیں آ گئی تھی۔ تم تو شروع سے میرے خلاف تھے، تم جو مجھے یہاں رہتے دیکھنا ہی نہیں چاہتے تھے فٹ پاتھ پر جا کے رہ لوں گی میں۔ تمہارا گھر تمہیں مبارک ہو۔"

کمرے کا ماحول عجیب سا ہو گیا۔ فاخرہ نے اُمید بھری نظروں سے بھائی کو دیکھا اس نے نظریں چرالیں پھر سبین کی آواز گونجی۔ "کیوں جائیں گی آپ ایدھی ہوم؟ ابھی ہم مر نہیں گئے ہیں، آپ کے بیٹے کا گھر سلامت ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔"

سب نے سبین کو حیرت سے دیکھا، رقیہ بیگم نے ناک بھوں چڑھائی۔ "رہنے دو بی بی پہلے بھی تم نے بڑا پھولوں کی سیج پر بٹھا کے رکھا تھا مجھے نہیں جانا تمہارے گھر۔"

سہیل تو سبین کی اس بات سے ہی ششدر تھے۔ انہیں رقیہ بیگم کے جواب پر اتنا غصہ آیا کہ بس۔ "تو پھر کیا ایدھی ہوم جائیں گی۔"

"ہاں وہاں چلی جاؤں گی مگر اس ڈائن کی شکل نہیں دیکھوں گی۔" انہوں نے سبین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بے چاری سبین شرمندہ ہو کے خاموش ہو گئی۔

فاخرہ نے ماں کے آگے ہاتھ جوڑے۔ "امی خدا کے لیے اپنا بڑھاپا اور ہماری زندگیاں یوں نہ خوار کریں، آپ احمر کے گھر چلی جائیں جب سبین کہہ رہی ہے تو......"

احمر نے بہن کی بات کاٹ دی۔ "مگر میں نہیں کہہ رہا یہ صرف سبین کہہ رہی ہے۔" احمر نے صرف سبین پر زور دیتے ہوئے کہا۔

سبین نے احمر کی طرف دیکھا۔ "احمر کل کو ہم بھی اس عمر میں ہوں گے بوڑھا اور بچہ برابر ہوتے ہیں۔ ان کے بچکانہ پن کو نظر انداز کرو اور سوچو یہ کہاں جائیں گی؟"

اب علی نے بھی زبان کھولی۔ "ہاں ماموں ممانی کی بات پر غور کریں۔"

احمر نے طنزیہ کہا۔ "اور اپنے گھر کا ماحول خراب کر لوں؟ تم سب نے دیکھا ان کے رویے میں ذرہ برابر بھی تبدیلی آئی ہے؟"

سہیل نے کہا۔ "میں احمر سے متفق ہوں، اگر مجھے بھی گھر کے ماحول اور بچوں کی پریشانی کا احساس نہ ہوتا تو میں بھی خالہ کو یہاں سے جانے کا نہ کہتا۔" یہ کہہ کر انہوں نے احمر کو دیکھا اور سوچتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس ایک تجویز ہے۔ اگر تم سنو تو میں کہوں؟"

احمر نے بے دلی سے کہا۔ "کیا؟"

"تم یوں کرو خالہ کا کمرا اوپر بنوا لو یہ وہاں

ابھی سہیل کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ

پھنکاریں۔ "جب میں نے کہہ دیا کہ میں اس

ساتھ نہیں رہوں گی تو تم لوگ کیوں بار بار یہ ہی

جا رہے ہو۔"

اب سبین اٹھ کر آئی۔ "آپ میرے ساتھ

رہیں گی۔ ایدھی ہوم جانے سے تو اچھا ہے

میری ماں کی طرح ہیں۔ آپ مجھے بیٹی بے

میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ ایدھی ہوم جانے

اپنے گھر میں رہیں۔"

احمر نے کہا۔ "لیکن ایک بات سب لوگ

امی کا گھر کے معاملات سے، سبین اور بچوں کے

کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھیں

بس۔"

سہیل نے جلدی سے کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے

گا۔"

رقیہ بیگم کچھ بولنے ہی لگی تھیں کہ فاخرہ نے

منت کی۔ "امی خدا کے لیے اب کچھ نہ کہیں۔"

اتنی دیر میں علی نے نانی کا سامان لا کے دھر دیا

احمر اور سبین بھی جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے

نخواستہ رقیہ بیگم بھی چلنے کو تیار ہو گئیں۔ ان کے جانے

سہیل اور لڑکوں نے سکھ کا سانس لیا۔

"اف کتنی ٹینشن پھیلا رکھی تھی، انہوں نے

علی نے کہا تو فاخرہ نے گھور کے دیکھا۔

سہیل بولے۔ "غلط تو نہیں کہہ رہا ہے اگر ہم

بڑوں کا ادب لازم ہے تو کیا بزرگوں کو نہیں چاہیے

اپنی زبان پر قابو رکھیں۔ ہر وقت دوسروں کو طعنے

کہنا کوئی اچھی بات ہے؟ اس طرح بچے سدھرتے تو

البتہ بڑوں کی عزت ان کے دل سے ختم ہو جاتی ہے

دو سبین کو اگر اس کے دل میں نیکی نہ آتی تو تمہاری ماں

ہوم میں پڑی ہوتی لاوارثوں کی طرح۔" پھر وہ بچوں کی

مڑے اور بولے۔ "ایدھی ہوم کیوں ہوتیں بھلا؟"

دونوں لڑکے یک زبان بولے۔ "اپنی کڑوی زبان کی

بدولت۔"

مداوا

مخترم مدیر

السلام علیکم

ایک اور سچ بیانی ارسال خدمت ہے۔ وقت و حالات کس طرح انسان کو کٹھ پتلی کی طرح نچاتے ہیں اسی کی تفسیر ہے یہ۔ اس سچ بیانی کے ہر کردار کے حالات اپنے آپ میں ایک سبق ہے اور سچ سرگزشت کا خاصہ ہے اس لیے سرگزشت میں اسے ضرور لگائیں۔

ڈاکٹر ظفر احمد خان

(کراچی)



دسمبر کی سرد رات کا ذکر ہے۔ کوئٹہ کی ہوائیں کراچی کو لپیٹ میں لے رہی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں اور لحافوں میں دبکے تھے۔ وقفے وقفے سے سرد ہوا سرسراتی گزر رہی تھیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید وہ اس سردی کا گلہ کر رہے تھے۔ ایسے میں ایک سایہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ وہ چرمی جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر گرم ٹوپی اور گلے میں مفلر لپٹا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ٹھونس رکھے تھے۔

وہ جمال نور تھا۔ اس کی عمر چھبیس برس رہی ہوگی۔ وہ اس وقت بفرزون کے رہائشی علاقے میں موجود تھا اور اپنے مطلوبہ مکان کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ وہ کھجور کا درخت اس مکان کے اندر اگا ہوا تھا جس کے پتے باہر تک جھول رہے تھے۔ وہ کوئی مجرم نہیں تھا بلکہ اپنی منگیتر سے ملنے آیا تھا۔ تقریباً پندرہ دن بعد ان کی شادی تھی۔ چھپ کر ملنا ان کی مجبوری تھی کیونکہ اس کی منگیتر نے کوئی فرمائشی تحفہ اس سے منگوایا تھا۔ منگنی کے بعد چھپ چھپ کر ملنے اور باتیں کرنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔

وریشہ اس کی منگیتر ایک خوب صورت اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ ویسے تو ان کی ارینج میرج تھی لیکن منگنی کے بعد سے یہ دونوں ایک دوسرے سے رابطے میں تھے۔ وریشہ کے گھر والے اور جمال نور کے گھر والے آپس میں رشتے دار نہیں تھے۔ یہ رشتہ کسی نے بتایا تھا ویسے تو سب ٹھیک تھا لیکن وریشہ کی فیملی دولت میں جمال نور کی فیملی سے اوپر تھی۔

وریشہ اور جمال منگنی کے بعد سے اب تک موبائل فون کے ذریعے ایک دوسرے سے گفت وشنید کرتے تھے لیکن بھلا ہو موبائل فون کا کہ جس کے ذریعے وہ ایسے شناسا ہوگئے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ان کی منگنی ابھی چند ماہ پہلے ہی ہوئی تھی لیکن جب سے اب تک جو پیار محبت ان کے مابین بڑھا تھا۔ اس سے ان کی بے قراریاں بڑھتی جارہی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پانے کے لیے اتنے بے قرار ہوچکے تھے کہ شادی کی تاریخ کا انتظار کرنا محال ہورہا تھا۔ جمال نور موبائل میں میسج پیکیج کرالیتا اور وریشہ کا بھی پیکیج کرادیتا جس سے وہ پوری پوری رات میسج بازی کرتے رہتے۔ کال پر اس لیے بات نہیں کرتے تھے کہ باقی گھر والے آواز نہ سن لیں۔ میسج کا یہ فائدہ ہے کہ بستر میں کمبل اوڑھ کر لیٹ جاؤ اور کمبل کے اندر موبائل آن کرلو پھر اس چھوٹے سے آلے کا کمال دیکھو۔ وریشہ طلسماتی انداز میں موبائل کے ذریعے اس کے بہت قریب آجاتی تھی۔

اسی بے تکلفی کے نتیجے میں وریشہ نے گفٹ منگوایا تھا۔ گفٹ تو ایک بہانہ تھا۔ اصل میں تو انہیں چھپ کر ملنا تھا اور اس چوری چھپے ملنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ جمال نور نے موبائل پر میسج بھیجا اس نے لکھا۔ تمہارے گھر کے باہر کھڑا ہوں۔

اسے صرف آدھے منٹ بعد جواب موصول ہوا۔ ”میں گیٹ کے اوپر سے اندر کی طرف ہاتھ ڈالوں تو پتلی رسی کا بنا ہوا ایک فیتا ہوگا وہ اوپر کی طرف کھینچ لینا۔ ہلکی سی کلک ہوگی اور گیٹ کھل جائے گا۔ اس کے بعد اندر کی طرف بائیں طر... سے ایک راستہ گھر کے عقب میں جاتا ہے۔ وہاں ایک کو... میں گول سیڑھیاں ہیں۔ ان کے ذریعے اوپر آجاؤ۔ بس او... آنے کے بعد جو دروازہ نظر آئے گا اسے کھول کر اندر آجانا۔“

جمال نور نے میسج پڑھ کر سمجھا پھر اس پر عمل کیا۔

گیٹ کے اوپر ہاتھ اندر کی طرف ڈالا تو وہ فیتا مل گیا۔ اس فیتا پکڑ کر اوپر کی طرف کھینچ لیا۔ ایک کلک کی آواز کے سا... لاک کھل گیا۔ وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ گیٹ کو وا... آہستہ سے بند کیا پھر بائیں طرف چلتا ہوا اس گول سیڑھی... پہنچ گیا۔ اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ وہ سیڑھی چڑھ کر... پہنچا تو سامنے صرف ایک ہی دروازہ تھا۔ اس نے درواز... ہینڈل پکڑ کر اندر کی طرف دھکیلا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ آ... پیدا کیے بغیر اندر داخل ہوگیا۔ کمرے میں نائٹ بلب کی م... روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وریشہ اپنے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ وہ جمال ... دیکھ کر مسکرائی پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشا... کیا۔

”دھیمی آواز میں بات کرنا۔ برابر والے کمرے ... ذیشان بھائی سورہے ہیں۔“ وریشہ سرگوشیانہ انداز میں بولی

”او کے تم فکر ہی مت کرو جانِ من۔“ جمال رومانٹک لہجے میں کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ میرا تحفہ لائے۔“ وریشہ نے سوالیہ اند... میں ہاتھ پھیلایا۔

”کیوں نہیں تم کہو اور میں نہ لاؤں ایسا کیسے ہو... ہے۔“ جمال نے اپنی جیکٹ کی زپ کھولی۔ ایک پیکٹ ... پھر اسے وریشہ کی طرف بڑھا دیا۔

”اوہ تھینکس گاڈ، تم کتنے اچھے ہو۔“ وریشہ ... پیکٹ جھپٹ لیا اور جلدی جلدی کھولنے لگی لیکن جمال تو ... کے طلسماتی حسن کی آب وتاب میں کھویا ہوا تھا۔ مدھم ر... میں بھی وریشہ کا چہرہ چودھویں کے چاند کی مانند دمک رہا ... ایسا لگ رہا تھا جیسے وریشہ کے وجود میں سے مقناطیسی شعا... نکل رہی ہیں جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ وہ بہ مشکل ... خود پر قابو کیے ہوئے تھا۔

”ارے تم کھڑے کیوں ہو...... بیٹھو ناں......“ و... نے تحفہ چیک کرکے سائیڈ میں رکھا۔ جمال وہیں بیڈ ... کنارے پر بیٹھ گیا۔

”ابھی ہماری شادی میں صرف کچھ دن باقی ہیں... مجھے یہ کچھ دن دس صدیوں کے برابر لگ رہے ہیں۔...

پانے کی تڑپ دن بدن بڑھتی ہی جارہی ہے۔ ایک ایک پل بہت بھاری ہوگیا۔“ جمال نے رومانٹک انداز میں کہا۔

”ارے مجنوں صاحب! صبر کیجیے۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔“ وریشہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

جمال نور پر پیار کا خمار ایسے چڑھنے لگا جیسے اس نے شراب کے دو تین پیگ لگا لیے ہوں۔ اسی اثناء میں اس نے اپنا ہاتھ وریشہ کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ وریشہ کچھ کسمسائی لیکن جمال نے مضبوطی سے ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وریشہ تذبذب کے عالم میں تھی۔

جب انسان اچھا برا یا نفع نقصان کا پہلو فراموش کربیٹھتا ہے تو وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔ وریشہ اسے روکتی رہی لیکن جمال نے ایک نہ سنی۔ یہاں تک کہ چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

”جمال یہ کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔“ وریشہ کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

”ارے سب ٹھیک ہے۔ تم کیوں فکر کرتی ہو۔ بس دس دن بعد تو ویسے بھی ہماری شادی ہوجائے گی۔ کیا فرق پڑتا ہے۔“ جمال نور نے اسے تسلی دی۔ ”تم کیوں ٹینشن لے رہی ہو۔ کچھ نہیں ہوگا۔“ جمال نے بکھرے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا اور باہر نکل آیا۔ وہ جس خاموشی سے آیا تھا، اسی خاموشی سے وہ عقبی راستے سے باہر سڑک پر پہنچ گیا۔

☆......☆

اگلے دن بھی جمال نور میسج کے ذریعے وریشہ کو تسلیاں دیتا رہا۔ کیوں کہ رات والے سانحے سے وہ قدرے گھبرائی تھی لیکن جمال نور نے اسے میسج کرکرکے خاصا مطمئن کردیا تھا۔ وہ نارمل ہوگئی تھی۔ جمال بھی مطمئن تھا لیکن آتشِ عشق بجائے ٹھنڈی ہونے کے اور بھڑک گئی تھی۔ جمال نور مزید بے قرار ہوچکا تھا لیکن جو غلطی وہ کرچکا تھا اب دوبارہ نہیں کرسکتا تھا۔

گھر میں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ امی ابو بہنیں اور بھائی سب اپنے اپنے تئیں کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ جمال نور بھی بہت خوش تھا۔ شادی میں صرف پانچ دن باقی رہ گئے تھے۔ آج جمال کے گھر والے وریشہ کے گھر جامہ جوڑے کی رسم کرنے جارہے تھے۔ دلہن اور اس کے گھر والوں کے لیے کپڑے اور تحائف پہنچانے گھر والے جاچکے تھے۔ صرف جمال گھر پر تھا۔ اس نے آفس سے چھٹیاں لے رکھی تھیں اور وقت گزارنے کی غرض سے اپنے کمرے میں بیٹھا رومانی ناول پڑھ رہا تھا۔

تقریباً چار گھنٹے بعد گھر والے رسم ادا کرکے واپس آگئے لیکن واپسی میں سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ جمال کو تشویش ہوئی۔ اسے ایسا لگا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے کیونکہ جو سامان وہ لے کر گئے تھے وہ واپس لے آئے تھے۔ امی اور ابو کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ جمال نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو اس سے رہا نہ گیا اس نے پوچھا۔ ”امی جان! خیریت تو ہے کوئی بات ہوئی ہے کیا۔“

”ارے بیٹا مت پوچھو۔ بڑے ہی کم ظرف لوگ تھے۔ اپنی اصلیت دکھادی انہوں نے اور اچھا ہی ہوا ورنہ شادی کے بعد اصلیت دکھاتے تو ہم تو پھنس گئے ہوتے۔“ نجمہ بیگم نے درشت لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ جمال نور نے خدشات سے بھرا سوال کیا۔

”بیٹے ہم رشتہ توڑ آئے ہیں۔ وہاں ہماری ان لوگوں سے بہت تلخ کلامی ہوگئی۔“ بابا جان بولے۔ جمال کے پیروں سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔

”اُف میرے خدا۔ یہ کیا ہوگیا۔“ جمال سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”ارے بیٹا تم فکر مت کرو۔ میں ایسے کئی رشتے تم پر سے وار کر پھینک دوں۔ لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے۔ میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔ لڑکیوں کی لائن لگادوں گی اور وہ کلموہی رقیہ جس نے یہ رشتہ بتایا تھا میں تو کل ہی اس کی خبر لوں گی۔ ایسے خبیث لوگوں کا رشتہ بتایا تھا اس نے۔“ نجمہ بیگم ترکی بہ ترکی بولیں۔

”ایسا کیسے ہوگیا۔ اوہ مائی گاڈ...... بہت برا ہوا۔“ جمال اپنے بال مٹھیوں سے پکڑ کر نوچنے لگا۔

”تو غم نہ کر بچے، میں کسی اچھے گھرانے میں تیری شادی اس دھوم دھام سے کراؤں گی کہ وریشہ کے گھر والے جل بھن کر رہ جائیں گے۔“ نجمہ بیگم فضا میں ہاتھ نچا کر بولیں لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ جمال کو فکر کیا تھی۔ وہ مسلسل اس رات ہونے والی غلطی کے بارے میں سوچ رہا تھا جس پر وریشہ بھی خدشات کا شکار ہورہی تھی لیکن جمال اسے تسلیاں دے کر مطمئن کررہا تھا اور آج وہی ہوگیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جمال خاموشی سے اپنے کمرے میں آکر چپ چاپ بیڈ پر آنکھیں موندھ کر لیٹ گیا۔ اس کا دماغ کشمکش کا شکار تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کے دماغ میں

سیاہ ہیولے منہ پھاڑے اسے ڈرا رہے تھے۔ یہی ہیولے وہ اندیشے تھے جو وریشہ سمجھانا چاہ رہی تھی۔ جمال اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ کاش وہ جذبات کی رو میں نہ بہکتا تو یہ سب نہیں ہوتا۔ وریشہ اب کنواری نہیں رہی تھی اور شادی سے پانچ دن پہلے یہ اندوہناک واقعہ پیش آگیا۔

☆......☆

اگلے دن جمال دوپہر تک سوتا رہا کیوں کہ وہ رات دیر تک جاگتا رہا تھا۔ اس نے وریشہ کو بھی کئی میسج کیے لیکن وہاں کوئی ریپلائی نہیں آیا۔ اس کی طرف بھی مکمل خاموشی تھی اور یہ خاموشی جمال کے لیے کسی عذاب سے کم نہ تھی۔ نجانے اس نے وریشہ کے حوالے سے کتنے خواب دیکھے تھے سب چکنا چور ہو گئے۔ جھگڑا ابھی دونوں پارٹیوں کے بڑوں میں ہوا تھا۔ جمال اکیلا کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اسے مجبوراً خاموش بیٹھنا تھا۔ جمال کے ذہن میں اس سے سرزد ہونے والی وہ غلطی بازگشت کررہی تھی۔ اس غلطی کے حوالے سے کوئی نیا جھگڑا نہ کھڑا ہوجائے۔ اس کے ذہن میں یہی تھا کہ کہیں حمل نہ ٹھہر جائے، ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور اگر یہ حقیقت ان کے بڑوں کے علم میں آئے گی تو بڑی بدنامی ہوگی۔ وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ یہ سوچ کر جمال کو جھرجھری آگئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس وقت اس کے موبائل فون کی میسج ٹون بجی۔ اس نے چونک کر اسکرین دیکھی تو کوئی میسج تھا۔ اس نے میسج کھولا تو وہ وریشہ کا میسج تھا۔ لکھا تھا۔ ”جمال ایک بری خبر ہے۔ میں ماں بننے والی ہوں۔“ یہ میسج پڑھ کر جمال پر بجلیاں گر پڑیں۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے جواب لکھا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی معاملہ تازہ تازہ ہے۔ جب ان سب کے دماغ ٹھنڈے ہوں گے تو میں سب کو منالوں گا۔ ڈونٹ وری۔“ جمال نے میسج تو کردیا تھا لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ واقعی سب ٹھیک ہوجائے گا۔ پھر وریشہ کا میسج آیا۔ ”اگر ہم دونوں کے بڑوں میں صلح نہ ہوسکی تب کیا ہوگا۔“ جمال میسج پڑھ کر سوچ میں پڑ گیا کہ اس کا کیا جواب دے پھر کچھ سوچ کر اس نے لکھا۔ ”ارے تم فکر مت کرو کچھ نہیں ہوگا۔ بس تم خیال رکھنا کہ اس بات کا اپنے گھر والوں کو مت بتانا ورنہ تمہاری بہت بدنامی ہوگی۔ میں کوشش کررہا ہوں کہ معاملہ افہام و تفہیم سے حل ہوجائے۔ بے شک شادی کی تاریخ ایک آدھ ماہ مؤخر ہوجائے۔“ یہ میسج کرکے وہ جواب کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر میں پھر میسج آیا۔ ”ٹھیک ہے تم جیسا کہتے ہو میں ویسا ہی کروں گی۔ بس یہ سوچ لو کہ میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ جو کچھ بھی کرو سوچ سمجھ کر کرنا۔“ جمال نے میسج پڑھا اور گہرا سانس لیا۔ وریشہ اب قدرے مطمئن تھی۔ اس کے بعد میسج نہیں آیا۔ غالباً وہ جمال کی باتوں سے مطمئن ہوچکی تھی۔

جمال اپنے کمرے سے نکل کر نجمہ بیگم کے کمرے میں پہنچا۔ نور محمد آفس کے لیے جا چکے تھے۔ اس کے والد ایک سرکاری ادارے میں کلرک تھے۔ نجمہ بیگم اپنی الماری کے کپڑے درست کررہی تھیں۔

”امی جان! کیا صلح کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔“ جمال نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے تو ہمارے ہوتے سوتے کو بھی گالیاں دے ڈالیں۔ بس ہاتھا پائی کی کسر رہ گئی تھی۔“ نجمہ بیگم ترخ کر بولیں۔

”ایسا بھی کیا اختلاف کہ رشتہ ہی ختم ہوگیا۔“ جمال نے کہا۔

”میں تو کہتی ہوں تم اس لڑکی کو بھول جاؤ۔ کیونکہ صلح کی کوئی صورت نہیں۔ تمہارے بابا جان کا بھی یہی خیال ہے۔ انہوں نے ہماری پیٹ بھر کے بے عزتی کی ہے۔ دولت کا غرور ہے انہیں۔ ہم کوئی گرے پڑے تو نہیں کہ ان کی بکواس سنتے رہتے۔“ نجمہ بیگم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ یہ سن کر جمال کا چہرہ لٹک گیا۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ وہ وریشہ کو کیا جواب دے گا۔

☆......☆

آج جمال کی شادی کا دن تھا لیکن شادی نہیں ہورہی تھی۔ وہ بہت افسردہ تھا۔ اگر ان کے بڑوں میں جھگڑا نہ ہوتا تو آج وہ دولہا بنا ہوتا۔ گزشتہ دو دن سے وریشہ کا بھی کوئی میسج نہیں آیا تھا۔ وہ خود سے وریشہ کو چھیڑنا نہیں چاہ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ ابھی وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ اس کے موبائل فون کی ٹون بجی۔ وہ وریشہ کا میسج تھا۔ ”ڈیئر جمال! مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ میری شادی دوسری جگہ طے کردی گئی ہے اور آج سے ٹھیک پانچ دن بعد میرا نکاح ہے۔ یہ رشتہ ہمارے ایک رشتہ دار نے بتایا ہے اور یہ جلد بازی رشتہ ٹوٹنے کی وجہ سے کی جارہی ہے۔ میرے گھر والے تمہارے گھر والوں سے بہت متنفر ہیں۔ وہ جلد بازی اس لیے بھی کررہے ہیں کہ تمہارے گھر والوں کو نیچا دکھا سکیں لیکن میں تم سے پوچھتی ہوں کہ تمہارا کیا جواب ہے۔“

جمال میسج پڑھ کر الجھ گیا کہ کیا جواب دے اس نے چند لمحے سوچا پھر میسج لکھا۔ ”میں نے اپنے امی اور بابا جان سے بات کی لیکن وہ نہیں مان رہے اور ان کے مطابق صلح کی کوئی صورت نہیں۔ میں صرف تمہارے اس مسئلے کے پیش نظر پریشان تھا لیکن اب تم بتا رہی ہو کہ ٹھیک پانچ دن بعد تمہارا نکاح ہے۔ اب ہم دونوں بری طرح پھنس چکے ہیں اگر تم چپ چاپ یہ شادی کرلیتی ہو تو تمہارا وہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے جس کے لیے تم پریشان ہو۔ تمہاری شادی کے بعد وہ حمل تمہارے شوہر کے کھاتے میں چلا جائے گا۔ اس طرح تم بدنامی سے بچ جاؤ گی۔ بس یہی ایک حل نظر آتا ہے مجھے اس مسئلے کا۔“ جمال نے میسج بھیج دیا۔

تین منٹ بعد میسج کا جواب آیا۔ ”ڈیئر جمال میں نے تمہاری محبت میں بہت بڑے بڑے خواب دیکھے تھے لیکن ہماری ایک لغزش نے ہمارے خواب چکنا چور کردیے۔ بس اب میرا یہ آخری میسج ہوگا۔ آج کے بعد ہم ایک دوسرے کو بھول جائیں گے۔ جو کچھ بھی ہمارے درمیان ہوا تھا ہم سمجھیں گے کچھ بھی نہیں ہوا۔ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہوگی۔ خدا حافظ۔“ یہ وریشہ کا آخری میسج تھا۔ جمال نے گہری سانس لی۔ جیسے اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ اسے سب سے زیادہ جس بات کی فکر تھی اس مسئلے کا حل آٹومیٹک نکل آیا تھا۔ اب ٹینشن والی کوئی بات نہیں تھی۔ جمال اب خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔

☆......☆

رشتہ ٹوٹ جانے کے بعد سے وریشہ کو اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔ اس رات جو سانحہ ہوا تھا اس کے چوبیس گھنٹے بعد وریشہ کو اپنی طبیعت کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ تھی لہٰذا اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح ایک پریگنینسی ٹیسٹ اسٹرپ منگوالی پھر اپنے طور پر ٹیسٹ کرلیا۔ ٹیسٹ کرنے کا طریقہ لیفلیٹ پر درج تھا۔ موجودہ دور میں یہ بھی بڑی سہولت ہوگئی ہے کہ گھر بیٹھے لیبارٹری ٹیسٹ کرلو۔ وریشہ نے بھی یہی کیا تھا۔ ٹیسٹ پوزیٹو آیا تھا۔ جس کے پیش نظر وہ خاصی پریشان ہوگئی تھی پھر بڑوں میں جھگڑے کے بعد رشتہ ختم ہوچکا تھا اور جمال کے بعد اب وہ کسی اور کی دلہن بننے جارہی تھی۔ صفدر اس کا ہونے والا نیا دولہا تھا اور آج وریشہ کی شادی تھی۔ نیا گھر سجا ہوا تھا۔ شادیانے بج رہے تھے۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ گھر میں مہمانوں کی بہتات تھی۔ لڑکیاں، عورتیں، بچے، نوجوان، بوڑھے سب ہی موجود تھے۔

وریشہ کو دلہن بنایا جارہا تھا۔ وہ ایک بہت بڑا بیج اپنے اندر چھپائے بیٹھی تھی جس کا رازدار صرف جمال تھا اور آج یہ گھناؤنا بیج سمندر کی گہرائیوں میں چھپنے جارہا تھا۔ صفدر اس کا ہونے والا شوہر ایک سیدھا سادہ شریف النفس شخص تھا۔ وہ ایک بہترین آئی ٹی انجینئر تھا۔ خوب صورت بھی بہت تھا۔ وریشہ نے جب صفدر کا فوٹو دیکھا تھا تو وہ ایک لمحے کے لیے اپنے سارے دکھ بھول گئی تھی۔ وہ جمال کے لیے دل میں گھر بنا چکی تھی لیکن حالات نے یکدم پلٹا کھایا اور وہ جمال کے بجائے صفدر کی منکوحہ بننے جارہی تھی۔ اس مسئلے کا حل صفدر کی صورت میں نکل آیا تھا۔ اس لیے ادھر جمال اور ادھر وریشہ خاموشی سے بیٹھ گئے تھے اور فیڈرل بی ایریا کے مہنگے بینکویٹ میں اس کی شادی انجام پائی۔

وہ رخصتی کے بعد بفرزون سے گلبرگ کے پوش علاقے میں صفدر کے گھر آگئی تھی۔ سہاگ رات کو وہ خاصی ڈری ہوئی تھی لیکن کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی اور یوں وہ مزید مطمئن ہوگئی۔ اس کے بعد زندگی نارمل ہوگئی۔ شادی کے کچھ دن بعد اس نے پہلے کسی لیڈی ڈاکٹر سے رجوع کیا پھر صفدر کو خوش خبری سنائی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ صفدر بھی یہ خبر سن کر بہت خوش ہوا۔ صفدر کے گھر والے بھی بہت خوش ہوئے۔ ان بے چاروں کو کیا خبر تھی کہ بچے کا باپ کوئی اور ہے۔

صفدر بھی وریشہ کو پا کر بہت خوش تھا کہ شادی کے فوراً بعد ہی اس نے ان کے خاندان کو خوشیوں سے ہمکنار کیا۔ وہ ایک ذہین و فطین خوبرو شخصیت کا حامل تھا اور ایک انٹرنیشنل کمپنی میں آئی ٹی انجینئر تھا۔ وہ اپنے ادارے میں ہردلعزیز سمجھا جاتا تھا۔ اس کے باس اس کے کام سے بہت خوش تھے۔ خوش کیوں نہ ہوتے صفدر تھا بھی بہت ذہین۔ یوں بھی اس نے آئی ٹی میں ڈپلوما کیا تھا۔ وہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا ماہر تھا۔ ادارے میں ہونے والی کسی بھی کمپیوٹر کی پیچیدگی کو ایک پل میں ختم کردیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باس صفدر کو بہت پسند کرتے تھے لیکن جہاں محبت کرنے والے ہوتے ہیں وہاں دشمن بھی ہوتے ہیں۔ جویریہ اور نوید بھی اسی ادارے کے اسی ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے جس میں صفدر تھا اور یہ دونوں صفدر سے جلتے تھے۔ جویریہ اور نوید کی آپس میں کافی انڈراسٹینڈنگ تھی۔ دراصل جویریہ صفدر کو پسند کرتی تھی۔ صفدر تھا بھی خوب صورت اور ذہانت و فطانت نے اس کی شخصیت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ ہمیشہ سنجیدہ رہتا تھا اور لڑکیوں سے دور بھاگتا تھا۔ جویریہ کافی

عرصہ تک اس کے آگے پیچھے گھومتی رہی لیکن صفدر نے اسے منہ نہیں لگایا۔ یہاں تک کہ صفدر کی شادی ہوگئی۔ صفدر کی شادی کے بعد جویریہ صفدر کی دشمن بن گئی اور اندر ہی اندر اسے نقصان پہنچانے کے منصوبے بناتی رہتی لیکن وہ اب تک کامیاب نہ ہوسکی تھی۔ وہ بظاہر نارمل رہتی، لیکن وہ چاہتی تھی کہ صفدر کی ادارے میں بڑے پیمانے پر بے عزتی ہو اور وہ ادارے سے نکال دیا جائے پھر کچھ عرصہ بعد اسے لگا کہ نوید بھی صفدر سے حسد رکھتا ہے۔ بظاہر تو وہ صفدر سے بڑی خوش اخلاقی سے ملتا تھا لیکن در پردہ صفدر سے حد درجہ عداوت رکھتا تھا۔ نوید اور جویریہ ایک ہی منزل کے راہی تھے۔ اپنے مشترکہ مقصد کی وجہ سے وہ دونوں قریب آگئے۔ یہ مقصد ان کی دوستی کا سبب بن گیا۔ وہ دونوں آپس میں دوست بن گئے۔ لنچ ٹائم میں نوید جویریہ کیفے ٹیریا میں موجود تھے۔

"میں چاہتی ہوں کہ باس کی نظروں میں صفدر کی کلاسیکل بے عزتی ہو اور وہ ادارے سے نکالا جائے۔ تب ہی میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے گی۔" جویریہ سینڈوچ چباتے ہوئے بولی۔

"لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کلاسیکل بے عزتی آٹومیٹک تو ہوگی نہیں۔ اس کے لیے ہمیں پلان کرنا ہوگا۔" نوید نے سینڈوچ منہ میں رکھ لیا اور جویریہ کو جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

"اور پلان ایسا منظم ہونا چاہیے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔" جویریہ بولی۔

"ہونہہ۔" نوید سوچتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے میں کچھ سوچتا ہوں اور تمہیں کل کوئی پلان بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے تم کل تک سوچ لو...... میں جلد از جلد صفدر کو بے عزت ہوتا دیکھنا چاہتی ہوں۔" جویریہ دانت پیس کر بولی۔

"ارے بس تم دیکھتی جاؤ ایسا پلان بناؤں گا کہ صفدر کافی عرصہ تک اپنا زخم چاٹتا رہے گا اور ہم دونوں کے دل کو چین ملے گا۔ اپنے آپ کو طرم خان سمجھتا ہے۔" نوید ٹیبل پر رکھے سینڈوچ کو گھورتے ہوئے بولا۔ جویریہ کی رقابت تو محض اسے ریجیکٹ کرنے کی تھی لیکن نوید کو اس کی ذہانت اور قابلیت سے جلن تھی۔ وہ بھی ہر وقت حسد کی آگ میں جلتا رہتا تھا۔ دونوں کے مقاصد ایک ہونے کی وجہ سے جویریہ اور نوید قریب آگئے تھے۔ نوید بھی خوبرو تھا لیکن صفدر جیسی ذہانت اور کارکردگی اس کے پاس نہیں تھی۔ جویریہ اور نوید اکثر آفس میں ایک ساتھ ہی دیکھے جاتے تھے۔

صفدر ان کے منصوبوں سے قطعی لاعلم تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ اس کی شادی کو اب چار برس ہوچکے تھے اور اب وہ ایک چار سالہ بیٹی کا باپ بن چکا تھا۔ وریشہ بھی بہت خوش تھی کہ اب زندگی اپنی ڈگر پر آگئی ہے۔

☆......☆

صفدر اپنے ڈپارٹمنٹ میں موجود تھا۔ اسی وقت انٹرکام پر اس کے باس رضوان حیدر نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ باس کے کمرے میں پہنچا۔

"سر آپ نے مجھے بلایا...... خیریت!" صفدر کمرے میں داخل ہوکر بولا۔

"ہاں صفدر میں تمہیں بہت جینئس اور مدبر سمجھتا تھا لیکن تمہاری اس حرکت نے سب پر پانی پھیر دیا۔" رضوان حیدر سپاٹ لہجے میں بولے۔

"سر! میں سمجھا نہیں کہ آپ کس بارے میں کہہ رہے ہیں۔" صفدر تذبذب کے عالم میں بولا۔

"ابھی پتا لگ جائے گا۔" رضوان حیدر نے کہا اور انٹرکام پر کسی کو بلایا۔ چند ساعت گزرنے کے بعد جویریہ باس کے کمرے میں آگئی۔ اس نے ایک شال لپیٹی ہوئی تھی۔ عموماً وہ آفس میں شال نہیں پہنتی تھی۔ صفدر کو یہ بات عجیب سی لگی۔

"آؤ جویریہ! اب بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہوا۔" رضوان حیدر بولے۔

"سر جب میں صبح آئی تو اپنے ڈپارٹمنٹ میں، میں اور صفدر صاحب ہی تھے۔ باقی اسٹاف نہیں آیا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ صفدر صاحب مجھ پر بری نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھ پر دست درازی کی اور مزاحمت کرنے پر میری عزت لوٹ لی، میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہی۔" جویریہ مگرمچھ کے آنسو بہانے لگی۔

"سر! یہ جھوٹ بول رہی ہے ایسا کچھ نہیں ہوا۔" صفدر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اگر میں جھوٹ بول رہی ہوں تو یہ دیکھیں سر۔" جویریہ نے یہ کہہ کر شال اتار دی۔ اس کی حالت دیکھ کر رضوان حیدر اور صفدر دونوں کو جھٹکا لگا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور جسم جھلک رہا تھا اور اس کی گردن کے پاس کچھ خراشیں بھی نظر آرہی تھیں۔

"مجھے نہیں پتا اس کی یہ حالت کس نے بنائی اور نہ میں یہ سمجھ پا رہا ہوں کہ یہ مجھ پر جھوٹا الزام کیوں لگا رہی ہے۔"

صفدر گھبراتے ہوئے بولا۔

''سر! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ یہ کافی دنوں سے مجھے للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن میں نظر انداز کر رہی تھی۔ آج اسے تنہائی میسر آئی تو اس نے موقع غنیمت جانا اور اپنی ہوس کی آگ بجھالی۔'' جویریہ بڑے خوب صورت انداز میں اداکاری کرتے ہوئے بولی۔

''دیکھو جویریہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اس سے ہمارے ادارے کی نیک نامی بھی خطرے میں پڑے گی۔ اس مسئلے کا حل نکالو ہمیں کیا کرنا ہے اور تم کیا چاہتی ہو۔'' رضوان حیدر قدرے درشت لہجے میں بولے۔

''سر میں چاہتی ہوں اسے پولیس کے حوالے کردیں تاکہ اسے قرار واقعی سزا ملے۔'' جویریہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔ جب اس نے خود ہی پولیس کا نام لے لیا ہے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ کیونکہ جب میں بے گناہ ہوں تو مجھے ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔'' صفدر نے کہا۔

''ٹھیک ہے تم دونوں میرے ساتھ چلو پولیس اسٹیشن۔ اب وہیں ہوگا دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔'' رضوان حیدر نے کہا اور انہیں لے کر نیچے پارکنگ لاٹ میں آگئے۔ جویریہ اور صفدر کو انہوں نے اپنی کار میں بٹھایا اور علاقائی تھانے کی طرف روانہ ہوگئے۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ پولیس اسٹیشن میں موجود تھے۔ یہاں کا ایس ایچ او مراد بخش جوان تینوں کے بیانات سن چکا تھا اور اب ان کے کیس پر سوچ بچار کر رہا تھا۔ وہ مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا اور چھت کو گھور رہا تھا۔

''دیکھو صاحب! یہ معاملہ تھوڑا الجھا ہوا ہے۔ لڑکی کہہ رہی ہے اس لڑکے نے اس کے ساتھ ریپ کیا ہے اور لڑکا کہہ رہا ہے کہ وہ بے قصور ہے لہٰذا قانون تو گواہ اور ثبوت مانگتا ہے۔ لہٰذا دونوں کا میڈیکل ٹیسٹ ہوگا اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجائے گا اور اگر یہ لڑکا گناہ گار نکلا تو اسے سزا سے کوئی مائی کا لال نہیں بچا سکتا۔'' مراد بخش اپنی پاٹ دار آواز میں بولا۔

''ویری گڈ! میں تیار ہوں۔'' صفدر جھٹ سے بولا لیکن جویریہ کے چہرے پر تفکر کے سائے لہرانے لگے۔ رضوان حیدر اپنے ادارے کو بدنامی سے بچانے کی غرض سے یہاں آگئے تھے تاکہ ان کا معاملہ حل ہو اور ان کی جان چھوٹے۔ مراد بخش نے اپنے حوالدار کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ جویریہ اور صفدر کو میڈیکل لیب پر لے جائے اور ان دونوں کا میڈیکل کروائے اور اس کی رپورٹ تحریری طور پر بنوائے اور رپورٹ اور ملزمان کو واپس تھانے لے کر آئے۔ اس کے لیے اس نے تحریری طور پر ایک اجازت نامہ لکھ کردیا۔

☆......☆

جمال کا وریشہ سے رشتہ ٹوٹنے کے بعد رابطہ بالکل ختم ہو چکا تھا لیکن وریشہ کی یادیں اس کے دماغ پر نقش ہو چکی تھیں۔ بڑوں کی لڑائی میں وہ ناگہانی طور پر پس گئے تھے لیکن جو غلطی جمال سے ہوئی تھی اس کے نتیجے میں ہونے والی عظیم الشان بے عزتی سے بچ گئے تھے۔ خیر وریشہ کی یادیں بھی رفتہ رفتہ مندمل ہوگئی تھیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد ہی اس کی شادی نازش سے ہوگئی۔ نازش ایک تعلیم یافتہ اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔

نازش سے شادی کرکے جمال سب کچھ.. فراموش کر بیٹھا۔ نازش خوب صورت بھی تھی اور خوب سیرت بھی اس نے جلد ہی جمال اور اس کے اہل خانہ کے دل میں جگہ بنالی تھی اور پھر شادی کے ایک سال بعد چاند سے بیٹے کو جنم دے کر سب کے دل جیت لیے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کا نام عالیان رکھا۔ وہ اتنا ہر دلعزیز اور لاڈلا تھا کہ جمال اور نازش کے پاس کم اور اپنے دادا، دادی، چچا اور پھوپھیوں کے پاس زیادہ رہتا تھا۔ اپنے اس خوشیوں بھرے گھرانے کو دیکھ کر جمال خوشی سے سرشار ہو جاتا تھا۔

جمال ایک بسکٹ بنانے والی فیکٹری میں سپروائزر تھا۔ اس فیکٹری میں مردوں کے علاوہ کافی عورتیں بھی ملازمت کرتی تھیں۔ جمال چونکہ کافی سینئر اور تعلیم یافتہ تھا لہٰذا سپروائزر بن چکا تھا۔ اس کے انڈر میں پچاس ساٹھ کارکن تھے۔ ان کی پروڈکٹ ملک میں کافی فیمس تھی۔ اسے فیکٹری کی طرف سے ایک مہران کار بھی دی گئی تھی اور دیگر مراعات بھی۔ وہ اپنی زندگی سے قدرے مطمئن تھا۔

جمال اور نازش کا ننھا عالیان بھی اب ساڑھے تین سال کا ہو چکا تھا۔ پٹر پٹر بولنے بھی لگا تھا۔ وہ جب اپنی توتلی زبان میں باتیں کرتا تو سب دلچسپی سے سنتے تھے۔ ان کے پورے گھر میں سوائے عالیان کے کوئی چھوٹا بچہ نہیں تھا کیونکہ بہن بھائیوں میں جمال سب سے بڑا تھا۔ جمال کے بعد اس کی دو بہنوں کی شادی ہوئی تھی لیکن وہ ابھی صاحب اولاد نہیں ہوئی تھیں۔

جمال کی روٹین تھی کہ وہ جب فیکٹری سے آتا تو رات کے کھانے کے بعد نازش اور عالیان کو ڈرائیو پر لے جاتا تھا.

کبھی آئس کریم، کبھی باربی کیو تو کبھی فوڈ اسٹریٹ۔ اس کا مقصد محض تفریح ہوتا تھا۔ اصل میں نازش سارا دن گھر میں رہتی تھی اور جمال فیکٹری میں ہوتا تھا۔ تو رات کو وہ انہیں ڈرائیو پر لے جا کر ان کی بوریت دور کردیتا تھا۔

آج بھی وہ ڈرائیو پر تھے۔ ان کی مہران ایک سگنل پر رکی ہوئی تھی۔ جیسے ہی سگنل کھلا تو جمال نے کار آگے بڑھائی، چشم زدن میں ایک ٹرک بے قابو ہوکر سگنل توڑتا ہوا گزرا۔ اگر جمال بروقت بریک نہ لگاتا تو وہ ٹرک انہیں بری طرح روندھ دیتا۔ کار کا بمپر ہلکی ضرب سے ٹیڑھا ہوگیا تھا لیکن شدید بریک اور جھٹکا لگنے سے نازش اور اس کی گود میں بیٹھا عالیان ڈیش بورڈ سے بری طرح ٹکرائے۔ نازش کے سر میں تو ہلکی سی خراش آئی لیکن عالیان کا سر بری طرح پھٹ گیا اور سرخ خون بہنے سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ جمال محفوظ رہا۔ ایک لمحے میں لوگ جمع ہوگئے۔

''ارے بچہ بہت زخمی ہے جلدی سے اسپتال لے کر جاؤ۔'' مجمع سے آواز آئی۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔ میں لے کر جا رہا ہوں۔ ڈونٹ وری۔'' جمال نے کہا اور کار تیزی سے نیشنل اسپتال کی طرف دوڑادی۔ وہ عالیان کو لے کر ایمرجنسی میں پہنچے۔ عالیان پر نیم غنودگی طاری تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے دماغ کے اندر چوٹ آئی ہے۔ ایمرجنسی میں فوراً اسٹریچر لایا گیا۔ اس پر عالیان کو لٹا کر اسے آپریشن تھیٹر کی سمت لے گئے۔ نرسیں اور وارڈ بوائے بھی پہنچ چکے تھے۔

جمال اور نازش کو آپریشن تھیٹر کے باہر روک دیا گیا۔ ڈاکٹر اور سرجن بھی آچکے تھے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر اور سرجن تھیٹر سے باہر آئے۔ جمال اور نازش بے چینی سے ان کی طرف لپکے۔

''آپ بچے کے والدین ہیں۔'' ایک ڈاکٹر نے پوچھا۔

''جی ڈاکٹر صاحب......اب وہ کیسا ہے؟'' نازش نے پوچھا۔

''سر میں بارہ ٹانکے آئے ہیں۔ ویسے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے لیکن چونکہ بچے پر غنودگی کی وجہ سے برین اسکین کروانا ہوگا تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ خدانخواستہ کوئی اندرونی چوٹ تو نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''جی ڈاکٹر صاحب کروالیں۔'' جمال نے کہا۔ تب عالیان کو ریڈیولوجی ڈپارٹمنٹ میں لے جایا گیا جہاں اس کا برین اسکین کیا گیا۔ اس کے بعد عالیان کو آئی سی یو میں منتقل کردیا گیا کیونکہ اسکین کی رپورٹ آنے میں چند گھنٹے درکار تھے۔ اس دوران نازش اور جمال آئی سی یو کے باہر انتظار کرنے لگے۔ تاکہ برین اسکین کی رپورٹ آئے تو صورت حال واضح ہو۔

''میرے خدا! یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہوگیا۔'' نازش نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''خدا پر بھروسا رکھو، سب ٹھیک ہے۔ انشاءاللہ رپورٹ میں بھی کوئی گڑبڑ نہیں آئے گی۔ میں نے امی، ابو اور ارسلان کو اطلاع دے دی ہے۔ وہ لوگ بھی پہنچنے والے ہوں گے۔'' جمال نے نازش کو تسلی دی۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' نازش آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ وہ دونوں آئی سی یو کے سامنے لگی بینچ پر بیٹھ گئے۔ اسی وقت ایک اور مریض کو آئی سی یو میں لے جایا جا رہا تھا۔ اس کے منہ پر آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا۔ اس کے باوجود جمال اسے پہچان گیا۔ وہ وریشہ تھی۔

☆......☆

چند گھنٹے بعد حوالدار صفدر اور جویریہ کو لے کر واپس تھانے پہنچ گیا اور ایک لفافہ مراد بخش کو تھما دیا۔ رضوان حیدر ابھی تک پولیس اسٹیشن میں موجود تھے۔ صفدر اور جویریہ رپورٹ سننے کے منتظر تھے۔ مراد بخش نے لفافے سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور قریب کی عینک لگا کر پڑھنے لگا۔ پھر وہ چشمے کے اوپر سے جویریہ، صفدر اور رضوان حیدر کو گھورنے لگا۔

''کیا ہوا انسپکٹر صاحب......کیا رپورٹ آئی ہے؟'' رضوان حیدر صاحب نے بے چینی سے پوچھا۔

''رپورٹ کے مطابق لڑکی کا ریپ ہوا ہی نہیں وہ ڈراما کر رہی ہے۔'' مراد بخش نے کہا۔

''تھینک گاڈ!'' صفدر نے رضوان حیدر کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں اور لڑکے کی میڈیکل رپورٹ کے مطابق اس کی ڈی این اے رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس کے اندر تو پیدائشی طور پر باپ بننے کی صلاحیت ہی نہیں۔'' مراد بخش صفدر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ صفدر فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا لیکن جب اس نے مراد بخش کے جملے پر غور کیا تو اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس کا دھیان جویریہ کی طرف سے ہٹ کر وریشہ اور اس کی بیٹی کی طرف گیا۔ ''مجھ میں پیدائشی طور پر باپ بننے کی صلاحیت نہیں ہے تو آرزو کس کی بیٹی

ہے؟'' آرزو صفدر کی بیٹی کا نام تھا وہ جویریہ کے اسکینڈل سے تو باعزت بری ہو گیا تھا لیکن یہ دوسرا دھماکا اس کے دماغ میں ہو چکا تھا۔ رضوان حیدر نے پولیس اسٹیشن کی ضابطے کی کارروائی مکمل کی اور تب وہ واپس اپنے ادارے کی طرف روانہ ہو گئے۔

جویریہ خاصی شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ آفس پہنچ کر رضوان حیدر انہیں اپنے کمرے میں لے گئے اور جویریہ کو خوب ڈانٹا اور کمپنی سے ڈس مس کر دیا۔ صفدر ایک طرف خوش تھا تو دوسری طرف سخت ٹینشن میں آ گیا تھا۔ باس کے کمرے سے فارغ ہو کر وہ اپنے ڈپارٹمنٹ میں آ گیا اور کرسی پر نیم دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔ رات کو وہ ڈیوٹی آف کر کے گھر پہنچا تو بجھا بجھا سا تھا۔ کھانا بھی اس نے بے دلی سے کھایا پھر وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

''کیا بات ہے۔ آپ نے کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھایا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔'' وریشہ بھی پیچھے پیچھے چلی آئی۔

''میری طبیعت ٹھیک ہے۔ بس ایک بہت بڑی الجھن آن پڑی ہے۔'' صفدر نے کہا۔

''کیسی الجھن؟'' وریشہ مستفسر لہجے میں بولی۔

''آرزو کس کی بیٹی ہے؟'' صفدر نے پوچھا جس پر وریشہ لڑکھڑا کر پیچھے ہو گئی۔

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے آپ ہی کی بیٹی ہے۔'' وریشہ نے لرزتی آواز سے کہا۔

''نہیں...... آرزو میری بیٹی نہیں ہے۔'' صفدر وریشہ کو معنی خیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ میری تو آپ سے شادی ہوئی ہے تو بیٹی بھی آپ کی ہونی چاہیے۔'' وریشہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

''نہیں وریشہ بیگم۔ یہ ایک کڑوا سچ ہے جو تم نے مجھ سے چھپائے رکھا تھا۔'' صفدر نے کہا۔ پھر اسے جویریہ اسکینڈل کی مختصراً روداد سنائی جسے سننے کے بعد وریشہ سفید پڑ گئی۔ وہ چکرا کر بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔ یہ وہ راز تھا جو ابھی تک جمال اور وریشہ کے سینے میں دفن تھا۔

''مجھے معاف کر دیں...... مم...... میں نے آپ کو لاعلم رکھا۔'' وریشہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ نکلیں۔

''معافی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اگر میرے ساتھ یہ واقعہ نہیں ہوتا تو میں زندگی بھر لاعلم رہتا اور کسی اور کے تخم کو اپنا سمجھتا رہتا۔'' صفدر سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''پلیز! مجھے معاف کر دیں۔ اس بارے میں میرے والدین بھی لاعلم ہیں۔ میں زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔'' وریشہ التجا کرنے لگی۔

''وریشہ رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کل تمہیں طلاق کے کاغذات مل جائیں گے۔'' صفدر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ وریشہ کافی دیر تک روتی رہی۔ صفدر عجیب غریب صورت حال سے دوچار تھا۔ ایک طرف وہ ناموں ہوا تھا اور دوسری طرف حرام کی بچی کا باپ بنا دیا گیا تھا۔ ایک طرف آگ تھی تو دوسری طرف پانی، دونوں جانب سے اس کی عزت نفس پر حملہ ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ بہرحال اس نے اپنے وکیل سے طلاق کے کاغذات تیار کرائے لیکن طلاق کی وجوہات میں گھریلو ناچاقی کا ذکر کیا تاکہ وہ خود نامردی اور وریشہ زناکاری کے الزام سے محفوظ رہے۔

وریشہ طلاق کے بعد اپنے ماں باپ کے گھر منتقل ہو گئی۔ اس کے گھر والے بھی حیران تھے کہ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا پھر اچانک یہ کیا ہو گیا۔ وہ اپنے والدین کو بھی نہ بتا سکی کہ طلاق کی وجہ کیا بنی۔ کیوں کہ یہ ایسا کڑوا سچ تھا جو وہ اپنے سینے میں لیے گھوم رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ جمال اور اس کی فیملی اب کہاں ہو گی لیکن بڑوں کی چپقلش اتنی شدید تھی کہ واپسی کی کوئی امید نہیں تھی۔ اگر وہ شروع میں ہی اپنی حالت اپنے بڑوں کو بتا دیتے تو شاید چار و ناچار یہ شادی ہو جاتی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ننھی آرزو کو لیے ہر وقت روتی رہتی تھی اور اپنے آپ کو کمرے میں قید کر لیا تھا۔

اب اس کی زندگی میں چہار اطراف اندھیرے ہی اندھیرے تھے۔ اسے ایک بچی کے ساتھ کون اپنائے گا۔ وہ سوچ سوچ کر کڑھنے لگی۔ اس کے والدین بھی اسے دیکھ دیکھ کر پریشان ہونے لگے۔ کسی کے پاس بھی وریشہ کے مسئلے کا حل نہیں تھا۔ اس نے کھانا پینا کم کر دیا تھا اور راتوں کو اٹھ کر جاگتی رہتی تھی۔ اس کا جسم سوکھنے لگا اور آنکھوں میں حلقے پڑنے لگے۔ پھر ایک دن اچانک وریشہ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ اس کی نبضیں ڈوبنے لگیں۔ بلڈ پریشر لو ہونے لگا۔ وریشہ کے والدین اور بھائی اسے لے کر اسپتال بھاگے۔ اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔ نیشنل اسپتال کی ایمرجنسی میں اسے آکسیجن لگا دیا گیا۔ اس پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔

☆......☆

جمال نے جب وریشہ کو آئی سی یو میں لے جاتے دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ پھر اس کے والدین اور بھائی بھی نظر آ گئے۔ جمال جلدی سے اٹھ کر وہاں سے فارمیسی کی طرف چلا آیا تاکہ ان لوگوں کی نظر نہ پڑے لیکن اسے تجسس بھی ہو رہا تھا کہ نہ جانے وریشہ کو کیا ہوا ہے۔ وہ دیکھنے میں برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر میں نازش اسے ڈھونڈتی ہوئی آ گئی۔

''ارے آپ یہاں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔ اسکین کی رپورٹ بھی آ گئی ہے۔'' نازش نے کہا تو وہ اس کے ساتھ آئی سی یو کی طرف آیا۔ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب باہر ہی کھڑے تھے اور وریشہ کے گھر والے بھی وہاں نظر نہیں آ رہے۔

''جی ڈاکٹر صاحب...... کیا رپورٹ ہے۔'' جمال ڈاکٹر صاحب کے قریب پہنچ کر بولا۔

''اسکین کی رپورٹ کلیئر ہے۔ چونکہ جھٹکا لگنے سے دماغ کا پانی ہل گیا ہے۔ لہٰذا بچے پر غنودگی طاری ہے۔ آپ اگر چاہیں تو بچے کو گھر لے جا سکتے ہیں۔ روٹین چیک اپ کے لیے او پی ڈی میں آتے رہیے گا۔ غنودگی کی کیفیت چند گھنٹوں میں ختم ہو جائے گی اور ایک ہفتے بعد ٹانکے بھی کھل جائیں گے۔'' ڈاکٹر صاحب نے بتایا۔

''اوہ تھینک یو ڈاکٹر صاحب۔'' جمال نے خوش ہو کر ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پکڑ لیے۔ تب وہ ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے۔ عالیان کو لے کر گھر آ گئے۔ واقعی چند گھنٹوں بعد عالیان کی غنودگی بھی ختم ہو گئی اور وہ کھیلنے لگا۔ عالیان کو نارمل دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔ نازش عالیان کی دیکھ بھال میں لگ گئی۔ جمال ان سب کو دادا دادی کے کمرے میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور بیڈ پر لیٹ کر وریشہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے ابھی تک سمجھ نہیں آیا کہ وریشہ کی یہ حالت کیسے ہوئی۔ اس کے ساتھ کیا ماجرا ہوا ہے۔ رات تو جیسے تیسے اس نے گزار لی لیکن صبح ہوتے ہی وہ تیار ہو کر وہ فیکٹری کا کہہ کر نکلا لیکن اس کا رخ نیشنل اسپتال تھا۔ وہ وریشہ سے ملنا چاہتا تھا۔ اسپتال پہنچ کر وہ سیدھا آئی سی یو پہنچا لیکن وہاں وریشہ نہیں تھی۔ اس نے کاؤنٹر سے معلوم کیا کہ وریشہ نامی مریضہ کہاں گئی تو وہاں موجود نرس نے بتایا کہ انہیں چوتھی منزل کے جنرل وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ تب جمال نے لفٹ کا رخ کیا اور چوتھی منزل پر پہنچا۔ وہ وارڈ کے دروازے پر لگی شیشے کی ونڈو میں سے جھانک کر وریشہ کو تلاش کرنے لگا پھر ایک وارڈ میں وریشہ نظر آ گئی۔ اس کمرے میں چار بیڈ تھے اتفاق سے وہاں وریشہ کے پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا وریشہ کے بیڈ کے پاس آ گیا۔ وہ اب ہوش میں تھی۔ آکسیجن ماسک بھی ہٹ چکا تھا۔ اس نے آہستہ سے وریشہ کو آواز دی۔ وریشہ جمال کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

''جمال...... تم......!'' وریشہ کے منہ سے حیرت سے نکلا۔

''یہ تم نے کیا حالت بنا لی ہے۔ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔'' جمال نے کہا۔

''جمال! میری تو دنیا ہی لٹ گئی۔'' یہ کہتے ہوئے وریشہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب آنسو تھمے تو اس نے ساری روداد اسے سنا ڈالی۔ جسے سن کر جمال سکتے میں آ گیا۔ اسے لگا جیسے وریشہ کے حالات کا ذمہ دار وہ ہے۔

''میں شرمندہ ہوں۔ میری وجہ سے تم اس حال کو پہنچی ہو۔'' جمال نے افسوس کا اظہار کیا۔

''جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا جمال لیکن وہ ایک تلخ حقیقت جس میں ہم دونوں ملوث ہیں۔ میرے اور تمہارے درمیان ایک راز ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب میں کیا کروں کہاں جاؤں۔'' وریشہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

''وریشہ! میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہیں بھلا نہیں پایا۔ میں تمہارے ساتھ برا نہیں ہونے دوں گا۔ میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کروں گا۔ میں تمہیں اپناؤں گا۔ مجھے پتا ہے آرزو میری بیٹی ہے۔'' جمال نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''کیا واقعی!'' وریشہ کے منہ سے حیرت اور خوشی سے نکلا۔ ''لیکن تمہارے گھر والے اور تمہاری شادی......''

''میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ نازش میری بیوی ہے اور عالیان ساڑھے تین سال کا میرا بیٹا ہے۔ رہی بات بی پاپا کی تو انہیں سمجھانا میرا کام ہے۔ میں اس گناہ کے کفارے کے لیے اب ضرور کچھ نہ کچھ کروں گا۔'' جمال نے کہا۔

''اور تمہاری بیوی نازش......'' وریشہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''وہ بہت اچھی اور سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ میری بات ضرور سمجھے گی۔ میں تمہیں اکیلے یہ جنگ نہیں لڑنے دوں گا جب کہ ہم دونوں اس میں ملوث ہیں۔'' جمال نے کہا۔

''اوہ میرے خدا۔ جمال تم آج میرے لیے فرشتہ بن کر آئے ہو ورنہ میں تو جینے کی امید چھوڑ چکی تھی۔'' وریشہ

روہانسی ہوگئی۔

''بس اب تم خود کو سنبھالو اور جلدی سے اسپتال سے گھر پہنچو۔ تب تک میں تمہارے لیے راستے استوار کرتا ہوں۔'' جمال نے وریشہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ فرطِ مسرت سے وریشہ نے جمال کا ہاتھ تھام لیا۔

''اچھا فی الحال میں جارہا ہوں۔ اس وقت کسی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو بدمزگی ہو جائے گی۔ ویسے تم بھی اپنے بڑوں کو ذہنی طور پر تیار کرنا۔ یوں بھی اب پہلے جیسے حالات نہیں ہیں۔ انہیں سمجھوتا کرنا ہی پڑے گا۔ میں بھی اپنے بڑوں کو سمجھاؤں گا۔'' یہ کہہ کر جمال وہاں سے روانہ ہوگیا۔

☆......☆

وریشہ جلد ہی صحت یاب ہو کر گھر آگئی۔ ویسے بھی اس کے صحت یاب ہونے میں جمال کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ جمال کی باتوں نے اسے بڑا حوصلہ دیا تھا۔ وریشہ نے اپنے والدین اور جمال نے اپنے والدین سے بات کی۔ پہلے تو وہ اپنی انا پرستی دکھاتے رہے لیکن پھر وریشہ کی حالت دیکھ کر ہتھیار ڈال دیئے۔ نازش البتہ سوچ میں پڑگئی کیونکہ کسی بھی عورت کے لیے ایک سوتن برداشت کرنا بڑے حوصلے کی بات ہوتی ہے۔

''نازش! میں تمہارا جواب سننے کے لیے منتظر ہوں۔'' جمال نے نازش سے سوال کیا۔

''تم نے مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کیا جواب دوں۔ عورت سب کچھ برداشت کرسکتی ہے لیکن سوتن کو برداشت نہیں کرسکتی۔'' نازش تذبذب کے عالم میں بولی۔

''دیکھو نازش سیدھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں دوسری بیوی کا تصور نہ ہونے کے برابر ہے لیکن اگر ہم اس مسئلے کا حل ایک مسلمان ہونے کے ناطے قرآن سے لیں تو بہت صاف ستھرا حل موجود ہے۔ اللہ پاک قرآن پاک کے ذریعے فرماتا ہے کہ ایک مرد چار بیویاں رکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ ان چاروں سے انصاف کرسکتا ہو۔ ان کے ساتھ مساوات کرسکتا ہو۔ اگر وہ مساوات نہ کرسکتا ہو تو پھر اسے ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا حق نہیں۔ میری جاب اچھی ہے۔ بڑا گھر ہے۔ اس گھر میں اگر وریشہ اور آرزو کو سر چھپانے کی جگہ مل جائے تو اس نیکی کے صلے میں اللہ پاک تمہیں نہ جانے کتنا اجر دے۔ جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ وریشہ ایک عورت ہے اور اس کا دکھ تم سمجھ سکتی ہو۔ اب فیصلہ صرف تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' جمال نے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو جمال، ابھی پلک جھپکتے ہمارا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ عالیان کو دوسری زندگی ملی۔ نہ جانے ہماری کون سی نیکی کام آگئی۔ وریشہ کے ساتھ جو ہوا وہ بھی ایک حادثہ ہی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری زندگی میں کوئی اندوہناک حادثہ رونما ہو۔ میں وریشہ جیسی مجبور عورت کی ہائے نہیں لینا چاہتی۔ اللہ نے ہمارے نصیب میں جو لکھا ہے اس میں وریشہ اور آرزو کا بھی حصہ ہے۔ میرے دماغ کا دھند چھٹ چکا ہے۔ میں وریشہ اور آرزو کو اس گھر میں لاؤں گی۔'' نازش جذباتی انداز میں بولی اور جمال اسے ستائشی نظروں سے دیکھنے لگا۔

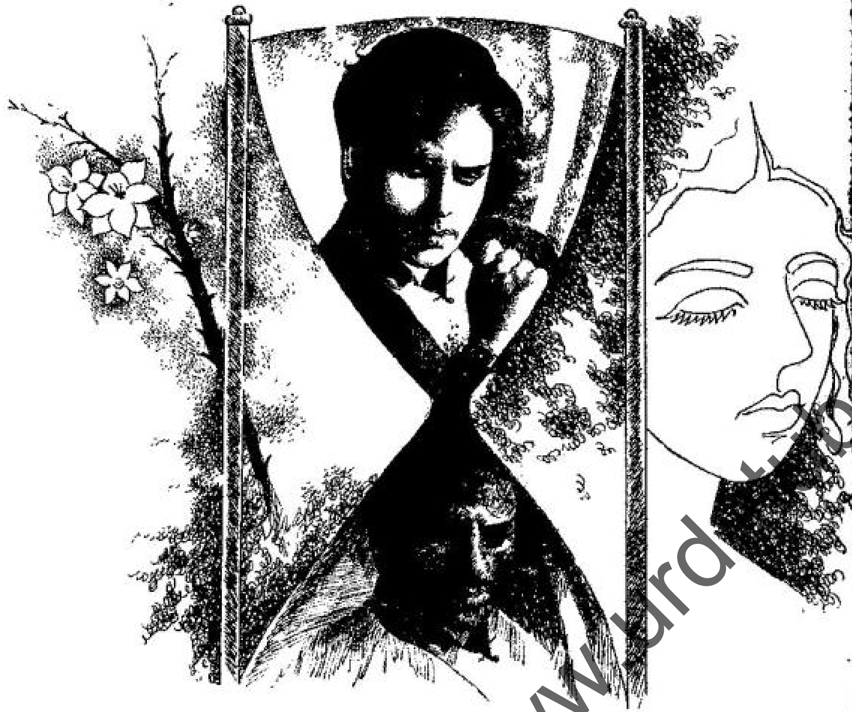
جمال نے وریشہ کا نمبر پنچ کیا اور اسے یہ خوش خبری سنائی کہ جمال کے والدین اور نازش راضی ہیں اور کل وہ قاضی صاحب کو لے کر اس کے گھر آرہا ہے۔ ان کا نکاح سادگی سے ہوگا۔ وریشہ یہ خبر سنتے ہی فرطِ مسرت سے رونے لگی۔ اگلے روز جمال اس کے والدین اور نازش، وریشہ کے گھر پر موجود تھے۔ قاضی صاحب آچکے تھے۔ گھر میں خاموشی تھی۔ وریشہ اور جمال کے اہلِ خانہ تھے۔ وہاں جمال اور وریشہ کا نکاح پڑھایا گیا۔ وریشہ گھر کے کپڑوں میں تھی بس ایک زرق برق دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔ نکاح بڑی سادگی سے انجام پایا۔ دعا کی گئی پھر وریشہ اور جمال کے والد گلے ملے۔ پرانے گلے شکوے دور کیے۔ نازش، وریشہ کے ہاتھ تھام کر اسے مبارک باد دینے لگی۔ جمال ان دونوں کو مسکراتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اتنے میں آرزو اپنی ماں وریشہ کو ڈھونڈتی ہوئی کمرے میں آگئی۔ جسے لپک کر جمال نے گود میں اٹھا لیا۔ اسے معلوم تھا کہ آرزو وریشہ اور اس کے پیار کی نشانی ہے۔ اس نے آرزو کو خوب پیار کیا اور گلے سے لگایا۔

''میں آپ کا کون ہوں۔'' جمال نے آرزو کے ہونٹوں کو انگلی سے چھیڑا۔

''آپ انکل ہیں۔'' ننھی آرزو نے دھیمی آواز میں کہا۔

''نہیں ہم آپ کے بابا جان ہیں۔ کیا ہیں۔'' جمال نے مسکراتے ہوئے آرزو کو سبق کی طرح پڑھایا۔

''بابا جان!'' آرزو نے بھولپن سے کہا۔ ان کی باتیں سن کر سر جھکائے وریشہ مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ میں ماضی کے دکھوں کا مداوا تھا اور مستقبل کے سنہرے خواب تھے۔



باغی

محترم مدیر
السلام علیکم
''سرگزشت'' کے لیے یہ میری پہلی تحریر ہے۔ یہ ایک ایسی لڑکی کی سچ بیانی ہے جس نے اپنے باپ سے بغاوت کی تھی۔

ایم زیڈ شیخ
(مظفر آباد، آزاد کشمیر)

''جیسے تمہارے دانت سفید ہیں ویسے ہی بال سفید ہو جائیں گے پھر بھی میں تمہاری شادی نہیں ہونے دوں گا۔'' ملک یاسر بھی، ضد، انا اور خود غرضی کے تکون میں سانس لے رہا تھا اور ضد میں آ کر اس نے یہ الفاظ اپنی بیٹی کے لیے کہے تھے کیونکہ وہ حقوق و فرائض کے سب فلسفے پسِ پشت ڈال چکا تھا۔ اس کا یہ فیصلہ کرن کے لیے سمِ قاتل تھا۔ زندگی میں کانٹے ہی کانٹے بھر دینے والا، مگر اسے ذرا بھی افسوس نہیں تھا۔ جب کہ کرن وہ تو بس اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی تھی، پھر وہ آنکھوں سے برستے ساون پہ بند باندھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اٹھی مگر دماغ پر چھائے بوجھ نے آنکھوں کے

آگے اندھیرا سا لا دیا اور وہ بستر پر ڈھے گئی۔ زبان کا زخم تلوار کے زخم پر بھاری تھا۔ اس کی روح تک زخمی ہو گئی تھی۔ اس نے چھلنی جگر کے ساتھ ایک فیصلہ کیا۔

اگر جینا ہی ہے تو پھر گھٹ گھٹ کے جینے کا کیا فائدہ۔

اس نے آنکھوں سے ساون کو سمیٹا اور ایک عزم لے کر اٹھی۔

اس کا عزم، زخم پر بھاری تھا۔

☆......☆

دریائے جہلم، کے کنارے واقع ”سلطان نگر“ قصبے میں کم و بیش سو گھرانے آباد تھے۔ مکانات کی بناوٹ اور طرز زندگی دیکھ کر واضح محسوس ہوتا تھا کہ تمام افراد، مالی لحاظ سے مضبوط ہیں۔ حکومت کی جانب سے خصوصی مراعات جو حاصل تھیں اسی کے باعث تمام گھرانے مالی لحاظ سے مطمئن طرز زندگی گزار رہے تھے۔ آپس میں تعلقات بھی کافی خوشگوار تھے۔ ایسے میں صرف ایک گھر ایسا تھا جس سے لوگ میل جول کم ہی رکھتے تھے اور وہ تھا ملک یاسر کا گھر۔

دولت تو سب کے پاس تھی مگر جو حال ملک یاسر کے گھر والوں کا تھا وہ کسی کا نہیں تھا۔ کرن، شمیم اور راحیل تینوں کو بچپن ہی سے کڑی نگاہ کے پہرے میں رکھا گیا تھا۔ ہر طرح کی صحبت سے بچا کر رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اسکول سے کالج میں جانے کے بعد بھی شمیم اور کرن کو بلا مقصد گیٹ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ دونوں ہم جماعت تھیں اس لیے راحیل انہیں کالج کے گیٹ پر اتار کر یونیورسٹی چلا جاتا اور واپسی پر انہیں گھر چھوڑ کر دکان پر والد کا ساتھ دینے پہنچ جاتا۔ بازار میں سب سے بڑی کریانے کی دکان ملک یاسر ہی کی تھی جس کی ہفتہ وار سیل لاکھوں میں تھی۔ دن بھر خوب گہما گہمی رہتی۔ رات دس بجے تک رش رہتا پھر وہ دکان بند کر کے گھر واپس آتے اور تب پانچوں افراد ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ رات، گیارہ بجے سے پہلے کھانا اور سونا ممنوع تھا۔ ملک یاسر کے خود ساختہ قوانین کی خلاف ورزی ناقابلِ معافی جرم تھا کیونکہ وہ ذرا ذرا سی بات پر اس طرح چیخنے چلانے لگتا جیسے قیامت آ گئی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ گھر پر موجود ہوتا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گھر آسیب زدہ ہے۔

بات بے بات گالی دینا، اس کی عادت تھی۔ ایسے میں ایک آسانی یہ تھی کہ وہ فجر کے بعد ناشتا کرتا۔ کچھ دیر خبریں دیکھتا پھر دکان پر چلا جاتا تھا۔ راحیل جب اسے گاہکوں سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔

”اتنے میٹھے لہجے میں گفتگو کرنے والا گھر میں جلاد کے روپ میں کیوں نظر آتا ہے۔“ وہ اپنے آپ سے پوچھتا اسے کوئی جواب نہ ملتا۔

راحیل سارے دکھ جھیل لیتا مگر ایک غم ایسا تھا جو اندر ہی اندر گھائل کر رہا تھا۔ اس کی محبت حرا...... جس کے وہ ساری دنیا سے لڑ سکتا تھا مگر اپنے جلاد باپ سے لڑنا اس بس کی بات نہیں تھی۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ جب یہ خبر اس کے باپ تک پہنچے گی تو اس کی محبت کا جنازہ نکل جائے گا۔ وہ جانتا تھا کہ برادری سے باہر اگر بادشاہ کی بیٹی بھی ہوئی تو اس کا باپ نہیں قبول کرے گا۔

”کیا فائدہ ایسی مردانگی کا...... میں لڑکی ہو کر بھی [illegible] پرڈٹ جانے کو تیار ہوں اور تم......“ ایک دن حرا نے طعنہ دیا۔

”تم نہیں جانتی میرے ابا کو...... چنگیز خان، ہلاکو خان اور ہٹلر تینوں کے مزاج کو ایک کھرل میں رگڑ کر ان کا مزاج تیار کیا گیا ہے۔ وہ سب ان کے سامنے کچھ بھی نہیں اور لڑ کر کا بھی کیا، میں گھر سے نکال دیا جاؤں گا تب سڑکوں پر مارا مارا پھروں گا۔“ اس نے افسوسناک لہجے میں سرنفی میں ہلایا۔

”تو پھر کیا ہے...... جوان آدمی ہو، پڑھے لکھے ہو، کسی جگہ جاب کر لیتا۔“

”تم نہیں سمجھو گی حرا...... میں بہت کمزور انسان ہوں۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے اپنے باپ کے سامنے سر اٹھانے کی۔ مجھے گھر سے نکال کر وہ روز میری ماں کو طعنے دیں گے۔ بچپن میں جب بھی میں کوئی غلط حرکت کرتا تھا تو میرے حصے کی سزا اماں کو بھگتنی پڑتی تھی۔ کبھی کبھی تو ابا اس حد تک چلے جاتے تھے کہ ماں پر تہمت لگا دیتے تھے کہ یہ میرا بیٹا ہی نہیں۔ کم عمری سے لاتیں گھونسے کھا کھا کر اتنا بزدل ہو گیا ہوں کہ زبان ہلاتے ہوئے بھی روح کانپ اٹھتی ہے۔ شاید اسی لیے میں اپنے اندر ایسا کچھ کرنے کا خیال تک ذہن میں لانے سے کتراتا ہوں۔ میں ایسا کچھ نہیں کر سکوں گا حرا۔ کبھی نہیں سکوں گا۔“

”تو پھر کیا ہوگا ہمارے پیار کا اس ادھوری کہانی کا انجام کیا ہوگا؟“ اس نے راحیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ افسردگی سے بولا۔

”یہ لو میری چوڑیاں، ان کو پہن لینا اور گھر میں بیٹھ جانا۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ......“ اس نے اپنے ہاتھوں سے چوڑیاں نکال کر راحیل کے ہاتھ میں دیں اور پھر پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چل دی۔

راحیل چپ چاپ اٹھا اور یونیورسٹی گیٹ سے نکل کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ وہ اندر سے ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ سمجھ گیا تھا کہ اس کی پیار کی کہانی ختم شد پر پہنچ گئی ہے۔ وہ حرا کو کھو چکا ہے، اس رات وہ گھڑی بھر کو بھی سو نہ سکا۔ کبھی اس کروٹ اور کبھی اس کروٹ، اسی میں اس نے رات گزاری تھی پھر تو یہ اس کا معمول بن گیا۔ یونیورسٹی جاتا تو ہر طرف اس کی نگاہیں حرا کو ڈھونڈتیں لیکن وہ نظر ہی نہیں آتی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ اس نے پڑھائی ادھوری چھوڑ دی ہے لیکن راحیل جاتا رہا۔ اس نے کھینچ تان کر امتحان پاس کر لیا۔

یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد وہ مکمل طور پر دکان پر بیٹھنے لگا۔ ایک سال کے اندر اندر اس کے باپ نے اس کی شادی کروا دی۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ راحیل اپنی جس کزن کو سخت ناپسند کرتا تھا باپ نے اپنی اسی بھتیجی سے شادی کرائی تھی۔ اس نے کمزور سا احتجاج بھی کیا تھا کہ اس کی ہونے والی بیوی بالکل ان پڑھ ہے اور وہ انجینئر...... مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔ باپ نے صاف جواب دیا تھا کہ اس کا فیصلہ پتھر کی لکیر ہے جو کہہ دیا سو ہو کر رہے گا۔

دونوں بہنیں بھی اس رشتے سے خوش نہیں تھیں کیونکہ ان کے خیال میں یہ ایک بے جوڑ شادی تھی۔ یوں بھی چچا زاد بہن بھائیوں سے کسی کی نہیں بنتی تھی کیونکہ وہ بالکل جاہلانہ حرکات کے مرتکب ہوتے تھے۔ اٹھنے بیٹھنے سے لے کر بات کرنے تک کا سلیقہ ان میں نہیں تھا پھر وہ لوگ انتہا درجے کے لالچی بھی تھے۔

راحیل نے دل پر پتھر رکھ کر بیوی کو قبول کیا تھا اور یہ بات بہنوں سے نہ چھپی۔ بھائی کو ٹوٹتے بکھرتے دیکھ کر بہنوں کو تشویش نے گھیر رکھا تھا۔ اب دونوں کو اپنی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ اب قربانی کی باری ان کی ہے۔ وہ آنے والے وقت کا سوچ کر ہی پریشان تھیں کہ وہ لمحہ آ ہی گیا۔

شمیم، کرن سے ایک سال بڑی تھی۔ اس کا رشتہ جب اس کے چچا زاد کے ساتھ طے کیا گیا تو اس کے لیے سکون و اطمینان کا آخری دن تھا۔ باپ کے فیصلے پر کرن نے ماں کے سامنے احتجاج کیا کہ اس کی بہن کی زندگی تباہ ہو جائے گی، مگر بے سود...... پتھر نے پگھلنا تھا نہ پگھلا۔ دو سالوں میں دو چراغ انا کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اب تیسری باری تھی کرن کی اور پھر ایک دن اس کا رشتہ بھی پھوپی کے بیٹے سے طے کر دیا گیا۔

☆......☆

وہ بپھر گئی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ سامنے اس کا ظالم باپ ہے۔

”زندگی میری ہے ابا! گزارنی مجھے ہے آپ کو نہیں۔ خدا کا واسطہ دو زندگیاں تو آپ تباہ کر چکے اب مجھے برباد نہ کریں۔“ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

”یہی...... یہی تو قصور ہے زیادہ تعلیم کا۔ ذرا سا پڑھ لکھ کیا گئی باپ بیٹی کا فرق ہی بھول گئی۔ کچھ اندازہ ہے کہ میں ملک نصیر کو زبان دے چکا ہوں۔ اب اگر چوں چراں کی تو چولھے میں جھوک دوں گا مردود...... سمجھا اسے، خون ہی گندا ہے پتا نہیں کس......“ وہ کرن کی والدہ کو گالیاں دینے لگا۔

”مجھ سے بات کریں ابا! کس تعلیم اور کس زبان کی بات کر رہے ہیں آپ؟ بچپن سے آج تک ہم آپ کی ڈگڈگی پر ناچتے آئے ہیں۔ ہم بھی انسان ہیں ہمارے بھی کچھ ارمان تھے مگر آپ کی ضد پر سب قربان ہو گئے۔ سولی پر چڑھا دیا آپ کی اس زبان نے۔ بھیا یونیورسٹی کی ایک پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے صرف آپ کی وجہ سے نہ کر سکے۔ اب جا کر پتا کیجیے اپنے بیٹے کا حال۔ ساتھ ہی مکان ہے اس کا۔ نشیات کا عادی ہو چکا ہے وہ، کیونکہ روز روز کے جھگڑے، دھنگا، فساد اور تو تو میں میں سے تنگ آ چکے ہیں وہ۔ دوسری جانب اپنی نازوں پلی بہن کے بارے میں جب یہ سنا کہ خودکشی کرنے کی کوشش کی اس نے تو میرا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ ابا، بے جوڑ شادیاں کروانے کی قسم کیوں کھائی ہوئی ہے آپ نے؟ اس سے بہتر نہیں ہے کہ اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دیں سب کا؟“

”سب بکواس، جھوٹ بولنا تم نے اپنی ماں سے سیکھا ہوا ہے۔ اچھا بھلا کام کرتا ہے راحیل اور ہر بار خوش و خرم دیکھا ہے میں نے شمی کو بھی۔“

”خوش! خاک خوش ہیں۔ دیمک زدہ ہیں دونوں...... کسی دن اچانک آپ کو پتا چلے گا کہ......“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”بہر حال جو بھی ہے، میں نے بہن کو زبان دے دی ہوئی ہے۔ اب فضول آنسو بہا کر میرا دماغ خراب مت کرو۔“ وہ وہاں سے چلا گیا۔ اس کی آنکھوں سے برستا ساون تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ماں بے چاری کیا کرتی۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر نصیب کو کوستی رہیں۔

”ماں! ماں مجھے نہیں کرنی اس سے شادی، آپ جانتی ہیں نا کیسا ہے وہ؟ شکل و صورت کا مسئلہ ہوتا تو اور بات تھی، سب لوگ ہماری دولت پر رال ٹپکاتے ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں سب کی فطرت، کہاں تھے ان دنوں یہ لوگ جب، جب ہمیں

ان کی ضرورت پڑی تھی۔ ابا کے آپریشن کے لیے پائی تک کسی نے نہیں دی تھی۔ آج ہم کروڑ پتی ہیں تو......'' وہ تلخ لہجے میں بولتی رہی۔

''بیٹی میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں میرے پلائے دودھ کی قسم ہے باپ کی بات مان لے وہ بہتر ہی سوچ کر فیصلہ کرتا ہے۔ اس گھر کا مالک ہے، اگر نہیں مانے گی بات تو کل میرا مرا ہوا منہ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوگا تمہیں۔''

''اماں جانتی بھی ہو؟''

'' کچھ مت بولو بیٹی میں اس عمر میں اس سے زیادہ بھونچال نہیں دیکھ سکوں گی۔ میں دعا کروں گی اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے۔''

وہ روتی رہی، اس بار اسے اپنی بے بسی پر رونا آیا۔ اس کا باپ، اس کی ماں کو اس کے سامنے لے آیا تھا اور یہ بات کرن جانتی تھی کہ اس کے انکار کی سزا اس کی ماں کو جھیلنی پڑتی۔ اس نے ماں کی خاطر اپنے ارمان، خواب، حسرتیں اور امنگیں سب قربان کردیں مگر ایک چیز اب بھی باقی تھی، اس کا دل۔ قسمیں، وعدے، وعیدیں اور مجبوریاں ہوتے ہوئے بھی اگر دل نہ مانے تو اس کا کوئی حل نہیں ہوتا۔ اس نے ڈولی میں بیٹھتے وقت بھی روتے ہوئے ماں سے کہا۔

''اماں! میں نہیں رہ پاؤں گی اس کے ساتھ۔ اب بھی روک لو یہ ظلم۔''

اس کی ماں روتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ غلط ہے۔ اس کے شوہر سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اپنے فیصلوں کی حکم عدولی کی بنا پر مرنے مارنے پر اتر آتا۔ اسے یاد تھا کہ ایک بار گھر میں پکانے کے لیے مکئی کی روٹی کا کہا گیا تھا مگر آٹا نہ ہونے کے باعث اس نے گندم کی روٹی پکالی تھی۔ اتنی سی بات پر یاسر نے مکا مار کر اس کے دو دانت توڑ دیے تھے۔ ''جب میں نے کہہ دیا تھا تو دوسرا ہر عذر بے معنی ہے۔'' یہ جملہ اس کا تکیہ کلام تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کو دعاؤں میں رخصت کیا، مگر دعا، دوا کے بغیر قبول نہیں ہوئی۔

اسے پہلی رات ہی یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی مویشی منڈی میں آگئی ہے۔ احسن کا کاروبار اور پیشہ بھینسیں پالنا اور دن بھر انہیں لے کر چراگاہ چلے جانا تھا۔ کرن کو معلوم تھا کہ احسن صبح سویرے اٹھ کر سب سے پہلے بھینسوں کے جملہ امور سر انجام دیتا تھا۔ اس کی ظاہری حالت یہ ہوتی تھی کہ اس کے ہاتھ سے گوبر کی بدبو آتی تھی۔ صفائی ستھرائی پر اس کی توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ دیوار کے ساتھ پاتھیوں کی قطاریں لگانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ کام کاج اور کاروبار کی حد تک ہوتا تو تب بھی کرن کو ناگوار نہ گزرتا مگر وہاں صورتِ حال یہ تھی کہ احسن سیدھا سیدھا ملنگ ٹائپ بندہ تھا۔ گندے کپڑے، لٹکا ہوا پیٹ، بہتی ناک اور اس جیسی کئی چیزیں لوگوں کی نظروں میں تھیں۔ گھر والے اسے بھولا، بھولا پکارتے تھے، مگر باقی افراد ملنگ کہتے تھے۔ کسی پر غصہ ہو تو بھولے کو پانچ روپے دو وہ اسے گالیاں دیتا تھا۔ ایسی باتیں کرن سے چھپی ہوئی نہیں تھیں۔ ایسے میں وہ خودکشی کرلیتی اگر ماں کی قسمیں نہ ہوتیں۔

''وہ جی، تسی بہت سوہڑے او......'' اس نے قمیص کے بازو کو دانتوں تلے سے نکال کر کہا۔

''میری بات کان کھول کر سن لو بھولے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ ''مجھے تمہارا ہاتھ تک نہ لگے جس دن تم نے مجھے چھونے کی کوشش کی تو وہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔''

وہ سہم گیا۔ کرن کا لہجہ اٹل تھا اس لیے احسن نے چپ سادھ لی۔ دونوں کے درمیان مزید کوئی گفتگو نہیں ہوئی، احسن اتنا بھی سادہ نہیں تھا جتنا لوگ اسے سمجھتے تھے، مگر وہ اتنا چالاک بھی نہیں تھا اس لیے اگلے چند دن چپ ہی رہا۔

بات کہاں چھپتی ہے۔ چند دن بعد سارے گھر کو پتا چل گیا کہ کرن ابھی تک کنواری ہے۔ گھر والوں نے اس سے بات کی نہ احسن سے بس یہی سوچ کر چپ کرگئے کہ ممکن ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھولے کو قبول کرلے۔ آہستہ آہستہ بات ہمسایوں تک پہنچی اور پھر ایک ماہ بعد آس پاس کے سب ہی جاننے والے اس بات سے آگاہ ہوگئے کہ بھولے کی بیوی ابھی تک کنواری ہے۔ لوگوں کی عادت ہوتی ہے دوسروں کے گھر جھانکنے کی اور پرائے معاملے میں ٹانگ اڑانے کی اس لیے بھولے کو بھی سنگی ساتھیوں نے الٹے سیدھے مشورے دینے شروع کردیے۔ نتیجتاً ایک دن ان کی لڑائی ہوگئی۔ احسن کی ماں نے بیٹے کی طرف داری کی تو کرن نے اسے بھی سنانی شروع کردی۔ اس کی آرام پسند طبیعت سے گھر والے پہلے ہی اس سے تنگ تھے، وہ سوائے کھانے اور آرام کرنے کے کچھ بھی نہیں کرتی تھی اس لیے لڑائی کے بعد ملک یاسر کو بلا کر بیٹی کی حرکات سے آگاہ کیا گیا اور اس کے ساتھ روانہ کردیا کہ گھر لے جا کر اسے سمجھا کر واپس بھیجے۔ یاسر کی تعلیم و تربیت کے بارے میں جو الفاظ احسن کی ماں نے ادا کیے تھے وہ اس کے منہ پر جوتا مارنے کے مترادف تھے، اس لیے اس نے گھر پہنچتے ہی بیٹی کی پٹائی شروع کردی۔ اس کے منہ میں جو آرہا تھا وہ بولے جارہا تھا اور پھر اس کے بعد حسب عادت کرن کی ماں کو گالیاں دینے لگا

جس کا واحد قصور کرن جیسی اولاد پیدا کرنا تھا۔

کرن کے جسم پر جگہ جگہ لکڑی کی چھڑی سے ضربیں لگنے کے نشانات تھے۔ وہ ماں کے اصرار پر چند نوالے زہر مار کرلیتی تھی وگرنہ سوائے رونے کے اسے کوئی دوسرا کام نہیں تھا۔ منت سماجت کرکے ماں نے اسے چند دن بعد دوبارہ اپنے گھر بھیجا۔

دن گزرتے رہے۔ شادی کو ایک سال گزر گیا مگر زمیں جنبد جنبد گل محمد کے مصداق، حالات جوں کے توں رہے۔ گھر میں کوئی بھی کرن سے بات نہیں کرتا تھا۔

ایک دن احسن کی ماں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں پوتے کی خواہش کا اظہار کیا تو کرن پھٹ پڑی۔

''اگر آپ لوگوں کو اتنی ہی خواہش ہے تو ایک اور کروا دیں صاحبزادے کو! میں انسان ہوں کوئی خریدی ہوئی مشین نہیں جسے آپ لوگ اپنی مرضی سے استعمال کریں گے۔ خبردار جو آئندہ میرے سامنے ایسا کچھ کہا۔''

''تو یہ تمہارے باپ کا گھر ہے کیا جہاں ٹانگ پر ٹانگ رکھے لیٹی رہتی ہو اور کھا پی کر عیش کرتی ہو۔ ہم تمہارے باپ کے نوکر ہیں جو پکا پکا کر کھلاتے رہیں تمہیں؟'' اس کی ساس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''تو کس نے کہا تھا منہ اٹھا کے مانگنے کے لیے رشتہ؟ کسی بھینس سے شادی کروا دیتے اس ڈنگر کی۔''

''شوہر ہے تمہارا وہ! شرم و حیا تو پاس سے بھی نہیں گزری تمہارے۔''

''کون سا شوہر! شوہر وہ ہوتا ہے جسے دل سے قبول کیا جائے نہ میں نے کبھی اسے شوہر سمجھا ہے اور نہ ہی آپ کو کوئی مقام دے پائی ہوں۔ آپ ایک انتہائی لالچی اور خود غرض عورت ہیں جنہیں ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ وہ دولت کی لالچ میں کتنی زندگیوں سے کھیل رہی ہیں۔'' وہ وہاں سے اٹھ کر اندر چلی گئی اور پھر چند دن بعد اس نے اپنے شوہر کی زبان سے تین بار طلاق کا لفظ کہلوا دیا۔ دینی اور قانونی معاملات بعد کی بات تھی فی الحال وہ اپنے باپ کے گھر پہنچی اور پھر اگلے چند گھنٹوں میں ملک یاسر اس بات سے آگاہ ہوچکا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔

☆......☆

وہ وہاں سے اٹھی اور لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل آئی۔ باپ کے تھپڑوں کی وجہ سے اس کے رخسار انگارے کی طرح جل رہے تھے۔ باہر آکر اس نے اپنا مختصر سا سامان اٹھایا اور مین گیٹ سے باہر نکل گئی۔ اس کی ماں، زارو قطار رو رہی تھی مگر وہ کرتی بھی کیا۔ ایک طرف ظالم شوہر تھا تو دوسری طرف ضدی بیٹی۔ دونوں اپنی انا کی تسکین کے لیے اس بے چاری کو انگاروں پر لوٹا رہے تھے۔ کرن وہاں سے نکل کر مین اسٹاپ پر آئی اور وین کی ایک سیٹ پر سست کر بیٹھ گئی۔ اسے شہر جانا تھا اپنی سہیلی کے پاس۔ روزینہ اس کی بچپن کی سہیلی تھی جس کی شادی قصبے سے دور شہر میں ہوئی تھی۔ اس کا شوہر وکیل تھا جس سے اسے مدد کی امید تھی۔ وہ وہاں پہنچی تو کافی دیر روزینہ سے لپٹ کر روتی رہی۔ روزینہ نے حال احوال دریافت کیا تو وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ روتے روتے اس نے مختصراً اپنی روداد روزینہ کے گوش گزار کی تو روزینہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔

''تو اب تمہارا کیا ارادہ ہے مونی۔'' وہ اسے پیار سے مونی کہتی تھی۔

''ارادہ کیا؟ بس کسی طرح اتنا کردو کہ کھانا اور رہائش کا بندوبست ہو جائے صرف اتنی مدد کردو کہ کسی پرائیویٹ اسکول میں مجھے چند ہزار پر جاب دلوادو جمیل بھائی سے کہہ کر۔ رہائش کے لیے میں خود کوئی جگہ دیکھ لوں گی۔''

''کبھی کبھی تمہارے اوپر بہت غصہ آتا ہے مجھے۔'' وہ پیار سے بولی۔ ''جب اتنا بڑا گھر موجود ہے تو پھر دوسری رہائش کس لیے۔ ہم تین ہی تو لوگ ہیں اس میں...... میں، جمیل اور ہمارا بیٹا۔ اب چار ہو جائیں گے تو کون سا فرق پڑ جائے گا۔''

''نہیں روزی! یہ مناسب نہیں ہے۔''

''بہرحال اس پر بعد میں بات کریں گے۔ ابھی تو چینج کرکے آؤ ذرا کچن میں چلتے ہیں، شام کے وقت جمیل آئیں گے تو میں تمہارے سامنے ہی بات کروں گی۔'' اس نے کہا تو کرن پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر اٹھی اور وہاں سے چلی گئی۔ روزینہ کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔

☆......☆

رات کے کھانے پر روزینہ نے جمیل اور طلحہ سے کرن کا تعارف کروایا۔ باتیں کرتے ہوئے اس نے جمیل سے کرن کی جاب کے حوالے سے بھی گفتگو کی۔ جمیل نے یقین دہانی کرائی کہ وہ ایک دو دن میں یہ کام کردے گا مگر ایک ہفتہ گزرنے کے بعد بھی اس نے کچھ نہ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ان دنوں بہت مصروف ہے اس کے باوجود ایک دو جگہوں پر بات کی ہوئی ہے بس وہ لوگ یکم سے پہلے نئی بھرتی نہیں کررہے۔

یکم آنے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا۔ وہ جلد از جلد وہاں سے جانا چاہتی تھی کیونکہ پچھلے ایک دو دن سے اسے جمیل کی آنکھوں میں کچھ خاص جذبات نظر آئے تھے۔ وہ چھوٹی بچی

نہیں تھی، سمجھتی تھی کہ یہ کس طرف حالات جا رہے ہیں۔ اسے لگا کہ ممکن ہے وہ اس گھر میں جھگڑے کا باعث بنے۔ جمیل کی نظروں کا مفہوم وہ سمجھتی تھی۔ وہ اس سے پہلے ہی وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ مرد سے کچھ بعید نہیں کہ کب کیا رنگ دکھلا جائے۔ وہ ساری رات سوچتی رہی۔ اسے فیصلہ کرنا تھا۔ اس سے پہلے کہ حالات کسی اور رخ پر چلے جائیں اسے اپنا آپ بچانا تھا اور اپنی دوست کا گھر بھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو سامنے جمیل تھا۔

”ارے آپ......؟“

”ہاں، وہ کچھ بات کرنی تھی آپ سے۔“

”جی فرمایئے۔“ وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

”اندر آ جاؤں؟“

”اگر مناسب سمجھیں تو آ جائیں یہ آپ ہی کا گھر ہے۔“ وہ چبھتے لہجے میں بولی۔

”یہ گھر آپ کا بھی اتنا ہی ہے جتنا ہمارا ہے۔“

”بغیر کسی رشتے کے؟“

”رشتے تو دلوں کے ہوتے ہیں کرن صاحبہ...... خیر میں یہ کہنے آیا تھا کہ اگر آپ ایل ایل بی میں داخلہ لے لیں تو کیسا رہے گا؟“

”یہ بات تو آپ مجھ سے صبح بھی پوچھ سکتے تھے ابھی پوچھنے کا مقصد؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ بس ریکویسٹ کرنی تھی آپ سے ایک یہ کہ آپ مستقل طور پر یہیں رہائش اختیار کر لیں، مجھے بہت خوشی ہوگی۔“

”جمیل صاحب! میں بہت صاف گو ہوں، یا پھر یہ کہہ لیں کہ منہ پھٹ قسم کی لڑکی ہوں۔ آپ میری دوست کے شوہر ہیں میرے دل میں آپ کے لیے اتنا ہی احترام ہے جتنا اپنے سگے بھائی کا۔ اگر آپ میری مدد نہیں کر سکتے تو خدارا مجھے سکون سے چند دن گزارنے دیں۔ ورنہ میرے پاس خودکشی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہے گا۔“ وہ سسک رہی تھی جبکہ جمیل ہکا بکا کھڑا سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ آخر کار وہ چپکے سے باہر نکل گیا۔

اگلی صبح، روزینہ ناشتے کے لیے کرن کو بلانے گئی تو کمرا خالی تھا۔ وہ صبح سب کے جاگنے سے پہلے ہی وہاں سے چلی گئی تھی۔ روزینہ نے دوسرے کمروں اور آس پاس ہر اس جگہ ڈھونڈ لیا جہاں وہ پائی جا سکتی تھی مگر اس نے ملنا تھا نہ ملی۔

دوسری جانب کرن اپنا مختصر سا سامان اٹھائے پیدل نامعلوم منزل کی جانب رواں تھی۔ اس کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ تھی جیسے اپنے آپ کو بتا رہی ہو کہ ”یہ دنیا ایسی ہی ہے کرن بی بی۔“

اس نے ایک اچھے سے ریستوران میں فیملی کیبن میں بیٹھ کر ناشتا کیا اور پھر واپس جہلم ویلی کی طرف جانے والی بس میں آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی اگلی منزل اس کی خالہ کا گھر تھا۔

☆......☆

ساجدہ خالہ بے اولاد تھیں اور بچپن سے ان کی خواہش تھی کہ کرن کو وہ اپنے پاس رکھیں مگر ملک یاسر کی طبیعت دیکھ کر کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ ایسے میں جب کرن نے یہ کہا کہ ”خالہ! میں آپ کے پاس رہنے کے لیے آئی ہوں ساری زندگی کے لیے۔“ تو ان پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ انہوں نے اسے ”میری بچی“ کہہ کر گلے لگا لیا مگر پھر اچانک وہ اداس ہو گئیں۔

”کرن بیٹا! تمہارے ابا؟“ انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ابا...... ابا تو قید کی سزا پوری کر رہے ہیں۔ وہ اپنے بنائے ہوئے اصولوں اور انا کے قیدی ہیں۔ میرا اب ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔“

”نہیں میری بچی! ایسا مت بولو خون کے رشتے ختم نہیں ہوتے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو آؤ ہم کھانا کھا کر اس موضوع پر بات کریں گے۔ تمہاری علیحدگی کا سنا تھا۔ بہت دکھ ہوا۔“

”واقعی دکھ کی بات ہے، میری زندگی کا ایک سال ضائع ہو گیا۔ کچھ انا پرستوں کی ضد کی خاطر۔“ وہ تلخی سے مسکرائی۔

☆......☆

وقت کی اڑان کا کوئی توڑ نہیں اس نے اڑنا ہے اور وقت جہلم ویلی کے اس گھر کے مکینوں کے لیے بھی ایک سا نہ رہا۔ کرن کی خالہ کے گھر کے بالکل سامنے والا گھر خالد صاحب کا تھا۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھا۔ کافی عرصہ سے انگلینڈ میں جاب کر رہا تھا۔ انہوں نے کرن کو دیکھا اور پسند کر لیا پھر جب کرن کا رشتہ مانگا گیا تو اس کی خالہ نے کرن سے رائے لی۔ وہ بضد تھی کہ اب اسے شادی نہیں کرنی مگر پھر خالہ اور خالو کے اصرار نے اسے قائل کر لیا۔ لڑکے کا گھر قریب ہی تھا، وہ چھٹی پر انگلینڈ سے آیا تھا اس لیے جلدی جلدی شادی کے دن مقرر ہو گئے۔



وعدہ معاف

جناب ایڈیٹر سرگزشت

یہ تحریر جن صاحبہ کی ہے انہوں نے خصوصی طور پر ہدایت دی ہے کہ ان کا اصل نام اور شہر کا نام بدل دوں۔ روداد اتنی سبق آموز ہے کہ اسے ہر ایک کو پڑھنا چاہیے۔

غلام رضا جعفری
(کراچی)

اچانک ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ کمرے میں گھپ ...را تھا۔ اندھیرے میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ...لیمپ بجھا ہوا تھا۔ سینے میں بھاری پن کا احساس ہوا۔ ...نے سانس کھینچی مگر سانس اسی طرح اٹک کر نکلی کہ جیسے یہ ...ی زندگی کا آخری سانس ہو۔ گھبرا کر اپنے سینے پر ہاتھ ...اور سر کو زور سے دائیں بائیں جھٹکا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سر ...تا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سردی کا موسم تھا مگر جسم پسینے سے ...ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے اوپر سے کمبل ہٹا دیا۔ پھر جب آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔ وال کلاک پر نظر ڈالی وہ رات کے دو بجا رہی تھی۔ سونے سے پہلے میری طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ اس اچانک اٹھنے والے درد نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ جی چاہا کہ برابر میں سوئی ہوئی بیوی کو جگا دوں کیونکہ دل گھبرا رہا تھا۔ میں نے ایک نظر شگفتہ پر ڈالی اور اٹھ کر باہر لان میں آ گیا۔ لان میں ٹھنڈی ہوا سکون دے رہی تھی۔ سردی کے باوجود بھی سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"شیراز...... شیراز۔" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میری بیوی شگفتہ باہر آگئی تھی۔

"کسی کا فون آیا ہے۔" اس نے کہا اور موبائل فون میری طرف بڑھایا۔ میں نے فون لے کر کال سنی۔

"واپس آنے کے بعد تم نے رابطہ کیوں نہیں کیا؟" یہ کرخت آواز میں بولنے والا میرا باس تھا۔

"میں نے سوچا صبح کال کرلوں گا آپ کو۔" میں نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

"یہ تمہیں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ کسی بھی کام سے واپسی پر پہلے اطلاع کرنا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن......"

"لیکن...... تم یہ بھول گئے ہو کہ تم پہلے کیا تھے اور اب کیا ہو۔" باس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"میرا مطلب ہے......"

"تم کام سے دل چرا رہے ہو۔" اس نے کہا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔"

"اگر ایسا ہی کرتے رہو گے تو تم سے سب کچھ چھین لیا جائے گا اور تم ایک بار پھر سڑک پر آجاؤ گے۔" اس نے میری بات قطع کرتے ہوئے کہا اور فون کی لائن کاٹ دی۔

"کیا ہوا؟" شگفتہ نے پوچھا۔ وہ میرے پاس ہی سبزے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے سردی سے بچاؤ کے لیے شال اوڑھ رکھی تھی۔ سردی کی شدت سے اس کے دانت بھی بجنے لگے تھے لیکن مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

"کس کا فون تھا اتنی رات گئے؟" اس نے میرا جواب نہ پا کر پوچھا۔

"تم جاؤ کمرے میں عارفہ ڈر جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کچھ واپس لینے کی بات ہو رہی تھی۔" اسپیکر کی آواز شگفتہ تک پہنچ رہی تھی۔ اسی وجہ سے اس نے پوچھا۔

"جو دے سکتا ہے وہ لے بھی سکتا ہے۔" میں نے کہا اور اسے واپس کمرے میں جانے کے لیے زور دیا تو وہ چلی گئی۔

میرے پاس اس وقت جو کچھ بھی ہے یہ سب کچھ اسی کا دیا ہوا تو ہے۔

اس سے پہلے کی زندگی تو بس...... اذیت ہی اذیت تھی۔ پورا مہینا فیکٹری میں شب و روز ایک کرنے کے بعد ملنے والی تنخواہ سے صرف چند روز ہی گزارا ہو پاتا تھا۔ ہم کچی آبادی کے ایک چھوٹے سے مکان میں کرا[ئے پر رہا] کرتے تھے۔ ایک کمرے کے اس مکان میں اگر [دو] ہی افراد یعنی میں اور میری بیوی شگفتہ رہا کرتے [تھے] مکان رہائش کے لیے موزوں نہیں تھا۔ جس مکان [میں] بمشکل گزارہ کررہے تھے کھنڈر جیسا تھا، مالک مکان [کی] طرف سے کوئی سہولت نہ تھی۔ اپنی محدود آمدنی کے لیے ہم نے اپنی ضروریات زندگی کو بھی محدود کرلیا تھا لیکن [اس] کے باوجود زندگی کٹھن تھی۔ پھر اچانک ہی نوکری [چلی] گئی۔ فیکٹری کے دو شراکت داروں میں ان بن ہوئی [تو] فیکٹری کا کام روک دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد فیکٹری [بند] کردی گئی۔ کاریگروں نے دوسری فیکٹریوں کا رخ [کیا۔] میں نے بھی کسی دوسری فیکٹری میں ملازمت کی کوشش [کی مگر] نہ ملی۔ اس تلاش میں دو مہینے گزر گئے۔ مکان کا مالک [کرایہ] نہ ملنے پر مکان خالی کرنے پر زور دینے لگا۔ ادھر [بے] روزگاری کی وجہ سے نوبت فاقوں تک آ پہنچی تھی۔

ایک رات جو میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھ[یرا] چھایا ہوا تھا۔ لائٹ چلی گئی تھی۔ تبھی سسکنے کی دھیمی دھیمی آ[واز] میرے کانوں میں پڑی تو میں شگفتہ کی طرف متوجہ ہوا [جو] سسک رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں ہی [موم] بتی تلاش کر کے جلائی تو کمرے میں کچھ روشنی ہوئی۔ [وہ] لیٹے لیٹے اپنے بازوؤں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے روتے روتے جواب دیا۔

"اگر کچھ نہیں ہوا تو رو کیوں رہی ہو؟" میں[نے] پوچھا۔

"پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔" اس نے درد کی شد[ت] سے کراہتے ہوئے بتایا۔ اس کا جواب سن کر میں لاجواب [ہو] گیا۔ درد کا حل دوا ہے۔ دوا کے لیے کلینک یا اسپتال جانا ضروری ہوتا ہے اور یہ پیسوں کے بغیر ہو نہیں سکتا۔ [بے] روزگاری نے کوڑی کوڑی کا محتاج کردیا تھا مگر میں یہ [بھی] جانتا تھا کہ درد کی اصل وجہ مرض نہیں بھوک ہے۔ پیٹ خال[ی] ہونے کی وجہ سے درد ہو رہا تھا۔ صبح کا ناشتا بھی ہم نے نہیں کیا تھا۔ دوپہر اور رات کو بھی کھانا نصیب نہیں ہوا تھا۔ شا[م] کے وقت چاچا رحمان کے جنرل اسٹور پر گیا تھا۔ کچھ راش[ن] ادھار مانگا تھا۔

"ادھار...... ادھار...... ہر وقت کا ادھار۔" اس نے [...] آواز میں کہا تھا تاکہ آس پاس کے لوگ بھی سن لیں۔

"چاچا تمہارا تو کوئی ادھار مجھ پر واجب نہیں ہے۔" [میں] نے شرمندگی سے جواب دیا۔ میرا لہجہ نرم اور آواز [التجا] جیسی تھی۔

"ہاں تو اچھا ہے ناں...... نہیں ہے تو...... مانگ [کیوں] رہے ہو؟"

"چاچا قرض تو مجبوری میں مانگا جاتا ہے۔ کھانے کو [کچھ] نہیں ہے گھر میں۔" میں نے کہا۔

"ارے ایسی کون سی مجبوری ہے۔ تمہارے بچے تو [ہیں] نہیں جو بھوک کے مارے بلک بلک کر رو رہے ہوں۔" [اس] نے کہا۔

"کام لگے گا تو دے دوں گا چاچا۔" میں نے کہا۔

"تم نہیں کرنے والے کام وام، مانگ کر کھانے کی [عاد]ت ہوگئی ہے تمہاری۔" اس نے کہا۔

"[ار]ے دو چاچا کچھ نہ پوچھو۔ اتنی منت کررہا ہے۔" [ایک] گاہک نے کہا۔ "ابھی کوئی ٹی ٹی لے آگیا تو سب کچھ [دے] کردے دو گے اور اس کے جانے کے بعد روتے رہو [گے] کہ میں لٹ گیا، میں برباد ہوگیا۔" اس منہ پھٹ گاہک [نے] ہنستے ہوئے کہا تو چاچا رحمن اس پر بھی بگڑ گیا۔ "اب کوئی [ڈ]اکو آئے تو سہی۔ وہ تو میں اس دن اسلحے سے ڈر گیا تھا [ور]نہ ان کی مجال تھی کہ وہ مجھ سے ایک پیسا بھی نکلوا لیتے۔" [چاچا] رحمن نے لمبی چوڑی تقریر کردی۔ اس گاہک کی بات پر [اسے وہ و]قت یاد آگیا تھا جب راہزن اسے لوٹ گئے تھے۔ جب [ہی] وہ بھڑک گیا تھا۔

میں خالی ہاتھ گھر آگیا اور ہم دونوں بھوکے ہی سو [گئے۔ مگ]ر اب خالی پیٹ کی تکلیف شگفتہ کی برداشت سے باہر ہو [گئی تھ]ی۔ وہ بے چینی کے عالم میں دائیں بائیں کروٹیں بدل [رہی تھ]ی۔ میں بستر سے اٹھا اور صحن میں رکھے ہوئے گھڑے [سے] پانی کا گلاس بھر لایا۔

"یہ پی لو۔" میں نے اس کی طرف پانی کا بھرا گلاس [بڑھا] کر کہا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی اور [پھر] بے دلی سے گلاس لے کر منہ سے لگا لیا۔ اس نے ایک [ہی] گھونٹ کر کے پورا گلاس خالی کردیا۔ تھوڑی دیر بعد [اسے] زوردار ابکائی آئی اور پانی اس کے معدے سے باہر [نکل آ]یا۔ وہ نڈھال ہوگئی تھی۔ میں نے اسے سہارا دیا کمرے [سے] باہر لایا اور کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی چٹائی پر لٹا دیا۔ وہ [لمب]ے اکھڑے سانس لے رہی تھی۔ موسم سرد تھا۔ وہ کپکپا رہی تھی۔

"بھوک سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔" شگفتہ نے مری مری سی آواز میں کہا۔

"اس وقت تو ساری دکانیں بند ہوں گی۔ بس ابھی تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ تو تمہارے لیے کچھ لے آؤں گا۔" میں نے اس کے بکھرے بالوں کو درست کرتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

اس کی نمناک آنکھوں میں بے شمار سوالات تھے۔

اس کے چہرے پر افسردگی اور بے چارگی تھی۔

میں بھی بے بس تھا۔ میں کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔ دل بہت پریشان تھا۔

میں نے بے چارگی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس وقت بھی شگفتہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"گھبراؤ مت۔ بس تھوڑی سی روشنی ہو لینے دو۔ میں تمہارے لیے کچھ کرتا ہوں۔" میں نے کہا تو اس نے جواباً نفی میں سر ہلا دیا۔ یعنی وہ ناامید ہوگئی تھی۔

مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں روشنی ہو جائے گی تو تمہیں اسپتال لے جاؤں گا۔ وہاں تم منٹوں میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔" میں نے کہا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے گر کر کچی زمین میں جذب ہو گئے۔ یہ میری بے بسی کا اظہار تھا۔ شگفتہ بھی جانتی تھی کہ میں اسے جھوٹی تسلیاں دے رہا ہوں۔

اچانک ہی میرے دل میں ماسی روبینہ کا خیال آیا۔ وہ بنگلوں میں ماسی کا کام کرتی تھی۔ اپنے اس کام کی وجہ سے وہ سارے محلے میں ماسی مشہور ہوگئی تھی۔

صبح کا اجالا ہوا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"شگفتہ میں ابھی آیا۔" میں نے کہا اور اس کا جواب سنے بغیر ہی گھر سے باہر نکل گیا اور تیز تیز چلتا ہوا ماسی روبینہ کے گھر پہنچ گیا۔ دروازے پر دستک دی۔ جواب نہ ملا تو پھر دستک دی۔ اس بار ذرا زور سے دستک دی تھی۔

"ابے کون ہے اتنی صبح صبح۔" اندر سے مردانہ آواز آئی۔ یہ ماسی روبینہ کے اکلوتے بیٹے راجو کی آواز تھی۔ دروازہ کھلا اور راجو باہر آگیا۔

"شیراز بھائی اس وقت خیریت تو ہے ناں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں! وہ ماسی روبینہ۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔ تبھی اندر سے ماسی روبینہ کی آواز آئی۔

''کی ہو یا راجو پتر...... کون ہے اتنے سویرے سویرے؟''

''ماسی میں ہوں...... شیراز۔'' میں نے ذرا دروازے کے قریب ہو کر بلند آواز میں کہا تاکہ وہ میری آواز سن لے۔

''شیراز پتر۔'' ماسی روبینہ نے دروازے میں آ کر کہا۔

''ماسی...... روبینہ کے پیٹ میں شدید تکلیف ہے۔''

''تو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ اماں کیا کرے گی۔'' راجو بیچ میں بول پڑا۔

''تو چپ کر۔'' ماسی روبینہ نے اسے ٹہوکا دیا اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''وہ اصل میں...... کل دوپہر سے کچھ کھایا نہیں ہے اگر کچھ ہو تو......'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ اس وقت مجھے شرمندگی بھی بہت ہوئی تھی۔

''اچھا اچھا۔'' ماسی نے کہا اور اندر چلی گئی۔

''چچ...... چچ...... چچ...... مانگنے کا طریقہ تو پرانا ہے مگر اتنی صبح تو کوئی نہیں آتا۔'' راجو نے طنزیہ مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے شرمندگی سے اپنی نظریں زمین میں گاڑ دیں۔

اس کی بات پر مجھے غصہ آیا تھا لیکن ضبط کر لیا کہ لوگوں کی زبان کب روکی جا سکتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد ماسی نے دروازے کے پردے کے پیچھے سے باہر ہاتھ نکالا اور کہا۔ ''یہ لے پتر جو کچھ ہے یہی ہے۔''

''اس وقت تو یہ بھی بہت ہے ماسی۔'' میں نے خوش ہو کر کہا اور شاپر پکڑ کر واپس گھر کی طرف چل پڑا۔

''اماں...... کل سے شگفتہ باجی کو بھی لے جانا اپنے ساتھ بنگلے میں ماسی کے کام پر۔'' چند قدم ہی گیا تھا کہ راجو کی آواز نے مجھے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ میں حسرت زدہ اس کو دیکھنے لگا۔

''ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔ اس طرح بھوکے تو نہیں رہو گے۔'' واجد نے کہا۔ میں شرمندہ ہو گیا۔ جی تو چاہا کہ اس کی ماں کا دیا ہوا شاپر اس کے منہ پر دے ماروں مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس وقت بھوک نے مجھے بھی فقیر بنا دیا تھا۔ میں سر جھکائے خاموشی سے گھر کی طرف چل پڑا۔

راجا خود تو کچھ کرتا نہیں تھا۔ ماسی روبینہ بنگلوں [illegible] کام کرتی تھی۔ کھانا پینا، پہننا اوڑھنا سب کچھ بنگلے [illegible] جاتا تھا۔ تنخواہ اتنی زیادہ تو نہ تھی مگر جتنی بھی تھی پوری [illegible] بچ جاتی تھی۔ مکان بھی اپنا تھا۔ بیوہ ہونے کی وجہ [illegible] کی خاص امداد بھی ہو جایا کرتی تھی۔ راجو کا کام تو [illegible] طرح کے نکھے دوستوں میں وقت گزارنا تھا۔ پان [illegible] ڈبو اور تاش کھیلنا اس کی خاص مصروفیات تھیں [illegible] خوش حال تھا اور میں پریشان حال۔ بے روزگاری [illegible] غربت کے بوجھ تلے دبا دیا تھا۔ شادی کو تین سال [illegible] تھے۔ ابھی کوئی اولاد نہ تھی۔

غربت انسان کو لوگوں کی نظروں سے گرا دیتی [illegible] کہنے والوں نے کہا ہے کہ بھوک برداشت کر لو مگر [illegible] آگے ہاتھ مت پھیلاؤ مگر یہ تو ناممکن بات ہے۔ کہنے وال[illegible] نے بھوک کی شدت سے ہونے والی تکلیف نہ جھیلی ہو [illegible] کوئی کب تک بھوک برداشت کرے۔ بھوک کی [illegible] صبر اور ہمت کو توڑ دیتی ہے۔ جھکا دیتی ہے دوسروں [illegible] سامنے بھیک مانگنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جیسے آج ہی [illegible] کر ماسی کے دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ بھیک مانگنے پر [illegible] ہو گیا تھا۔ لوگ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ نظروں [illegible] دیتے ہیں۔ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں مگر [illegible] مجبوری، بے بس کی بے بسی اور پریشان حال کی پریشا[illegible] کوئی نہیں دیکھتا۔ مجبور لوگوں کی انا مر جاتی ہے۔ شرم [illegible] جاتی ہے۔ سر جھک جاتا ہے جیسے راجو کی باتوں نے [illegible] جھکا دیا تھا ورنہ یہی راجو دور سے ہی بلند آواز میں [illegible] کرتا تھا۔ ''شیراز بھائی...... آج کل دکھائی نہیں [illegible] ہمارے لیے بھی کچھ وقت نکال لیا کرو۔ ہمیں بھی کچھ خد[illegible] کا موقع دو۔''

ماسی کا دیا ہوا شاپر لیے گھر آ گیا۔ شگفتہ میری [illegible] تھی۔

''تمہارے لیے کھانے کو لایا ہوں۔'' میں نے کہا [illegible] اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بھی بمشکل اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ا[illegible] نظریں شاپر پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے شاپر میں سے کاغذ [illegible] لفافہ نکال کر اس میں دیکھا۔ برگر پر نظر پڑی۔ لفافے [illegible] برگر نکال کر ایک نوالہ توڑ کر اپنے ہاتھ سے اسے کھلا[illegible] لیے اس کے منہ کے قریب کیا تو یک دم اس نے میرا ہاتھ [illegible] لیا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اس کے چہرے [illegible] ناگواری عیاں تھی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''خراب ہے۔'' اس نے کہا اور ابکائی لی۔

''خراب ہے؟'' میں نے اس کے الفاظ دہرائے اور وہی نوالہ اپنے ناک کے قریب کیا تو اس میں سے اٹھنے والی ناگوار بدبو نے میرے دماغ کو چکرا دیا۔ ماسی روبینہ نے نہ جانے کب سے رکھا ہوا برگر اٹھا کر دے دیا تھا۔ وہ پورا برگر میں نے ایک طرف پھینک دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو چار کوے کائیں کائیں کرتے آئے اور برگر کھانے لگے۔ یہ ان کے نصیب کا تھا۔

''ہمارے نصیب میں کچھ ہے بھی یا نہیں۔'' میں نے سوچا۔

''اب کیا کروں...... کس سے جا کر مانگوں......'' پریشانی سے میں نے سر پکڑ لیا۔

''اتنا پریشان مت ہو شیراز۔'' شگفتہ نے کہا اور پھر لیٹ گئی۔

''تو پھر کیا کروں میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' میں نے کہا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ آنے والے نے دروازہ بہت زور سے کھٹکھٹایا تھا۔ گلی کے آخری مکان تک آواز گئی ہوگی۔

''لو...... آ گیا کوئی قرض لینے والا۔'' میں نے کہا اور جا کر دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ایک دس بارہ سال کا لڑکا ہاتھ میں سیاہ شاپر پکڑے کھڑا تھا۔

''ہاں بولو۔'' میں نے پوچھا۔

اس نے شاپر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''رات دادا کا سوئم تھا۔ یہ ابو نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔''

میں نے اس سے شاپر لے کر دیکھا چکن بریانی تھی۔ میں جلدی سے گھر کے اندر گھس آیا اور دروازہ بند کر کے کنڈا لگا دیا۔ خوشی خوشی اپنے ہاتھوں سے شگفتہ کو بریانی کھلائی اور خود بھی کھائی۔

ہڈیاں باہر پھینکنے کے لیے دروازے سے باہر جھانکا تھا کہ وہی لڑکا پھر آ گیا۔

''انکل وہ شاپر واپس دے دیں۔'' اس نے کہا۔

''کیوں بھئی کیا مذاق ہے؟'' میں لڑکے کی بات سن کر چونک پڑا۔

''وہ تو کونے والے مکان میں دینا تھا۔ میں آپ کو دے کر چلا گیا۔''

''اچھا...... یہ ہڈیاں دیکھ رہے ہو ناں۔ ہم نے کھا لیا ابو کو بتا دینا۔'' میں نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

کام کی غرض سے چند ایک لوگوں سے رابطہ کیا مگر کام نہ لگا رنگ والے مستری، ہوٹل والے، یہاں تک کہ کباڑیوں سے بھی کام پر رکھ لینے کی منت کی مگر بے سود۔ سارا دن سڑک چھاپ چھاپ کر شام کو تھکا ہارا خالی ہاتھ گھر آ گیا۔

صبح کے وقت تو کسی کے سوئم کا کھانا ہمارے ہاں حکم الٰہی سے پہنچ گیا تھا۔ بار بار کسی کا سوئم چالیسواں تو ہونے سے رہا۔ مسئلہ وہی رات کا کھانا اور صبح کا ناشتا۔ سوچا کسی نہ کسی دکاندار کی منت کر لوں تو کچھ مل ہی جائے مگر لیکن اس دن جو رحمٰن چاچا نے شرمندہ کیا تھا۔ یہ سوچ کر کسی سے کچھ کہنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن پھر بھی یونہی گھر سے باہر نکل آیا۔ ایک چھ سات سال لڑکے پر نظر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ تھا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے سامنے آ گیا۔

''اوئے...... کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے اسے جھڑک کر پوچھا۔ آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو وہ سہم گیا۔

''وہ...... وہ...... دکان پر جا رہا ہوں سودا لینے۔'' اس نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

میں نے ایک نظر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ میری اس اچانک کارروائی پر وہ اپنی جگہ سے ہل گیا اور حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے سو کا نوٹ چھین لیا...... اسے کان سے پکڑ کر گھمایا تو وہ بلبلا اٹھا اور الٹے قدموں بھاگ کھڑا ہوا۔ میں تیز تیز چلتا ہوا چاچا رحمٰن کے جنرل اسٹور پر پہنچ گیا۔ دو چار گاہک کھڑے ہوئے تھے۔

''ادھار بالکل نہیں دوں گا۔'' چاچا رحمٰن نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''میں نے ادھار کب مانگا ہے آپ سے؟ اس نے سارے گاہکوں کو باری باری فارغ کیا تو میں نے اپنا ضروری سامان بتایا۔ اس نے سارا سامان تول کر شاپر میں ڈال دیا۔

''کتنے پیسے ہوئے چاچا؟'' میں نے شاپر اٹھا کر پوچھا۔

''چار سو ستر روپے۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا دو چار دنوں میں دے دوں گا۔'' میں نے

کہا۔
''واپس کردو سارا سامان۔'' اس نے شاپر پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ بڑبڑانے لگا میں سنی ان سنی کر کے گھر کی طرف چل پڑا۔
گھر پہنچا ہی تھا کہ راجو اپنے دو ساتھیوں کو لیے میرے پاس آپہنچا۔ اس نے ایک شاپر میری طرف بڑھایا اس میں تربوز اور آم کے چھلکے دکھائی دے رہے تھے۔ میں حیرت سے راجو کا منہ تکنے لگا۔
''تم نے صبح ہی مجھے بتایا تھا کہ تمہاری گھر والی کے پیٹ میں بھوک سے درد ہو رہا تھا۔''
''یہ چھلکے کھانے سے درد ورد سب غائب ہو جائے گا۔'' اس کے ایک دوست نے کہا۔
''یہ بکریاں بڑے شوق سے کھاتی ہیں۔ کبھی ان کے پیٹ میں درد ہونے کے بارے میں نہیں سنا ہوگا تم نے۔'' یہ راجو کا دوسرا دوست تھا۔ وہ تینوں میری غربت کا مذاق اڑا رہے تھے اور میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ ان تینوں لفنگوں کی باتیں سن کر میرا خون کھولنے لگا تھا۔ وہ میری بے عزتی کر رہے تھے۔ یہ ساری شرارت راجو کی ہی تھی۔ ان کی بے تکی باتوں نے مجھے آپے سے باہر کر دیا تھا۔ میں نے راجو کا گریبان پکڑ لیا اور منہ سے اول فول بکنے لگا۔ اس کے ساتھی کے ہاتھ میں نہ جانے کیا چیز تھی جو اس نے میرے ماتھے پر ماری تو خون جاری ہو گیا۔ میں نے بھی راجو کو مکا جڑ دیا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا۔ وہ بھی لہولہان ہو گیا۔ ہم کافی دیر لڑتے رہے۔ وہ تین تھے اور میں اکیلا۔
''کیا ہوا شیراز۔ کیا ہوا کیوں لڑ رہے ہو تم لوگ اس کے ساتھ۔ شیراز اندر آجاؤ۔'' یہ شگفتہ کی آواز تھی جو شور شرابہ سن کر دروازے پر آگئی تھی۔ اس وقت لالہ کریم وہاں آ گیا اس نے مداخلت کر کے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ وہ چلے گئے اور میں بھی گھر آ گیا۔ شگفتہ میرا خون دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس نے اپنا دوپٹا پھاڑ کر میرا خون صاف کیا۔
نوکری کی تلاش میں سارا دن گزار کر گھر پہنچا تو اپنے استقبال کے لیے مالک مکان کو کھڑا پایا۔
مالک مکان سراج کو دیکھ کر میں چونکا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے کہیں اِدھر اُدھر غائب بھی نہیں ہو سکتا تھا۔
''اس خبیث کو بھی آج ہی آنا تھا۔'' میں نے دل میں سوچا۔
''کیوں میاں کہاں چھپتے پھر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔ اس کا سخت لہجہ ایسا تھا کہ جیسے اس نے ہتھوڑا میرے سر پر دے مارا ہو۔
''آپ سے کہاں چھپ سکتا ہوں چاچا۔ آپ تو گڑے مردے بھی نکال لیتے ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
''ارے میاں اِدھر اُدھر کی چھوڑو، کرائے کی بات کرو۔ تین مہینوں کا کرایہ نہیں ملا۔'' اس نے کہا۔
''بس چاچا نوکری لگنے دو پورا کرایہ چکتا کر دوں گا۔''
''ارے میاں تم مکان خالی کردو۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ میں خاموش کھڑا اس کا منہ تکنے لگا۔
''چلو جلدی کرو۔ اپنا سامان نکالو باہر۔'' اس نے ہاتھ سے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ مالک مکان کو اس وقت قائل کرنا مجھے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ جب کچھ سجھائی نہ دیا تو اسے اپنے گھر کے باہر کھڑا چھوڑ کر ایک طرف چل پڑا۔ وہ مجھے پکارتا رہا۔ آوازیں دیتا رہا۔ میں اس کی ہر بات کو ان سنی کر کے تیز تیز چلتا ہوا گلی کے کونے تک پہنچ گیا۔ اس کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں کھڑی ہوئی ہائی روف کے پیچھے چھپ گیا۔ میں نے دیکھا مالک مکان غصے میں گھر کے دروازے کو ٹھوکریں مار رہا تھا۔
دروازہ کھلا۔ شگفتہ دکھائی دی۔ ان دونوں کی کوئی بحث ہوئی اور کافی دیر بعد مالک مکان چلا گیا۔
میں گھر جانے کی بجائے گلی سے باہر ہوٹل میں چلا گیا۔ چائے کا آرڈر دے دیا اور تھوڑی ہی دیر میں چائے آگئی۔ چائے کا کپ منہ سے لگایا ہی تھا کہ پولیس اہلکار ہوٹل میں داخل ہوئے میں نے اپنا دھیان دوسری طرف کر دیا۔ میرا دل دھڑکنے لگا تھا۔ کہیں مالک مکان نے رپورٹ تو نہیں کر دی۔ پچھلے مہینے اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر اگلے ماہ پورا کرایہ نہ دیا تو پولیس کے حوالے کرا دوں گا اور اس ماہ پورا کرایہ تو کیا کچھ بھی نہیں دیا۔ اس پر یہ کہ ابھی گھر کے پاس ہی کھڑا چھوڑ کر ادھر آ گیا۔
پولیس اہلکار میرے پاس آ کر رک گیا۔
''جی......؟'' میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''جی کے بچے۔'' اس نے کہا اور ایک زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر جما دیا۔ میں چکرا گیا۔

''آواز سنائی نہیں دی تم کو......'' اس نے کہا۔ اب مجھے خیال آیا کہ ہوٹل کے اندر داخل ہوتے وقت میرے کان میں جو آواز ''اوئے......اوئے ادھر آ'' پڑی تھی ان ہی کی تھی۔
''سوری میں نے سنا نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔
اس نے میری کلائی کو اس مضبوطی سے پکڑ لیا کہ جیسے میں کوئی جرم کرتے وقت رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہوں۔ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔
''چلو صاحب کے پاس۔'' اس نے کہا اور مجھے ہوٹل سے باہر ایک طرف کھڑی ہوئی پولیس موبائل کے پاس لے آیا جہاں ان کا صاحب یعنی پولیس افسر کھڑا تھا۔
''یہ آ گیا صاحب!'' پولیس اہلکار کا یہ کہنا تھا کہ پولیس کے لوہے جیسے ہاتھ نے میرے دوسری طرف کے رخسار کو بھی سرخ کر دیا۔ اس کی انگلی لگنے سے میری آنکھ سے پانی بہنے لگا تھا۔
''بٹھاؤ اس کو۔'' افسر نے کہا تو اس اہلکار نے مجھے پولیس موبائل میں بٹھا دیا۔ موبائل اسٹارٹ ہوئی نامعلوم سمت چل پڑی۔
''کیا ہوا جناب؟ میں نے تو کچھ نہیں کیا؟'' میں نے لرزتی آواز میں کہا مجھ سے ٹھیک طرح سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ مجھے تھانے لے گئے۔
''چوریاں، ڈکیتیاں، قتل جیسی وارداتوں میں تم ملوث ہو۔'' پولیس والوں کے منہ سے یہ سننا تھا کہ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ آنکھوں کے سامنے جیل کے قیدیوں کے مناظر کسی فلم کی ریل کی طرح حرکت کرنے لگے۔ کال کوٹھڑی میں پھانسی کے منتظر قیدیوں میں، میں اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ تختہ دار پر پھانسی لگنے والے مجرم کی جگہ اپنے آپ کو جھولتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر پولیس افسر کے پیر پکڑ لیے۔ اس کے سامنے بہت رویا، گڑگڑایا مگر انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ شگفتہ بھی روتی پیٹتی تھانے پہنچ گئی۔ ساتھ ہی محلے کی دو تین اور بھی عورتیں تھیں جن میں رانی بھی شامل تھی جب کہ مجھے راجو نے پھنسایا تھا۔ پولیس والوں نے مجھے چھوڑنے کے عوض ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کر دیا۔ ہم بہت روئے۔ ڈکیتی کے کیس میں تیراڈی لگا کر جیل بھیج دینے کی دھمکی دی جا رہی تھی۔
شگفتہ نے اپنے طور پر بہت کوشش کی کہ میری ضمانت کروا لے مگر کچھ نہ کر سکی۔ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی کیوں کہ اس کا کسی بااثر فرد سے تو کیا عام محلے داروں سے بھی واقفیت نہ تھی پنجرے کے پنچھی کو باغات، کھیت کھلیان کی کیا خبر۔ کنویں کے مینڈک کو دریاؤں، ندی نالوں اور جوہڑوں کا کیا پتا۔ ایسی ہی مثال میری بیوی شگفتہ کی بھی تھی۔
اسی رات جب میں نے ایک سپاہی کو حوالات کی طرف آتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ مجھے دوبارہ سے تھانے کے ڈرائنگ روم نامی جگہ پر لے جانے کی تیاری ہے جہاں گزشتہ رات بھی مجھ پر تشدد کے پہاڑ توڑے گئے تھے۔
اس سپاہی نے نزدیک آ کر کہا۔ ''معین صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔'' پھر اس نے دروازے پر لٹکا تالا کھولا اور مجھے ساتھ لے کر ایک کمرے میں پہنچا۔ وہاں ایک ہی شخص پولیس کی وردی میں تھا جب کہ تین لوگ اور بھی تھے۔
ان میں سے ایک نے کہا۔ ''تمہاری ضمانت کرا دی ہے۔ کیس بھی ختم کرا دیا ہے۔''
''آپ......آپ کون ہیں۔'' میں نے پوچھا۔
''ہم خدائی فوجدار ہیں۔ ابھی تو گھر جاؤ آرام کرو۔''
میں وہاں سے نکلا تو سیدھا گھر آیا۔ بیوی خوش ہو

غزل

مرتے دم تک یہ خیال ہی اس کو دامن گیر تھا
مرد یا عورت تھی وہ نام جس کا ہیر تھا

اللہ بخشے مرنے والے میں بہت تھیں خوبیاں
سچ کا ویری بہت تھا، جھوٹوں کا وہ پیر تھا

عقل و دانش کا پلندہ صبح تک سوچا کیا
رات کو کھانا جو کھایا حلوا تھا یا کھیر تھا

عمر بھر ڈر اس کو رہا نظر نہ لگ جائے کہیں
نظر نہ اس کو لگی جو نام کا نظیر تھا

صاف وہ منکر تھے کہ میں نے تیر کوئی مارا نہیں
دل میں کھبھ کر رہ گیا جو کس کا آخر تیر تھا

اس کے دروازے تک بھی میں پہنچا کس طرح
اک دوپٹا اس کا میرے پاؤں کی زنجیر تھا

(پھرو ح حیران پوری)

مرسلہ: حنیف ادیب۔ لاہور

گئی۔ اس نے کہا۔ ”صبح ایک صاحب آئے تھے۔ انہوں مجھ سے تمام معلومات لیں پھر مجھے یہ کچھ روپے دے کر بولے۔ ”شام تک تمہارا شوہر آجائے گا۔“

قارئین جانتے ہیں وہ کون تھا؟ یہی میرا باس۔ اس نے مجھے کنویں سے نکال کر کھائی میں دھکیل دیا ہے۔

جیل سے باہر میں مجرم ہو کر بھی مجرم نہیں ہوں۔ اس کے دکھائے ہوئے سبز باغوں کی ہریالیاں دیکھ کر خوش ہوں اور حیرت زدہ بھی۔ اس نے جو آزادی دی ہے وہی تو اصل میں قید خانہ ہے۔ اس نے مجھے اپنے جال میں پھانس لیا۔ میں جیل کی اسیری سے نکل کر ان کی غلامی میں آگیا۔ انہوں نے میری ضمانت کرائی اور میرا باس بن گیا۔ اس کے تعلقات بین الاقوامی اسمگلروں کے ساتھ ہیں۔

اس نے میری ضمانت کرا کر مجھے ایک نئی دنیا میں کھینچ لیا اور میں اس کے بتائے ہوئے کام کرنے لگا۔ میں مجرم ہو کر بھی مجرم نہیں تھا۔ میں ان کے قید خانے میں بظاہر آزاد تھا۔ لیکن پابہ زنجیر تھا۔ ان کے چنگل سے نکلنے کا سوچ کر بھی نکل نہیں سکتا تھا۔ اس نے کئی پولیس افسروں کو بھی ساتھ ملا رکھا تھا۔ مجھے اس بات کا اس وقت پتا چلا کہ جب اس نے شراب نوشی کرتے ہوئے حقیقت اگل دی تھی۔ وہ اپنے اسی طریقے سے بہت سارے بے گناہ لوگوں کو تو۔ اپنے اس قید خانے میں قید کر چکا تھا۔ جس طرح مجھے کیا تھا۔ یعنی پہلے پولیس کیس بناتا پھر بری کراتا۔ جیل حکام، ایئرپورٹ کے اسٹاف، غرض ہر وہ محکمہ جس سے اس کا واسطہ پڑتا تھا۔ سب اس کی رشوت کے قید خانے کے قیدی تھے۔ فرق اتنا تھا کہ وہ سب میری طرح ہسٹری شیٹر نہ تھے جبکہ میرے چہرے پر جرم کی سیاہی خود اس نے پوتی تھی۔ کل میں اسی کے کام نمٹا کر امریکا سے آیا ہوں اور اس وقت بیگم کے ساتھ جہازی سائز کے بیڈ پر لیٹا تھا کہ باس کا فون آگیا۔

اس کام میں میری طرح مجبور کئی لڑکیاں بھی میرے ساتھ ہوتی ہیں۔ اسی نے مجھے ضروریات زندگی کی ہر سہولت فراہم کی ہے۔ نہ صرف مجھے بلکہ اس نے اپنے ہر کارندے کو نوازا ہوا ہے۔ جو ابھی وہ مجھ سے واپس لینے کی بات کر رہا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے اس کی فراہم کردہ ہر سہولت میسر ہے لیکن...... سکون نہیں۔ اس سے تو میری وہ سڑک چھاپ زندگی ہی اچھی تھی۔ رات کا چین اور دن کا سکون تو تھا۔ غربت کی اس زندگی میں بھی بے فکری تھی۔ نہ اسمگلنگ کرتے ہوئے گرفتار ہونے کا ڈر تھا اور نہ ہی اپنے خوب صورت بیڈ روم میں رات کو سوتے میں چھاپہ پڑنے کا خوف۔ اس فاقوں بھری زندگی میں بھی ایک اپنا ہی مزہ تھا، آزادی تھی۔ پنجرے میں قید پنچھی کو ملتا تو پیٹ بھر کر ہے مگر پرواز کی آزادی نصیب نہیں ہوتی۔ پنجرہ چاہے جواہرات جڑی ہوئی سونے کی تاروں کا کیوں نہ ہو لیکن پنجرہ تو پنجرہ ہی ہوتا ہے۔ اب میرے سینے میں اس قید خانے سے آزاد ہونے کی خواہشیں ابھرنے لگی تھیں۔

شگفتہ میرے لیے مشروب کا گلاس بھر کر لے آئی۔ مشروب پینے سے دل کو کچھ قرار ملا۔ گھبراہٹ اور بے قراری اور سینے کی تکلیف میں کمی ہوئی۔

آج باس نے جس ہتک آمیز انداز میں ڈانٹا تھا اس کا مجھے دکھ تھا۔ میں اپنی زندگی داؤ پر لگا کر کام کرتا تھا اس کا یہ صلہ مل رہا تھا۔ یوں بھی میں اس زندگی سے تنگ آگیا تھا۔ گزشتہ کلب سے آتے ہوئے ایک بندے سے ملاقات ہوئی تھی اس نے اشاروں اشاروں میں بتا دیا تھا کہ وہ مجھے پہچان گیا ہے کیونکہ اس کا تعلق ایک سرکاری ایجنسی سے ہے۔ اس نے کہا تھا کہ جب بھی ضمیر جاگ اٹھے تو وطن کی معیشت کو نقصان پہنچانے والوں کو قانون کے سامنے کھڑا کر دو۔

اب وہ وقت آچکا تھا۔ میرا ضمیر مجھے برابر ملامت کر رہا تھا اسی لیے میں نے موبائل پر جلدی جلدی چند ایک میسیج کیے اور باس کو کال کر کے اگلی دوپہر ملاقات کا وقت مقرر کر لیا۔

باس کی خفیہ قیام گاہ میں بین الاقوامی اسمگلروں کی محفل عروج پر تھی۔ شراب اور شباب سب کچھ ہی میسر تھا۔ ہر کوئی اپنی مستی میں مگن تھا کہ رقص کے لیے مدعو کی گئی رقاصاؤں نے یک دم ہم سب کو ہی اسلحہ کی زد میں لے لیا اور کہا۔ ”خبردار! اگر کسی نے بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو فائر کر دیا جائے گا۔“

ہوا یہ تھا کہ میں نے اپنے کسی بھی ساتھی کو خبردار کیے بغیر اعلیٰ قانونی حکام کو آج کے اس اسمگلنگ کے اس تاریخ ساز منصوبے کی اطلاع کر دی تھی اور انہوں نے موقع پر ہی انسپکٹر جواد خان نے کارروائی شروع کر دی تھی، وعدہ معاف گواہ ہوں۔ بہت جلد وعدے کے مطابق آزاد ہو جاؤں گا۔ اس چھاپے کے دوران ہوئی فائرنگ میں میرا باس اور کئی اہم کارندے مارے گئے تھے، اس لیے مجھے اب کوئی خوف بھی نہیں ہے۔

وہ اکثر رات کے اس پہر آم کے اس دیو قامت پیڑ کے نیچے آکر بیٹھ جاتی تھی۔ رات کا یہ پہر اسے بہت بے چین کرنے لگتا تھا۔ بستر پر بن پانی کے مچھلی کی مانند کروٹیں بدلنے کے بعد بھی اسے قرار نہ ملتا تھا۔ وہ سکون کی تلاش میں کمرے سے باہر نکل آتی تھی۔ کچھ دیر صحن کے بیچ و بیچ ٹہلنے کے بعد اس دیو قامت پیڑ تلے بیٹھ جاتی۔ بغیر کسی ڈر اور خوف کے اپنی نظریں پیڑ کی بڑی بڑی شاخوں پر مرکوز کر دیا کرتی پھر ہمیشہ کی طرح اپنی سوچوں کے حصار میں ڈوب جاتی۔ یہ وقت اسے زندگی کی درد بھری اذیتوں سے دور لے جاتا تھا۔ اردگرد کیا ہو رہا ہے؟ کیسے ہو رہا ہے؟ وہ ان سب باتوں سے بے نیاز ہو کر اپنے ماضی میں ڈوبی، اپنے مستقبل کی فکر میں گم صم نہ جانے کتنی دور نکل جاتی تھی۔ سوچوں کا لشکر اس کے ذہن پر یلغار کر دیتا



محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

شک انسان کی زندگی کو کس طرح دیمک بن کر چاٹ جاتا ہے یہ سچ بیانی اسی کی تصویر ہے۔ اس معصوم سی مریم کے دکھ درد کی تفسیر ہے۔ اُمید ہے اسے سرگزشت میں جگہ ضرور ملے گی۔

فضہ خان

(ہری پور ہزارہ)



تھا۔ایسے وقت میں وہ بے خودسی ہوجاتی۔اسے اندازہ بھی نہ ہوتا تھا اور نہ وقت گزرنے کا احساس ہوتا۔وہ بس پیڑ کو دیکھتی رہتی تھی۔خیالوں کے منجدھار میں ڈوبتی ابھرتی رہتی۔ پھر گھر کے قریب ہی بنی مسجد میں تہجد گزار آنا شروع ہوجاتے وہ باتیں اس کی سماعتوں سے ٹکراتی۔وہ یک دم ہی دکھوں کی وادی سے باہر قدم رکھتی ہوئی حال کی دنیا میں واپس آجاتی تھی۔

وہ اپنے گالوں پر پھیلے آنسو اپنے ہاتھوں کی چاروں انگلیوں کو جوڑ کر صاف کرتی ہوئی پھر اٹھ کھڑی ہوتی تھی اور نہایت دلجمعی کے ساتھ تہجد کی نماز کے لیے وضو کرکے وہ اپنے خدائے بزرگ و برتر کے سامنے سجدہ ریز ہوجایا کرتی تھی۔

اپنے دل کی ساری باتیں،شکوے، تکلیفیں اپنے اللہ سے بانٹنے کے بعد وہ انتہائی پُرسکون ہوجایا کرتی تھی۔اس بے چین راتوں میں یہ وہ واحد گھڑیاں ہوا کرتی تھیں جو اس کی سکون سے گزرتی تھیں۔

مگر آج تو نہ ہی تہجد کی نمازاسے دکھ ساگر سے باہر لا پائی تھی۔نہ ہی فجر کی اذان اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔یوں ہی درخت کو گھورتے ہوئے صبح کی روشن کرنوں نے شاخوں کی اوٹ سے جھانکنا شروع کردیا تھا۔

صحن کے بیچ اس کا مٹی سے بنا ہیولا کسی بے جان بت کی طرح زمین پر ڈھیر معلوم ہو رہا تھا۔آنکھوں میں اندھیری رات کے بعد روشن کرنوں کی چمک چبھنے لگیں تو اس کے بے جان ہیولے میں جان آگئی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔اپنے حسین رخسار پر پھیلے موتیوں کی مانند آنسو چنتی وہ تیز تیز ڈگ بھرتی اپنے کمرے کی جانب چل پڑی۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا پھر دیوار میں ایک سائیڈ پر بنی لکڑی کی الماری کا پٹ کھول کر اپنا کالج کا بیگ نکالا۔ایک ایک کرکے ساری کتابیں بیگ سے نکال کر الماری میں رکھ دیں پھر الماری سے اپنے دو جوڑے کپڑوں کے نکال کر کالج بیگ میں ٹھونسنے لگی۔اپنی ضرورت کا دوسرا سامان اپنا شناختی کارڈ اور چند سو روپے بیگ میں رکھنے کے بعد زپ بند کرتے ہی وہ غسل خانے کی جانب بڑھ گئی۔ٹھیک دس منٹ بعد وہ کالج کے یونیفارم میں ملبوس آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ کنگھی کرنے کے بعد الماری سے اپنا عبایہ نکالا اور سلیقے سے اوڑھنے کے بعد وہیں بیڈ پر بیٹھ گئی۔چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد وہ بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔ ہمیشہ کی طرح دادی کچن میں ناشتا بنانے میں مصروف تھیں۔اسے کمرے سے نکلتا دیکھا تو فوراً گویا ہوئیں۔"مریم پتر......تو آج جلدی تیار ہوگئی۔"

"جی ہاں ! دادی آج جلدی جانا تھا۔ہوسکتا ہے مجھے آنے میں بھی دیر ہوجائے......میرا......میرا پریکٹیکل بھی آج......تو آپ میرا انتظار مت کرنا۔"اس نے رک رک کر نا جانے کیا سوچتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تھی۔

دادی نے اس کے سامنے چائے کا کپ اور انڈا پراٹھا رکھا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

"دیکھ پتر رات تو نے غصے میں جو بھی کہا۔مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔وہ جیسا بھی ہے تیرا باپ ہے۔"کچھ لمحے خاموشی کے بعد دوبارہ بولی۔"پتر! اگر تیرے لیے کچھ سوچ کر اس نے فیصلہ کیا ہے تو ٹھیک ہی کیا ہوگا۔تیری ماں کی بے وفائی کی وجہ سے وہ تجھ سے بھی ناراض ہے ورنہ وہ!"

ابھی دادی کی بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ وہ چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے بول پڑی۔"میری ماں بے وفا نہیں تھی دادی۔مجھے آپ سے کم از کم اس سوچ اور اس بات کی توقع نہ تھی۔ پھر بھی اگر آپ ایسا سوچتی ہیں تو میں کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ آپ کو تو اپنا اکلوتا بیٹا ہی سچا اور ٹھیک لگے گا......مگر میں ایک بات آپ کو بتا دوں۔" وہ ایک پل ٹھہری، پھر بولی۔"میں اچھی طرح جانتی ہوں۔میں آج تک اپنی ماں سے ملی نہیں۔اس کو دیکھا نہیں مگر مجھے پتا ہے اور میں جانتی ہوں۔میری ماں غلط نہیں تھی۔انہوں نے جو کیا ٹھیک کیا تھا۔اب میں بھی وہی کروں گی جو مجھے ٹھیک لگے گا۔وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔"آپ مجھے اس بارے میں کچھ مت سمجھائیں۔نہ ہی اب سمجھنا ہے مجھے۔اب میں چلتی ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

وہ دادی سے دوٹوک الفاظ میں سب کچھ بول چکی تھی۔وہ اپنا بیگ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مگر بچے وہ تیرا باپ ہے، تو غصہ نہ کر بلکہ ٹھنڈے دماغ سے سوچ۔اگر اپنی ماں کو ٹھیک ثابت کرنا چاہتی ہے تو مان لے اس کی بات۔تیری زندگی بھی آسان ہوجائے گی۔میں بھی اپنی آخری عمر سکون سے گزار سکوں گی۔"دادی نے اس کے کھڑے ہوتے ہی اسے پھر سے سمجھانا چاہا۔اس نے ایک گہری سانس خارج کی، پھر بولی۔"مجھے کچھ بھی ثابت نہیں کرنا دادی......میں تھک گئی ہوں اب اور میرے خیال میں، میں پچھلے انیس سال سے یہ سب تو کر رہی ہوں۔وہ جو سمجھتے ہیں، سمجھتے رہیں۔مجھے اب کچھ بھی فرق نہیں پڑتا۔وہ میرا باپ نہیں ہے۔ایک بار کہہ دیا ہے نہیں ہے تو بس نہیں ہے۔بات ختم۔"

مریم نے اپنا لہجہ سخت کرتے ہوئے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔آج پہلی بار دادی نے اس کے لہجے میں نفرت اور حقارت دیکھی تھی۔انھوں نے اب مزید بحث مناسب نہ سمجھی۔چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔گھر سے باہر نکلتے ہی اس نے قدم روک لیے پھر اس نے مڑ کر گھر کی طرف دیکھا اور بڑبڑائی۔"دادی مجھے معاف کر دیجیے گا۔میں جانتی ہوں آپ کے علاوہ کسی کو میرے جانے کا دکھ نہیں ہوگا۔ مگر میں کیا کروں۔میرے یہاں سے جانے میں ہی میری اور اس گھر کی بھلائی ہے۔اپنی عزت نفس کی مزید تذلیل مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔میں اب جا رہی ہوں یہاں سے ہمیشہ کے لیے۔دنیا بہت بڑی ہے۔کہیں نہ کہیں تو عزت سے سر چھپانے کی جگہ مل ہی جائے گی۔"

اس نے گھر کے دروازے پر آخری نگاہ ڈالی تھی پھر انگلیوں کے پوروں سے آنسو چنتی سر جھٹکتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔بیٹیاں ہمیشہ باپ کے گھر سے روتے ہوئے نکلتی ہیں لیکن اس وقت باپ کا شفقت بھرا ہاتھ ان کے سر پر ہوتا ہے۔بہت سی دعائیں ہوتی ہیں۔باپ انھیں رو کر رخصت کرتے ہیں لیکن وہ اکیلی روتی ہوئی جا رہی تھی۔

☆......☆

مریم اپنے والدین مشتاق اور امبر زرین کی ایک ہی بیٹی تھی۔ان دونوں نے محبت کی شادی کی تھی مگر یہ محبت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی۔وہ شادی سے پہلے تو امبر پر جان نچھاور کرتے تھے۔اس کے ساتھ شہر کے چپے چپے اور کونے کونے میں گھومتے پھرتے اور ہوٹلنگ کرتے نظر آتے تھے۔ہر عاشق کی طرح انھوں نے بھی بے شمار قسمیں وعدے اور دعوے کیے تھے مگر شادی کے چند روز بعد ہی جب وہ محبوبہ سے بیوی بنی تو اس نے اپنی تنگ ذہنیت کی بنا پر اسے شک کی نگاہوں سے جانچنا شروع کر دیا۔اپنے اور امبر کے رشتے میں اس نے خود ہی شک کا زہر گھولا تھا جس کی کڑواہٹ دن بدن بڑھتی چلی گئی۔

امبر ایک آزاد خیال گھرانے سے تعلق رکھنے والی پڑھی لکھی اور سمجھدار لڑکی تھی۔اس نے اپنے طور پر ہر ممکن کوشش کی مشتاق کے ساتھ نباہ کرنے کی مگر آئے روز بڑھتے شک نے پابندیوں کی صورت اختیار کر لی۔اس پر دوست احباب بہن بھائی یہاں تک کے والدین تک سے ملنے پر پابندی لگ گئی۔وہ مشتاق کے ایک کنال کے گھر کے ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی۔

وہ اس کی ہر بات برداشت کرتی رہی۔ہر زیادتی پر وہ صبر کا مظاہرہ کرتی رہی۔جب حد سے تجاوز کر جاتا تو وہاں بھی لڑ یا رو کر اس کا مقابلہ صرف یہ سوچ کر کر لیتی کہ ابھی نہ سہی کبھی تو اسے یقین آئے گا۔

اسے اُمید تھی کہ اولاد کی پیدائش کے بعد اس کے رویے میں تبدیلی آجائے گی مگر شک کے بیج کا پودا ہمیشہ دراز ہوا کرتا ہے، گھٹتا یا ختم نہیں ہوتا۔اگر کچھ ختم ہوتا ہے تو وہ محض رشتے ہیں۔

ان دونوں کے درمیان بھی ایسا ہی ہوا۔

ڈیڑھ سال بعد امبر نے پھول سی بچی مریم کو جنم دیا۔یہ دن اس کے لیے انتہائی خوشی کا دن تھا۔دل ہی دل میں وہ اس بات پر پُر اُمید تھی کہ مشتاق کو جب بیٹی کی پیدائش کی خبر ملے گی تو وہ ساری باتیں بھول جائے گا۔ان دونوں کا رشتہ مضبوط ہو جائے گا مگر یہ صرف اس کا خیال تھا۔مشتاق کو جب پتا چلا امبر نے بیٹی کو جنم دیا ہے تو وہ آفس سے نہ اسپتال گیا اور نہ ہی اس شام گھر واپس آیا۔وہ بے چینی سے اس کا انتظار کرتی رہی اور اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آگئی۔

وہ اگلے ہی روز گھر آ گیا مگر اپنے کمرے میں اسے بچی سمیت پا کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔اس نے بچی کی شکل تک نہ دیکھی۔الٹا اس پر تہمت لگا کر اسے کھڑے کھڑے طلاق دے دی کہ نا جانے کس کا گندہ خون میرے گھر لے آئی ہو۔

اس پر تو جیسے قیامت ٹوٹ چکی تھی۔

وہ آج دن تک یہ سب برداشت کرتی آئی تھی مگر یہ الزام یہ گالی اس کا وجود اس کی روح تک چھلنی کر چکی تھی۔

امبر نے بغیر کچھ کہے کسی بات کا ثبوت دیے۔کوئی دلیل پیش کیے بغیر مریم کو وہیں بیڈ پر پھینکا اور اپنے والدین کے گھر واپس آگئی۔

ظلم و زیادتیاں اور نفرتیں اس قدر پختہ ہو چکی تھیں کہ اس نے کبھی پلٹ کر بچی کی خبر تک نہ لی۔

مریم اپنی دادی کی کفالت میں آگئی۔دن مہینے اور سال گزرتے چلے گئے۔مریم نے ماں کو نہیں دیکھا تھا۔نہ ہی اس کے باپ نے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔بچپن میں اسے کبھی گود میں نہیں اٹھایا،کبھی بھولے سے اس ننھے وجود پر نگاہ پڑ بھی جاتی تو وہ نظریں پھیر لیتا۔

امبر نے دوسری شادی کر لی اور ملک سے باہر چلی گئی۔مشتاق کی ماں نے بھی اس کے لیے لڑکی دیکھ کر شادی کر دی۔اس کا پھر سے گھر بس گیا۔

سوتیلی ماں کو ہمسائیوں سے مریم کے بارے میں ساری معلومات مل چکی تھیں۔لہٰذا اس نے بھی اس کے ساتھ وہی رویّہ رکھا جو باپ کا تھا۔مگر دادی کے ہوتے ہوئے وہ ظلم و زیادتیاں نہ کر پاتی تھی مگر پھر بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی۔شادی کے ایک سال بعد ان کے گھر دو جڑواں بچوں کی پیدائش ہوئی۔اللہ کا حکم کہ دونوں ہی بیٹے تھے۔صحت مند تندرست و توانا تھے۔یوں وہ دو سوتیلے بھائیوں کی نام نہاد بہن بن گئی۔

اب وہ اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی مگر نہ کبھی اس نے ماں کی ممتا دیکھی نہ ہی اپنے سامنے چلتے پھرتے، اپنی بیوی بچوں سے پیار کرتے، ان کے لاڈ اٹھاتے باپ کی نظروں میں اپنے لیے ایسا کچھ دیکھا۔وہ اسی طرح دادی کی گود میں پل کر جوان ہو گئی۔ساری زندگی باپ نے بیٹی میں کوئی دلچسپی نہ لی۔گویا وہ اچھوت ہو۔بس دو وقت کی روٹی اور چھت کے علاوہ باقی کی ساری ضروریات دادی اپنی پینشن کے پیسوں سے پوری کرتی چلی آئی تھیں۔

جیسے ہی مریم نے جوانی کی دہلیز پار کی تو سوتیلی ماں نے باپ کے کان بھرنا شروع کر دیے۔اب باپ کو امبر کی بیٹی مریم میں امبر نظر آنے لگی۔اس کے شک کا نشانہ اب وہ بنتی چلی گئی۔

دن بہ دن اس کے لیے سختیاں اور پریشانیاں بڑھنے لگیں۔سوتیلی ماں کو وہ ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔مگر دادی کے ہوتے ہوئے وہ اپنی دلی حسرتیں پوری نہ کر پاتی تھی۔وہ شوہر سے کہہ کر کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ پھر اس نے باپ کے کان میں مریم کی شادی کی بات ڈال دی۔اپنے ہی ایک جاہل اور آوارہ عزیز کا رشتہ امبر سے جوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

باپ کے لیے تو وہ کبھی بھی اہم نہ تھی۔لہٰذا اس نے بیوی کی بات کی تائید کرتے ہوئے دادی سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔دادی نے جیسے ہی یہ خبر سنی تو فوراً آگ بگولہ ہو کر بیٹے پر برس پڑیں۔وہ ہرگز مریم کی شادی اس آوارہ سے کرنے کے حق میں نہ تھیں مگر مشتاق نے بھی ماں سے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ سال کے اندر اندر اسے گھر سے رخصت کر دینا چاہتا ہے۔کون رضا مند ہے؟ کون نہیں؟ اس بات سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔وہ فیصلہ کر چکا ہے۔اب اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔لہٰذا مریم کے گوش گزار بھی یہ بات کر دی جائے اور شادی کی تیاریاں کی جائیں۔یہ کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔جبکہ دادی سوائے پریشان ہونے کے کچھ نہ کر سکتی تھی۔وہ اچھے طریقے سے ہر بات جانتی تھیں کہ اب وہ اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔انھوں نے مریم کو اس بات سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

جیسے ہی مریم کالج سے واپس آئی دادی نے کھانے کے فوراً بعد اسے سب کچھ بتا دیا۔جیسے ہی یہ بات مریم کے کانوں میں پہنچی تو اس پر تو جیسے قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ابھی آگے پڑھنا چاہتی تھی مگر اتنی جلدی۔ اپنے نام نہاد باپ کا فیصلہ سننے کے بعد اس کے اندر نا جانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی۔وہ دادی کی بات سنتے ہی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی، بغیر کوئی جواب دیے سیدھا باپ کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

وہ اس وقت کمرے میں بیڈ پر لیٹا ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھا۔جب مریم نے انہیں مخاطب کیا۔”مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

انہوں نے ایک نگاہ مریم پر ڈالی اور پھر ٹی وی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔”تمہیں جو بات کرنی ہے ماں سے کر دو۔وہ مجھے بتا دیں گی۔اس وقت میں مصروف ہوں۔“

”مجھے اماں سے نہیں آپ سے بات کرنی ہے۔“ اس نے اپنا لہجہ مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں بولو کیا بات ہے؟“ باپ نے نظریں ٹی وی پر ہی مرکوز کیے رکھیں۔

”مجھے فی الحال شادی نہیں کرنی۔آپ پلیز اپنا فیصلہ بدل دیں۔“ مریم نے دوٹوک الفاظ میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اس نے یہ بات سنتے ہی ٹی وی کا والیم میوٹ کر دیا اور بیڈ سے اتر کر اس کے مدمقابل آ کھڑا ہوا۔

”وجہ پوچھ سکتا ہوں۔تمہیں کیوں نہیں کرنی شادی؟“ انہوں نے لفظ کیوں پر زور دیتے ہوئے اس سے وجہ جانی تھی۔ان کے لہجے میں کڑواہٹ واضح تھی۔یوں جیسے ان کے سامنے بیٹی نہ کھڑی ہو کوئی اور ہو۔

وہ زندگی میں پہلی بار اپنے باپ کو مدمقابل کھڑا پا کر قدرے گھبرا گئی۔

”میں۔میں آگے۔پڑھنا چاہتی ہوں۔“ مریم نے رک رک کر اپنی بات مکمل کی۔

”پڑھ کر کیا کرو گی؟ تمہاری ماں بھی تو بہت پڑھی لکھی تھی۔آخر اس نے کیا کیا؟“ اس نے طنزیہ انداز میں استفسار کیا۔

اس جواب کی مریم کو قطعی توقع نہیں تھی۔وہ پھٹی پھٹی نظروں سے باپ کو دیکھنے لگی۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔اور میں اپنے فیصلے سے کبھی نہیں ہٹتا۔“

انہوں نے مریم کو حتمی جواب دیتے ہوئے رخ ٹی وی کی جانب موڑ لیا۔ٹی وی کا والیم میوٹ سے ہٹانے کے لیے بٹن پر ہاتھ رکھا۔اس سے پہلے بٹن دباتے، وہ پھر سے بول پڑی۔”ٹھیک ہے مگر مجھے آپ کا فیصلہ نہیں منظور۔اور میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔مجھے شادی نہیں کرنی فی الحال۔میرا ابھی یہی فیصلہ ہے اور میں دیکھتی ہوں مجھے......“ اس سے پہلے وہ اپنی بات مکمل کرتی مشتاق نے ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا۔

دادی جو باہر کھڑی دونوں کی گفتگو سن رہی تھیں۔تھپڑ کی آواز سنتے ہی فوراً لپک کر اندر آ گئیں۔”مشتاق ہوش کر۔جوان بیٹیوں پر کوئی ہاتھ اٹھاتا ہے کیا؟“

دادی نے مریم کو بازو سے پکڑ کر پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔جبکہ مریم کے اندر بچپن سے لے کر آج تک جو عزت و احترام کا کمزور بت تھا وہ بھی لرز کر پاش پاش ہونے کو تھا۔وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے گال پر ہاتھ رکھے باپ کو دیکھنے لگی۔

”اماں یہ میری بات سے انکار کر رہی ہے۔اسے شرم نہیں آ رہی۔یہ کیسے میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔کیا بیٹیاں ایسی ہوتی ہیں؟“ اس نے ماں سے بھی اسی انداز میں قدرے چیختے ہوئے کہا۔

زندگی میں پہلی بار اپنے نام نہاد باپ کی زبان سے لفظ بیٹی سنتے ہی اس کے پورے وجود میں آگ لگ گئی تھی۔اگر کوئی اور لمحہ ہوتا تو شاید اس کے لیے زندگی کا حسین ترین لمحہ ہوتا مگر زندگی نے اسے اس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔جہاں اس کے لیے اب ہر رشتہ ہر لفظ بے معنی ہو چکا تھا۔جب انسان کسی چیز کی خواہش کرتا ہے تو اسے پانے کی لگن میں ہر ممکن جدوجہد بھی کرتا ہے۔مریم نے کبھی کسی چیز کی خواہش نہ کی تھی۔اسے خواہش تھی تو سچے رشتوں کی۔اپنے باپ کی چاہت، اس کی شفقت اور محبت کی۔جس کے لیے وہ لمحہ بہ لمحہ ترسی تھی، تڑپی تھی۔بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی تک یہ خواہش کہ اس کا باپ صرف ایک بار محض ایک بار اسے بیٹی کہہ کر محبت سے پکارے۔یہ خواہش اس کے ساتھ ہی جوان ہوئی اور پھر احساس محرومی نے اس کی اسی خواہش سے دل پھیر دیا۔جب کہ اب کوئی امید کوئی خواہش نہ تھی۔تب اس کے نام نہاد باپ نے بیٹی کہا بھی تو کس حیثیت سے!

”بیٹی......کیا آپ مجھے بیٹی سمجھتے ہیں؟“

مریم نے نمناک نظروں سے باپ کو دیکھتے ہوئے بے بسی سے پوچھا۔دادی نے پھر سے اسے بازو سے کھینچ کر کمرے سے باہر نکالنا چاہا، مگر اس میں نا جانے اتنی ہمت کہاں سے آ گئی۔وہ اپنا بازو چھڑاتی ہوئی دو قدم آگے بڑھ کر باپ کے روبرو کھڑی ہو گئی۔

”آج تک کبھی آپ نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔کبھی مجھے مسکرا کر دیکھا۔کبھی میری ذات میں دلچسپی لی۔“ اب اس کی ہچکیاں بندھنے لگی تھیں۔”محض دو وقت کی روٹی اور یہ عارضی چھت دے دینا بیٹی بن جانے کے لئے اگر آپ کی نظر میں کافی ہے تو میں نہیں ہوں آپ کی بیٹی۔مجھے نہیں چاہیے ایسا باپ۔“ وہ چیخی تھی۔انیس سال کی بھڑاس آج لاوے کی صورت پھٹ پڑی تھی۔بچپن کی حسین گھڑیاں جو اس نے دادی کی گود میں ڈر ڈر کے سہم سہم کر گزاری تھیں۔ان کی خلش آج بھی اسے بے چین کیے ہوئے تھی۔جوانی کے وہ حسین لمحے جن میں باپ بیٹیوں کی ڈھارس ان کے سائبان ہوا کرتے ہیں۔بیٹیاں اپنے ابا کی جان اپنے ابا کی پہچان ہوا کرتی ہیں۔وہ لمحے اس نے اپنے باپ کے بے جا شک اور اس کی نظروں میں نا جانے کیسی چبھن کا گمان بن کر گزارے۔وہ بھولی نہیں تھی۔اگر وہ بولتی نہیں تھی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ اس کے سینے میں دل نہیں دھڑکتا۔وہ محسوس کرتی تھی۔وہ پل پل جیتی اور پل پل مرتی تھی مگر اب وہ روز اپنی عزت نفس کی تذلیل سہہ سہہ کر تھک چکی تھی۔

دادی نے ایک بار پھر بازو سے پکڑ کر زور سے اسے کھینچا تھا۔”مریم بیٹا......چپ ہو جا خدا کے لیے......چلو یہاں سے۔“ جبکہ وہ حیرت کا مجسمہ بنا بغیر کچھ بولے قہر برساتی نظروں سے مسلسل اسے گھور رہا تھا۔ایک ڈری سہمی معصوم سی لڑکی۔جس کی شاید ان کے گھر یا ان کی زندگی میں کوئی بھی اہمیت نہ تھی۔وہ آج اس کے سامنے سوال بن کر آ کھڑی ہوئی تھی جس کا شاید ہی اس نے کبھی گمان کیا ہو۔

شور شرابہ سن کر دوسری بیوی عشرت اور بیٹے بھی باری باری کمرے میں آ کر کھڑے ہو چکے تھے۔اب حیرت زدہ صورتیں لیے صورت حال کو جانچنے کی کوشش میں تھے۔

”دادی آج چھوڑیں مجھے آپ۔مجھے پوچھنے دیں ان سے کہ میری کیا غلطی تھی؟ جس کی آج تک میں سزا کاٹتی رہی، چپ چاپ سہتی رہی۔“ اس نے بے بسی سے کہا۔”اور یہ ظلم پر ظلم کرتے رہے۔بتائیں مجھے کیا میں نے ان سے کہا تھا یہ میری ماں سے پسند کی شادی کریں؟ اگر یہ کند ذہن تھے تو نہ

کرتے ان سے پسند کی شادی۔ نہ پیدا کرتے مجھے۔ اگر سنبھال نہیں سکتے تھے تو کیوں پیدا کیا مجھے؟'' وہ اب گلا پھاڑ کر چیخ رہی تھی۔ یوں جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔

روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھنے لگی تھیں۔ چیخ چیخ کر گلا بیٹھ چکا تھا۔ دادی پھر سے اس کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑ کر اسے چپ ہونے اور کمرے سے باہر نکلنے کا کہہ رہی تھی۔ مگر وہ ہر بات سے بے پرواہ آج اپنے غموں اور ناانصافیوں کا حساب لینے اپنے باپ کے سامنے کھڑی تھی۔

''چھوڑیں مجھے دادی۔ مجھے بتائیں آپ اگر آپ کو شک تھا اپنی محبت پر یا اپنے خون پر تو اسی دن جس دن میری ماں مجھے چھوڑ کر یہاں سے گئی تھی۔ آپ نے اسی دن میرا بھی گلا کیوں نہیں دبا دیا؟'' اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ مجھے اسی دن مار دیتے آپ مگر پل پل جینے اور پل پل مرنے کے لیے زندگی نہ دیتے۔ میں نہیں ہوں آپ کی بیٹی۔ نہ ہی آپ سے میرا تعلق ہے۔ لہٰذا میری زندگی کا کوئی بھی فیصلہ کرنے کا حق میں آپ کو نہیں دیتی۔'' مریم نے اب اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

وہ قہر برساتی نظروں سے مسلسل مریم کو گھور رہا تھا بغیر کچھ کہے سب کچھ سن رہا تھا۔

''ارے آپ چپ کیوں ہیں؟ کچھ بولتے کیوں نہیں جی؟ دیکھ نہیں رہے کیسے قینچی کی طرح زبان چلا رہی ہے بے شرم۔ کس طرح مروت اور لحاظ کی ساری حدیں پار کیے کھڑی ہے آپ کے سامنے؟ بدلحاظ بے مروت نہ ہو تو۔ آخر دکھا ہی دیا اس نے کہ اپنی ماں کی بیٹی ہے۔ نظر آ گیا آپ کو دیکھ لیا آج آپ نے۔ ورنہ میری بات پر تو آپ کو کبھی یقین نہ آتا تھا۔ جیسی ماں ویسی بیٹی۔ بدلحاظ بدزبان۔'' اس کی سوتیلی ماں نے مشتاق کو بازو سے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ موقع ہاتھ لگتے ہی اس نے جلتی پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ مریم اب اس کی طرف پلٹی۔

''ہاں ہوں میں اپنی ماں کی بیٹی پھر۔ ہوں میں اپنی ماں کی بیٹی۔'' مریم چیخی تھی۔ ''نکال دو مجھے بھی گھر سے۔'' وہ غصے سے اپنی سوتیلی ماں پر آج زندگی میں پہلی بار دھاڑی تھی۔ وہ پھر سے اپنے باپ کی طرف منہ کر کے بے بسی سے سر پکڑتے ہوئے بولی۔ ''حد ہوتی ہے... حد ہوتی ہے کسی بات کی۔ مجھے آج بیٹی کہہ کر گالی مت دیں آپ۔ اب یہ رشتہ یہ لفظ میرے لیے گالی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آپ ایک کمزور انسان ہیں۔'' اس نے انگلی سے باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کمزور انسان ہیں آپ جو باپ کہلوانے کے لائق نہیں ہے۔'' دادی نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے کھینچا۔

''بس کر دے مریم خدا کا لیے بس کر۔'' دادی ا... کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں۔

اب اس نے احتجاج بند کر دیا تھا۔ الفاظ ... تھے۔ شکوے بے شمار تھے۔ نفرتیں کم نہ ہوتی تھیں مگر ا... ہمت جواب دے چکی تھی۔

دادی نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑا اور ... گھسیٹتے ہوئے اسے اس کے کمرے تک لے آئیں۔ ... بے سدھ پڑی بس ایک ہی بات دہرائے چلی جا رہی تھی۔ ... نہیں ہوں کسی کی بیٹی۔ میرا کوئی باپ نہیں۔''

دوسری جانب مشتاق کی حالت بھی کافی خراب ... تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ لڑکی جو ان کے لیے کبھی اہم ... تھی۔ آج انہیں ان کی زندگی کے سب سے اہم پہلو کی بھیا... تصویر دکھا گئی تھی۔ وہ وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ ... بھاگ کر گلاس میں پانی انڈیلنے لگی جبکہ دونوں بیٹے ان کی طرف لپکے۔ دونوں نے باپ کو بمشکل سنبھالتے ہوئے بیڈ پر بٹھایا۔ ... وہ اکیلے رہنا چاہتے تھے لہٰذا عشرت اپنے بیٹوں کو لے کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

بازی پلٹ چکی تھی۔ بیٹی باپ کے مدمقابل آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بیٹی جس نے اب تک باپ سے نظریں ملا کر ... تک نہ کی تھی۔ ہمیشہ ڈری سہمی کبھی ایک کونے میں تو ... دوسرے کمرے میں چھپتی پھرتی تھی۔ کبھی جسے انہوں نے ... سامنے مسکراتا نہ پایا تھا۔ نہ مارے خوف کے وہ کھل کر روئی ... کبھی اس معصوم نے کسی چیز کی فرمائش نہ کی تھی۔ ... اسے چاہیے بھی ہوتا تو وہ دادی سے کہہ دیتی۔ بھری دنیا ... سوائے دادی کے اس نے کبھی کسی دوسرے کی محبت نہ ... تھی۔ سخت نظروں اور لہجوں سے دھتکاری ہوئی معصوم مریم ... ایسے اپنی انیس سالہ زندگی کا حساب باپ کے روبرو آ کھڑی ... کرے گی۔ اس کا شاید کسی نے تصور بھی نہ کیا تھا۔

مریم کے لفظوں نے باپ کو ماضی سے لے کر حال ... کی ساری کہانی سنا دی تھی۔ ایک ایک ناانصافی ایک ایک ظلم ... کی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح چل رہا تھا۔ زندگی میں ... بار انہیں آج احساس ہوا تھا۔ یہ احساس انہیں اندر اندر ... جا رہا تھا، کھائے جا رہا تھا۔ وہ مجرم تھے مریم کے معصوم ... کے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک کی ہر خواہش ہر آرزو ... مسرت کے قاتل تھے وہ۔

☆......☆

گھر سے مریم سامان لے کر نکل تو پڑی تھی مگر اسے نہیں ... علم تھا کہ اس کی منزل کہاں ہے۔

کالج گھر سے دور نہ تھا۔ وہ روز پیدل آیا جایا کرتی ... مگر آج اس نے قدم کالج کی جانب بڑھانے کے بجائے ... انجان راستے پر رکھ دیئے تھے۔ بس اسٹاپ پر کافی دیر کھڑا ... رہنے کے بعد ایک بس آ کر رکی۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کے ... ساتھ ہی اس پر چڑھ گئی مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ بس کس روٹ کی ... اور کہاں جائے گی؟ بس مسلسل چلتی رہی کہیں کہیں رک کر ... سواریاں اٹھاتی یا پھر اتارتی اور پھر سے آگے بڑھ جاتی۔ جبکہ وہ ... ہر بات سے بے نیاز مسلسل شیشے پر نظریں ٹکائے گم سم بیٹھی پیچھے کی طرف کو بھاگتی سڑک کو گھورتی رہی۔ کنڈیکٹر نے کرایہ مانگا، ... سو کا نوٹ بڑھایا، اس نے بقایا واپس کیا اس نے لے کر ... بیگ میں ڈال دیا۔ اس دوران اس نے کسی سے ایک لفظ نہ ... کہا۔ پھر دو گھنٹے کی مسافت کے بعد بس اپنے آخری اسٹاپ پر آ کر رک گئی۔ بس کے کھڑے ہوتے ہی کنڈیکٹر نے زور شور سے آوازیں لگانا شروع کر دی تھیں ''لاری اڈا لاری اڈا۔''

کنڈیکٹر کی آواز پر وہ خیالوں کی دنیا سے باہر نکلی اور ... اپنے کاندھے سے بیگ لگائے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسرے ... مسافروں کے ساتھ وہ بھی بس سے نیچے اتر گئی مگر ان سب ... مسافروں کی کوئی نہ کوئی منزل تھی لیکن اس کی تو کوئی منزل نہ ... تھی۔ اس نے اپنے اردگرد نظریں گھما کر جگہ کا جائزہ لیا مگر وہ ... نہیں جانتی تھی وہ کہاں کھڑی ہے۔ اس نے بچپن سے جوانی تک ... گھر سے اسکول اور وہاں سے گھر ہی دیکھا تھا اس سے زیادہ ... دادی کے ساتھ بازار چلی جاتی تھی یا پھر عقب میں ہی موجود ... صاحب کے دربار تک۔ اس کے علاوہ دنیا میں کیا ہے؟ کیسا ... ہے؟ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد اس نے ... آگے بڑھا دیئے۔ سڑک کے ایک سائیڈ پر بنے فٹ پاتھ ... پر نظریں جھکا کر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ پھر یونہی منزل کی ... تلاش میں سڑکوں گلیوں اور بازاروں میں چلتے چلتے نا جانے ... کتنا وقت گزر گیا تھا۔

پیاس کی شدت نے اس کے پاؤں سست کر دیے۔ اس ... نے نظریں اٹھا کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ شہر سے کافی دور نکل آئی ... تھی۔ یہ ایک ویران سڑک تھی۔ وقفے وقفے سے اکا دکا ... گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ کچھ لمحوں بعد اس کا دل گھبرانے ... لگا۔ اسے دادی شدت سے یاد آئی تھیں۔ سارا وجود سے ... مسلسل پیدل چلتے رہنے کے باعث بری طرح سے تھک چکا تھا۔ میرے مالک میں کہاں جاؤں۔ میری مدد فرما۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر روتے ہوئے اللہ سے مدد طلب کی۔ اس پکار نے اس کے اندر ہمت پیدا کر دی اور وہ دوبارہ سے چلنے لگی تھی۔

کچھ دور آگے جا کر بستی شروع ہو گئی تھی۔ اسے ایک طرف مزار نظر آیا۔ وہ اکثر دادی کے ساتھ داتا دربار جایا کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مزار میں پانی ضرور ہو گا۔ لہٰذا اس نے اپنا رخ اس جانب موڑ دیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اردگرد نظریں دوڑائیں۔ وہاں اِکا دُکا لوگ دعا کی غرض سے آتے اور جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ دو تین ملنگ بھی موجود تھے جو کہ مزار

کچھ تجارتی غلطیاں

کوک سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ مشروب پوری دنیا کا مشہور ترین مشروب ہے۔ اس وقت جب وہ بازار میں آیا تو اسی وقت ایک اور مشروب بھی سامنے آ گیا۔ اور وہ تھا پیپسی۔ اس زمانے میں پیپسی والوں پر معاشی بحران آیا ہوا تھا۔ پیپسی کے بند ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے کوک والوں سے کہا کہ وہ اس برانڈ یعنی پیپسی کو خرید لیں۔ چونکہ کوک والوں کے دماغ اس وقت آسمان پر تھے۔ اس لیے انہوں نے پیپسی کی درخواست پر غور کرنا ہی مناسب نہیں سمجھا۔

اس کے بعد یہی پیپسی سنبھالا لے کر ان کے راستے کی دیوار بن گیا۔ اس مشروب نے کوک کی مارکیٹ کو بہت بری طرح نقصان پہنچایا تھا۔

مشہور موجد الیکو نڈر گراہم بیل اپنا بنایا ہوا ٹیلی فون لے کر ویسٹرن یونین والوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی یہ ایجاد اس کمپنی کو فروخت کر کے کچھ حاصل کر لے گا۔ لیکن یونین والوں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر۔ یہ تم کیا فالتو چیز اٹھا کر لے آئے ہو۔ اس کے تو تمہیں کوئی دس ڈالرز بھی نہیں دے گا۔''

گراہم بیل مایوس ہو کر واپس چلا آیا۔ لیکن صرف دو سال بعد وہی کمپنی گراہم کو 25 ملین ڈالرز دینے کو تیار ہو چکی تھی۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ گراہم نے کہیں اور سودا کر لیا تھا۔

مرسلہ: نسیم مشرف، سکھر

کے احاطے میں دھمال ڈال رہے تھے۔ اس نے مزار کے اندر قدم رکھتے ہی پانی تلاش کرنا شروع کر دیا۔ پھر قریب ہی اسے پانی کا مٹکا نظر آ گیا۔ وہ فوراً مٹکے کی طرف لپکی اور ایک ہی سانس میں تین گلاس پانی کے غٹا غٹ پی گئی۔ پانی پینے کے بعد اس کے جسم میں تھوڑی سی جان آئی تھی۔ وہ مٹکے کے قریب ہی ایک درخت کے سائے میں ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ درخت کی شاخوں کو کچھ لمحے گھورنے کے بعد اس نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں۔ تھکاوٹ کی وجہ سے اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆......☆

دادی عصر کا وقت شروع ہوتے ہی مسلسل نظریں دروازے پر لگا کر برآمدے میں رکھے پلنگ پر بیٹھ گئی تھیں۔ مریم کا پریکٹیکل بھی ہوتا تو وہ تین بجے تک گھر آ جاتی تھی مگر اب تو عصر کی اذان بھی ہو چکی تھی۔ اس کا پچھا اتا پتا نہ تھا۔ دادی کا دل اب بے تحاشا گھبرانے لگا تھا۔ وہ پلنگ سے اٹھ کر چپل اپنے پیروں میں ڈالتی سر پر دوپٹا لٹکاتی گھر سے نکل پڑی اور تیز تیز قدم اٹھاتی کالج تک پہنچیں۔ مگر وہاں تالا پڑا دیکھ کر ان کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ قریب ہی چوکیدار کرسی پر بیٹھا سو رہا تھا۔ دادی فوراً اس کی طرف لپکیں۔ ”پتر میری مریم ابھی تک گھر واپس نہیں گئی ہے۔ کہاں ہے وہ؟“ دادی نے چوکیدار کو ہلاتے ہوئے بے بسی سے پوچھا۔

چوکیدار تیزی سے اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کیا مطلب اماں جی مریم؟“ چوکیدار نے حیرت سے دادی کو دیکھا پھر کچھ توقف کے بعد دوبارہ بولا۔ اماں جی کالج تو دو بجے بند ہو گیا تھا۔ مریم کو نہ میں نے صبح کالج آتے دیکھا نہ ہی چھٹی کے وقت نظر آئی ہے۔“

دادی کی ٹانگوں سے اب جان نکلنے لگی۔ چوکیدار نے انہیں سہارا دیتے ہوئے اپنی کرسی پر بٹھایا پھر بھاگتا ہوا گلاس میں پانی لے آیا۔

پانی پینے کے بعد طبیعت کچھ سنبھلی۔

”اماں جی آپ حوصلہ کریں مریم تو بہت سمجھدار ہے۔ بہت سلجھی ہوئی اور تابعدار بچی ہے۔ آ جائے گی آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں۔“ ادھر ہی اپنی کسی سہیلی کے گھر چلی گئی ہو گی۔ چوکیدار نے دادی کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”نہیں اس کی کوئی سہیلی نہیں ہے۔ اس نے اپنے باپ کے ڈر سے کبھی کسی لڑکی سے دوستی نہ کی تھی۔ تو پھر اس کی کون سہیلی ہو گی بھلا؟“ دادی نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں جی۔ ضرورت سے زیادہ شک، سختیاں، پابندیاں انسان کو بگاڑ دیتی ہیں۔ اگر بگاڑیں نہ بھی تو بھی، ایسا غلط کرنے پر ضرور مجبور کر دیتی ہیں جس کا انسان نے تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔ چوکیدار نے دادی کی بات سن لینے کے بعد اپنا خیال پیش کیا۔“

دادی بغیر وقت ضائع کیے ہمت پکڑتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”مجھے تو میرے گھر تک چھوڑ آ پتر۔ میں مشتاق سے کہتی ہوں میری بچی کو ڈھونڈ کر لے آئے۔ پتا نہیں کہاں ہو گی بیچاری کو تو راستوں کا بھی پتا نہیں۔“ دادی نے روتے ہوئے کہا۔ چوکیدار ان کا بازو پکڑ کر ان کے گھر کی طرف چل پڑا۔ پھر دروازے پر چھوڑ کر واپس پلٹ گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی دادی نے زار و قطار رونا شروع کر دیا اور روتے ہوئے مشتاق سے فریادی کرنے لگیں۔

”مشتاق پتا نہیں میری بچی کہاں چلی گئی۔ میری بچی نا جانے کہاں ہو گی۔ اسے تو دنیا کا کچھ پتا نہ تھا۔ خدا کے لیے میری بچی کو ڈھونڈ کے لے آ۔“

وہ اپنے کمرے میں لیٹے نظریں چھت پر لگائے ماضی کی تلخیوں میں الجھے ہوئے تھے۔ اپنی ہر ایک زیادتی ایک ایک ظلم کسی فلم کی مانند انہیں اپنی نظروں کے سامنے گردش کرتا نظر آ رہے تھے۔ مریم کی کہی ہوئی باتیں حقیقت کے ہتھوڑے بن کر ان کے دماغ پر برس رہے تھیں۔ اماں جی کی چیخ و پکار سن کر وہ ہڑبڑا اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر تیزی سے باہر نکلے۔

مشتاق کی دوسری بیوی عشرت کچن سے نکل کر کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ اماں اپنے بیٹے کو دیکھتے ہی پھٹ پڑی بولی تھیں۔

”میری بچی کالج نہیں گئی مشتاق۔ تیری وجہ سے وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ نہ جانے مسکین کہاں ہو گی۔ اگر وہ گھر واپس نہ آئی تو خدا کی قسم میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

دادی سر پکڑے زمین پر بیٹھی رو رہی تھیں۔ مشتاق پر جیسے سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ ٹانگوں سے جان نکلنے لگی۔ وہ وہیں پلنگ پر بیٹھ گئے۔ مریم کی، کی ہوئی صدائیں ان کے دماغ میں گردش کرنے لگی تھیں۔ ”نہیں ہوں میں کسی کی بیٹی۔ نہیں میرا کوئی باپ......“

مشتاق کی بیوی اب اپنی اہمیت ضروری سمجھتے ہوئے ان کی طرف بڑھی۔ ”ارے سنا آپ نے مریم گھر سے بھاگ گئی ہے۔“ اس کا یہ کہنا تھا کہ مشتاق نے فوراً غصے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ مگر اس نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ...... اور فوراً جلتی پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا۔ ”ارے مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ یہ لڑکی ایک نہ ایک دن گل ضرور کھلائے گی۔ میں نہ کہتی تھی آپ سے۔ جیسی ماں ویسی بیٹی۔ اب اس نے سر پر ہاتھ باندھتے ہوئے ڈراما کیا تھا۔ ”ارے مجھے تو لوگوں کی فکر ستا رہی ہے۔ لوگ تو یہ ہی سمجھیں گے کہ مشتاق کی بیٹی بھاگ گئی گھر سے۔ ارے لوگوں کو کیا پتا کہ کس کا گندہ خون تھی۔“

”چپ ہو جاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا...... سمجھی تم۔ وہ میری بیٹی تھی۔ میرا خون تھی وہ۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے تھپڑ جڑ دیا۔ وہ اس عمل کے لیے تیار نہ تھی فوراً لڑکھڑا کر گر پڑی۔ تھپڑ مارنے کے بعد اس کے قریب ہی بیٹھ کر بالوں سے پکڑتے ہوئے اسے یہ جملے بولے۔ جبکہ وہ انتہائی خوفزدہ اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ”میں خود ڈھونڈ کر لاؤں گا اسے...... میں واپس لے کر آؤں گا اسے۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور عشرت کو ٹھوکر مار کر کہتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتے گھر سے باہر نکل گئے۔

☆......☆

مغرب کی اذان مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے چاروں طرف گونجی۔ وہ فوراً نیند سے بیدار ہوئی۔ اس نے اِدھر اُدھر نظریں گھما کر دیکھا۔ چاروں طرف شفق کی سرخی پھیل چکی تھی۔ شام کے سائے دیکھ کر اس کے سارے وجود میں اضطراب طاری ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا وہ یہاں بیٹھے بیٹھے بہت سی نظروں کا نشانہ بن چکی ہے۔ لہٰذا وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ مزار میں ایک کونے میں لڑکوں کا ٹولا کھڑا تھا جو مسلسل اسی کو گھور رہا تھا۔ اب اسے اپنی جگہ سے اٹھتا دیکھ کر آپس میں اشارے اور سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ نظریں چراتی نیچے دیکھتی تیز تیز قدم اٹھاتی مزار سے باہر نکل آئی۔ اب مغرب کی سرمئی ماحول رفتہ رفتہ سیاہی کا لبادہ اوڑھنے لگا تھا۔ سیاہی گہری سے گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ گھر سے سب کچھ چھوڑ کر یہ سوچ کر نکل پڑی تھی کہ دنیا بہت بڑی ہے وہ کہیں بھی چلی جائے گی۔ مگر دنیا بڑی ہونے کے ساتھ ساتھ کتنی ظالم ہے؟ اس کا اندازہ اسے نہیں تھا۔ جہاں قدم قدم پر درندوں اور وحشی بھیڑیوں کا سامنا ہوتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ جانتی بھی تو کیسے؟ اس نے دنیا دیکھی ہی کب تھی۔ گھر سے پانچ منٹ کے فاصلے پر کالج اور وہاں سے گھر بس اس کی ساری دنیا یہی تھی اس سے زیادہ دنیا تو اس کے باپ نے اسے کبھی دیکھنے ہی نہ دی تھی۔ اس ساری دنیا میں سوائے دادی کے کوئی محبت نہ دیکھی تھی۔ اسے اندازہ کیسے ہوتا کہ دنیا کیا ہے؟ کیسی ہے؟

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی مزار سے کافی آگے آ گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ مزار میں کھڑے وہی لڑکے مسلسل اس کے پیچھے تھے۔ اس کی دھڑکنیں مزید تیز ہونے لگیں۔ اسے اب شدت سے دادی یاد آ رہی تھی۔ اس نے قدموں کی رفتار مزید تیز کر دی، پھر بھاگنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ دائیں بائیں نظریں گھما کر مین روڈ تلاش کرنے لگی۔ اس ویرانے میں آخر اسے روڈ نظر آ گیا۔ مگر سڑک پر وقفے وقفے سے اِکا دُکا گاڑیاں تیزی سے گزر کر آگے بڑھ جاتی تھیں۔ وہ ایک جگہ رکی نہ تھی۔ مسلسل چل رہی تھی۔ بھوک اور پیاس کی شدت سے وہ نڈھال ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ تعاقب کرنے والے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ اب وہ بالکل اکیلی تھی۔ دور دور تک اسے کوئی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ اپنے دائیں بائیں سہارا ڈھونڈنے لگی۔ وہ تھک چکی تھی پھر وہ چلتے چلتے سڑک کے کنارے ایستادہ شیشم کے درخت کے نیچے گر پڑی۔ آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے گالوں کو تر کرنے لگے۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس نے نظریں اوپر اٹھا کر تاریک آسمان کو دیکھا۔ پھر روتے ہوئے رب سے التجا کرنے لگی۔

”یا اللہ میری مدد فرما۔ تو سب جانتا ہے۔ تجھ سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ میرے مالک میری مدد فرما۔“ روتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ”مجھے معاف کر دینا دادی میں پتا نہیں کہاں آ گئی ہوں۔ میں نہیں جانتی دادی۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ کاش میں یہ قدم نہ اٹھاتی۔ میرے ساتھ برا سلوک ہوتا تھا لیکن سر پر چھت تو تھی نا۔ اب تو یہاں کچھ بھی نہیں سوائے لوگوں کی گندی نظروں کے میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟ وہ خود کلامی کرتے آنکھوں پر ہاتھ رکھے رو رہی تھی۔ روتے روتے اسے اپنے قریب قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے فوراً چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ وہی تین لڑکے اب اس کے اردگرد آ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ اسے غلیظ نگاہوں سے گھور رہے تھے۔“

”کک...... کون ہو تم؟“ اس نے تینوں کو یک بارگی دیکھتے ہوئے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

”تم کون ہو؟ یہاں صبح سے کیا کر رہی ہو؟“ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے ان میں سے ایک لڑکا اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

"تمہیں اس سے مطلب۔ میں جو بھی ہوں۔ تم جاؤ یہاں سے ورنہ......" وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا لہجہ سخت کرتے ہوئے بولی۔

"لگتا ہے گھر سے بھاگ کر آئی ہو۔" ان میں سے ایک لڑکا اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ جبکہ وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہوگئی تھی۔

"نقاب ہٹا کر دیدار تو کراؤ اپنا۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں۔ پردے میں کیا ہے؟" ایک لڑکے نے ہاتھ کی انگلی سے آگے بڑھ کر اس کا نقاب کھینچا۔ مریم نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ دیے اور مزید پیچھے ہوتے ہوئے درخت کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔

"پردے میں رہنے دو، پردہ نہ ہٹاؤ...... پردہ جو ہٹ گیا تو بھید کھل جائے گا۔"

اسی لڑکے نے واہیات انداز میں یہ گانا گنگنایا۔ پھر تینوں نے مل کر زوردار قہقہہ لگایا۔

"توبہ یہ حسن اور اس پر یہ نزاکت اور تمہارا شرمانا، گھبرانا۔" اس سے پہلے وہ مزید بکواس کرتا۔ مریم کے اندر نا جانے کہاں سے اتنی ہمت آئی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے زوردار دھکا دیا پھر اسے دھکیلتے ہی وہاں سے بھاگ اٹھی۔ وہ تینوں اس اچانک عمل کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ لہٰذا اس کے سامنے کھڑا لڑکا جو مسلسل اسے چھیڑ رہا تھا۔ وہ تو دھکا لگتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑا اور دوسرے دو اس کے پیچھے لپکے۔

"ابے رک بھاگ کر کہاں جائے گی۔" وہ پیچھے بھاگتے ہوئے دھاڑے۔ اس نے بیچ سڑک پر اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح بھاگتے ہوئے سامنے سے آتی تیز رفتار گاڑی کے ساتھ اس کا وجود ٹکرایا۔ وہ ہوا میں اچھل کر زمین پر گر پڑی۔

ڈرائیور نے گاڑی کو زور سے بریک لگائی ٹائر چرچرائے۔ گاڑی رک گئی۔ ڈرائیور نے شیشے سے پیچھے جھانک کر دیکھا اور گاڑی کو گیئر لگاتا آگے بڑھ گیا۔

ان تینوں نے بھی مریم کا زمین پر خون میں لت پت پڑا وجود دیکھا اور وہاں سے رفو چکر ہوگئے۔

☆......☆

مشتاق ساری رات سڑکوں پر مارے مارے پھرتا رہا۔ اس نے شہر کے کونے کونے چپے چپے میں مریم کو تلاشا۔ اسے بیٹی کے ساتھ کیے ظلم یاد آ رہے تھے۔ اب وہ تلافی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اب مل نہیں رہی تھی۔ اس نے تھک ہار کر آخر اسپتال کا رخ کیا۔ اسپتال کا مردہ خانہ دیکھنے کے بعد وہ پولیس اسٹیشن جا پہنچا۔ تھانے میں رپورٹ درج کرانے کے بعد وہ بوجھل قدم لیے گھر واپس آ گیا۔ دادی چپ چاپ پلنگ پر بیٹھی منتظر نگاہوں سے مریم کی راہ تک رہی تھیں۔ مگر اسے اکیلا پا کر وہ پھر سے رونے لگیں۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ مشتاق نے چپ چاپ برآمدے میں رکھی کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں موند لی تھیں۔ پھر اسی طرح بیٹھے بیٹھے صبح پانچ بجے موبائل فون بجنے پر وہ بیدار ہوا۔ اس نے اسکرین کو دیکھا۔ کوئی انجان نمبر تھا۔ مشتاق نے جلدی سے کال ریسیو کر کے موبائل فون کان سے لگایا۔ کال کرنے والے نے اپنا تعارف کروایا۔ یہ تھانے والوں کی کال تھی۔

"جی جی سر کچھ پتا چلا میری بچی کا؟" وہ بے چینی سے پوچھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"جی جناب پتا چل گیا ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے۔ تھانہ نظیر آباد سے اطلاع آئی ہے۔ جو آپ نے معلومات دی تھیں...... بالکل اسی کے مطابق بچی کے پاس سے شناختی کارڈ ملا ہے۔ ایک ڈیڈ باڈی ملی ہے بیٹی کی لاش مردہ خانے بھجوائی جا چکی ہے پھر بھی آپ جا کر تصدیق کر لیں اور لاش لے آئیں۔"

دوسری طرف سے جیسے ہی خبر مشتاق کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ بے جان سا ہو گیا۔

دادی اور عشرت دونوں ہی نے صورت حال سمجھنے کی کوشش میں پہلے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر دادی نے لپک کر مشتاق کو بازو سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"کیا ہوا۔ مشتاق بول نا۔ کہاں ہے میری بچی...... کیا ہوا؟" دادی چیخی تھیں۔

پھر وہ اپنا سینہ پیٹتے ہوئے بولا۔

"مر گئی اماں...... وہ مر گئی۔ میری مریم مر گئی۔ میں نے مار دیا مریم کو۔ میرے شک کے زہر نے مار دیا۔ ہاں مر گئی مریم۔"

وہ ہسٹریائی انداز میں اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔ وہ پاگل ہو گیا تھا لیکن اس پاگل پن سے کیا مریم کے وہ انیس سال، سسکتے ہوئے انیس سال کا مداوا ہو سکتا ہے؟ میں آج بھی سڑک پر بے وجہ دوڑتے بھاگتے مشتاق کو دیکھ کر یہی کچھ سوچتی ہوں۔ نظروں میں مریم کی تصویر آ جاتی ہے۔

ماسی

محترم مدیر

السلام علیکم

ہم آپ ایک ایسے معاشرے میں سانس لے رہے ہیں جس میں دھوکے بازوں، فراڈیوں کا غلبہ ہے۔ ذرا سی نظر چوکی اور ایک بڑی چوٹ کا شکار ہو گئے، یہ روداد ایک ایسے گھرانے کی ہے جسے ایک معمولی سی عورت نے پریشانیوں کے گرداب میں لا پھینکا تھا۔

علی اختر
(فیصل آباد)

کلینک بند کرنے کا وقت ہوا تو میں اوپر آ گیا اور بیٹے کو کہہ دیا کہ وہ جاتے ہوئے آواز دے جائے کیونکہ ابھی کچھ مریض بیٹھے تھے۔ ہم نے اپنے گھر ہی میں کلینک بنا رکھا تھا زنیرہ کلینک۔ میں کوالیفائیڈ ڈاکٹر نہیں، محکمہ صحت میں بطور ڈسپنسر نوکری کرتا ہوں، وہاں سے فارغ ہوتے ہی کلینک پر آ جاتا ہوں۔ جانتا ہوں یہ میرے پیشے کی خلاف ورزی ہے اور حاسدوں نے کئی بار میری شکایت بھی کی ہے۔ محکمانہ کارروائیاں اس وقت بے موت مر جاتی تھیں



جب فائلوں کے پیٹ میں کرنسی کی بہتر خوراک چلی جائے اس لیے مجھے کسی قسم کا کوئی خوف یا ڈر نہیں تھا اور پھر قدرت جب بندے پر مہربان ہو تو ترقی کے راستے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا۔ میں نے اپنے مکان کی ازسرِ نو تعمیر کروائی اور تین منزلہ بنا لیا تھا۔ نیچے کلینک اور اوپر کی دونوں منزلوں میں میرا کنبہ رہتا ہے۔ میرا یہ علاقہ جہاں زنیرہ کلینک قائم ہے، شہر سے چار پانچ میل دور ہے۔ چونکہ یہاں کوالیفائڈ ڈاکٹر نہیں ہیں۔ اوپر سے اس علاقے کے قرب و جوار کے لوگوں کو یہ پختہ یقین بھی ہے کہ ڈاکٹر قادر بخش کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔

میرا کنبہ ہم میاں بیوی کے علاوہ چار بیٹوں اور تین بیٹیوں پر مشتمل ہے اور اب میں عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں میرے دو بڑے بیٹے اور ایک بیٹی بیاہی جا چکی ہے۔ بڑا بیٹا داور میرے ساتھ ہی کلینک پر کام کر رہا ہے۔ اس نے ہومیو پیتھک کا ڈپلوما حاصل کر رکھا ہے اور ایلو پیتھک کا کام بھی سیکھ لیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے مجھ سے بڑھ کر شفا رکھی ہے۔ میں نے اس کی شادی کر دی ہے۔ اس کی بیوی رضوانہ برادری کی ہے کیونکہ ہم برادری سے باہر شادی نہیں کرتے پھر بھی اس نے آتے ہی روایتی بہوؤں والا سلوک ہمارے ساتھ روا رکھا ہے۔ اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے جو اس وقت شہر کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھ رہے ہیں جن پر میں بے دریغ روپیا خرچ کر رہا ہوں۔

اسے آپ بنیاد پرستی جانیں یا قدامت پسندی کہہ لیں کہ ہم برادری سے باہر بچوں کی شادیاں نہیں کرتے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا ہے رضوانہ میرے نزدیکی رشتہ دار کی بیٹی ہے۔ عمر میں اگرچہ وہ داور سے ایک دو سال بڑی ہی ہوگی، چونکہ مسئلہ خاندان کا تھا اس لیے میں نے بخوشی اس کے ساتھ داور کی شادی کر دی مگر اس نے آتے ہی اپنے ہتھکنڈے دکھانے شروع کر دیے۔ شاید اس میں میری غلطی بھی تھی کہ میں کلینک کی ساری آمدنی اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا اور پھر اگر دوائیاں لانے کی ضرورت پڑتی یا کسی جگہ خرچنے کی نوبت آ جاتی تو اسی سے پیسے لے لیتا۔ حالانکہ یہ کام میری بیوی بھی بڑے احسن طریقے سے کرتی آئی تھی لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں میں ایسا کرنے میں ایک انجانی سی خوشی محسوس کرنے لگا تھا۔ شاید میرے پیش یہ بات ہو کہ رضوانہ اپنے آپ کو غیر جگہ آیا سمجھ کر کسی کمپلیکس میں مبتلا نہ ہو جائے لیکن ان سب باتوں کا الٹا اثر ہوا۔

رضوانہ ایک انجانے Complex میں مبتلا تھی۔

داور اس سے کہیں زیادہ خوب صورت تھا۔ سرخ و سپید رنگت، خوب صورت نیلی آنکھیں جن پر نفیس کمانی کی نظر والی عینک اس کی خوب صورتی کو اور بھی بڑھا دیتی تھی۔ شاید میں یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ میرے سارے خاندان کو نظر کی عینکیں لگی ہوئی ہیں۔ یہ موروثی بیماری اب تو میری اگلی نسل سے ہو کر تیسری نسل تک بھی آ گئی ہے۔ میرے دونوں پوتوں اور پوتی کو بچپن ہی سے عینکیں لگ چکی ہیں۔ دوسری بات کہ میرے خاندان میں سب کو اللہ تعالیٰ نے خوب صورتی عطا کر رکھی ہے۔ رضوانہ، داور کے مقابلے میں قبول صورت تو تھی لیکن اس کی ٹکر کی نہ تھی۔ شاید یہی اس کے بگاڑ کا سبب تھی۔ ہر وقت روپیا پیسا اس کے ہاتھوں میں رہنے لگا تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ بہت بڑے سیٹھ کی بہو ہے اس لیے اس کی خواہشات بھی بڑھنے لگی تھیں۔ گھر میں بچوں کے لیے پھل آتے تو وہ بھی بیڈ کے نیچے یا پھر سنگھار میز کے پیچھے پڑے ہوتے لیکن اس کو پروا نہ تھی۔ وہ دولت کو بڑی بے پروائی سے اس لیے اجاڑ رہی تھی کہ یہ اس کے سسر کی کمائی تھی اور اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی تھی کہ اس کمائی میں اس کے شوہر کا حصہ زیادہ ہے اس لیے کہ وہ بھی میرے ساتھ مجھ سے بڑھ کر کمائی کرتا ہے مگر اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کیا اور کتنا خرچ کرتی ہے اسے تو بس روپیا چاہیے تھا۔ میں اس کی خواہشوں کی تکمیل میں اپنی سی کوشش کرتا چلا آ رہا تھا۔

پھر جب میں نے اپنے دوسرے بیٹے شناور کی شادی کی تو اسی وقت سے اس نے دبے لفظوں میں اپنے آپ کو ہم سے الگ کرنے کی باتیں شروع کر دیں۔ پہلے پہل وہ داور کے کان بھرتی رہی مگر جب اس نے دیکھا کہ داور کی طرف سے اس کی باتوں پر دھیان نہیں دیا جاتا تو اس نے دھیرے دھیرے یہ مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ وہ شناور کی بیوی کے ساتھ قطعاً نہیں رہ سکتی۔ اس طرح پہلی بار ہمارے ہنستے مسکراتے گھر میں رنجشوں کی دیوار سر اٹھانے لگی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز جب داور کو میں نے کہا۔ ”بیٹے! تمہارے چچا کے بیٹے کی آج مہندی ہے۔ رضوانہ، میں اور تمہاری امی وہاں چلے جاتے ہیں تم کلینک بند کر کے وہاں آ جانا۔“

ابھی میں نے بات ختم نہ کی تھی کہ رضوانہ قریب آتے ہوئے بولی۔ ”چچا جان! میں شادی پر نہیں جاؤں گی۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میرے پاس ڈھنگ کے کپڑے نہیں ہیں۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”ابھی چند روز پہلے تو خود تم نے اپنی پسند کی شاپنگ کی تھی اسی شادی کے لیے۔“ میری بیوی عائشہ نے کہا۔

”وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ شناور کی بیوی اس قدر مہنگے اور خوب صورت لباس میں وہاں جائے اس میں میری سبکی ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ داور اس قدر کمائی کرتا ہے مگر اس کی بیوی کے مقابلے میں شناور جو کام بھی نہیں کرتا اس کی بیوی اس قدر شاندار کپڑے پہنے۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”اوہو! تو یہ بات ہے بھئی ابھی مہندی کی رسومات شروع ہونے میں ٹائم باقی ہے کہ تم اس طرح کرو، داور کو ساتھ لے جاؤ اور اپنی پسند کا ریڈی میڈ سوٹ لے آؤ۔“ میں نے ہنستے ہوئے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

یہ بات اس وقت تو دب گئی اور بدمزگی پیدا نہ ہوئی لیکن عائشہ بتا رہی تھی کہ شادی میں رضوانہ کا رویہ بڑا اکھڑا اکھڑا سا رہا۔ حالانکہ اس نے اپنی پسند کے ملبوسات پہن رکھے تھے، پھر بھی اس کے رویے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے اس کے ساتھ زبردستی کی گئی ہو۔

شادی ختم ہو گئی مگر رضوانہ کا رویہ دن بدن جارحانہ ہوتا جا رہا تھا۔ نہ جانے اسے شناور کی بیوی نصرت سے کس بات کی دشمنی تھی جو ختم ہونے کی بجائے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ حالانکہ نصرت کی عادت اس سے قطعاً مختلف تھی۔ وہ ہر وقت ہنسنے والی لڑکی تھی جو زمانے کے ساتھ بدلتے ہوئے تیوروں کو دیکھتے ہوئے اپنے لباس اور اپنی بناوٹ سجاوٹ کو بدلنے کی عادت تھی اور شناور کی بھی یہ عادت تھی کہ وہ ہر وقت اپنی بیوی کو بناؤ سنگھار میں دیکھنا پسند کرتا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ایک سرد جنگ کا آغاز ہو چکا ہے۔ عائشہ نے بھی کئی بار اس بات کا مجھ سے ذکر کیا تھا لیکن میں نہ جانے کیوں اس سے نظر چرا رہا تھا۔

اس روز داور نیچے کلینک میں جانے سے کترا رہا تھا۔ میں اپنے کام سے واپس آیا تو مجھے عائشہ نے بتایا کہ آج داور کلینک نہیں جا رہا۔ شاید اس کا نیچے دل نہیں لگتا۔ مریض دیکھ کر فوراً اوپر آ جاتا ہے اور پھر بڑی کسلمندی سے نیچے جاتا ہے۔

میں نے داور سے پوچھا تو اس نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی اور پاؤں پٹختا ہوا نیچے کلینک کے لیے اتر گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے نیچے آیا تو کتنے ہی مریض اس کا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر داور چپ چاپ ان کو دیکھنے اور نسخے لکھنے لگا۔ مریضوں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے داور سے اس کے رویے کا سبب پوچھا تو مجھے لگا جیسے وہ بڑی دیر سے بھرا بیٹھا ہو۔

”میں اس روز روز کی چخ چخ سے تنگ آ گیا ہوں ابا جان۔ میری سمجھ سے باہر ہے رضوانہ کا رویہ۔ یہ تو صرف میں جانتا ہوں کہ اس سے کس طرح نباہ کرتا چلا آ رہا ہوں۔ اب تو اس کا رویہ میرے ساتھ بھی جارحانہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی تو بس ایک ہی ضد ہے کہ میں آپ سے الگ ہو جاؤں۔“ داور کے لہجے میں لجاجت سی آ چکی تھی۔ ”یہ میرا فیصلہ نہیں ہے ابا جان۔“

”جانتا ہوں۔ مجھے تو وہ نفسیاتی مریض لگنے لگی ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے کہ وہ جب بھی اکیلے میں بیٹھتی ہے ضد شروع کر دیتی ہے کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ ابھی تک تو میں یہ معاملہ ٹالتا چلا آ رہا ہوں مگر آج کے رویے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ داور آہستہ آہستہ کھلنے لگا تھا۔

”تو کوئی بات نہیں۔ ایسا کر لیتے ہیں میں نے اس محلے سے ذرا ہٹ کر مکان لے رکھا ہے جو کرائے پر چڑھا ہوا ہے۔ وہ کرایہ داروں سے خالی کروا کے تمہیں اور تمہارے بچوں کو ادھر بھیج دیتے ہیں۔“ میں نے آہستگی سے جواب دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ایک بہت بڑا بوجھ اس کے دل و دماغ سے اتر گیا ہو۔

”تم اسے اپنے لیے مسئلہ نہ بناؤ۔ میں آج ہی کرایہ داروں کو کہہ دیتا ہوں۔“ میں نے فیصلہ سنا دیا۔

اس روز جب ہم شادی سے واپس آئے تو رضوانہ کا رویہ سارے گھر والوں کے ساتھ یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔ لگتا تھا اسے بھی داور نے آگاہ کر دیا تھا جسے اس نے نہ صرف قبول کر لیا تھا بلکہ اسی وقت سے اپنی چیزیں اکٹھا کرنا شروع کر دی تھیں۔

میں نے اس بات پر اپنی بیوی کو بھی رضامند کر لیا تھا۔ اس کی بھی یہی رائے تھی کہ اگر اس طرح رضوانہ اور داور خوش رہ سکتے ہیں تو ہمیں کیا اعتراض ہے، پھر اگلے مہینے ہی ہم نے داور اور رضوانہ کو دوسرے گھر بھیج دیا۔ گھر اور سامان کی ساری سجاوٹ میں میری بیوی ان کے ساتھ ساتھ

تھی۔ رضوانہ نے اپنے میکے کا سارا سامان پیک کر کے ساتھ لے لیا تھا بلکہ کچھ چیزوں کی ضرورت تھی وہ بھی میری بیوی نے انہیں لا دی اور اس طرح ایک اور گرہستی کا اضافہ ہو گیا۔

اب داور کا روزانہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ کلینک سے فارغ ہوتے ہی اپنے بیوی بچوں کے پاس چلا جاتا اور اگلے دن پھر کلینک پر آ جاتا۔ رضوانہ نئے گھر میں کیا گئی تھی۔ اس کے معمولات میں بھی فرق آ گیا تھا اور پھر اس کی اپنی زندگی میں بھی بڑی تبدیلی آنے لگی۔ اس نے جاتے ہی سب سے پہلے بیوٹی پارلر میں جا کر بالوں کی سیٹنگ کروالی۔ نئے اسٹائل کے بال ترشوا کر ان کی اگلی لٹیں ڈائی کروالی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کپڑوں کی وضع قطع بھی خاصی ماڈرن کروالی تھی۔ اب وہ خاصی تبدیل ہو گئی تھی۔

☆......☆

''آپ نے اندازہ لگایا... قادر کہ... یہاں سے جانے کے بعد رضوانہ نے کیا رنگ پکڑے ہیں۔'' میری بیوی عائشہ نے ایک روز مجھ سے کہا۔

''مجھے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے کہ میں ادھر جا کے دیکھوں پھر جب سے وہ یہاں سے شفٹ ہوئے ہیں۔ رضوانہ بھی ادھر کا رستہ بھول گئی ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ صبح میں کام پر چلا جاتا ہوں۔ وہاں سے دن ڈھلے آتا ہوں تو کلینک پر بیٹھ جاتا ہوں۔ داور بھی میرے ساتھ ہی ہوتا ہے پھر میں بھلا کیسے جان سکتا ہوں۔'' میں نے تفصیلاً جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے خوف سا آنے لگا ہے۔ ہر وقت اس کی طنز میں ڈوبی تند و تیز باتیں میرا دامن پکڑے رہتی ہیں اس لیے میں اسے کچھ کہنے سے رہی۔'' عائشہ نے دوبارہ کہا۔

''چلو چھوڑو عاشی، تمہیں پتا ہے کہ بندہ جب غربت کے اندھیروں سے نکل کر امارت کی روشنی میں آتا ہے تو اسے اپنے آپ کو سنوارنے اور سجانے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اکیلے گھر میں رہتے ہوئے اسے اور کوئی کام نہیں تھا اس لیے اس نے اپنے آپ کی طرف دھیان دینا شروع کر دیا ہے، چھوڑو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔''

''نہیں قادر'' باتیں چھوٹی ہوں گی تو بڑھیں گی۔ بچے تو صبح اسکول چلے جاتے ہیں پھر اس کا سارا دن بناؤ سنگھار میں گزر جاتا ہے۔ وہ تو آج اچانک میں سمیرا کے ساتھ ادھر گئی دیکھا تو وہ اس طرح بنی ٹھنی ہوئی تھی جیسے ابھی کسی فنکشن سے لوٹی ہو۔'' عائشہ ابھی تک اسی بھنور میں تھی۔

''اچھا جاؤں گا کسی روز میں بھی۔'' میں نے بات ختم کی۔

داور اس روز بھی کچھ پریشان سا لگ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مریضوں پر بھی توجہ نہیں دے پا رہا۔ تب میں نے پوچھا۔ ''داور کچھ پریشانی ہے کیا۔''

''نہیں ابا جان۔'' اس نے میرے اچانک پوچھنے پر بوکھلا کر جواب دیا۔

''تمہارا چہرہ تمہارے جواب سے میل نہیں کھا رہا اگر کچھ ہے تو مجھے بتاؤ۔'' میں نے دوبارہ پوچھا۔

''وہ ابا جان میں تو ادھر کلینک پر آ جاتا ہوں۔ رضوانہ پہلے بچوں کو تیار کرواتی ہے۔ اسکول چھوڑنے جاتی ہے پھر آ کر دوپہر کے لیے کھانا بناتی ہے اس وقت تک بچوں کو لانے والا رکشا آ جاتا ہے پھر بچوں کو لے کر آتی ہے سارا دن تھکی رہتی ہے۔ اب کچھ دنوں سے اسے بخار بھی آ رہا ہے۔ چاہتا تھا کہ کسی نوکرانی کا بندوبست ہو جائے مگر آپ سے کہنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔'' اس نے بتایا تو مجھے لگا واقعی اس کی ضرورت ہے۔

''تو بیٹے اس میں شرمانے والی کون سی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہمیں شکر ادا کرنا چاہیے کہ ایک تو ہماری ملازمت قائم ہے۔ اوپر سے کلینک کی کمائی ہمارے پورے خاندان کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہے پھر ہمیں نوکرانی رکھنے میں کیا قباحت ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا تو اس کے چہرے کی بشاشت لوٹ آئی اور وہ دوبارہ دل جمعی سے کام میں لگ گیا۔

رات کو میں نے عائشہ سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ یکدم ماں سے عورت بن گئی۔

''مجھے اس بات کا پہلے کئی روز سے شک تھا اور داور نے بھی باتوں باتوں میں کئی بار مجھے قائل کرنا چاہا تھا مگر میں ہر بار سنی ان سنی کر دیتی تھی۔ آخر اس نے آپ کو قائل کر ہی لیا۔ میں نہ کہتی تھی کہ رضوانہ ہاتھوں سے نکلتی جا رہی ہے۔''

''ارے نہیں بھاگوان ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ تم اپنی کسی ملنے والی سے کہہ کر نوکرانی کا بندوبست کرا دو۔ میں بھی اپنی مریض عورتوں سے اس کا ذکر کروں گا۔ کہیں سے کوئی اچھی ماسی مل جائے تو ان کا یہ مسئلہ بھی حل ہو

جائیے۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ انتہائی ہوشیار اور چالاک لڑکی ہے۔ میرا داور تو اس کے آگے بھیگی بلی بنا رہتا ہے۔ آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ اس لڑکی نے آتے ہی کس قدر چالاکی سے ہمارے گھر میں دراڑ ڈال دی۔ ہم سب ایک ہی چھت تلے کس قدر آرام و سکون سے زندگی گزار رہے تھے کہ اس نے سکون کے پانیوں میں نفرت کی کنکریاں پھینکنا شروع کر دیں جس کا نتیجہ ہے کہ آج اپنے شوہر کو لے کر دوسرے گھر میں رہ رہی ہے۔'' عائشہ بھی اپنے من کی بھڑاس نکالنے پر تلی ہوئی تھی۔

''یہ تو برسوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ کنبے اور خاندان کے بٹوارے ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر وہ ہم سے الگ ہو بھی گئے ہیں تو کون سی قیامت آ گئی ہے پھر داور تو ہمارا ہی ہے کہ ہم اس کے والدین ہیں۔ اس کی ضرورتوں پر ہم دھیان نہ دیں گے تو اور کون دے گا۔ بہرحال تم بھی ماسی ڈھونڈو میں بھی دیکھتا ہوں۔'' میں نے بات ختم کرنے کی کوشش کی تو عائشہ پھر سے بول اٹھی۔

''دیکھنا آپ کی ڈھیل کوئی نیا چاند نہ چڑھا بیٹھے۔ پتا ہے وہ یہاں سے کیوں الگ ہوئی ہے کہ اس نے بڑی آہستگی کے ساتھ یہ منصوبہ بنانا شروع کر دیا تھا کہ میری دونوں بیٹیوں سمیرا اور زنیرہ کی شادیاں ہو جائیں اور اس کے لیے گھر خالی ہو جائے مگر جب اس نے دیکھا کہ شاور کی دلہن نصرت آ گئی ہے تب سے اس نے الگ رہنے کا منصوبہ بنا لیا اور اس وقت تک نہیں ٹلی جب تک اس کا مطالبہ پورا نہیں ہو گیا۔''

عائشہ کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ ''چھوڑو عاشی! تم تو خوامخواہ اس کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ بچے ہیں۔ انہیں آزادانہ ماحول اور زندگی پسند ہے تو ہمیں ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیے۔ پرندے آزاد فضاؤں میں رہیں تو خوب صورت لگتے ہیں۔''

''پتا نہیں آپ ہر بات کو اس قدر آسان کیوں لیتے ہیں۔ پتا ہے کہ وہ ہمارے خاندان کی خوب صورتی سے بھی جلتی ہے۔''

''لو اب یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''بس کئی بتانے والے ہیں۔ رضوانہ کی والدہ نسرین کی شہ پر وہ ایسی حرکتیں کرتی ہے اور کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ نسرین کہتی پھرتی ہے قادر بخش نے اپنی بیٹیاں شو پیس بنا کر رکھی ہوئی ہیں۔'' عائشہ روانی میں بتا رہی تھی۔

''چھوڑو عاشی یہ سب بکواس ہے۔''

''ٹھیک ہے میں کون سا اس بات کو دل سے لگا بیٹھی ہوں مگر مجھے یہ سب سن کر افسوس ضرور ہوا۔ بہرحال آپ داور سے یہ ضرور کہیں کہ وہ اپنی بیوی کو ذرا لگام دے کر رکھے۔''

''کہہ دوں گا۔'' میں نے بات ختم کی۔

اگلے روز میں نے داور سے کہہ دیا کہ وہ بھی اپنی مریضوں سے کہہ دے کہ کوئی گھر پر کام کرنے والی مل جائے تو اسے ملوائیں۔ داور نے یہ سنا تو اس نے خوش دلی سے ہامی بھر لی۔

☆......☆

اندر کا خوف یا تو انسان سے عقل مندی کے کام کروا دیتا ہے یا پھر وہ کوئی نہ کوئی ایسی غلطی کر بیٹھتا ہے جس کے سبب وہ ساری زندگی پچھتاوے میں گزار دیتا ہے۔ کلینک سے اس قدر کمائی ہونے لگی تھی جس سے میرے خاندان کی تمام ضرورتیں بہ احسن طریق پوری ہونے کے بعد بھی اس کا ایک بڑا حصہ بچنے لگا تھا اور پھر داور چونکہ جوان، محنتی ہونے کے ساتھ قدرتی حسن سے بھی مالا مال تھا اس لیے اس کے مریضوں خصوصاً خواتین مریضوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہونے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ کی قدرتی شفا اور پھر اس کی لچھے دار باتوں سے مریضوں کا آدھا مرض تو ویسے ہی ختم ہو جاتا تھا۔ مجھے اب اس کی طرف زیادہ دھیان دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے فالتو پیسوں سے چھوٹی موٹی پراپرٹی خریدنے اور بیچنے کی طرف توجہ دینا شروع کر دی تھی اور اس سے میری کمائی میں بڑی تیزی سے بڑھوتری ہونے لگی تھی۔

میں نے عقل مندی یہ کی کہ جتنے پیسے میرے پاس جمع ہوتے تھے میں باہر کے ممالک میں مقیم اپنے رشتے داروں سے اس رقم کے ڈرافٹ منگوا لیتا تھا اور ان کے بدلے میں ان کے گھر متبادل رقوم نقد دے دیتا تھا۔ یہ میرے ایک وکیل دوست نے مجھے مشورہ دیا تھا۔ اس نے ایک روز مجھے سمجھایا تھا کہ قادر بخش وقت بدلتے دیر نہیں لگتی اور پھر ہر آدمی تمہارا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تو تم جس پر احسان کرو گے اس کی دشمنی کا سامنا کرنے کو تیار رہو۔ مجھے پتا ہے تم دن رات محنت کرتے ہو اور تمہارے پیش نظر محنت کے بل بوتے پر آگے بڑھنے کا عزم رکھتے ہو جس کے لیے تم راتوں کی نیند

بھی حرام کر رکھتے ہو مگر یہ بھی سوچو تم ایک ڈسپنسر ہو۔ ایک معمولی عہدے کے سرکاری ملازم۔ تمہارے اپنے ساتھی بھی تمہاری بے تحاشا کمائی کے دشمن ہیں۔ وہ کسی بھی معاملے میں تمہیں الجھا سکتے ہیں۔ میری مانو تو اس کمائی کو اس ملک میں تحفظ دینے کی خاطر اپنے عزیزوں، دوستوں سے جو غیر ممالک میں کام کرتے ہیں۔ ان سے وقتاً فوقتاً اپنی جمع شدہ رقوم کے ڈرافٹ منگواتے رہو۔ اس طرح تمہارا مستقبل محفوظ رہے گا اور کوئی دشمن تمہیں کسی مرحلے پر نقصان بھی نہ پہنچا پائے گا۔

اس کی بات میری سمجھ میں آگئی تھی اور میں نے اپنے تمام نزدیکی رشتے داروں اور احباب کو ٹیلی فون پر اس بات سے آگاہ کر دیا تھا۔ کچھ نے تو ہامی بھر لی تھی۔ رضوانہ کا باپ وقاص احمد بھی امریکی شہریت لیے ہوئے وہاں رہائش پذیر تھا۔ گرین کارڈ ہولڈر ہونے کے سبب اس کا پاکستان آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میں نے جب وقاص احمد سے بات کی تو سمدھی ہونے کے سبب اس نے انکار تو نہ کیا البتہ تھوڑی سی ردوکد کے بعد وہ اس بات پر راضی ہو گیا تھا اور کچھ ہی دنوں بعد دو لاکھ کا ڈرافٹ میرے نام آگیا۔ جسے میں نے بینک میں اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروانے سے پہلے اس کی فوٹو کاپی کروا کر اپنی فائل میں لگالی تھی تاکہ ضرورت کے وقت اسے استعمال کر سکوں اور اس کی ادائیگی نقد رقم کی صورت میں، میں نے اس کے گھر پہنچا دی۔ رضوانہ کو جب پتا چلا کہ اس کے باپ نے اتنی رقم کا ڈرافٹ میرے نام بھجوایا ہے تو وہ ہر ایک سے بولنے لگی۔ ”آخر میرا باپ ہی کام آیا ناں۔“

رضوانہ کی کہی ہوئی بات آہستہ آہستہ عائشہ تک پہنچی تو ایک روز اس نے مجھے کہا۔ ”کچھ آپ نے بھی سنا کہ ہمیشہ کی طرح اب بھی آپ کے کان اپنی بہو کے بارے میں کچھ سننا پسند نہیں کرتے۔“

”کیا ہوا ہے۔“ میں نے لاعلمی سے پوچھا۔

”رضوانہ نے کسی سے کہا ہے کہ آخر اس کا باپ ہی کام آیا ناں۔ اتنے بڑے بڑے ڈرافٹ ادھر سے آنے لگے ہیں۔“ عائشہ نے ٹھہر ٹھہر کر اس انداز میں مجھے جتایا کہ مجھے غصہ آجائے مگر میں اپنی فطری عادت کے ہاتھوں مجبور تھا۔

”بات تو اس کی درست ہے مجھے رقم کی ضرورت تھی اور پھر تمہیں تو علم ہے کہ میں نے جتنے ڈرافٹ بھی ادھر سے منگوائے ان کی نقد ادائیگی اس کے گھر کر دی ہے۔ میرے ذمے اب اس کا ایک پیسا بھی نہیں ہے۔ وقاص احمد بھی اس بات کو بخوبی سمجھتا تھا۔ جب سب لوگوں نے مجھے اس معاملے میں مدد دینے سے انکار کر دیا یا بڑے خوب صورت طریقے سے ٹال دیا تب وہی میرے کام آیا رضوانہ جھوٹ نہیں کہتی۔ میں نے تفصیلاً عائشہ کی بات کا جواب دیا۔

”یہ تو ٹھیک ہے جب ہم نے اس کی پائی پائی کا حساب کر دیا ہے تو رضوانہ کو ایسی بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔“ عائشہ نے کہا۔

”میں دیکھ لوں گا جب کوئی بات ہوگی۔“ میں نے بات ختم کی۔

”وہ ایسی باتیں ضرور کرے گی کیونکہ یہ اس کی عادت بن چکی ہے۔“ عائشہ نے دوبارہ آہستگی سے کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔“

بات یہیں ختم ہوگئی تھی مگر اس کے چند دنوں کے بعد ایک روز شناور نے مجھ سے علیحدگی میں پوچھا۔ ”ابا جان! آپ نے بھابی رضوانہ کے والد سے کتنے پیسے لیے ہیں؟“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ہر جگہ یہ کہتی پھر رہی ہیں کہ کلینک کا سارا کاروبار اسی کے والد کی کمائی سے چل رہا ہے۔ اگر اس کے والد باہر سے پیسے نہ بھیجیں تو آج ہی یہ سب ٹھپ ہو جائے۔“ شناور نے ڈرے لہجے میں کہا۔

”ہوں، تو گویا عائشہ کی بات درست ہی ثابت ہوئی۔“ میں نے سوچا اور پھر پوری تفصیل سے شناور کو آگاہ کر دیا۔

”آپ دوسرے رشتے داروں سے بات کیوں نہیں کر لیتے جب آپ ان کے بھیجے ہوئے ڈرافٹوں کی رقم پاکستانی کرنسی میں ان کو ادا کر دیتے ہیں تو پھر ایسی باتیں سنانے کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔“ شناور نے گویا میری بات کو پورے طور پر سمجھ لیا تھا۔

”اگر آپ مناسب جانیں تو میں اپنے ایک دوست سے بات کرتا ہوں۔ وہ بھی یورپ میں مقیم ہے۔ میں اس سے ڈرافٹ منگوا لیا کروں گا۔“ شناور نے دوبارہ سے کہا۔

”ٹھیک ہے تم ایسا کر کے دیکھو اگر ادھر بات بن جائے تو ہمیں اس کے باپ کے ترلے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

یہ بھی ان ہی دنوں کا ذکر ہے جب ایک روز رضوانہ کے باپ کا باہر سے فون آیا۔

”قادر بخش بول رہا ہوں۔“ میں نے موبائل فون آن کرتے ہوئے کہا۔

”سناؤ ڈرافٹ مل رہے ہیں۔“ اس نے بات شروع کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، مجھے جو ڈرافٹ بھی ملتا ہے اس کے مطابق رقم تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کروائے جا رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس کی اطلاع مجھے بینک اسٹیٹمنٹ سے ملتی رہتی ہے۔ وہ یار تم سے بات کرنی تھی اب تمہیں اس قدر بچت ہونے لگی ہے تو اپنے پوتے پوتیوں کا بھی کچھ دھیان کرو۔ میری بیٹی سارا سارا دن گھرداری میں لگی رہتی ہے پھر اسے بچوں کو اسکول لے جانا اور لانا پڑتا ہے کچھ خدا کا خوف کرو۔ ان کے لیے کوئی گاڑی وغیرہ خرید لو۔ اگر پیسے نہیں ہیں تو میں بھجوا دیتا ہوں۔“ رضوانہ کے باپ نے بات میں مزاح کا رنگ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ میرا وعدہ رہا یہ رقم میں جلد اتارنے کی کوشش کروں گا۔ میں پہلے سے تمہیں کہنے والا تھا مگر مجھے کہنے میں ہچکچاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔“ میں نے جواب دیا تو آگے سے ایک ہلکا سا قہقہہ ابھرا اور پھر وہ گویا ہوا۔

”تم کل ہی مارکیٹ سے زیرو میٹر گاڑی کی قیمت معلوم کر کے مجھے بتاؤ۔ میں اتنی رقم کا ڈرافٹ بھجوا دوں گا۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے اس کا ذکر داور سے کیا۔ اپنے سسر کی پیشکش سن کر وہ بھی بہت خوش ہوا۔ دوسرے روز میں اور داور شہر پہنچے اور نئے کیری ڈبہ کی قیمت پوچھ کر میں نے رضوانہ کے والد کو بتا دی۔ چند دنوں بعد اس کی طرف سے ڈرافٹ آگیا۔ اس طرح ہم ایک نئی کیری ڈبہ کے مالک تو بن گئے مگر اس کو چلانا کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ مجبوراً اس کے لیے مجھے ایک ڈرائیور بھی رکھنا پڑا۔ میری ملازمت اور کاروبار سے اتنی بچت تو ہو جاتی تھی کہ میں ایک ڈرائیور کی تنخواہ بھی آسانی سے نکال سکتا تھا اس لیے ڈرائیور مجھ پر قطعاً کوئی بوجھ نہ تھا۔

داور کے ذریعے رضوانہ کو پتا چل گیا تھا کہ میں نے یہ گاڑی اس کے والد سے رقم لے کر خریدی ہے اس لیے وہ اس پر بھی اپنا دعویٰ کرنے لگی تھی اور تو اور اس نے ڈرائیور کو بھی یہ باور کروا دیا تھا کہ گاڑی کی اصل مالک وہی ہے۔ لہٰذا ڈرائیور بھی اسی کی بات زیادہ مانتا تھا۔ زیادہ ہوشیاری رضوانہ نے یہ بھی دکھائی کہ وہ ڈرائیور پر اپنی نوازشات کر کے اسے اپنا زیر بار کرنے لگی۔ اس کا احساس مجھے وقتاً فوقتاً ہوتا رہا تھا مگر اس روز تو حد ہی ہوگئی۔

ایک فنکشن میں ساری فیملی کو جانا تھا میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ داور کے بچوں کو لے کر جلد واپس آجائے تاکہ دوسرے لوگوں کو فنکشن میں شرکت کے لیے لے جاسکے۔

ڈرائیور گاڑی لے کر چلا گیا۔ کافی انتظار کے بعد میں نے موبائل پر اس سے رابطے کی کوشش کی مگر کال سنی نہ گئی۔ بار بار کی کوشش کے باوجود جب دوسری طرف سے کوئی ردعمل دکھائی نہ دیا تو میں نے موٹر سائیکل پر جا کر اس کا پتا کرنے کی کوشش کی۔ وہ داور کے مکان میں بیٹھا ہوا ناشتا کر رہا تھا۔ مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے اندر جا کر اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اسے باجی رضوانہ نے روکا ہوا تھا۔ جب میں نے رضوانہ سے پوچھا تو وہ بولی۔ ”چچا جان کیا ہوا آپ اس قدر پریشان ہیں۔ فنکشنوں میں دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔ اس بے چارے نے ناشتا نہیں کیا تھا میں نے سوچا ناشتا کرا دوں۔“

”مگر بیٹی ادھر سب انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ آپ چلیں ہم بس ابھی آتے ہیں۔“

میں جب واپس آیا تو میری بیوی عائشہ نے بڑی عجیب نظروں سے میری جانب دیکھا۔

”وہ وہاں ناشتا کر رہا ہے اور رضوانہ بچوں کو تیار کر رہی ہے ابھی آجائے گا۔“ میں نے خفت بھرے لہجے میں انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”وہ اس طرح کے حربوں سے اپنی اہمیت کا احساس دلا رہی ہے۔ حالانکہ جب وہ ہمارے ساتھ رہتی تھی تو کسی بھی پارٹی یا فنکشن میں جانے کے لیے سب سے پہلے وہی تیار ہوتی تھی۔“ میری بیوی نے کہا۔

”کوئی بات نہیں، آجائے گی۔“

مگر اس کے باوجود اس نے آنے میں اتنی دیر کر دی کہ سب کی برداشت سے باہر ہوگیا۔

”لگتا یوں ہے کہ گاڑی اس کے باپ کی ہے۔“ منجھلی بیٹی نے کہا تو میں نے اسے ذرا سختی سے جواب دیا۔ ”اب تم کوئی گل نہ کھلا بیٹھنا۔ تمہیں شاید علم نہیں

گاڑی اسی کے والد کی بھیجی ہوئی رقم سے خریدی گئی ہے۔ جب تک اس کے پیسوں کی ادائیگی نہیں ہو جاتی اس وقت تک تو اسی کی گاڑی ہے۔"

"ہم نے کون سے ان کے پیسے دبا لینے ہیں۔ لین دین تو دنیا میں ہوتا ہی آیا ہے۔" اب کی بار چھوٹی بیٹی بول اٹھی۔

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ڈرائیور گاڑی لے کر آ گیا۔ گاڑی خالی تھی۔

"رضوانہ نہیں آئی کیا؟" عائشہ نے خالی گاڑی دیکھ کر کہا۔

"وہ جی باجی ابھی تیار ہو رہی تھیں۔ مجھے کہا کہ تم گاڑی میں انہیں بٹھا کر لے آؤ جانا تو اسی راستے سے ہے۔ میں تیار ہو جاتی ہوں پھر یہیں سے چلے چلیں گے۔"

"امجد تمہیں میں نے کیا کہہ کر بھیجا تھا اور پھر تم میری کال بھی نہیں سن رہے تھے۔" میں نے ڈرائیور سے سختی سے پوچھا۔

"وہ جی اس میں میرا کوئی قصور نہیں، مجھے باجی نے جان بوجھ کر روکا ہوا تھا۔" امجد نے جلدی سے کہا۔

"چلو بیٹھو۔" میں نے بچوں کو کہا اور خود غصے سے اندر کلینک میں چلا گیا۔

کلینک میں بے شمار مریض بیٹھے ہوئے تھے۔ داور نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ ابھی تک گئے نہیں؟"

"وہ تمہارے بچے ابھی تک نہیں آئے۔" میں نے بتایا۔

"انہیں گاڑی لینے نہیں گئی تھی۔" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"گاڑی صبح سے ادھر ہی تھی۔ اب اتنی دیر بعد آئی ہے تو پتا چلا کہ ابھی تک تمہاری بیوی اور بچوں کی تیاری مکمل نہیں ہوئی۔ اب ادھر سے گزرتے ہوئے انہیں لے لیں گے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"اف یہ رضوانہ۔" داور نے کہا اور دوبارہ مریض دیکھنے لگا۔

☆......☆

نور بانو اپنی عمر کے حساب سے پچاس پچپن سے کم تو نہ تھی۔ اونچی لمبی، سفید سیندھوری رنگت، گہری پیازی آنکھیں اور مضبوط کاٹھی کی عورت تھی۔ اس کی آنکھوں کی بے چینی اور تیزی سے گھومنا یہ ثابت کر رہا تھا کہ وہ اپنی جوانی میں خاصی تیز طرار اور چالاک رہی ہوگی۔ میں اس شام کلینک میں بیٹھا مریضوں کو دیکھ رہا تھا کہ وہ عورتوں والے حصے میں آ کر بیٹھ گئی مگر جتنی دیر وہ بیٹھی رہی اس کی آنکھیں تیزی سے اپنے اردگرد کا جائزہ لیتی رہیں۔ ایک دو مریض عورتوں کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ "جی بی بی۔"

"میرا نام نور بانو ہے۔ میں پچھلے روز آپ کے [illegible] سے مل کر گئی تھی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ آپ کو گھر کے کام کاج کے لیے عورت کی ضرورت ہے اس لیے حاضر ہوئی ہوں۔" اس کا باتیں کرنے کا انداز بھی خاصا شاطرانہ تھا۔

"ضرورت تو ہے۔" میں نے اس کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں جی آپ سے اگلے اسٹاپ کے محلے میں رہتی ہوں۔ میری دو بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے گزارہ ہوتا ہے جی آپ کو تو پتا ہے کس قدر مہنگائی ہو چکی ہے۔"

"پہلے بھی یہیں رہتی تھیں یا اس جگہ نئے آئے ہو اور تمہارا شوہر کیا کرتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"وہ تو مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے جی۔ اکیلی رہتی ہوں بچوں کے ساتھ۔" اس نے جس انداز سے بتایا تھا، اس سے لگتا تھا کہ یا تو وہ ضرورت سے زیادہ چالاک ہے یا پھر معاشرے کے ہاتھوں ستائی ہوئی ہے۔ تنخواہ [illegible] سارے معاملات طے ہونے پر میں نے اس سے آخری سوال پوچھا۔ "کام پر آنے کے بعد تمہارے بچوں کو کون سنبھالے گا۔"

"جی آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میرے بچوں [illegible] میری لڑکی سب سے بڑی ہے اور وہ بچوں کو سنبھال لے گی میں پہلے جہاں کام کرتی تھی وہاں بھی جانے سے پہلے میری لڑکی سنبھال لیتی تھی پھر آپ کو تو پتا ہی ہے۔ محنت [illegible] کے بچے جھولنے میں ہی سمجھدار ہو جاتے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ کل تم کسی وقت آ جانا میں داور کو [illegible] دوں گا۔ وہ تمہیں اپنا گھر دکھا دے گا۔ کیا کرنا ہے اور [illegible] نہیں کرنا۔ یہ تمہیں اس کی بیوی سمجھا دے گی۔"

"ٹھیک ہے جی۔" یہ کہہ کر وہ واپس چلی گئی۔ میں [illegible] تک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی چال میں [illegible] ایک مستانہ پن واضح تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا کہ اس عورت کی گھر گرہستی اجڑنے میں کس کی زیادہ غلطی رہی ہو گی۔ اگلے دن داور کو میں نے ڈیوٹی پر جانے سے پہلے رات کی روداد سنا دی تھی اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ یہ عورت مجھے بڑی مظلوم اور معاشرے کی ستائی لگ رہی ہے۔ وہ اپنی بیوی سے کہہ دے کہ اس کا خاص دھیان رکھے۔

شام کو جب میں کام سے واپس لوٹا تو رضوانہ ادھر آئی ہوئی تھی۔ آج وہ بہت خوش تھی کیونکہ اس کی نوکرانی رکھنے کی خواہش بھی پوری ہو چکی تھی۔ میں نے دیکھتے ہی اس کی خوشی کا اندازہ لگا لیا تھا۔

"وہ چچا جان! میں نے ماسی نور کو ملازم رکھ لیا ہے۔ داور کہہ رہے تھے بڑی مظلوم اور معاشرے کی ٹھکرائی عورت ہے۔ میں سوچتی ہوں جب اتنی خوب صورت عورت اس قدر دکھی ہو سکتی ہے تو پھر بدصورت عورتوں کو کون پوچھتا ہے۔ میں ادھر آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔" رضوانہ نے خوشی سے بتایا۔

"اس میں بھلا شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے تمہاری ضرورتوں کا احساس رہتا ہے تم ہی نہیں بلکہ اپنے سارے بچوں کی ضروریات اور ان کی خواہشات کا علم ہوتا ہے، ہم تمہارے والدین ہیں۔" میں نے ہنس کر جواب دیا پھر وہ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد "چلتی ہوں ماسی کو اپنے گھر جانا ہے۔ اس کے بچے منتظر ہوں گے۔" یہ کہہ کر وہ نیچے اترنے لگی۔ تو میں نے کہا۔

"ٹھہرو تمہیں امجد گاڑی پر چھوڑ آتا ہے۔"

"دیکھتی ہوں۔ اسے میں نے ہی کچھ ضروری اشیاء لینے بھیجا تھا۔ اب تک آ گیا ہوگا۔ نیچے ہوگا میں چلی جاؤں گی۔" رضوانہ یہ کہہ کر نیچے اتر گئی۔ اس کے جاتے ہی گھر میں گویا قیامت سی آ گئی تھی۔

"اب شہزادی صاحبہ کے لیے نوکرانی بھی رکھ دی گئی ہے آخر مجھے اس مشورے میں شامل کیوں نہیں رکھا گیا۔ اب شناور کی بیوی کے لیے بھی الگ سے نوکرانی رکھنے کا سوال اٹھے گا۔" عائشہ پھٹ پڑی تھی۔

"عاشی کچھ خدا کا خوف کرو۔ ایک تو وہ اپنے گھر سے دور اور اکیلی رہتی ہے۔ اس کے سارے بچے اسکول جاتے ہیں۔ ان کی تیاری اور انہیں اسکول چھوڑ کر آنا جانا۔ اسے گھر سنوارنے میں وقت ہی کتنا ملتا ہوگا پھر نصرت تو تمہارے ساتھ رہتی ہے اور گھر میں اوپر کے کاموں کے لیے پہلے سے ایک ماسی موجود ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بہر حال قادر جی، اس کا نتیجہ بڑا برا ہوگا اور اس کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوگی۔ اس کے مزاج پہلے ہی بگڑے ہوئے ہیں اب اور بگڑ جائیں گے۔" عائشہ نے اسی لہجے میں مجھے باخبر کیا۔

"ایک تو تمہیں ہمیشہ وہم رہتا ہے۔ رضوانہ پڑھی لکھی لڑکی ہے وہ سب جانتی ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"وہ کچھ نہیں جانتی، بس اتنا جانتی ہے کہ اپنی بات کس طرح منوائی جاتی ہے اس کے لیے اسے چاہے کچھ بھی کرنا پڑے وہ کر گزرتی ہے۔" عائشہ نے تنک کر کہا۔

میں خاموش ہو گیا۔ اس سے اگلے دن اتوار کی وجہ سے سینٹر میں چھٹی تھی اس لیے میں گھر پر ہی تھا۔ داور ابھی تک کلینک پر نہیں پہنچا تھا۔ عائشہ کام کاج کرتے کرتے بڑی دزدیدہ نظروں سے مجھے تکتی جا رہی تھی۔

"یہ ابھی تک داور نہیں پہنچا۔" میں نے عائشہ کو چھیڑنے کی خاطر کہا۔

"اس کی چہیتی اسے اجازت دے گی تو آجائے گا۔ بیٹھا ہوگا اس کی پائنتی میں۔" عائشہ نے جلے کٹے لہجے میں جواب دیا۔

میں اسے بار بار فون ملا رہا تھا مگر وہ فون یا تو کاٹ دیتا یا پھر گھنٹی بدستور بجتی رہتی۔ میں اس کی اس حرکت سے زچ ہو رہا تھا کہ عائشہ نے کہا۔ "قادر جی نہ پریشان ہوں۔ یہ اس کی آج کی روٹین نہیں وہ تو ہر روز ایسے ہی کرتا ہے۔ مریض انتظار کرتے کرتے اٹھ جاتے ہیں مگر اسے اس سے کیا غرض۔ یہ قادر بخش تو ہے نہیں۔ رات دو بجے بھی دروازہ کھٹکے تو فوراً نیچے جا کر مریض کو دیکھ آتے ہیں۔ یہ داور ہے داور!" شاید عائشہ نے مجھے طنز کے نکلے پر چڑھا لیا تھا۔ میں ابھی غصے میں ہی تھا کہ وہ آ گیا۔ آتے ہی سیدھا اوپر آیا تھا اور سلام کر کے نیچے کلینک میں جانے لگا تو میں نے پوچھا۔ "خیریت تھی۔ اس قدر دن چڑھا لیا۔"

"ہوں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا اور نیچے اتر گیا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے میں بھی اس کے پیچھے فوراً نیچے اترا۔

مہترانی صفائی کر رہی تھی، میں دیکھ رہا تھا کہ داور کچھ کنی کترا رہا ہے۔

"کیا بات ہے کوئی پریشانی ہے۔"

میرے پوچھنے پر وہ تقریباً پھٹ پڑا۔ ”میں تو تنگ آگیا ہوں اس بدبخت سے۔“

”کون ہے وہ۔“ میں نے اجنبیت سے پوچھا۔

”وہی رضوانہ بدبخت کی دماغ کی سوئی جہاں اٹک جاتی ہے بس مجال ہے کس سے مس ہو جائے۔“ وہ روہانسا ہو کر بولا۔

”آخر ہوا کیا ہے؟“

”ہونا کیا ہے کل آپ نے کسی بات پر امجد ڈرائیور کو ڈانٹا ہوگا۔ اس نے کچھ باتیں اپنی طرف سے لگا کر رضوانہ کے کان بھر دیے۔ بس رات سے وہ اسی بات کی ضد کر رہی ہے کہ اب نہ تو گاڑی کلینک پر جائے گی اور نہ ہی امجد ادھر جائے گا۔ گاڑی میرے والد نے صرف میرے بچوں کے لیے لے کر دی ہے۔ اسے چچا جان نے نہیں خریدا کہ وہ اس پر رعب جھاڑیں۔“

”بس اتنی سی بات پر تمہارا موڈ خراب ہو گیا ہے۔ میرے بچے زندگی اسی اتار چڑھاؤ کا تو نام ہے اگر وہ ایسا چاہتی ہے تو اسے کر لینے دو۔ چند دنوں میں راست پر آجائے گی۔ میں امجد سے کہوں گا کہ وہ بچوں کو اسکول چھوڑ کر گاڑی ادھر ہی بند کر دیا کرے اور جب بچوں کو لانا ہو تو ادھر سے ہی لے کر آیا کرے۔ تم پریشان نہ ہو۔ مجھے ضرورت ہوگی تو موٹر سائیکل ہے میرے پاس۔“ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا تو داور فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے چمٹ گیا۔

”ابا جان! آپ واقعی عظیم ہیں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ آپ نے گاڑی کی قیمت رضوانہ کے والد کو ادا کر دی ہے۔ میں نے اسے بتانے کی بہت کوشش کی مگر وہ ہے کہ مانتی ہی نہیں۔“ داور نے کہا۔

”میرے بیٹے! یاد رکھو گھر بنانا اور اس کے ایک ایک زاویے کو سنبھالنا بہت مشکل کام ہے۔ اسے گرانا اور بگاڑنا بہت آسان ہے۔ ہوسکتا ہے جس نے گاڑی کی قیمت کے بارے میں بتایا ہو کہ یہ رضوانہ کے والد نے خرید کر دی ہے وہ یہ بتانا بھول گیا ہو کہ قادر بخش نے اس کی تمام قیمت اسے ادا کر دی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے تم پریشان مت ہوا کرو۔ تم یہ بتاؤ ماسی کا کام وغیرہ تو رضوانہ کو پسند آگیا۔ وہ آتی بھی ہے یا چھٹیاں کرتی رہتی ہے۔“ میں نے بات کا رخ موڑا۔

”رضوانہ بتا رہی تھی وہ بہت اچھی ہے۔ اخلاق میں بھی اور کام کاج میں بھی۔ اس بارے میں تو اس کی کوئی شکایت نہیں۔ ان چند دنوں میں تو ماسی نے رضوانہ کو جیسے جکڑ لیا ہو۔ مجال ہے رضوانہ کو کسی کام میں ہاتھ بھی لگانے دے۔“ داور نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔

”چلو خدا کا شکر ہے کہ تمہاری یہ اذیت تو ختم ہوئی۔“

☆......☆

وقت اگر انسان کے بس میں ہوتا تو وہ اس میں سے اپنی پسند کے لمحات کو منجمد کر کے اپنے پاس رکھ لیتا یا پھر وقت کے گھوڑے کی لگام کھینچ رکھتا۔ وقت بڑی تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ امجد ڈرائیور کو رضوانہ نے اتنا سر چڑھا لیا تھا کہ وہ اب مجھے بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا اس لیے ایک روز میں نے اسے گاڑی سے اتار دیا اور ملازمت سے نکال دیا۔ میرے اس عمل پر رضوانہ بڑی جز بز ہوئی تھی مگر میں نے اسے خاطر میں نہ لاتے ہوئے یہ کام کر ڈالا۔ ماسی کو بھی رضوانہ نے خاصی ڈھیل دے رکھی تھی۔

اس روز نہ جانے عائشہ کس کام کی غرض سے رضوانہ کی طرف گئی۔ اس وقت ماسی چھٹی کر کے اپنے گھر جا رہی تھی۔ اس نے دو بڑی گٹھڑیاں اور ایک چھوٹی سی دیگچی پکڑی ہوئی تھی۔ عائشہ نے مجھے بتایا کہ میں نے گٹھڑیاں دیکھ کر سوال کیا۔

”ماسی کہیں جا رہی ہو یا کہیں سے آئی ہو یہ بڑی بڑی گٹھڑیاں!“

اس سے پہلے کہ ماسی مجھے کچھ جواب دیتی رضوانہ فوراً بول اٹھی۔ ”وہ دراصل امی جان کتنے دنوں سے ماسی بچوں کے کپڑوں کا تقاضا کر رہی تھی آج میں نے پرانے کپڑے نکالے تھے وہ میں نے اسے دے دیے کہ اپنے بچوں کے لیے لے جائے اور شام کو اسے گھر جاتے دیر ہو جاتی ہے اس لیے بچوں کے لیے روٹی اور سالن میں اسے دے دیتی ہوں۔ یہاں کام کرتے کرتے تھک جاتی ہے گھر جا کر کہاں کام ہوتا ہوگا۔“

میں نے عائشہ کی بات کو ہنس کر ٹال دیا۔ تو وہ زچ ہو کر بولی۔ ”قادر جی! میں رضوانہ کی دشمن نہیں ہوں مگر مجھے اس کی عادتوں سے اختلاف ہے میں نے بھی ساری عمر گھر میں نوکرانی رکھی ہے مگر کبھی اسے سر پر نہیں بٹھایا۔ رضوانہ نے تو حد ہی کر دی ہے اب اگر شام کو بچوں کے لیے پھل فروٹ لے جانا داور کی عادت ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ پھل فروٹ بھی ماسی کو دے دیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ ہر

روز نہ صرف کھانا بلکہ پھل فروٹ بھی اپنے بچوں کے لیے لے جاتی ہے۔“

”میں داور سے بات کرتا ہوں۔“ میں نے یہ کہہ کر اس سے جان چھڑائی۔ انہی دنوں ایک شام میں سینٹر سے فارغ ہو کر گھر آیا اور آرام کی غرض سے اوپر کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ داور نے نیچے کلینک سے آواز دی۔ میں نے آواز نہ سنی تو اس نے ایک مریضہ کو اوپر بھیج دیا۔

”آپ کو نیچے ڈاکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔“ مریضہ نے مجھے آکر اطلاع دی۔ میں نیچے اترا تو داور کے نزدیک سفید کپڑوں میں ملبوس ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔

”یہ آپ سے ملنے آئے ہیں۔“ داور نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ میں نے اس شخص سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”میرا نام حفیظ ہے اور میں ایف آئی اے سے آیا ہوں۔ آپ کے خلاف ہمارے پاس اطلاع پہنچی ہے کہ آپ نے ناجائز طریقے سے روپیا بنا رکھا ہے۔“

اب میں کرسی لے کر اس کے نزدیک بیٹھ چکا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کس نے درخواست دی ہے اور میں نے کون سا دولت کمانے کا ناجائز دھندا اختیار کیا ہوا ہے۔“

”یہ تو مجھے علم نہیں اور نہ ہی درخواست دہندہ کا نام بتانے کی ہمیں اجازت ہے۔ آپ بس دو ایک روز تک ہمارے دفتر میں آکر بڑے افسران سے مل لیں اور اس جگہ رسید دے دیں کہ آپ کو اطلاع ہوگئی ہے۔“

”مگر مجھے کچھ پتا تو چلے کہ مجھ پر الزام کیا ہے۔“ میں نے ڈرے اور کمزور لہجے میں پوچھا۔

”آپ ڈاکٹر قادر بخش ہیں ناں اور ایک ہیلتھ سینٹر میں بطور ڈسپنسر کام بھی کرتے ہیں۔ آپ کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں اور یہ سب اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے ہیں یا کر رہے ہیں اور آپ نے اپنے ہیلتھ سینٹر سے ادویات چوری کر کے اتنا مال بنالیا ہے کہ آپ کے اس وقت چار پانچ مکان ذاتی ہیں اور خالی پلاٹ الگ سے ہیں اگر آپ چاہیں تو اس کی تفصیل بھی آپ کو مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے حکومت نے ایک نیا ادارہ بنایا ہے جو ایسے کرپٹ افراد کے خلاف کام کرنے کے علاوہ انہیں سخت سزائیں دینے کا مجاز بھی ہے۔“

اس نے کچھ اس انداز سے یہ سب کچھ مجھے بتایا گویا وہ میرے ہی خاندان کا کوئی فرد ہو۔ اس کی یہ تفصیل سن کر میں اور بھی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میرا بدن پسینے سے بھیگ چکا تھا۔

”تو مجھے اب کیا کرنا ہوگا۔“ میں نے داور کی طرف دیکھا تو اتنی دیر تک وہ اس کے لیے ٹھنڈا منگوا چکا تھا۔

”جی نہیں مجھے پانی نہیں پینا۔ مجھے تو یہ آرڈر ہے کہ میں ابھی اور اسی وقت آپ کو ساتھ لے جاؤں مگر آپ مجھے شریف اور دیانت دار آدمی لگے ہیں اس لیے میں نہیں چاہتا کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہو اس لیے آپ اپنی جائداد کے تمام ثبوت اور آمدنی سے متعلق شہادتیں لے کر دو ایک روز تک دفتر آجائیں۔“ حفیظ نے بوتل پیتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ نے آنے میں پس و پیش سے کام لیا تو تیسرے روز میں پولیس کے ہمراہ آپ کو گرفتار کر کے لے جاؤں گا۔“

یہ میرے لیے ایک نئی افتاد تھی۔ حفیظ تو اٹھ کر جا چکا تھا لیکن میں اس قدر خوفزدہ ہو گیا تھا کہ بے ہوش ہونے کے قریب تھا۔ میں سوچ رہا تھا آخر وہ میرا کون سا دشمن ہے جس نے محکمہ کو یہ تمام تفاصیل دی ہیں اور میری جائداد کے ساتھ ساتھ میری کلینک کی تمام آمدنی کا حساب کتاب محکمہ کو پہنچایا ہے۔

حفیظ نے بتایا تھا کہ انہوں نے یہ تمام تفاصیل بڑے دنوں تک اِدھر اُدھر سے اکٹھی کی ہیں اور یہ کہ وہ بڑی دیر سے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں تاکہ پتا چلا سکیں کہ میرا رابطہ ملک دشمن اداروں یا اشخاص سے تو نہیں ہے۔

داور بھی پریشان تھا۔

”آپ سلیم انکل سے بات کریں۔“ داور نے ایک راہ دکھائی۔

سلیم کا پورا خاندان اپنی بیماری کے سلسلے میں ہمیشہ سے میرے پاس آتا رہا تھا۔ وہ خود وکالت کے پیشے سے منسلک تھا اور ایک بہترین وکیل کے طور پر جانا جاتا تھا۔ میں نے اسی وقت اس کے فون پر بات کی تو اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے جب آپ نے کسی ناجائز طریقے یا کمائی سے دولت نہیں بنائی تو آپ کیوں ڈرتے ہیں۔ بس آپ یوں کریں اپنی تمام جائداد کے اصل کاغذات اور باہر سے آنے والی رقوم کے ڈرافٹوں کی فوٹو کاپیاں ساتھ لے لیں ہوسکے تو اس کی بینک اسٹیٹمنٹ بھی نکلوا لیں ان کی ایک فائل بنالیں اور ان کے دفتر چلے جائیں۔“

’’مگر یار مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں کبھی ایسے جھنجٹ میں نہیں پڑا۔‘‘ میں نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔

سلیم بولا۔ ’’آپ یہ کاغذات تو تیار رکھیں میں آپ کے ساتھ خود ایف آئی اے کے دفتر چلوں گا۔ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘

اس رات مجھے نیند نہ آئی۔ ساری رات میں سوچتا رہا کہ نہ جانے وہ کون سا میرا دشمن ہے جس نے یہ وار کیا ہے۔

تمام رات یہی سوچتا رہا پھر نیند آگئی۔ اگلی صبح کسلمندی سے اٹھا اور سینٹر میں آگیا۔ مشتاق جب آیا تو آتے ہی میرے چہرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیا اور بولا۔

’’کیا بات ہے قادر بھائی چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘ میں نے چھپانے کی کوشش کی۔

’’یوں بات نہیں بنے گی۔ بھائی کہتے اور سمجھتے بھی ہو۔ بات بھی چھپا رہے ہو۔‘‘ مشتاق نے اسی لہجے میں پوچھا۔

میں نے ساری بات اس کو بتا دی۔

’’کون ہو سکتا ہے وہ شخص...... لگتا ہے کوئی بڑا گہرا دشمن ہے تمہارا۔ اصل میں بھائی قادر بخش ہمارا معاشرہ ذلالت کی اس گہرائی تک پہنچ چکا ہے جہاں سے واپسی بہت مشکل ہے یہ ہمیشہ شریف آدمی کو بزدل جانتا ہے اور کسی کھاتے پیتے آدمی کو تو لوگ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ وہ دوسرے کو اذیت میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ بھوکے ننگے کو کچھ دے تو سکتے نہیں لیکن اپنے سے بڑی حیثیت کے مالک کو بھی جینے کا حق نہیں دیتے۔ تم کیوں گھبراتے ہو۔ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ، میں نے تمہیں بھائی کہا ہے اور بھائی اپنے دوسرے بھائی کو مشکلوں میں چھوڑ کر بھاگتے نہیں۔ میں چوہدری الیاس سے بات کرتا ہوں۔‘‘

مشتاق کی باتوں سے مجھے کافی حوصلہ ملا تھا۔ میں نے اپنی تمام جائداد کے کاغذات کی نقول بنوائیں۔ اپنے نام باہر سے آنے والی رقوم کی بینک سے اسٹیٹمنٹ حاصل کی اور ان ڈرافٹس کی کاپیاں بھی کروالیں جو میرے نام رضوانہ کے والد نے بھجوائے تھے۔

اور پھر تیسرے دن ان سب کے ساتھ ایڈووکیٹ سلیم کے ہمراہ ایف آئی اے کے دفتر جا پہنچا۔ جانے سے پہلے طے شدہ پروگرام کے تحت چوہدری الیاس کو بھی ٹیلی فون کر دیا جس نے اسی وقت ایف آئی اے کے اعلیٰ افسر سے بات کرلی اور میرے وہیں بیٹھے اس اعلیٰ افسر نے اپنے اس ماتحت کو تلقین کر دی تھی کہ آنے والے شخص کے ساتھ اچھا رویہ اختیار کیا جائے۔

’’ہوں! تو آپ ڈاکٹر قادر بخش ہیں؟‘‘ اس نے سوال کیا۔

’’جی۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’کیا ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں یا......!‘‘

’’جی نہیں، ڈسپنسر ہوں اور یہ میرے پاس اس کا ڈپلوما بھی ہے۔‘‘ میں نے اپنا ڈپلوما اسے دکھایا۔

’’تمہیں علم ہے کہ یہ تمہارے اپنے محکمہ کے اصول و ضوابط کی خلاف ورزی ہے۔‘‘ اس نے اگلا سوال کیا۔

’’جانتا ہوں مگر چلن تو برسوں سے چلا آرہا ہے۔ اب تو ایم بی بی ایس ڈاکٹر بھی پرائیویٹ پریکٹس کرتے ہیں۔‘‘ میں نے آہستگی سے کہا۔

’’وہ تو ٹھیک ہے۔ ایک ڈسپنسر کی حیثیت سے تم نے اتنی بڑی جائداد کیسے بنالی اور اپنے کلینک میں ہیلتھ سینٹر کی ادویات چرا کر مریضوں کو دیتے ہو۔‘‘ اس کا براہ راست مجھ پر حملہ تھا۔

’’نہیں سر، محکمہ صحت نے دو ایک بار میرے کلینک پر چھاپے مارے ہیں مگر انہوں نے ہر بار مجھے بے قصور ہونے پر باعزت طریقے سے چھوڑ دیا تھا۔ یہ اس کا ثبوت ہے۔‘‘ میں نے فائل سے اپنے کاغذات میں سے محکمہ صحت کا دیا ہوا ثبوت دکھایا۔

’’یہ تو ٹھیک ہے مگر ایک ڈسپنسر اتنی جائداد کیونکر بنا سکتا ہے کچھ اور بھی کرتے ہو۔‘‘ افسر نے ذرا ترشی سے پوچھا۔

’’سر میرا ایک بھائی باہر کے ملک میں رہتا ہے جو وقتاً فوقتاً مجھے بڑی بڑی رقوم کے ڈرافٹ بھجواتا رہتا ہے پھر میں جائداد کی خرید و فروخت بھی کرتا ہوں۔ یہ سارے ثبوت اس فائل میں موجود ہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے قادر بخش یہ فائل اور اس سے متعلقہ کاغذات میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ میں ان کی چھان بین کر کے تمہیں اس کی اطلاع دے دوں گا۔ یاد رکھو اگر کہیں بھی تم غلط ہوئے تو اس کا خمیازہ تمہیں سزا کی صورت میں بھگتنا ہوگا۔‘‘ اس نے فائلیں اپنے پاس رکھتے ہوئے کہا اور ہمیں گھر جانے کی اجازت دے دی۔

اس اعصاب شل کر دینے کے عمل میں میرا پورا دن

ضائع ہو گیا تھا مگر پھر بھی مجھے تسلی ہو چکی تھی کہ میں کہیں غلط نہیں ہوں۔

رات گھر لوٹا تو داور ابھی تک ادھر ہی تھا۔ میں نے ساری تفصیل اسے بتائی تو وہ بولا۔ ’’ابا جان! میں اسی دن سے سوچ رہا ہوں کہ آخر ہمارا کون دشمن ہے جس نے ہمیں اس مشکل میں پھنسایا ہے۔ سوچ سوچ کر میری سوئی ڈرائیور امجد پر اٹک گئی ہے۔ ایک وہی ہمارا دشمن ہو سکتا ہے۔‘‘

’’مگر اسے اس قدر تفصیل کے ساتھ کس نے بتایا ہوگا۔‘‘ میں نے خود سے سوال کیا۔

’’یہ تو ہے۔ ہو سکتا ہے جب تک وہ ہمارے ہاں ملازم رہا۔ یہ تفصیل اکٹھی کرتا رہا ہو۔‘‘ داور نے خیال ظاہر کیا۔

’’نہیں داور، میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ اس میں ضرور کوئی ایسا شخص شامل ہے جو ہمارے گھر کا بھیدی ہے۔‘‘ میں نے جواب دیا تو وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

’’یہ تو ہے۔‘‘ وہ آہستگی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ’’بہرحال گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ بہتر فیصلے کرنے والا ہے چونکہ ہم کسی جگہ بھی غلط نہیں ہیں لہٰذا ہمیں اپنے یہ معاملات اسی پر چھوڑ دینا چاہیے۔‘‘ میں نے اسے تسلی دی تو وہ اپنے گھر چلا گیا۔

میں پورے دو ڈھائی ماہ اذیت کی اس سولی پر لٹکا رہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ اس اثنا میں دو تین بار مجھے کیس کے سلسلے میں انہوں نے اپنے دفتر بھی بلایا لیکن بالآخر فیصلہ میرے حق میں ہو گیا اور مجھے باعزت بری کر دیا گیا کیونکہ میرے پاس رقوم کی بیرونِ ملک سے آمد کے تمام ثبوت موجود تھے۔

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب میں ایف آئی اے سے سرخرو ہو کر بیٹھا تھا کہ ایک روز داور پھر منہ لٹکائے میرے سامنے بیٹھا تھا۔ ’’ابا جان! جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کیس سے باعزت بری کر دیا ہے تو آپ اس طرح کیوں نہیں کرتے کہ اپنی جائداد اپنے بچوں میں تقسیم کر دیں اور ان کی رجسٹریاں فرداً فرداً ان کے نام کروا دیں۔ ویسے ہمارے لیے وہی مکان کافی ہے۔‘‘

میں کتنی دیر اس کے چہرے کو دیکھتا رہا جس پر خجالت تھی۔ ندامت تھی مگر اس کے باوجود اس نے اتنا کہنے کی بالآخر جرأت کر ہی ڈالی تھی۔

’’یہ سب تمہاری بیگم رضوانہ نے تمہیں پڑھایا ہوگا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’لیکن اس میں حرج بھی کیا ہے۔‘‘ اس نے دریافت کیا۔

’’دیکھو داور آج تک تمہاری بیوی نے جو تمنا کی وہ میں نے اس لیے پوری کی کہ میں اسے اپنی بیٹی سمجھتا تھا۔ اس کے لیے مجھے پورے گھر کی مخالفت بھی برداشت کرنا پڑی مگر میں تمہاری یہ خواہش ابھی پوری نہیں کر سکتا کیونکہ ابھی میں ترقی کی اس منزل تک نہیں پہنچ پایا ہوں جس کی خواہش میرے دل میں ہے۔ لہٰذا اسے کہہ دو کہ وہ ابھی انتظار کرے یا تو میں مر جاؤں یا پھر میری خواہش مکمل ہو جائے۔‘‘ میں نے بڑی نرمی سے اسے سمجھایا۔

بس رضوانہ اسی روز سے میری مخالفت پر اتر آئی تھی۔ وہ ہر ایک سے کہتی تھی کہ چچا جان کے پاس کیا تھا جب وہ یہاں بیاہ کر آئی تھی، یہ سب میرے والد کی دولت یہاں چمک رہی ہے۔ ان کے دیے پر یہ عیش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد میرے شوہر کی کمائی ہے باقی سارے کیا کرتے ہیں۔ نکمے میرے شوہر اور والد کی کمائی پر گل چھرے اڑاتے ہیں۔

عائشہ نے یہ باتیں کئی بار میرے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی تھی اور میں نہ جانے کیوں خاموش رہتا تھا۔ درگزر کرتا رہا اور مجھے اب اس کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ خاموشی اور شرافت بزدلی کا دوسرا نام ہے۔

اس طرح ایک بار پھر داور میرے سامنے مجرموں کی طرح بیٹھا یہ مطالبہ کر رہا تھا۔

’’ابا جان جتنے پیسے ہمیں آپ ماہانہ خرچ کے لیے دیتے ہیں ان میں ہمارا گزارہ نہیں ہوتا۔ میں جو کماتا ہوں وہ آپ کو روزانہ دے دیتا ہوں۔‘‘ احساس شرمندگی سے بوجھل الفاظ میں وہ کہہ رہا تھا۔

’’تو بیٹے میرے پیسوں سے ڈرائیور اور ماسی کو عیش کرانے کا کس نے کہا ہے، دیکھو داور میں نے آج تک تمہیں نہیں کہا کہ تم کس قدر اور کہاں پیسے خرچ کرتے ہو لیکن یہ بات بھی نہیں کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ ماسی روزانہ پوری ہنڈیا اور فروٹ لے کر جاتی ہے تم نے کبھی دیکھا۔ جب وہ یہاں پر آئی تھی تو اس کی کیا حالت تھی اور آج اس کی صحت اور اس کے طور اطوار کیا ظاہر کرتے

ہیں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "کبھی غور کیا کہ امجد کے حالات یہاں آنے سے پہلے کس قدر خستہ تھے اور جب میں نے اسے کام سے نکالا تو اس کی کیا حالت تھی۔ تم نے خود اسے پیٹرول چوری کرتے اور گاڑی کی مرمت میں گھپلے کرتے پکڑا تھا۔ اس طرح ہر ایک پر نوازشات کی بارش برساؤ گے تو خرچا کہاں سے پورا ہوگا۔ تم نے کبھی اپنی بیوی کو روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے ہر کام میں اس کی حمایت کی اور میں نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ خرچے کی بات نہیں۔ بات غلط اقدامات کو روکنے کی ہے۔"

"ابا جان۔ میں آپ کے علم میں لائے بغیر اسے روکتا رہتا ہوں مگر یہ سب اس کی فطرت میں شامل ہو چکا ہے۔ اس کی عادت بن چکی ہے۔" داور نے آہستگی سے جواب دیا۔

"اور ایک بات، شاید تمہیں یہ جان کر دکھ ہو کہ مجھے باوثوق ذرائع سے پتا چلا ہے کہ ایف آئی اے میں ہمارے بارے میں جو درخواست دی گئی تھی وہ امجد ڈرائیور نے تمہاری بیوی کی حمایت میں دی تھی لیکن میں آج تک خاموش رہا۔ ہماری جائداد ہماری دولت سے کسی کو کیا غرض ہوسکتی ہے۔ میں نے راتوں کو جاگ جاگ کر محنت کی ہے۔ کبھی بھی محنت سے جی نہیں چرایا، اگر یہ سب میری محنت کے صلے میں رب نے مجھے دیا ہے تو یہ سب تم لوگوں کا ہی ہے اگر اسے سوچ سمجھ کر خرچ کرو گے تو اس میں اضافہ ہوگا۔ لٹاؤ گے تو جلد ختم ہو جائے گا۔"

وہ سر جھکائے میری باتوں کو غور سے سن رہا تھا، میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "دیکھو داور! اب وہ تمام ملنے جلنے اور رشتہ داروں میں کہتی پھرتی ہے کہ میرے اس حملے میں تو چچا جان بچ گئے ہیں میں دیکھوں گی وہ کب تک بچتے ہیں۔ دولت میرے باپ اور میرے شوہر کی ہو اور عیش یہ کریں مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔"

☆......☆

داور کی یہ ہمیشہ سے عادت رہی تھی کہ رات گیارہ بارہ بجے جب بھی کلینک بند کرتا تو اوپر آواز دے دیتا کہ وہ گھر جا رہا ہے لہٰذا نیچے آکر دروازہ بند کرلیں۔ جب وہ آواز دیتا تو کوئی نہ کوئی نیچے جا کر کلینک کا دروازہ بند کر لیتا اور داور اپنی موٹر سائیکل پر گھر چلا جاتا۔ اس بار گرمیاں بھی اپنے پورے عروج پر تھیں لیکن شہروں یا ان کے قریب بسنے والے لوگ تھوڑی زمین پر بھی منزلیں بنا لیتے ہیں تاکہ مجبوراً یا عادتاً ایک ہی گھر میں سب کا گزارہ ممکن ہو جائے۔

میں نے لب سڑک ایک مکان کا سودا کر کے اس کی ادائگی کر دی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ اس جگہ اپنا پرائیویٹ اسپتال بناؤں گا۔ ابھی میں اس کام سے فارغ ہی ہوا تھا کہ چھوٹے بیٹے شناور کا شہر جاتے ہوئے موٹر سائیکل کا حادثہ ہو گیا اور دو تین جگہ سے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی کچھ روز مقامی اسپتال میں رہنے کے بعد اس کی ٹانگ پر پلستر چڑھا کر اسے فارغ کر دیا گیا تو ہم لوگ اسے گھر لے آئے اور اوپر بڑے کمرے کے آگے والے چھوٹے کمرے میں اسے لٹا دیا۔ اس کے بچے ان دنوں ننھیال گئے ہوئے تھے۔ ہم لوگ بڑے کمرے میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ میری منجھلی بیٹی نے آواز لگائی۔ "اف وقت کا تو پتا ہی نہیں چلتا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں میں تو سونے کے لیے چھت پر چلی۔"

"تمہیں کس نے کہا ہے کہ فضول جاگتی رہو۔ جاؤ سو جاؤ۔" بڑی بیٹی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

ہم ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ نیچے سے داور کی آواز آئی۔ "ابی جان میں گھر جا رہا ہوں نیچے آکر دروازہ لگالو۔"

ہم دروازہ بند ہونے کی آواز کے منتظر تھے کہ نیچے سے کئی آدمیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے سمجھا شاید مریض آگئے ہیں کیونکہ اس کے بعد داور کی یا کلینک کا دروازہ بند ہونے کی آواز نہیں آئی تھی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک لحیم شحیم سا بندہ دھڑا دھڑ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آگیا۔

"اوہ بھائی کون ہو تم اور یہ تم منہ اٹھائے اوپر کیوں آگئے ہو، کیا نیچے ڈاکٹر نہیں ہے۔" میں نے ایک ہی سانس میں کہا۔

"بتاتا ہوں۔" اس کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی دو اور آدمی جو قد کاٹھ میں اسی کی طرح کے تھے، اوپر آگئے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے اور ایک نے داور کو قابو کیا ہوا تھا۔ اس کے سر سے پستول کی نالی لگی تھی۔ دوسرے نے فوراً اپنا پستول ہماری طرف کرتے ہوئے بڑے سفاکانہ طریقے سے کہا۔ "خبردار اگر کسی نے چیخنے کی کوشش کی۔ ایک جگہ صوفے پر اکٹھے ہو کر بیٹھ جاؤ۔"

ہمیں صوفے پر بٹھا کر پہلے والا شخص اوپر چھت پر چلا گیا اور وہاں سے منجھلی بیٹی کے ساتھ دوسرے بچوں کو بھی اٹھا لایا۔ اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا جس کی زد میں وہ بچوں

کو نیچے اتار لایا تھا۔

"اماں جی، جو کچھ گھر میں ہے۔ وہ لے آؤ۔ تمام زیور اور نقدی اس جگہ لا کر ڈھیر کر دو۔ چھپانے کی کوشش نہ کرنا ہمیں ساری چیزوں کا علم ہے کہ وہ کہاں کہاں رکھی ہیں۔"

اب وہ تینوں ہمارے اردگرد کھڑے تھے اور ان کے پستولوں کی نالیاں ہماری طرف تھیں۔ میرا پورا خاندان یرغمال بنا ہوا ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔

میری بیگم نے اٹھنے میں ذرا کوتاہی کی تو ان میں سے ایک نے داور کے گال پر زور سے تھپڑ رسید کر دیا۔ دوسرے نے پاؤں سے ٹھوکریں مارنا شروع کیں تو داور کی ... بہنیں رونے لگیں اور ان کی منتیں کرنے لگیں۔ میں نے کہا "ٹھہرو میں نکال کر دیتا ہوں۔"

"نہیں بابا جی آپ نہیں ہلیں گے۔ اماں جی جلدی کریں اور تمام زیور نکال دیں۔" میری بیوی عائشہ بڑے حوصلے سے اٹھی اور جہاں جہاں زیور، نقدی رکھی تھی وہاں سے نکال کر ان کے بچھائے ہوئے رومال پر ڈھیر کرنے لگی۔

پہلا شخص جو سیڑھیاں چڑھا تھا وہ آرام کے ساتھ میرے ایک طرف بیٹھ گیا اور مجھ سے بڑے دوستانہ انداز میں باتیں کرنے لگا۔ دوسرے دونوں ادھر ادھر سے چیزوں کو الٹنے پلٹنے لگے۔

"میں تو جی ان کا ساتھی نہیں ہوں مجھے یہ پکڑ کر لائے ہیں۔" وہ بولا۔ "ہم کوئی ایسے ویسے لوگ نہیں ہیں ہم نے صرف آپ سے زیور اور نقدی چھیننی ہے۔ آپ کی بیٹیاں ہماری بہنوں کی طرح ہیں۔ انہیں چپ کرائیں ورنہ ان کے شور سے کچھ بھی ہوسکتا ہے جو ہم آپ کے ساتھ کرنا نہیں چاہتے۔" ان میں سے ایک نے دھمکی دی تو میری بیٹیاں خاموش ہوگئیں۔

"بابا جی ہمیں اچھی طرح شناخت کرلیں۔ کل کو ہمیں آپ کو شناخت پریڈ میں پہچاننا پڑا تو آسانی ہوگی۔" میں نے گہری نظر سے ایک ڈاکو کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

"مجھے کیا ضرورت ہے۔" میں نے ڈرے لہجے میں کہا۔

"دیکھو بزرگو! کل آپ نے پولیس میں رپورٹ درج کروانی ہے اس کی ہمیں فکر نہیں مگر پھر اس کا خمیازہ بھی بھگتنے کو تیار رہنا۔ آپ کی بچیاں کالج یونیورسٹی جاتی ہیں۔ ان کی حفاظت کی گارنٹی پھر کسی کے پاس نہ ہوگی۔" وہی بولا۔

ان میں سے ایک نے شاید پشتو یا کسی اور زبان میں کچھ کہا تو وہی اسے جواب دے کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "بابا جی! اگر تمہارے کسی لڑکے کے کپڑے ہوں تو اسے دے دو۔ نیچے دھکم دھکا میں اس کے کپڑے پھٹ گئے ہیں۔"

میری بیوی نے فوراً چھوٹے بیٹے کا نیا سوٹ اسے دے دیا۔ اس نے کپڑے پہننے کے لیے قمیص اتاری تو اس نے فوراً اسے ڈانٹ دیا۔ "بے غیرت! بے شرم بہنوں کے سامنے کپڑے بدلتے ہو۔ دفع ہو جاؤ۔ باہر جا کر کپڑے بدلو۔"

وہ شرمندہ سا ہو کر باہر نکل گیا۔

سارے زیورات اور نقدی میز پر بچھے کپڑے پر رکھ دی تو وہی ڈاکو جو شاید ان کا سردار تھا، بولا۔ "بابا جی! بس

ہم جیسے عام انسانوں اور سوچنے والوں کے درمیان یہی فرق ہے کہ وہ اپنی غلطیوں اور خطاؤں سے بھی کوئی نہ کوئی مفید پہلو نکال ہی لیتے ہیں کہ اس تخریب میں مضمر ہے ایک تعمیر کی صورت۔

اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہم تعمیر میں تخریب کے بہانے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ایسی ہی صورتحال پلاسٹک کی ایجاد کے ساتھ ہوئی تھی۔

چارلس گڈائر ربر کی کوئی اور قسم بنانے کے لیے تجربے کر رہا تھا۔

اس نے ربڑ اور سلفر کیملغوبے کو ایک برتن میں رکھ کر اسٹو پر رکھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسٹو بجھا ہوا تھا۔ اس میں آگ نہیں ہے۔ پھر وہ کسی کام سے باہر چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے چولہا تو بند ہی نہیں کیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا گھر آیا۔ چولہے کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سلفر اور چونے کے اشتراک سے کوئی اور چیز بن گئی تھی۔ اور یہی پلاسٹک تھی۔ اس کے بعد اس نے مزید تجربات کیے۔ اور لوگوں نے بھی اس فیلڈ میں کام کیا۔ اور آج کی پلاسٹک آپ کے سامنے ہے۔

یعنی ایک غلطی ایسی ہی ہوتی ہے جو مفید ثابت ہو جاتی ہے۔

مرسلہ: اعجاز فرحت، سکھر

یہی کچھ تھا۔ ہمیں تو ایک ڈیڑھ کروڑ کا ہدف دیا گیا تھا اور تم نے معمولی سی رقم ہمارے آگے رکھ دی ہے۔ باقی کدھر ہے اور اماں جی وہ جو سیف ہے الماری کے خفیہ خانے میں اس میں رکھا زیور نکال دیا؟'' اس نے میری بیوی سے پوچھا۔

میں آج صبح ہی ایک مکان کی ادائیگی کر کے آیا تھا۔ باقی رقم ادھر ختم ہو گئی تھی۔ میں جواب دیتے ہوئے بھی سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کون شخص ہے جو ہمارے گھر کے کونے کونے سے واقف ہے اور اسے یہ بھی علم ہے کہ ہم نے گھر کے زیورات کہاں رکھے ہیں۔ نقد رقوم کدھر پڑی ہے اور ایک ڈیڑھ کروڑ کا ہدف کس نے دیا ہے۔

''اماں جی جلدی کرو، بچیوں کے کانوں اور گلے میں پڑے زیورات پہنی ہوئی انگوٹھیاں بھی اتروا دو ورنہ ہم میں سے کسی کو ہاتھ لگانا ہوں گے۔''

عائشہ نے جلدی سے نہ صرف بچیوں بلکہ اپنے پہنے ہوئے تمام زیورات بھی اتروا کر ان کے حوالے کر دیے۔ جب سب کچھ اکٹھا ہو گیا تو اس شخص نے جس کو داور پر تعینات رکھا تھا اس نے پستول کی نال کو داور کے سر پر زور سے دبا کر بولا۔ ''ہمارے ساتھ اپنے دوسرے گھر چلو وہاں سے بھی اپنی بیوی کے زیورات اور نقدی دو۔'' یہ کہہ کر وہ تینوں ہمیں کمرے میں بند کر کے چلے گئے جس کمرے میں شناور پڑا تھا اسے بند کرنا شاید بھول گئے تھے یا انہیں یقین تھا کہ ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ یہ اٹھ کر کیسے دروازہ کھول پائے گا۔

''بیٹا ایک بات کہوں کم از کم ایک موبائل تو چھوڑ جاؤ۔ ہم باہر کیسے نکلیں گے۔''

''ماں جی! ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ یہ موبائل کی سمیں دروازے کے باہر پڑی ملیں گی صبح باہر نکلو گے تو اٹھا لینا۔'' یہ کہہ کر وہ داور کو ساتھ لے کر چلے گئے۔

انہیں گئے جب کافی دیر ہو گئی تو سب نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا اور اونچی اونچی آوازیں دینا شروع کر دیں۔ شناور کو بھی حالات کا علم تھا۔ چنانچہ اس نے خود کو گھسیٹ کر باہر لانے کی کوشش کرنا شروع کر دی تا کہ کسی طرح ہمارے کمرے کا دروازہ کھول کر ہمیں باہر نکالے۔

بالآخر وہ کامیاب ہو گیا۔ چارپائی سے نیچے اترا اور اپنے وجود کو گھسیٹتا ہوا باہر لایا۔ بڑی مشکلوں سے ہمارے کمرے کا دروازہ کھولا اور ہمیں باہر نکالا۔

میں نے جلدی سے موٹر سائیکل نکالی اور داور کے گھر کی طرف دوڑا۔ اس کے مکان کا دروازہ اسی طرح بند تھا۔

میں نے پڑوسیوں کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس وقت رات کا تقریباً ایک یا ڈیڑھ بجا تھا۔ وہ باہر آئے تو میں نے انہیں حالات سے باخبر کیا۔ داور کے گھر میں دوسرے گھر سے ہو کر اندر داخل ہوا۔ سیڑھیوں سے نیچے اترا تو دیکھا ان دونوں میاں بیوی اور بچوں کو ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگائی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے انہیں باہر نکالا۔ وہ بے حد پریشان اور خوفزدہ تھے۔

داور کا چہرہ تشدد کی وجہ سے کافی سوجا ہوا تھا مگر وہ بدحواس ہوتے ہوئے بھی حوصلے میں تھا۔ میں نے اس سے جب پوچھا کہ یہ سب کس طرح ہوا تو اس نے بتایا۔ ''میں نے جب کلینک بند کرنے کے لیے آپ کو آواز دی اور خود موٹر سائیکل نکالنے لگا تو یہ دو آدمی تیسرے کو پکڑے ہوئے کلینک میں آئے۔ اس وقت کلینک سے سارے مریض جا چکے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی بڑے پریشان لہجے میں بولا۔ ''ڈاکٹر صاحب ہمارے دوست کے پیٹ میں بڑا درد ہے اور اسے الٹیاں بھی ہو رہی ہیں۔ مہربانی فرما کر اسے گلوکوز کی بوتل لگا دیں۔''

میں نے کہا کہ میں دوائی دے دیتا ہوں آرام آ جائے گا مگر یہ بضد رہے کہ اسے اس سے افاقہ نہیں ہوگا۔ مہربانی کر کے آپ بوتل لگا دیں...... میں بوتل نکال کر اسے لگا رہا تھا کہ ان میں سے ایک نے پستول نکال لیا اور دوسرے نے مجھے پیٹنا شروع کر دیا اور پیٹتے ہوئے مجھے لے کر اوپر آ گئے اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ ادھر سے لوٹ مار کر کے وہ مجھے موٹر سائیکل پر دونوں کے درمیان بٹھا کر ادھر لے آئے اور کہنے لگے دروازہ کھلواؤ۔ میں نے کال بیل دی تو رضوانہ نے میری آواز سن کر دروازہ کھول دیا۔ وہ تینوں میرے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ میں نے جلدی سے کہا رضوانہ جو زیور اور نقدی ہے ان کے حوالے کر دو زیادہ پس و پیش نہ کرنا۔ ان کے پاس اسلحہ ہے اور انہوں نے جو میرا حشر کیا ہے تمہارے سامنے ہے۔ رضوانہ میری حالت دیکھ کر گھبرا گئی اور اس نے موبائل، نقدی اور زیورات ان کے حوالے کر دیے۔ وہ میرے بچوں کی طرف بڑھے تو رضوانہ نے انہیں رب رسول کا واسطہ دیا کہ بچوں کو نہ جگایا جائے ورنہ ان کے خوف زدہ ہو کر چیخنے سے ان کا معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ سب کچھ لوٹنے کے بعد انہوں نے ہمیں کمرے میں بند کر دیا اور خود چلے گئے۔''

''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ساری رات پولیس موبائل

یہاں گشت کرتی ہے پھر بھی ایسے لوگوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔'' شناور نے کہا۔

''جب وہ لوگ مجھے موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے گئے اس وقت پولیس کی موبائل ہم سے کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر بھی نظر انداز کر دیا۔'' داور نے جواب دیا۔

اگلی صبح میں نے مشتاق کو ٹیلی فون پر بتایا اور سینٹر سے چھٹی کر لی۔ تمام دن ہم سب اسی دہشت میں رہے۔ کتنے دنوں تک ہمارے ذہن سے یہ خوف نہ نکل سکا پھر چوہدری الیاس کے کہنے پر میں اپنے دو ایک اور دوستوں کو لے کر پولیس اسٹیشن گیا اور ایف آئی آر کٹوانے کے لیے ایس ایچ او کو کہا تو وہ روایتی انداز میں مجھے ٹالنے لگا۔ اسی اثناء میں چوہدری الیاس کا فون آیا تو وہ ایف آئی آر کاٹنے پر تیار ہوا۔

پھر وہی ہوا۔ وہ ایک بار وہ کلینک پر آئے اور چائے پانی لے کر چلے گئے۔ دن بیتتے گئے اور چوری بلکہ ڈاکے کا معاملہ کھٹائی میں پڑتا چلا گیا پھر ہماری عدم دلچسپی نے یہ معاملہ ہی ختم کر دیا۔

ماسی نور اس دوران کام کاج کے لیے داور کے ہاں مسلسل آتی رہی بلکہ جب اس کو ہمارے ہاں ڈاکے کی اطلاع ملی تو سب سے زیادہ دکھ اسی کو ہوا تھا جس کا اظہار اس نے نہ صرف رضوانہ سے کیا بلکہ خصوصی طور پر میرے پاس بھی افسوس کے لیے آئی تھی۔

''بس ماسی! یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے میری بچیوں کی عزت محفوظ رکھی ورنہ ان کا کیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ڈاکٹر صاحب یہ تو رب کا خاص کرم ہوا ورنہ لگتا ایسے ہے جیسے کسی نے خصوصی طور پر انہیں سب کچھ سمجھا کر بھیجا ہو۔ میں تو کہتی ہوں آپ کو پولیس میں بھی اس معاملے کے لیے نہیں جانا چاہیے یہ لوگ انتقام لینے میں بڑے تیز ہوتے ہیں۔ ان سے بچنا ہی چاہیے۔'' وہ مجھے سمجھانے کے موڈ میں تھی۔

''میں اسی لیے پولیس اسٹیشن نہیں گیا۔ حالانکہ لوگوں نے مجھے یہی مشورہ دیا تھا۔'' میں نے ماسی کی تسلی کر ڈالی پھر ڈاکے کا یہ معاملہ بھی تقریباً دب گیا۔

پھر ایک روز تھانے سے ایک آدمی آیا کہ چور ملزمان پکڑے ہیں۔ ان کی شناخت کے لیے آپ تھانے آئیں۔

میں تھانے گیا تو انسپکٹر نے مجھے بٹھا کر بتایا کہ تھانے کے معاملات کیسے چلتے ہیں۔ دراصل وہ مجھے باتوں کی آڑ میں یہ بتانا چاہتے تھے کہ ان کا ہاتھ گرم ہوگا تو معاملہ آگے چلے گا۔ تبھی میں نے سوچا کہ آیندہ میں ان کے بلانے پر بھی تھانے نہیں جاؤں گا۔

اس کے بعد بھی ایک دوبار مجھے بلایا گیا مگر میں نے جانے سے انکار کر دیا تو معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اب میں بالکل اسے بھول چکا تھا۔ وقت اس قدر تیزی سے آگے بڑھنے لگا کہ میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ کبھی میرے ساتھ یہ سانحہ گزرا تھا۔ ماسی کتنے عرصہ ہمارے ہاں ملازم رہی اور کب چھوڑ گئی مجھے اس کی بھی خبر نہ تھی۔ ایک روز باتوں باتوں میں داور نے ماسی نور کا کام چھوڑ کر جانے سے متعلق بتایا تھا مگر میں نے اس پر بھی دھیان نہ دیا پھر ایک عرصہ بعد تھانے سے ایک بار پھر ایک سپاہی کلینک پر آیا۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کو انسپکٹر صاحب نے بلایا ہے۔''

''کس معاملے میں۔'' میں نے پوچھا۔ ''اگر اس ڈاکے کے بارے میں ہے تو انہیں جا کر بتا دیں کہ اب ہمیں اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔''

''ڈاکٹر صاحب! وہ پہلے والے انسپکٹر بدل چکے ہیں۔ ان کی جگہ نئے انسپکٹر آئے ہیں۔ انہوں نے کل ہی ڈاکوؤں کا ایک گروہ پکڑا ہے جس نے آپ کے ڈاکے کا بھی اعتراف کیا ہے۔'' پولیس کے سپاہی نے جواب دیا۔

''یار میں نے کہا ناں کہ اب مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ بہر حال تم بضد ہو تو میں کل آ جاؤں گا۔''

''میں نے سپاہی کو رخصت کر دیا اور اگلے روز شام کے وقت تھانے چلا گیا۔ نیا انسپکٹر مجھے دیکھ کر اپنی کرسی سے اٹھ کر ملا۔ ''آئیے ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ کو یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، دکھ اس بات کا ہے کہ اتنا عرصہ ہوا آپ کے ہاں ڈاکا پڑا مگر اس کی درست سمت میں تفتیش نہ ہو سکی۔ دراصل اسے ہمارے محکمے کی تساہل پسندی سمجھ لیں یا بد دیانتی کہ ہر اس معاملے کو گنجلک بنا کر اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں جن کے مدعی آپ جیسے شریف لوگ ہوتے ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی یہی ہوا مجھ سے پہلے یہاں کا انچارج بھی ایک ایسا ہی راشی انسان تھا۔ کہتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہو رہی ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے اور اس سے آنکھیں نہیں چرائی جا سکتیں۔ بہر حال یہ تو ایسی باتیں ہیں جو چلتی رہیں گی جب تک ہمارا پورا معاشرہ نہیں سدھر جاتا۔'' پھر وہ رکا میرا جائزہ

لے کر بولا۔ ”آپ کو تکلیف دینے کی میں نے اس لیے جسارت کی کہ کچھ روز پہلے میں نے ڈاکوؤں کا ایک گروہ پکڑا ہے جو عورتوں کو بطور مہرہ استعمال کرتے ہیں۔ ان عورتوں کو وہ لوگ مختلف گھروں میں بحیثیت ماسی نوکر رکھواتے ہیں جن کے ذریعے ساری معلومات حاصل کرتے ہیں پھر ان گھروں میں ڈاکے ڈالتے ہیں۔ میں نے ایک ایسی ہی عورت کو گرفتار کیا ہے۔ اسے لیڈیز پولیس کی تحویل میں رکھا ہوا ہے۔ ابھی میں اسے آپ کے سامنے بلواتا ہوں۔ آپ اسے دیکھ لیں۔“ پھر اس نے موضوع بدل دیا۔ ”دراصل ڈاکٹر صاحب ہمارے محکمہ کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔ ہم لوگ بعض اوقات یا تو مجبوراً یا پھر عادتاً ایسے گروہوں کے ساتھ مل کر اور ان سے مک مکا کر کے خود بھی ایسے کام کرواتے ہیں اور لوٹ مار میں اپنا حصہ لے کر معاملات کو بگاڑ دیتے ہیں لیکن نہ جانے اللہ تعالیٰ نے کن کی دعاؤں کے صدقے مجھے ایسے کاموں سے بچا رکھا ہے۔ اس تھانے میں آیا تو پرانے کیسوں میں سے ایک دبی ہوئی ڈاکے کی درخواست آپ کی بھی تھی پھر میں نے اپنے طور پر اس کی تفتیش شروع کی کڑیوں سے کڑیاں ملائیں تو اس گروہ کا انکشاف ہوا۔ یوں یہ خطرناک گروہ پکڑا گیا۔ آپ عورت کو دیکھ لیں شاید ماسی کے روپ میں یہ بھی آپ کے گھر کام کرتی رہی ہو۔“

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں دو لیڈی کانسٹیبلز ایک لمبے قد کاٹھ کی عورت کو ساتھ لے کر آگئیں۔ اس عورت کا اپنے پاؤں پر چلنا دوبھر ہو رہا تھا اس کی حالت پولیس تشدد سے اس قدر مخدوش تھی کہ پہلی نظر میں اسے پہچاننا ممکن نہ تھا۔

”ہوں، دیکھیے اور اسے پہچانیے کبھی یہ عورت آپ کے گھر میں بھی ماسی بن کر کام کرتی رہی ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گیا۔ یہ ہمارے بلکہ داور کے گھر کام کرنے والی ماسی نور بانو تھی اس کی یہ حالت دیکھ کر میں خود شرمندہ ہو رہا تھا۔

”انسپکٹر صاحب یہ عورت تو ایسی نہیں ہو سکتی اس نے ایک عرصہ تک ہمارے گھر کام کیا ہے۔ نہایت مخلص، ایماندار اور پیار کرنے والی عورت ہے، ایسے گھناؤنے دھندے میں کیسے ملوث ہو سکتی ہے۔“ میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر ہنس کر بولا۔ ”دیکھ لیں صاحب۔ یہ ڈاکوؤں کی مشیر خاص تھی۔ اس کے ایماء پر ہی میں نے اس کے پورے گروہ کو پکڑا ہے۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور ہمارے [illegible] کے پیش رو بھی ان کی حفاظت کرتے تھے۔ پولیس موبائل [illegible] ان کی حفاظت کے لیے ان کے قریب ہوتی تھی۔ یہ بات [illegible] کر مجھے داور کی بات یاد آگئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ انسپکٹر [illegible] دوبارہ آواز آئی۔ ”آپ کی دعاؤں سے میں نے ان کے [illegible] صرف ہاتھ پاؤں کاٹ دیے ہیں بلکہ اپنے محکمے کی گندی مچھلیوں کو بھی کیفر کردار تک پہنچا دیا ہے۔“ مجھ سے باتیں کرتے کرتے اس نے اچانک اپنی گفتگو کا رخ بدلا۔ ”ہاں تو بی بی تم ان کے گھر کام کرتی رہی ہو۔“

ایک دو بار پوچھنے پر وہ آہستگی سے بولی۔ ”جی میں نور بانو کے نام سے ان کے ہاں ملازم ہوئی تھی اور تھوڑے ہی عرصہ میں میں نے ان کی بہو کو شیشے میں اتار لیا تھا اور اسی کی وجہ سے مجھے ان کی امارت، ان کے گھر اور ان کے افراد کی ملکیتی زیورات نقدی کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں کہ وہ کس کس جگہ رکھی جاتی ہیں۔ کن کن موقعوں پر کیا کیا پہنا جاتا ہے۔ میں نے سب اپنے ساتھیوں کو بتا دیا تھا۔ انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ اولاً ایک ڈیڑھ کروڑ کی اسامی ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب یہ ایسے گروہ کی سرگرم کارکن ہے جو مختلف ناموں سے آپ جیسے شریف لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہیں اور آپ لوگ مارے شرافت یا اپنی مصروفیت کی آڑ میں کسی تھانے میں ان کے بارے میں رپورٹ بھی نہیں دیتے پھر ایسے سانحات کا شکار ہو جاتے ہیں۔“ انسپکٹر نے بتایا۔

ماسی ایک بار پھر بولی۔ ”ڈاکٹر صاحب خدا کے لیے مجھے معاف کردیں۔“ اس کی اس آواز پر کانسٹیبلز اسے دھکیلتی ہوئی لے گئیں۔

”چل...... چل...... مائی......“ اور میں سوچتا رہ گیا کہ ہم سب تساہل پسندی میں کس طرح لٹیروں کا شکار ہو رہے ہیں بلکہ آپسی حسد کا شکار ہو کر خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لیتے ہیں۔ اس ڈاکے کی کامیابی میں رضوانہ کی حسد بھی شامل رہی تھی۔ وہ حسد کے عالم میں ہمارے گھر کی باتیں نور بانو کو بتاتی رہی تھی لیکن کیا کریں، اس کی فطرت میں یہ سب شامل ہے اس لیے اسے سمجھایا نہیں جا سکتا۔ اس واقعے کے بعد داور نے بیوی سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر تم نے اپنی فطرت نہیں بدلی تو میرے پاس آخری آپشن طلاق کا ہے۔

داور کی اس بات نے اسے ڈرا دیا ہے اس لیے اب وہ اپنی فطرت بدلنے کی کوشش کر رہی ہے۔

بنیاد

محترم مدیر سرگزشت
السلام علیکم
ایک طویل سرگزشت کو مختصر کرکے ارسال کررہا ہوں۔ اُمید ہے سرگزشت کے معیار پر پوری اترے گی۔

اعجاز احمد راحیل
(ساہیوال)



جیپ دھول اڑاتی کچے راستے پر آگے بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود بندہ مضبوط جسامت کا مالک تھا۔ اس کے برابر سفید لٹھے کے سوٹ میں ملبوس وڈیرا وریام جکھرانی براجمان تھا۔

وڈیرا وریام اپنی زندگی کی پچاس بہاریں دیکھ چکا تھا پھر بھی خود کو جوان سمجھتا تھا۔ شراب وشباب اس کی کمزوری تھی۔ ان کے بغیر وہ اک پل نہیں گزارتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ہمہ وقت ہاتھ میں جام اور پہلو میں پری وش ہو۔ جوانی

سے لے کر اب تک وہ دل ہی کی تو مانتا رہا تھا۔ بہت زیادہ کسی کی ماننا بھی اسے مغرور بنا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کا دل اپنی کرنے لگا، دھڑکنوں کی چال بگڑ گئی۔ مجبوراً اسے ہارٹ اسپیشلسٹ سے رجوع کرنا پڑا۔

اس وقت بھی وہ حیدر آباد کے معروف اسپتال سے دوا لے کر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر کے بقول اس کا دل کسی وقت بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ لہٰذا احتیاط ضروری ہے۔

اسپتال سے نکلنے کے بعد اس نے ڈرائیور سچل کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلا کر جیپ اسٹیشن سے دائیں جانب موڑ دی۔ ذرا آگے جا کر ایک جگہ روک کر نیچے اتر گیا۔ دس منٹ بعد جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کپڑے کا تھیلا تھا جس میں دو تین رنگین بوتلیں تھیں۔

سچل نے کپڑے کا تھیلا پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جیپ چل پڑی۔

ایک کہاوت ہے کہ "جیسا دیس ویسا بھیس" وڈیرے وریام کے ساتھ رہنے والے اس کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ جس طرح شیر کا جھوٹا کتے، گیدڑ کھاتے ہیں۔ اسی طرح وہ سب بھی اس کا جھوٹا کھاتے تھے۔ تاہم سچل ان سب سے الگ مزاج کا تھا۔

آدھا فاصلہ طے کرنے کے بعد وڈیرے وریام نے اس کی طرف دیکھا، گہری سانس خارج کی پھر بولا۔ "اڑے بابا سچل! کیا تو بھی ڈاکٹر کی باتوں میں آ گیا ہے؟"

"نن...... نہیں سائیں۔" سچل جس کا خیال کہیں اور تھا بوکھلا گیا۔

"تو پھر؟"

"اچھا سائیں۔" وہ اس کا اشارہ سمجھ گیا، اس نے تھیلے سے بوتل نکالی اور وڈیرے کی طرف بڑھا کر تیز موسیقی لگا دی۔ آخر سفر تمام ہو گیا۔ جیپ اب گوٹھ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ گندم کی فصل پک گئی تھی۔ ہر طرف سنہری کھیت لہلہا رہے تھے۔ یہ ساری زمینیں اس کی تھیں۔ وہ شیشے سے باہر دیکھنے لگا۔ سورج آخری شعاعیں بکھیر رہا تھا۔ جیپ آگے بڑھتی رہی۔ جب وہ گوٹھ میں داخل ہوئے تو سچل نے اچانک بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ وڈیرے وریام کو اچھا خاصا جھٹکا لگا لیکن جب اس کی نظر سامنے پڑی تو چونک گیا۔ اس کے چونکنے کی وجہ ایک لڑکی تھی جو کہ اچانک ہی جیپ کے آگے آ گئی تھی۔ اسی وجہ سے سچل کو بریک لگانا پڑی۔

وڈیرے کی نظریں کچی سڑک کے درمیان کھڑی حیرت زدہ لڑکی پر ٹک گئیں۔ عورت اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ وہ اپنے یار بیلیوں میں یہ بات بڑے فخر سے بتاتا تھا کہ عورت خود کو اتنا نہیں جانتی جتنا وہ عورت کے سرد گرم سے واقف ہے مگر وہ لڑکی پہلی نظر میں اس کے سارے دعوے غلط ثابت کر گئی۔ اس کا چہرہ سورج کی روشنی میں تانبے کی طرح چمک رہا تھا۔ سر دوپٹے سے بے نیاز ناک کی سیدھ میں نکلی مانگ، ست رنگا پراندہ بھی بل کھا کر سینے پر بائیں جانب عجب بہار دکھا رہا تھا۔ چونکہ گرمی کا موسم تھا۔ پسینے کی وجہ سے جسم کے ساتھ چپکا ململ کا لباس دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ جس کی کالی موٹی آنکھیں ڈر کی وجہ سے پھیل کے اور بھی بڑی لگ رہی تھیں۔ لمبی سیاہ پلکوں کی جھالریں اٹھیں تو اٹھی رہ گئیں۔ سچل نے نظر گھما کر بت بنی لڑکی کو دیکھا۔ اس کو آن واحد میں ایک انجانی فکر نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا اور جیپ آگے بڑھا دی۔ وہ جانتا تھا کہ اب وڈیرا اس لڑکی کے بارے میں پوچھے گا۔

"اڑے بابا گاڑی روکو۔" وڈیرے نے کہا۔

وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ سچل نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ جیپ رک گئی۔

"ہی چھوکری کیر آ؟" (یہ لڑکی کون ہے؟) وہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سچل سے مخاطب ہوا۔

"سائیں! یہ بابا غلام رسول کی بیٹی ہے۔"

وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس لمحے لڑکی جو کہ جیپ کے نیچے آتے آتے بچی تھی۔ اس کے اوسان بحال ہوئے، تب اسے اپنی حالت کا ادراک ہوا اور اس نے جلدی سے دوپٹا سر پر اوڑھ لیا۔ کھیتوں کی طرف چل دی۔ تاہم وہ بے خبر تھی کہ وڈیرے کی نگاہیں اس کے تعاقب میں ہیں۔ وہ سر جھکائے آگے بڑھتی رہی۔

وہ اسے گلی میں مڑنے تک دیکھتا رہا۔ پھر سچل کو جیپ آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔

"واہ جو چھوری سٹھی آ۔" (واہ خوبصورت لڑکی ہے)

وڈیرے وریام جکھرانی نے حسب عادت مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ ذرا توقف کے بعد بولا۔ "کل شام تک یہ چھوکری ہماری حویلی میں ہونی چاہیے۔"

اس کی آنکھوں میں ہوس اور ہونٹوں پر خبیثانہ مسکراہٹ تھی۔

سچل آنے والے وقت کے بارے میں منصوبہ بنانے لگا۔ وہ اس لڑکی جس کا نام بھی اسے معلوم نہ تھا، اسے وڈیرے

کی ہوس کی بھینٹ چڑھنے سے بچانا چاہتا تھا۔ وہ ایسا کیوں چاہتا تھا؟ اس بات کا علم صرف اسے ہی تھا۔

اس نے جیپ آگے بڑھا دی۔ دو، تین موڑ کاٹنے کے بعد جیپ حویلی کی طرف جانے والی سڑک پر جا رہی تھی۔ وڈیرے کی حویلی گوٹھ کے نزدیک اپنی زمینوں پر تھی۔ گوٹھ سے حویلی تک کا فاصلہ بمشکل پانچ منٹ کا تھا۔

دونوں چپ رہے۔ راستہ خاموشی سے کٹ گیا۔ جیپ حویلی کے مرکزی گیٹ پر رکی تو چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے جیپ حویلی میں داخل ہو چکی تھی۔ ذرا آگے جا کر سچل نے بریک لگائی تو وڈیرا وریام نیچے اتر گیا۔ سچل نے جیپ گیراج میں کھڑی کرنے کے لیے آگے بڑھا دی۔ جب وہ لوٹا تو وڈیرے کی "خوراک" والا تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا۔ پھر وہ باتیں کرتے ہوئے وڈیرے کے کمرے کی جانب چل پڑے۔ سچل نے بوتلیں الماری میں رکھ دیں۔ جبکہ وڈیرا جہازی سائز بیڈ پر لیٹ گیا۔ سچل کچھ دیر مزید وہاں رکا پھر کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے کوارٹر کی جانب چل پڑا جو کہ حویلی کے عقبی حصے میں تھا۔

☆......☆

سچل اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس کا ذہن مختلف خیالوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ منظر تازہ ہو گیا جب وہ اس لڑکی کے باپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس دوران وہ لڑکی کھانا لے کر آئی تھی۔ آج جب وہ اچانک جیپ کے سامنے آئی تو اس نے اسے پہچان لیا تھا۔ لڑکی کا باپ غلام رسول انتہائی خوش اخلاق شخص تھا۔ وہ بہت تھوڑا وقت اس کے پاس بیٹھا تھا لیکن جب اٹھا تو اس کے اخلاق کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔

گو کہ اسے وڈیرے وریام کے ساتھ رہتے ہوئے چند ماہ گزرے تھے لیکن وہ اس کی سرشت سے بہ خوبی واقف ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب وڈیرا جب تک اسے حاصل نہیں کرے گا اسے چین نہیں آئے گا۔

☆......☆

اس کا نام پارو تھا۔ تقریباً دو ماہ قبل اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ وہ اس گوٹھ میں آئی تھی۔ اس کا باپ غلام رسول عرف گاما اور بھائی قاسم کاشت کرتے تھے۔ ان کی چار ایکڑ زمین تھی جو کہ حال ہی میں انہوں نے خریدی تھی۔ ایک ایکڑ میں سبزیاں کاشت کی ہوئی تھیں۔ جبکہ تین ایکڑ رقبے پر کیلے کا باغ تھا۔ ان کا وقت اچھا کٹ رہا تھا۔ پہلے وہ لوگ دریائے سندھ کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ پھر جب دریائے سندھ نے کروٹ بدلی تو وہ اپنی جمع پونجی لے کر اس گوٹھ میں آ گئے۔ غلام رسول پہلے آیا تھا۔ پارو اور قاسم ایک ماہ بعد آئے تھے۔ پارو کی سانولی سلونی رنگت، سرو جیسا قد، آنکھیں غیر معمولی طور پر بڑی اور پرکشش تھیں۔ اس کے حسن میں ایک دل موہ لینے والی سادگی اور معصومیت تھی۔ سب سے اہم پہلو اس کی بے باکی تھی۔ وہ قطعی بے خبر تھی کہ وہ کتنا دلکش سراپا لیے ہوئے ہے۔ اسے دیکھ کر سمجھ آتا کہ ملکہ حسن کا تاج سانولی رنگت پر کیوں سجایا جاتا ہے۔ اس سادگی میں انتہا درجے کی تمکنت اور شان تھی۔ فقط نام ہی پارو نہیں تھا۔ ہر عضو پارے کی طرح مچلتا محسوس ہوتا۔ یہ حقیقت ہے کہ جو کشش دیہاتی حسن و سادگی میں محسوس ہوتی ہے۔ ایسی دلکشی کسی اور میں کہاں؟

عام سے ڈیزائن کے سوٹ میں بھی اس کا سراپا بے حد جاذبیت لیے ہوئے تھا۔ دیہاتی زندگی نے نشیب و فراز کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ ہر عمل میں ایک بے ساختہ پن تھا۔

اس کی متجسس آنکھوں میں قوس قزاح کے ہزاروں رنگ موجزن تھے۔ جس رات قاسم اور پارو گوٹھ میں آئے۔ کھانا کھانے کے بعد غلام رسول نے اسے اپنے پاس بٹھا کر ایک بات سمجھائی۔ "پارو دھی ہم جس گوٹھ سے آئے ہیں۔ وہاں کا ماحول اور تھا، یہاں کا کچھ اور ہے۔ میری اور اپنے بھائی کی عزت کا خیال رکھنا۔"

"اچھا بابا۔" اس نے پورے اعتماد سے کہا تھا۔

باپ نے اس کا ماتھا چوما اور کہا۔ "یہاں سب اجنبی ہیں کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ بس خود کو گھر تک محدود رکھنا۔ باقی ہم جانیں اور ہمارا کام۔"

وقت کا گھوڑا چلتا رہا۔ غلام رسول کی دوستی برکت سے ہو گئی۔ وہ دونوں ہم عمر تھے۔ زمین بھی ساتھ ساتھ تھی۔ سارا دن اکٹھے گزرتا۔ کچھ دن قبل وہ اپنی بیٹی جنداں کو لے کر ان کے گھر آ گیا تھا۔ اس طرح پارو اور جنداں کی دوستی ہو گئی۔ جنداں ہنس مکھ لڑکی تھی۔ بات بات پر قہقہے لگا کر ہنسنے والی لڑکی۔ جب ہنستی تو اس کے ہموار دانتوں کی چمک دیکھنے والی ہوتی۔ جنداں نے جاتے ہوئے اسے بھی اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ ان کا گھر گوٹھ کے شمالی جانب تھا۔ وہ اپنے باپ سے اجازت لے کر جنداں کے پاس گئی تھی۔ وہیں سے واپس آ رہی تھی کہ وڈیرے کی نظروں میں آ گئی۔

جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو باپ بے چینی سے صحن میں ٹہلتا نظر آیا۔ یہ بات اس نے محسوس کر لی۔ وہ دروازہ بند کر کے اپنے باپ کی طرف بڑھی۔ وہ اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکا اور دروازے کے قریب ہی روک لیا۔

"بابا سب خیر تو ہے نا؟" باپ کو مضطرب دیکھ کر اس نے استفسار کیا۔

"ہاں دھی رانی سب خیر ہے۔ ذرا یہ چٹھی پڑھنا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"آپ نے تو ڈرا ہی دیا۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی اور لفافہ پکڑ لیا۔ غلام رسول جھینپ گیا۔ اس لمحے اسے اپنے بوڑھے باپ پر بہت پیار آیا تھا۔

"اچھا اب چٹھی پڑھ کر سنا پتر۔" اس کا خیال چٹھی کی طرف تھا۔

"اچھا بابا پڑھتی ہوں۔" پارو نے پہلی بار لفافے کو بغور دیکھا۔

یہ کسی نے ہندوستان سے بھیجا تھا۔ خط بھیجنے والے کا نام من پریت سنگھ تھا۔ اس نے پتا گو کہ آہستہ آواز میں پڑھا تھا لیکن غلام رسول نے سن لیا۔

"من پریت سنگھ۔" وہ خود کلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔ پھر خوشی سے اچھل پڑا۔ ایک ماہ قبل ہی اس نے اپنے بیٹے سے خط لکھوا کر پوسٹ کیا تھا۔ اب اس کا جواب آیا تھا۔

وہ ماضی میں کھو گیا۔ اس کے گھبرو یار من پریت سنگھ کا من موہنا چہرہ ذہن میں تازہ ہو گیا۔

پارو نے لفافہ پھاڑ کر خط نکالا اور پڑھنے لگی۔ تحریر اردو اور پنجابی میں لکھی تھی۔ جس کا لب لباب کچھ اس طرح تھا۔

ست سری اکال

غلام رسول ویر آپ کی چٹھی ملی تو مینوں یقین نہیں آیا کہ ایک دن ایسا بھی ہوگا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم سب اکٹھے تھے، پھر بٹوارہ ہو گیا، سرحدیں بن گئیں، لیکن جس طرح پانی پر لاٹھی مارنے سے پانی ٹٹ نہیں سکدا، اسی طرح ہمارا رشتہ اور تعلق کبھی ختم نہیں ہو سکدا۔

مجھے وہ سمے بہت یاد آتا ہے۔ جب ہم اکٹھے تھے۔ کاش وہ دور لوٹ آئے، لیکن شاید اب ایسا نہ ہو۔

ایک ماہ بعد میں پاکستان آؤں گا۔ حسن ابدال میں حاضری دینی ہے۔ وہاں سے سیدھا آپ کے پاس آواں گا۔

ایک بات تو بھل گیا سی۔ ماں جی اور بھابی کیسی ہیں؟ آپ دونوں کے گلشن میں پھول بھی کھلے ہوں گے نا۔ مینوں یقین اے کہ آپ نے اپنا وعدہ پورا کیا ہوگا۔ میں نے بھی اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔

اچھا ہن سانوں اجازت دیو۔ واہگرو تہانوں سدا سکھی رکھے۔

تیرا ابھرا، من پریت سنگھ

پارو نے خط پڑھا اور باپ کی طرف دیکھا۔ غلام رسول کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر رخساروں کو دھو رہے تھے۔ وہ تڑپ گئی۔

"کیا ہوا بابا؟"

"کچھ نہیں دھی، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔"

پھر اس نے پارو کے ہاتھ سے خط پکڑا، چوم کر سینے سے لگا لیا۔ خود کلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔ "پریتے! ماں جی اور تیری بھابی کو اللہ نے بلا لیا۔ یہ چٹھی پارو نے پڑھی ہے۔ میں نے اپنی دھی کا نام پارو رکھا ہے۔ تیری اماں کا نام پارو تھا نا، اسی لیے یہ نام رکھا۔"

آخری الفاظ پارو نے سن لیے۔ وہ دلار سے بولی۔

"بابا مجھے کچھ کہا ہے؟"

"ہاں دھی رانی۔"

"کیا کہا ہے؟"

مگر وہ کچھ نہ بولا۔ بس آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، پھر دونوں باتیں کرتے ہوئے کمرے کی جانب چل پڑے۔

اسی اثنا میں قاسم بھی آ گیا۔

اس نے جلدی سے آٹا گوندھا۔ قاسم چولہے میں اپلوں کی آگ جلانے لگا۔ پارو نے ہانڈی چڑھا دی۔

شام ہو چکی تھی۔ بھنڈی کا سالن بنا کر اس نے توا رکھ دیا۔

وہ روٹیاں بنانے لگی۔ گھر کے سکوت میں حیدر آبادی چوڑیوں کی چھنک گونجنے لگی۔

ایک گھنٹے بعد وہ دونوں کھانا کھا کر چارپائیوں پر لیٹ چکے تھے۔ جبکہ قاسم کھیت کی رکھوالی کرنے چلا گیا۔ گیدڑ ٹماٹر اور کیلے کی فصل کو بہت نقصان پہنچاتے اسی لیے قاسم اپنے ایک دوست سے دو کتے کچھ دنوں کے لیے مانگ لایا تھا۔

پارو سو گئی۔ جبکہ غلام رسول جاگ رہا تھا۔ آج پھر گزرا وقت اس کے ذہن کے کواڑوں پر دستک دے رہا تھا۔ اس نے خیالوں کے کواڑ کھول دیئے اور گزرے وقت کی بھول

بھلیوں میں کھو گیا۔

☆......☆

مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں بھنگے والا میں وہ اپنی ماں جنت، بیوی فاطمہ اور بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کا باپ اللہ دتہ عدم سدھار گیا تھا۔ یہ ایک پسماندہ گاؤں تھا جس میں مسلمان اور سکھ رہتے تھے۔ دس، بارہ گھر ہندوؤں کے بھی تھے۔ ضروریات زندگی کی اشیاء شہر سے لانا پڑتی تھیں۔ قریبی شہر فیروز پور تھا۔ وقت اچھا گزر رہا تھا۔ من پریت سنگھ کا گھر ان کے پڑوس میں تھا۔ ان دونوں کا بچپن اکٹھے گزرا تھا۔ ایک ہی اسکول میں چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ الگ الگ مذاہب کے پیروکار تھے مگر دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک دوسرے کے کام آنا۔ دکھ سکھ بانٹنا۔ حتیٰ کہ زمین پر کام بھی کروا دیا کرتے۔ خاص طور پر بیساکھی کے دنوں میں اکٹھے کام کرتے تھے۔ مرد صبح سویرے گندم کی کٹائی کے لیے نکل جاتے۔ ان کی عورتیں کھانا وغیرہ اکٹھا تیار کرتیں پھر غلام رسول کی بیوی اور من پریت سنگھ کی پتنی امرت کور کھانا لے کر کھیتوں میں جاتیں۔ جہاں پر من پریت سنگھ کا بھائی دلجیت سنگھ اور غلام رسول کا بھائی عبداللہ اور وہ دونوں ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔

جب گندم کی کٹائی کا سیزن ختم ہو جاتا تو وہ بے حد پُرجوش ہو جایا کرتے تھے۔ اس کی وجہ میلے تھے۔ دونوں کو کبڈی کا شوق تھا۔ جہاں بھی میلا لگتا کبڈی کا مقابلہ ضرور ہوتا۔ مقابلے میں شرکت کے لیے دونوں اکٹھے ہی جایا کرتے تھے۔ ان دنوں ان کا جوش دیدنی ہوا کرتا تھا۔

"اوئے گامیا! اس واری کی پروگرام اے۔" من پریت سنگھ نے یار باش لہجے میں پوچھتا۔

"پریتے یار! جد تک ساہ چلدے نیں۔ جد تک میلے لگدے رہنے۔ تیرا ابھرا گاما ہک تان کے میدان وچ اتر دا رہے گا۔"

(من پریت یار! جب تک سانس چلتا رہے گا۔ جب تک میلے لگیں گے۔ تمہارا بھائی گاما سینہ تان کر میدان میں آتا رہے گا)

وقت مٹھی میں بند ریت کی طرح پھسلتا رہا۔ ان کے دو ہی، کام تھے۔ کھیتی باڑی اور میلے ٹھیلے۔ دونوں پہلوان تھے۔ میلے پر اکٹھے ہی جاتے۔ ایک دن غلام رسول نے من پریت سنگھ کے کہنے پر دونوں گھروں میں حائل دیوار بھی گرا دی۔ یوں ان کا گھر بھی ایک ہو گیا۔

لیکن تقدیر کو انہیں جدا کرنا ہی تھا۔ ان دنوں پاکستان کی تحریک نے زور پکڑ لیا تھا۔ اِدھر اُدھر سے اطلاعات آنے لگیں تھی کہ اکالی دل اور ہندو مہا سبھا کے کارکنان مسلمانوں کو دھمکا رہے ہیں کہ وہ فیروز پور میں ایک بھی مسلمان کو رہنے نہیں دیں گے۔ اگر پاکستان بنا تو مسلمانوں کو یہاں سے جانا ہوگا پھر مسلمانوں کے گھروں پر حملے بھی شروع ہو گئے۔

وہ چودہ اور پندرہ اگست کی درمیانی شب تھی۔ بہت سنسنی خیز لمحات تھے۔ دونوں گھروں کے لوگ جاگ رہے تھے۔ گرمیوں کی رات تھی۔ دن میں بھی بلا کی گرمی پڑی۔ غلام رسول اور عبداللہ دن بھر روزے کی حالت میں کام کرتے رہے۔ دونوں تھک گئے تھے۔ تاہم وہ سونا نہیں چاہتے تھے۔ صحن میں چارپائیاں بچھی تھیں جن پر سب براجمان تھے۔ مشرق کی سمت سے ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ من پریت سنگھ ریڈیو کے قریب بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی غلام رسول گہری سوچوں میں ڈوبا نجانے کہاں کھویا ہوا تھا۔ بارہ بج گئے۔ اس کے فوراً بعد ریڈیو پر انگریزی میں اعلان ہوا۔ "یہ پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس لاہور ہے۔ اب ہم ایک خصوصی پروگرام پیش کر رہے ہیں "صبح آزادی"

اس کے فوراً بعد اردو میں یہی اعلان مصطفیٰ علی ہمدانی کی آواز میں کچھ اس طرح دہرایا گیا۔ "السلام علیکم۔ پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس۔ ہم لاہور سے بول رہے ہیں۔ رات کے بارہ بجے ہیں۔ پروگرام سنیے طلوع صبح آزادی۔"

غلام رسول کے چہرے پر خوشی و غم کی ملی جلی کیفیت ظاہر ہوئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے پھر زور سے چلایا۔ "پاکستان زندہ باد۔"

اسی وقت من پریت سنگھ اور غلام رسول بہ یک وقت اپنی جگہ سے اٹھے۔ دونوں نے بانہیں وا کیں اور ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

"گامیا! مبارکاں...... ودھائیاں۔" من پریت سنگھ کی کپکپاتی آواز اس کی قلبی کیفیت کی مظہر تھی۔

دونوں شدت جذبات سے ایک دوجے کو بھینچ رہے تھے۔

"خیر مبارک پریتے۔" وہ بس اتنا ہی کہہ پایا۔ آنکھوں سے آنسو بھل بھل بہنے لگے۔ پتا نہیں یہ خوشی کے آنسو تھے یا جدائی کا غم!

ہاں وہ عجیب لمحے تھے۔ اپنا ملک بننے کی خوشی اور اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ۔ دونوں کا مذہب الگ تھا لیکن ان کا رشتہ

بھائیوں جیسا تھا۔ بالکل سگے بھائیوں جیسا۔

ان کے دکھ، سکھ سانجھے تھے۔ انہوں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ایک دن بچھڑ جائیں گے۔ ہاں وقت ایسا ہی ہوتا ہے۔ اپنوں سے اپنے جدا کر دیتا ہے۔ بالکل بہتے پانی جیسا جو کبھی پلٹ کر نہیں آتا۔ کناروں سے جڑی مٹی کو اپنے ساتھ بہا کر کسی اور دیس پہنچا دیتا ہے۔ اب غلام رسول کو بھی کسی اور دیس پہنچنا تھا۔ یا شاید نہیں پہنچنا تھا۔ ''گامے! میرے یار بس یہ چار دناں دی گل اے۔ واہگرو سب اچھا کرے گا۔''

''بس دعا کرنا پریت ویر۔''

''او میرے یار ملک دی ونڈ (ملک کی تقسیم) ساڈے دل نہیں ونڈ سکدی۔'' (ہمارے دل تقسیم نہیں کر سکتی) ان دونوں کی جذباتی گفتگو جاری تھی۔

''گامے ویر! دیکھ لینا کہ کچھ عرصے بعد پھر دونوں ملک ایک ہو جائیں گے۔'' امرت کور نے مداخلت کی پھر اپنی جگہ سے اٹھی اور انہیں ایک دوسرے کی بانہوں کے ''کلاوے'' سے نکال دیا۔

''واہگرو ایسا ہی کرے گا۔'' من پریت سنگھ نے اس کی تائید میں کہا لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔ وقت کچھ اور ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ یہ وچھوڑا ایک دو دن کا نہ تھا۔ بلکہ لمبی جدائی کا سندیسہ تھا۔ ایک دوسرے سے دوری مقدر تھی۔ بہت دور رہ کر دکھ سہنا تھا اور بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپنا تھا۔ پھر ان دونوں کی گفتگو شروع ہو گئی۔ یہ گفتگو کافی طویل ثابت ہوئی۔ من پریت بضد تھا کہ وہ لوگ کچھ دن ادھر رہ کر انتظار کریں۔ اسے امید تھی کہ یہ سب زیادہ دیر نہیں چلے گا۔ کچھ دنوں تک یہ ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔ سب جانے والے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔

اب غلام رسول بھلا کیوں کر وہاں رکتا۔ اسے ہر حال میں اپنے ملک، اپنے پاکستان پہنچنا تھا۔ اب تو اس کی دھڑکنوں کی آواز پاکستان بن گئی تھی۔

ان کی گفتگو کا نتیجہ آخر کار یہ نکلا۔ غلام رسول نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''پریتے! میں اک وار تے پاکستان ضرور جاواں گا۔'' (پریت! میں ایک دفعہ تو پاکستان ضرور جاؤں گا)

آس پاس کی مسلمان بستیوں پر حملے ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جا رہا تھا اس لیے پھر چار و ناچار من پریت سنگھ کو بھی اس کی بات ماننا پڑی۔

غلام رسول کا خیال تھا کہ آج رات ہی رخت سفر باندھا جائے لیکن من پریت سنگھ نے صبح کا پروگرام ترتیب دے دیا۔ تاہم ان لوگوں نے تیاری مکمل کر لی۔ روزہ بھی رکھ لیا۔

صبح کے چار بج چکے تھے۔ وہ نماز ادا کر کے سو گئے۔

دو گھنٹے بعد من پریت سنگھ نے انھیں جگا دیا۔ غلام رسول نے محسوس کیا کہ وہ مضطرب ہے۔ اس سے قبل وہ پوچھتا۔ اس نے خود ہی بتانا شروع کر دیا۔ وہ جیسے جیسے اس کی باتیں سنتا رہا پریشان ہوتا رہا۔

اس نے جو کچھ بتایا وہ سب انتہائی پریشان کن صورت حال تھی۔

ہندو بلوائیوں اور سکھ جتھوں نے نزدیکی سڑک سے گزرنے والے قافلوں پر حملے شروع کر دیے تھے۔

پاکستان کی بنیاد میں خون کی نہریں شامل ہونا شروع ہو چکی تھیں۔

من پریت سنگھ ان کے پاس کافی دیر بیٹھا رہا۔ اب حالات کچھ اور رخ اختیار کر چکے تھے۔ وہ نامعلوم مدت کے لیے بچھڑنے والے تھے۔ اس کی کوشش تھی کہ ان آخری لمحوں میں وہ اپنے یار گامے کے ساتھ رہے۔ اس سے باتیں کرے۔ وہ گاہے گاہے باہر کا چکر بھی لگا کر آ جاتا تھا۔ جب تیسری بار گیا تو غلام رسول نے ایک کام اس کے ذمے لگا دیا۔ وہ کام تھا بھنگے والا کے ایک پاگل لڑکے گلزاری کو ساتھ لانا۔ وہ اسے بھی پاکستان لے جانا چاہتا تھا۔ گلزاری کہیں نہیں ملا تھا۔

☆......☆

بھنگے والا میں بھی قتل و غارت شروع ہو گئی۔

باہر نعرے اور للکارے سنائی دینے لگیں۔ تین چار بار گھر کا دروازہ بھی دھڑا دھڑ پیٹا گیا۔ تاہم خیریت گزری۔ ہوتا وہی ہے جو رب کو منظور ہو۔ سہ پہر کے بعد صورتِ حال اور بھی مخدوش ہو گئی۔ گاؤں میں موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔ نئی اطلاع کے مطابق سکھوں اور ہندوؤں کے جتھے مزید سرگرم ہو گئے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے گھر نذرِ آتش کرنا شروع کر دیے تھے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب در و دیوار بھی سرگوشیاں کرتے محسوس ہوتے تھے، موت کی سرگوشیاں۔ رقصِ اجل شروع ہو چکا تھا۔ ہر سو موت کی آہٹیں سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ ڈرے سہمے رب پر توکل کیے بیٹھے تھے۔ اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ من پریت سنگھ باہر کا چکر لگا کر واپس آیا تھا۔ اس نے آتے ہی تیاری کا بول دیا۔ انہیں تیاری کیا کرنا تھی؟ بس کچھ زیور اور نقدی تھی۔ جو غلام رسول کے پاس محفوظ تھی۔ بس یہی زادِ سفر تھا۔ ابھی وہ نکلنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

وہ سب چونک گئے۔ من پریت سنگھ نے انھیں کمرے میں بھیج دیا اور خود دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ تاہم وہ کمرے کے دروازے کو باہر سے تالا لگانا نہیں بھولا تھا۔

ان کے دل خزاں رسیدہ پتے کی مانند لرزنے لگے۔ آنے والے لمحوں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ خدشوں کے سنپولیے دماغ میں سرسرا رہے تھے۔

اسی اثنا میں باہر سے للکارے سنائی دیے۔ کئی لوگوں کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں ابھریں۔ اک شور برپا ہو گیا۔ گاہے گاہے ''جے ہند'' کا نعرہ سنائی دیتا۔

وہ ڈرے سہمے دل ہی دل میں خدا کو یاد کرنے لگے۔ اس مشکل گھڑی میں بس اسی کا سہارا تھا۔

باہر شور کچھ تھم گیا۔ پھر کوئی زور سے چلایا۔

ست سری اکال، جو بولے سو نہال

پھر للکارے سنائی دیے۔ آہستہ آہستہ خاموشی چھا گئی۔ یقیناً آنے والے چلے گئے تھے۔ اب انھیں من پریت سنگھ کا انتظار تھا تاکہ اصل صورتِ حال کا پتا چل سکے۔ اس کی واپسی پندرہ منٹ بعد ہوئی۔

''کیا ہوا پریتے؟'' غلام رسول نے اس کے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔

''گامیا! ہونا کی اے؟ لگدا اے آن والا وقت چنگا نہیں ہیگا۔'' (گامیا! ہونا کیا ہے؟ لگتا ہے آنے والا وقت اچھا نہیں ہے) پھر وہ موجودہ صورتِ حال تفصیل سے بتانے لگا۔

بھنگے والا کے ایک برہمن کی بیٹی کسی مسلمان کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔ اب وہ ان لوگوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق وہ کسی گھر میں چھپے ہوئے ہیں۔ کوئی مناسب موقع دیکھ کر پاکستان جائیں گے۔ من پریت سنگھ نے انہیں یقین دلایا کہ ادھر کوئی نہیں ہے۔ اگر وہ گھر میں آ جاتے تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ عمر بھر کے تعلق پس پشت ہو گئے تھے۔ مسلمان ہونا جرم بن گیا تھا۔ ان دنوں ایسے کئی واقعات سننے گئے۔ تقسیم ہند نا عاقبت اندیش عاشق لوگوں کے لیے اچھا وقت ثابت ہوا تھا۔

''گامے! شام تک ایسیں اوکھے سوکھے ویلا گزار دو۔ رات نوں اسیں تہانوں سرحد کول پہنچا واں گے۔'' (گامے! شام تک جیسے تیسے وقت گزار لو۔ رات کو ہم تمھیں سرحد کے پاس پہنچا دیں گے) من پریت سنگھ نے اسے تسلی دی۔

پھر وہ انہیں ایک الگ کمرے میں بند کر کے باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی لگ بھگ مغرب کے وقت ہوئی۔ اس دوران وہ چاروں سخت اضطراب میں مبتلا رہے۔ اب انھیں رات کا انتظار تھا۔ جنت بی بی بوڑھی عورت تھی۔ اس کے لیے اتنا سفر پیدل طے کرنا مشکل تھا۔ من پریت سنگھ نے کہیں سے ایک مضبوط بانس ڈھونڈ لیا۔ اس کے ساتھ ایک چادر کو اس طرح باندھا کہ وہ جھولا بن گیا۔ مغرب کے وقت انھوں نے پانی سے روزہ افطار کیا۔ نماز ادا کرنے کے بعد کھانا کھایا پھر آنے والے وقت کے بارے میں لائحہ عمل ترتیب دینے لگے۔

☆......☆

رات کی تاریکی میں ان کا سفر جاری تھا۔ مختصر سا قافلہ جو کہ آٹھ افراد پر مشتمل تھا، دشوار گزار راستوں سے ہوتا ہوا گنڈا سنگھ بارڈر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ انہوں نے چالیس میل کا سفر طے کرنا تھا۔ غلام رسول کی ماں جنت بی بی کا ''جھولا'' باری باری سب مردوں کے کندھوں پر منتقل ہوتا رہا۔ جب دونوں اٹھانے والے تھک جاتے تو دوسروں کی باری آ جاتی۔ آسمان پر بادلوں کی آوارہ ٹولیاں ہوا کے دوش پر تیر رہی تھیں۔ غلام رسول اور عبداللہ کا ارادہ تھا کہ راستے میں کہیں کچھ دیر رک کر روزہ رکھ لیں گے۔ کھانے، پینے کا انتظام وہ بھنگے والا سے ہی کر کے چلے تھے۔ ابھی تک ان کا سفر بخیر و عافیت گزر رہا تھا۔ لیکن حالات بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے؟

بہرکیف سردار من پریت سنگھ، وجیت سنگھ اور ان کے دونوں چچازاد بھائی ساتھ تھے۔ وہ چاروں مسلح تھے۔ چاروں کے پاس کرپانیں اور تلواریں تھیں۔ تاہم غلام رسول کے پاس سردار من پریت سنگھ کی دی ہوئی بارہ بور بندوق تھی۔

ذرا آگے جا کر ریتلا علاقہ شروع ہو گیا۔ اس جگہ سرکنڈے اور چھوٹی جھاڑیاں کثیر تعداد میں تھیں۔ وہ ان کے درمیان مختصر سی کچی سڑک پر آگے بڑھتے چلے گئے۔ ذرا آگے جا کر سڑک کے بیچ دس، بارہ بندوں کی لاشیں دیکھ کر وہ رک گئے۔ یہ سب خاکِ وطن کو بوسہ دینے والے لوگ تھے۔ جو ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان جا رہے تھے لیکن تقدیر نے انھیں نہ پہنچنے دیا۔

اس دوران سرکنڈوں میں ہلچل ہوئی۔ ان سب کی اپنے اپنے ہتھیاروں پر گرفت مضبوط ہو گئی۔

غلام رسول نے سرکنڈوں کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی تھا۔ اگلے ہی لمحے ''جے ہند'' کا نعرہ بلند ہوا۔ سرکنڈوں میں گھات لگا کر بیٹھے بلوائیوں نے حملہ کر دیا۔ ان کی تعداد آٹھ تھی۔ سردار من پریت سنگھ، اس کے دو چچازاد بھائی تلواریں

سونت کر میدان میں اتر گئے۔

"ست سری اکال، جو بولے سونہال" من پریت سنگھ نے نعرہ لگا کر تلوار چلائی۔ ایک ہندو کی چیخ بلند ہوئی پھر تلواریں ٹکرانے لگیں۔ عبداللہ اور دلجیت سنگھ نے جلدی سے جھولا زمین پر رکھ دیا۔ پھر وہ بھی لڑائی میں شامل ہو گئے۔ غلام رسول اپنی بیوی کو ماں کے پاس چھوڑ کر میدان میں کود پڑا۔

وہ چاہ کر بھی فائر نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ اندھیرا تھا۔ دوست دشمن کی پہچان مشکل تھی۔ اس نے بندوق کو نال کی طرف پکڑ کر ایک بلوائی کے سر پر وار کیا۔ وہ کراہ کر گر پڑا۔ اگلے ہی لمحے کسی اور کی چیخ سنائی دی۔ وہ عبداللہ تھا۔ ایک بلوائی نے اس کے پیٹ میں تلوار گھونپ دی تھی۔ غلام رسول نے ہوائی فائر کیا۔ بلوائیوں میں سے ایک کو چھرا لگا۔ وہ زمین بوس ہو گیا۔ دلجیت سنگھ نے کرپان سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اپنے ساتھیوں کے انجام سے خوفزدہ ہو کر باقی بلوائیوں نے راہِ فرار میں عافیت سمجھی۔

غلام رسول تیزی سے عبداللہ کی طرف لپکا۔ تلوار کے کاری وار نے اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ ہاں موت ایسی ہی ہوتی ہے۔ پل میں آجاتی ہے۔ کچھ دیر پہلے وہ اُن کے ساتھ محوِ سفر تھا۔ اب حقیقی سفر پر چلا گیا تھا۔ وہ جوان بھائی کے جسدِ خاکی سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ من پریت سنگھ نے اسے دلاسہ دیا اور انہیں آگے بڑھنے کو کہا۔ مجبوراً انھیں عبداللہ کی لاش چھوڑ کر آگے بڑھنا پڑا۔ ہاں اس نے من پریت سنگھ کو راستے میں کہا تھا کہ اگر ممکن ہو تو عبداللہ کی لاش گڑھا کھود کر دفنا دے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ایسا ہی کرے گا۔ خط میں من پریت نے اسی وعدے کا بتایا تھا۔ آخر وہ دل گرفتہ لوگ سرحد پر پہنچ گئے۔ من پریت اور دوسرے لوگ واپس چلے گئے تھے۔ سرحد پار کرتے ہی اس کی ماں بھی مر گئی۔ ماں کو ستلج دریا کے ساتھ ایک گاؤں جودھ سنگھ والا کے قبرستان میں دفنا کر وہ لاہور مہاجر کیمپ آ گئے۔

کچھ عرصہ لاہور میں گزار کر وہ حیدر آباد آ گئے۔ حیدرآباد سے گوٹھ ولی داد آ گئے۔ ایک سال بعد قاسم کی پیدائش ہوئی۔ اس کے چار سال بعد پارو پیدا ہوئی تھی۔ جب پارو سات سال کی ہوئی تو اس کی بیوی فوت ہو گئی۔ اب پارو اکیس سال کی ہو چکی تھی کہ اس نئے گوٹھ میں آنا پڑ گیا۔ غلام رسول کو یہ سب کل کی بات لگ رہی تھی۔ حالانکہ قیام پاکستان کو اٹھائیس برس گزر چکے تھے۔ اس نے آنکھوں میں آئے آنسو پونچھے اور کروٹ بدل لی۔

☆......☆

کبھی کبھی حسن بھی وبالِ جان بن جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی پارو کے ساتھ ہوا۔ وڈیرا دریام جکھرانی نشست گاہ میں بیٹھا شراب سے دل بہلا رہا تھا۔ ان دو دنوں میں وہ ایک پل بھی اسے ذہن سے نہ نکال پایا۔ دلکش خدوخال کی مالک پارو کے حسن کا تیر سیدھا اس کے دل میں کھب گیا تھا۔ ایک ہی نظر میں وہ اس سانولی لڑکی پر مر مٹا تھا۔ درندہ شکار کو دیکھنے کے بعد کیسے خود پر قابو پا سکتا ہے؟

پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں اس نے اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لیں۔ یہ سب نواز چانڈیو کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ نواز چانڈیو اس کا پرانا نمک خوار اور ہاں میں ہاں ملانے والا بندہ تھا۔

پارو کا حسین عکس دریام کے ذہن کی اسکرین پر ابھرا۔ وہ آنکھیں بند کر کے اسے خیالوں میں دیکھنے لگا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان خیالوں میں کھو جائے تو خود سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ جب پریشان ہو تو خیالات مزید الجھا دیتے ہیں۔ ایسے میں نیند اڑ جاتی ہے لیکن اگر خیال خوشنما ہوں تو انسان خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ پارو کے دل موہ لینے والے حسن کا نشہ، شراب کے نشے کے ساتھ مل کر دو آتشہ ہو گیا۔ اسے اونگھ آ گئی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خیال، خواب بن جاتے ہیں۔ ہم جو سوچتے ہیں وہ خواب میں نظر آتا ہے۔

سوچ کے پنچھی نے لمبی اڑان بھری اور اس نے خود کو پارو کے پاس پایا۔ وہ سفید ململ کے لباس میں ملبوس تھی۔ وڈیرا دریام قدم قدم چلتا ہوا، اس کے قریب چلا گیا۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرائی، بولی۔ "میں کب سے تمھارا انتظار کر رہی ہوں۔ جن سے محبت ہو، انھیں اتنا ستایا نہیں کرتے۔"

وہ شرمندہ ہو گیا۔ کچھ نہ بولا۔ تاہم اسے یاد آنے لگا کہ اس نے پارو کو بلایا تھا۔ وہ طے شدہ مقام پر پہنچ کر انتظار کرتی رہی ہے۔

وہ خود کو عاشق صادق سمجھنے والا کچھ دیر لب بستہ رہا، آخر شرمسار لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے گویا ہوا۔

"پارو! میں تمھارے خیالوں میں جب کھو جاؤں تو مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ تمھارا نشہ ذہن پر ہر پل، پل پل چھایا رہتا ہے۔"

وہ اسے بغور دیکھنے لگی۔ جیسے اس کے لہجے کی صداقت کو پرکھنا چاہتی ہو پھر جیسے یقین آ گیا، اٹھلا کر بولی۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ جنھیں سوچا جائے بندہ انھیں بھول جائے۔"

اس کی بات سچی تھی۔ وڈیرا لاجواب ہو گیا۔

کچھ دیر اپنی جگہ پر ساکت کھڑا رہا پھر اس کے قریب اور قریب ہونے لگا۔

وڈیرے کی نظریں دھاگوں، موتیوں اور شیشے کے امتزاج سے بنے پراندے پر ٹک گئیں۔ کچھ دیر دیکھتا رہا تبھی اس کے دل میں بے اختیار خواہش ابھری کہ پراندے کو ہاتھ میں لیا جائے۔ اسے چھو کر دیکھا جائے۔

اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ پارو تڑپ کر دور ہو گئی۔

لیکن پراندے کی ایک لڑی ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں آ گئی۔

وہ وفورِ شوق سے لڑی کو چومنے لگا پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ وہ لڑی کوبرا سانپ بن گئی۔ جس نے آن واحد میں وڈیرے کا بازو اپنی گرفت میں لے لیا۔ بازو پر لپٹا کوبرا سانپ پھن پھیلا کر اس کے چہرے کے عین سامنے ہو گیا۔

کوبرا جھومنے لگا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اسی لمحے سانپ نے اس کی گردن پر ڈس لیا۔ پارو نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"نن......نہیں۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ تاہم ذہن پر غنودگی طاری رہی۔

"کیا ہوا سائیں؟" سچل جو کہیں نزدیک جا رہا تھا۔ وڈیرے کے چیخنے کی آواز سن کر کمرے میں آ گیا۔

"سچل! میرے بازو پر سانپ......" وہ بمشکل اتنا ہی کہہ پایا۔ تاہم اگلے ہی لمحے اس کے حواس بحال ہو گئے۔ اس نے اپنے بازو کی طرف دیکھا۔ وہاں سانپ کی بجائے سچل کا ہاتھ نظر آیا۔

"سائیں! ادھر مجھے تو کوئی سانپ نظر نہیں آ رہا۔" یہ کہہ کر سچل نے وڈیرے کا بازو چھوڑ دیا۔

وہ کچھ دیر چپ رہا۔ پھر اسے خواب کے بارے میں بتانے لگا۔ یہ سب سن کر سچل بولا۔

"سائیں! خواب، خیال ہوتے ہیں۔ زیادہ سوچنا نہیں چاہیے۔"

وڈیرے نے سر تفہیمی انداز میں ہلایا پھر بولا۔ "اچھا میں نہا کر آتا ہوں۔ پھر کہیں گھومنے چلیں گے۔" یہ کہہ کر وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ فریش ہو کر واپس آ گیا۔ تب تک سچل گاڑی نکال کر لے آیا تھا۔ نواز چانڈیو نے اسے بتایا تھا کہ پارو اور جنداں عصر کے بعد نہر پر پانی بھرنے جاتی ہیں۔ اس کا ارادہ اب نہر کی طرف جانے کا تھا۔ یہ بڑی نہر تھی جو کہ گوٹھ سے شمالی سمت بہتی تھی۔ جبکہ کچھ فاصلے پر جنوب کی طرف چھلیلی نہر تھی۔ چونکہ گوٹھ میں پانی کی سہولت نہ ہونے کے برابر تھی۔ عورتیں کپڑے وغیرہ نہر پر دھوتی اور گھریلو استعمال کے لیے پانی بھی بھر کر لاتی تھیں۔

دس منٹ بعد وہ حویلی سے نکل کر نہر کے قریب پہنچ چکے تھے۔

وڈیرا گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ سچل نے گاڑی آگے لے جا کر کھڑی کی اور وڈیرے کی جانب چل پڑا۔

وڈیرا نہر کی پٹری پر کھڑا ہو گیا۔ سچل بھی اس کے پاس پہنچ گیا۔ اچانک وڈیرے کی نظر پارو پر پڑی۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر سچل کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "اڑے سچل! یہ وہی لڑکی ہے نا۔ یا مجھے لگ رہا ہے؟"

سچل کا دل بے طرح دھڑکا۔ وہ پہلے ہی پارو کو دیکھ چکا تھا۔ چونک کر بولا۔ "جی سائیں وہی ہے۔"

"آؤ پھر۔" وڈیرے نے اسے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

پارو نے گھڑا ابھر کر "ڈھاک" پر رکھا پھر اس کے اوپر بازو لپیٹ لیا۔ مشرقی حسن اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ وڈیرے کے حواس پر حملہ آور ہونے لگا۔ اسے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا اور وہ بے اختیار پارو کی طرف چل پڑا۔

پارو اکیلی نہ تھی۔ جنداں بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ وڈیرے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر مضطرب ہو گئی۔

اس کے ہاتھ سے گھڑا پھسل کر نہر میں جا گرا۔

وڈیرا قہقہہ لگا کر ہنسا۔ پھر سچل کی طرف مڑ گیا۔ جنداں نے ایک پل ڈوبتے گھڑے کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر اس نے پارو کو اشارہ کیا۔ دونوں گوٹھ کی جانب چل دیں۔ وڈیرے کی ہوس بھری نگاہیں دور تک پارو کا تعاقب کرتی رہیں۔ وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ "پارو۔"

پھر اس نے سچل کو اشارہ کیا اور جیپ کی طرف چل پڑا۔

کچھ دیر بعد جیپ حویلی کی طرف جا رہی تھی۔ راستے میں وڈیرے نے سچل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "سچل آج رات پارو میرے بستر پر ہونی چاہیے۔" پھر لمحاتی توقف کے بعد بولا۔ "تم جسے ساتھ لے جانا چاہو لے جانا۔"

اسی اثنا میں جیپ حویلی پہنچ گئی۔ اس نے وڈیرے کو اتار کر جیپ گیراج میں کھڑی کردی اور وڈیرے کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد وڈیرے نے نواز چانڈیو کو بھی بلا لیا پھر اسے آیندہ کا لائحہ سمجھانے لگا۔

چانڈیو کے ہونٹوں پر بھید بھری مسکراہٹ رینگ گئی۔

☆......☆

رات کا پنچھی پر پھیلا چکا تھا۔ آسمان پر گہرے بادلوں کی دبیز چادر تنی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے تاریکی مزید بڑھ گئی۔ بارہ بجے کا وقت تھا۔ ایسے میں چار ڈھاٹا پوش بندے حویلی سے نکلے اور گوٹھ کی جانب چل دیے۔ ہر سو خاموشی تھی۔ تاہم کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے ماحول میں وحشت سی محسوس ہوئی۔ اسی اثنا میں کماد کے کھیت سے گیدڑ چلّانے لگے۔ بجلی چمکی اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ وہ چاروں رک گئے۔ ایک طرف سے بڑا سا کالا بلا نکلا اور ان کے سامنے اک پل رکا اور کھیت میں گھس گیا۔ کالی بلی ہو یا بلا اگر راستہ کاٹ لے تو اسے برا شگون سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے بھی سمجھ لیا۔ ان کے دل انجانے خوف سے دہل گئے۔ وہ کچھ دیر آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے پھر آگے بڑھنے لگے۔ تاہم وہ یہ بات نہیں جانتے تھے کہ دو آنکھیں ان کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہی ہیں۔ جب وہ حویلی سے نکلے، اس وقت سے یہ آنکھیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ جو کوئی بھی تھا، چھپتا چھپاتا ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ چاروں تیز تیز چلتے ہوئے گوٹھ میں داخل ہو گئے۔ ان کا ہدف غلام رسول کا گھر تھا۔ جہاں چھپر کے نیچے اپنے باپ اور بھائی کے ساتھ پارو سو رہی تھی۔ قاسو موسم کے تیور دیکھ کر کھیت میں نہیں گیا تھا۔ دوسری گلی سے تعاقب کرنے والا بھی غلام رسول کے گھر کے سامنے پہنچ گیا پھر وہ دوڑا اور جمپ لگا کر ہاتھ دیوار کی منڈیر پر رکھ کر اندر کود گیا۔ دھپ کی آواز بادلوں کی گڑگڑاہٹ میں دب گئی۔ تاہم شہتوت کے درخت کے نیچے بندھی بکریاں ممنانے لگیں۔ بکریوں کی آواز سن کر قاسو کی آنکھ کھل گئی۔

اسی اثنا میں بجلی چمکی اور بادل زور سے گرجے۔ بجلی کی چمک میں قاسو نے ایک ہیولے کو چھپر کی طرف بڑھتے دیکھا تو تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں گھر کی دیوار سے کود کر آنے والے خیر خواہ نہیں ہوتے۔ تاہم آنے والا دوست نہیں تو دشمن بھی نہ تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ کوئی ہمدرد ہے۔

''کون ہو تم؟'' اس نے بستر کا کونا اٹھا کر لوڈڈ بارہ بور بندوق اٹھائی اور ہیولے کو للکارا۔ اس کی آواز سن کر غلام رسول اور پارو بھی جاگ گئے۔

''ششش۔'' ہیولے نے جواباً سرگوشی کی اور تیزی سے چارپائی کے قریب آگیا۔

قاسو بھی چارپائی چھوڑ چکا تھا۔ اس نے قریب آکر کہا۔ ''میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ یہ بعد کی بات ہے۔ بس اتنا بتا دیتا ہوں کہ کچھ بندے پارو کو اٹھانے آرہے ہیں۔'' اس نے دانستہ وڈیرے وریام کا نام نہ لیا۔

''کک...... کیا؟'' قاسو بوکھلا گیا۔

''ہاں یہ سچ ہے۔ بس وہ پہنچنے والے ہیں۔'' اس نے قاسو کو یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ پھر غلام رسول کی طرف دیکھا۔ ''چچا آپ پارو کو لے کر کمرے میں چلے جائیں۔''

پارو اور اس کا باپ جلدی سے کمرے میں چلے گئے۔ اجنبی شخص قاسو کو سمجھانے لگا۔ قاسو اثبات میں سر ہلاتا رہا۔

اب ان کی نظریں بیرونی دروازے اور دیوار کی جانب تھیں۔ ایک بار پھر بجلی چمکی۔ قاسو نے کسی کا سر دیوار کے اوپر سے نکلتے دیکھا۔

''تون کیر آھین؟'' (تم کون ہو؟) قاسو گرجا۔ اگلے ہی لمحے اس نے بندوق کا رخ دیوار کی طرف کر کے ہوائی فائر کر دیا۔ دوسری جانب والا جلدی سے نیچے ہو گیا پھر اپنے باقی ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ جب وہ گلی کی نکڑ پر پہنچے ہی ہوں گے کہ قاسو نے بکریوں کی رسیاں کھول کر دروازہ وا کیا اور فائر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی شور مچاتا شور کر دیا۔

''چور...... چور۔''

وڈیرے کے کارندے اس افتاد سے گھبرا گئے۔ وہ سرپٹ بھاگتے ہوئے کیلے کے باغ میں داخل ہو گئے۔ فائر کی آواز اور قاسو کا شور سن کر لوگ گھروں سے نکل آئے۔

قاسو لوگوں کو صورتِ حال بتانے لگا کہ وہ صحن میں بکریوں کے پاس اکیلا سویا ہوا تھا۔ جبکہ اس کا باپ اور بہن کمرے میں تھے۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ تین، چار بندے بکریاں کھول کر لے جا رہے تھے۔ اس نے فائر کیے تو بھاگ گئے۔

اسی اثنا میں بارش شروع ہو گئی۔ سب اپنے اپنے گھروں کی طرف دوڑے۔ قاسو نے دروازہ بند کیا اور صحن میں کھڑے باپ اور بہن کے پاس آگیا۔

پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہ شخص چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ اس نے آواز دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ آنے والا جا چکا تھا۔ بارش تیز ہو گئی۔ پارو اور اس کا باپ کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ قاسو نے بکریاں چھپر کے نیچے کھڑی کیں اور کمرے میں آگیا۔

☆......☆

وہ چاروں ہاتھ باندھے وڈیرے کے سامنے کھڑے تھے۔ وڈیرا وریام پورے گھنٹے سے ان کی بے عزتی کر رہا تھا۔ وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ پھر وہ گرجا۔ ''نکمے ہو تم سب نکمے جاؤ دفعان ہو جاؤ۔''

وہ سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گئے۔ اس رات وڈیرے کو دل کا دورہ پڑا۔ اسے حیدر آباد کے سرکاری اسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ پچل اس کے ساتھ رہا۔ دس دن بعد اسے چھٹی ملی تھی۔ وہ آٹھ دس دن بستر پر آرام کرتا رہا۔ جب دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ایک بار پھر پارو کی طلب میں دل مچلنے لگا۔ کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، اپنی موت سے بے خبر۔

☆......☆

وہ اپریل کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ حیدر آباد کے ریلوے اسٹیشن پر کافی رش تھا۔ ان میں مسافروں کی تعداد کم اور شہر کے لوگ زیادہ تھے۔ یقیناً وہ موسم انجوائے کر رہے تھے۔ حیدر آباد ایک تاریخی شہر ہے۔ یہاں کے لوگ بہت سادہ دل اور مہمان نواز ہوتے ہیں۔ نجانے کیوں یہاں بارشیں کم ہوتی ہیں۔ جس روز بارش ہو اس شہر کے باسیوں کے لیے عید کا دن ہوتا ہے۔ اس دن بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ اس ہجوم میں غلام رسول اور قاسو بھی شامل تھے۔ وہ من پریت سنگھ کو لینے آئے تھے۔ غلام رسول کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ کبھی بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ جاتی۔ کبھی آنکھیں نم ہو جاتیں۔

تقدیر نے انھیں جدا کیا تھا۔ اب قسمت ملانے والی تھی۔ قاسو باپ کی قلبی کیفیت سے بے خبر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

آخر انتظار کی طویل گھڑیاں مختصر ہو کر ختم ہو گئیں۔ دور سے آتی ریل گاڑی کی سیٹی سن کر اسٹیشن پر ہلچل مچ گئی۔ لوگ اپنا سامان اٹھا کر پلیٹ فارم کی جانب لپکے۔

قسمت اور ریل گاڑی ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ لوگوں کو پل میں اپنوں سے جدا کر دیتی ہیں اور ملا بھی دیتی ہیں۔ وصال راحت جاں ہوتا ہے اور وچھوڑا بہت اذیت ناک۔ سنسان ریلوے اسٹیشن ہو یا کسی کا دور جاتا موہوم عکس۔ دونوں مناظر ہی دل فگار ہوتے ہیں۔ وہ ایک مدت سے بچھڑے اب ملنے والے تھے۔ خوشیاں مقدر میں تھیں۔ ایسے ہی میں تقدیر دور کھڑی مسکرا رہی تھی۔ گویا بہ زبان خاموشی کہہ رہی ہو۔ ''میرا ہر وار کاری ہوتا ہے۔ قسمت جنھیں ملا دے۔ میں انھیں جدا کر سکتی ہوں ہمیشہ کے لیے بھی کر سکتی ہوں۔''

ریل گاڑی اب پلیٹ فارم پر رک چکی تھی۔

مسافر اترنے، چڑھنے لگے۔ وہ دونوں باپ، بیٹا اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لوگوں کے جم غفیر کی جانب بڑھے۔ غلام رسول اترنے والے مسافروں کو بغور تکنے لگا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر مسرت کا رنگ جھلک پڑا۔ اس نے نیلی پگڑی کی جھلک دیکھی تو بے اختیار اس طرف چل پڑا۔ اس نے اپنے یار پریتے کو پگڑی اور قد کاٹھ سے پہچان لیا تھا۔ بلاشبہ وہ من پریت سنگھ ہی تھا جو کہ متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی نظر اپنی جانب بڑھتے غلام رسول پر پڑ گئی۔ وہ بھی اس کی طرف چل پڑا۔ گو کہ گردش ایام نے دونوں کے خال وخد پر برا اثر ڈالا تھا لیکن دل کے رشتے یار کی خوشبو سے جان لیتے ہیں، پہچان لیتے ہیں۔

''اوئے گامیا۔''

''پریتے۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو پرانے ناموں سے پکارا۔

اگلے ہی لمحے وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو گرم جوشی سے بھینچ رہے تھے۔ آنکھوں سے بہتے آنسو ان کی قلبی کیفیت کے غماز تھے۔

محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور نہ یہ سرحدوں کی پرواہ کرتی ہے۔

اسی اثنا میں ریل گاڑی نے اسٹیشن چھوڑ دیا۔ وہ روتے رہے۔ لوگ متجسس نظروں سے انھیں دیکھ کر آگے بڑھ جاتے۔ وچھوڑا کا درد آنسوؤں کی شکل میں نجانے کب تک بہتا رہتا۔ قاسو آگے بڑھا اور انھیں ایک دوسرے کی بانہوں کے ''کلاوے'' سے نکال دیا۔

دونوں آنسو پونچھنے لگے پھر غلام رسول نے قاسو کا تعارف کروایا۔ دونوں گلے ملے۔ قاسو نے من پریت سنگھ کا

اٹیچی کیس اٹھالیا اور تینوں اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔

کچھ دیر بعد وہ تانگے پر بیٹھے گوٹھ کی طرف جا رہے تھے۔

گھوڑا سبک روی سے کچی سڑک پر چلتا رہا۔ وہ باتیں کرتے رہے، قہقہے لگاتے رہے پھر من پریت سنگھ نے کوئی فرمائش کی۔ غلام رسول کچھ لمحے خاموش ہوا اور اگلے ہی پل اس کی پرسوز آواز آزاد فضاؤں اور کھیت کھلیانوں پر سحر پھونکنے لگی۔

باغ بہاراں تے گلزاراں، بن یاراں کس کاری
یاراں ملن دکھ جان ہزاراں، شکر گراں لکھ واری

اس لمحے دونوں خود کو بھنگے والا کے ماحول میں محسوس کر رہے تھے۔

☆......☆

وہ ایک اندھیری شب تھی۔ آخری راتوں کا چاند فجر کے وقت آکاش کے سینے پر جلوہ افروز ہوتا تھا۔ اندھیری رات کے من میں بہت کچھ چھپا ہوتا ہے۔ نیکی بھی اور برائی بھی۔ من پریت سنگھ کو ان کے پاس آئے چوتھا دن تھا۔ اس نے اپنی کہانی سنائی جو کہ بڑی دلدوز تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے ہاں ایک بیٹی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی بیٹی کی پیدائش کے فوراً بعد مر گئی۔ اس نے اپنی بیٹی کا نام جسونت رکھا تھا جسے پیار سے جسی کہا کرتا تھا۔ اس کے بھائی دلجیت سنگھ نے شادی نہیں کی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ دونوں بھائیوں نے جسی کی پرورش کی۔ جب وہ جوان ہو گئی تو وہاں کے ایک ٹھاکر کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ٹھاکر کو دلجیت سنگھ نے قتل کر دیا۔ دلجیت جیل ہی میں مر گیا تھا۔ وہ دونوں آنے والے وقت سے بے خبر تھے۔ ان چار دنوں میں وہ گزرے وقت کے بیتے پل یاد کرتے رہے۔ اس رات بھی غلام رسول اور من پریت سنگھ ماضی کے گہرے سمندر میں غوطہ زن تھے۔

"من پریت ویر! وہ ایک گلزاری ہوا کرتا تھا۔ اس کی کوئی خیر خبر سناؤ؟"

غلام رسول کو اچانک گلزار عرف گلزاری یاد آیا۔ گلزار جو کہ مسلمان تھا۔ اپنے بوڑھے ماں باپ کا اکلوتا سہارا۔ پھر کچھ یوں ہوا کہ اس کا باپ برکت ایک دن چل بسا۔ اس کے دو ماہ بعد ماں رحمت بی بی کی سانسیں پوری ہو گئیں۔ دونوں کا ایک ساتھ گزر جانا دس سالہ گلزار کے لیے ذہنی دھچکا ثابت ہوا۔ اس کا دماغی توازن خراب ہو گیا۔ وہی گلزار جو صبح سویرے باپ کے ساتھ گاؤں کی کچی مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرتا تھا۔ اس نے ساتھ والے قصبے کے مندر کی سیڑھیوں پر ڈیرا جما لیا۔ ہاں، کبھی کبھار وہ مسجد میں رات کو آکر سو جاتا تھا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ وہ مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں کا سانجھا بن گیا۔ مسجد کا مولوی امام بخش ہو یا مندر کا پنڈت سریش رام، یا کسی سردار کا ڈیرا سب اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتے تھے۔ اسے لنگر یا پرساد سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ بس اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کھانے کی احتیاج تھی۔ بٹوارے کے وقت غلام رسول اسے پاکستان لانا چاہتا تھا لیکن وہ چھپ گیا۔ تاہم من پریت سنگھ نے یقین دلایا کہ وہ گلزاری کا خیال رکھے گا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ ان دونوں کو دوسروں کی طرح یقین تھا کہ جلد ہی ملک پھر سے ایک ہو جائے گا۔ مسلمان دوبارہ اپنے گھر لوٹیں گے۔

گلزاری کا نام سن کر بوڑھے من پریت سنگھ کے چہرے پر کرب آمیز کیفیت طاری ہوئی۔ کچھ دیر چپ رہا، پھر گہری سانس لے کر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "گامے! جدوں پاکستان بن گیا سی۔ اوس توں بعد جہڑے مسلمان ہندوستان رہ گئے سن۔ اونھاں تے وڈے ظلم ہوئے سی۔" (گامے! جب پاکستان بن گیا تھا۔ اس کے بعد جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے تھے۔ ان پر بڑے ظلم ہوئے تھے)

پھر وہ تفصیل سے سب بتانے لگا۔ جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

قیام پاکستان کے بعد جو مسلمان کسی نہ کسی وجہ سے پاکستان نہ آسکے۔ ان پر انتہا پسند ہندوؤں نے یہ کہہ کر ظلم ڈھانا شروع کر دیا کہ جب ان لوگوں نے اپنا ملک زبردستی بنا لیا ہے تو یہ سب ادھر جا کر رہیں۔ گلزاری کو بھی ہندوؤں نے شہید کر دیا تھا۔

☆......☆

وہ ایک دلفریب صبح تھی۔ پارو اور جنداں حسب معمول پانی بھرنے نہر پر گئیں۔ جب وہ پانی بھر کر واپس آ رہی تھیں۔ راستے میں وڈیرے کی جیپ آتی نظر آئی۔ وہ راستے کے ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ جیپ ان کے قریب آکر رک گئی۔ وڈیرا وریام نیچے اترا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ سہم گئیں۔ پارو کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وڈیرا قریب آکر رک گیا اور پارو کی طرف ہوس زدہ نظروں سے دیکھنے لگا پھر اچانک جیسے پارو کو ہوش آ گیا۔

"چلو۔" اس نے قریب کھڑی جنداں کو ٹہوکا دیا۔

پھر خود بھی قدم بڑھایا لیکن وڈیرے نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا، چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر بولا۔ "اڑے بابا! تم لوگ گوٹھ میں نئے آئے ہو۔ بس سوچا تھوڑا تعارف شعارف ہو جائے۔"

"سائیں! جو بھی پوچھنا ہو میرے بابا سے پوچھ لیجیے گا۔" پارو نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ہم پوچھ لیں گے۔ پہلے ہم ایک دوسرے کو اپنا تعارف تو کروا دیں۔" پھر وہ اپنے بارے میں بتانے لگا۔ پارو چپ چاپ کھڑی رہی پھر اس نے آگے بڑھنا چاہا تو وڈیرے نے اس کی کلائی پکڑ لی، بولا۔ "اڑے بابا اپنے بارے میں تو کچھ بتاتی جاؤ۔"

"سائیں میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے زور لگانا شروع کر دیا۔ وڈیرے کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ وہ مچلنے لگی۔ گھڑا نیچے گر پڑا پھر اچانک پارو نے اس کے ہاتھ پر دانت گاڑھ دیے۔ وڈیرے کے منہ سے سسکاری نکلی۔ اس نے کلائی چھوڑ کر پارو کو دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر سنبھل گئی۔

"کتیا تیری تو میں......" وہ گالیاں دیتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

جنداں اس صورتِ حال پر پریشان ہو گئی پھر وہ آگے بڑھی اور وڈیرے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ "سائیں! اسے معاف کر دو۔"

وڈیرے نے اسے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر زمین بوس ہو گئی۔ وہ پارو پر جھپٹا۔ اس نے تیزی سے اپنا بچاؤ کیا اور پوری قوت سے دائیں ہاتھ سے تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیا۔

وہ گنگ رہ گیا۔ احساس تذلیل سے اس کا چہرہ سرخ ہوا اور وہ دل تھام کر نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ اس مشقت نے بلڈ پریشر بڑھا دیا تھا پھر وہ بمشکل اٹھا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ خون بہنے لگا تھا۔

وہ خشمگیں نگاہوں سے دیکھتا ہوا جیپ میں جا بیٹھا۔ اس کی آنکھیں بے زبان خاموشی آنے والے طوفان کا پتا دے گئیں۔ پارو اور جنداں بھی سہمی سہمی سی گوٹھ کی طرف چل پڑیں۔

☆......☆

رات گزر گئی۔ اگلی صبح اس کا باپ، بھائی اور من پریت کھیتوں میں چلے گئے۔ پارو وڈیرے کے بارے سوچنے لگی۔ وہ کمرے میں اکیلی تھی۔ خوشگوار ہوا کے جھونکے کھڑکی سے اندر آ رہے تھے۔ تاہم چارپائی پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی پارو کے ذہن میں سوچوں کے بھنور بن رہے تھے۔ وہ خود کو ایک ان دیکھے جال میں محسوس کر رہی تھی۔ اس نے ابھی تک اپنے باپ کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ جنداں کو بھی سختی سے منع کر دیا تھا۔ وہ اکیلی ہی اس حالات سے نبرد آزما تھی۔

وہ جان گئی تھی کہ وڈیرا وریام جکھرانی اب اس کی عزت کے درپے ہے۔ جلد یا بدیر یقیناً وہ اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔

اس کا جرم غیر معمولی تھا۔ وڈیرے کے چہرے پر تھپڑ مارنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وڈیرے کینہ پرور ہوتے ہیں۔ اپنے سینے میں بدلے کی آگ کو کبھی بجھنے نہیں دیتے۔

وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر کمرے کے کچے فرش پر ٹہلتی رہی جیسے کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہو۔ آخر ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔ ہاں اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے بھائی قاسم عرف قاسو کو اس صورتِ حال سے آگاہ کر دے گی۔

"پارو۔ اے پارو کہاں ہو دھی رانی؟" اس کے باپ غلام رسول کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی من پریت سنگھ کا قہقہہ سنائی دیا۔ وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکلی۔ وہ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔

"جی بابا۔" پارو نے قریب جا کر دھیمے لہجے میں کہا۔

"دھی رانی لسی لے آؤ۔"

"اچھا بابا! ابھی لاتی ہوں۔"

اس نے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجا کر کہا۔ پھر چھپر کے نیچے رکھی "چاٹی" کی طرف بڑھ گئی۔

تبھی من پریت سنگھ گویا ہوا۔ "گامے! میں کل توں محسوس کر رہیا آں۔ پارو دھی نوں کوئی مسئلہ اے۔" (گامے میں کل سے محسوس کر رہا ہوں۔ پارو بیٹی کو کوئی مسئلہ ہے۔)

غلام رسول چونکا، پھر بولا۔ "وہ کیسے؟"

"یار سدھی تے صاف جہی گل اے۔ اوہ چپ چپ اے۔"

(یار سیدھی اور صاف سی بات ہے۔ وہ خاموش خاموش سی ہے)۔ من پریت نے گویا انکشاف کیا۔

"اچھا میں پوچھتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد پارو لسی لے کر آ گئی۔

"پارو دھی! ایک بات سچ بتاؤ۔ کیا وجہ ہے؟ تم چپ چپ ہو۔" غلام رسول نے جگ اس کے ہاتھ سے پکڑا۔

"کک...... کچھ نہیں بابا۔" وہ ہڑبڑا گئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" غلام رسول نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اسی اثنا میں قاسو بھی آگیا۔ وہ لسی پینے لگے۔

کچھ دیر بعد غلام رسول نے پھر وہی بات چھیڑ دی۔ پارو ٹال مٹول کرتی رہی۔ بالآخر ایک گھنٹے کی تگ و دو کے بعد ان تینوں نے حقیقت اگلوا لی۔ قاسو فرط جوش سے کانپنے لگا۔ تاہم من پریت سنگھ نے اسے سمجھایا کہ وقت آنے دو۔ اس کا حل بھی سوچ لیتے ہیں۔

قاسو نے سوچ لیا کہ اب وہ رات کو ایک آدھ چکر گھر کا لگایا کرے گا۔

☆......☆

سیانے کہتے ہیں کہ سانپ ایک خطرناک جانور ہوتا ہے۔ اگر کسی کو ڈس لے تو سانسیں چھین لیتا ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کی روزی روٹی کا ذریعہ یہی سانپ ہوتے ہیں۔ اس کا باپ خیر محمد عرف خیرو ایک سپیرا تھا۔ جس کے کندھے سے لٹکتے "جھولے" میں آٹھ، دس سانپ ضرور ہوتے تھے۔ اس کی ساری زندگی سانپوں کے درمیان گزری پھر سانپ کے ڈسنے سے ہی جاں بحق ہوا تھا لیکن مرنے سے پہلے وہ اس کے ذمے ایک کام لگا گیا تھا۔ وہ وقت جب خیرو نے موت کی آخری ہچکی لینے سے قبل اٹکی ہوئی سانسوں کے درمیان ایک پٹاری کی طرف اشارہ کیا۔ "ہن میں تھنجی پھی جی قاتل جی موت بند آھی۔"

(اس میں تیری پھپھو کے قاتل کی موت بند ہے)

بس اتنا بتا کر وہ مرگیا تھا لیکن اس کے ناتواں کندھوں پر بھاری ذمہ داری کا بوجھ ڈال گیا۔ بعدازاں اسے گوٹھ کے بڑوں سے حقیقت کا پتا چلا۔ اس کا باپ خیرو تھرپارکر کی ایک گوٹھ کا باسی تھا۔ قیام پاکستان سے قبل اس نے اتر پردیش میں موجود اپنے رشتے داروں میں شادی کی۔ اس کی ماں اسے جنم دے کر مرگئی پھر اس کی پھوپی سکینہ نے اسے پالا پوسا۔ پاکستان بنا تو وہ لوگ تھرپارکر کی گوٹھ میں ہی ٹک گئے۔

گرمی کے دنوں میں اکثر سپیرے حیدرآباد اور کراچی کے مضافات میں عارضی طور پر نقل مکانی کر جایا کرتے تھے۔ ایک بار سپیرے حیدرآباد کے نزدیک ایک گوٹھ میں ڈیرا لگا کر بیٹھے، تو ایک مقامی وڈیرے کی نظر سکینہ پر پڑگئی۔ پھر اسی رات اسے اٹھا لیا گیا۔ اس واردات کا خیرو چشم دید گواہ تھا۔ وہ مقامی پولیس چوکی پر وڈیرے کے خلاف پرچہ کٹوانے گیا تو بے عزت ہوکر واپس آیا۔ دو دن بعد سکینہ کی لاش مل گئی۔ لاش کیا ایک کالک تھی جو خیرو کے چہرے پر مل دی گئی تھی۔ وہ بہن کی لاش لے کر تھرپارکر واپس آگیا پھر کچھ عرصے بعد خود بھی مرگیا۔ یہ سب ایک بزرگ سپیرے نور بخش عرف نورو نے اس کے باپ کی موت کے بعد بتایا تھا۔ اس نے بیس سال گوٹھ میں گزارے پھر وہ کراچی چلا گیا۔ کراچی میں ہی اس نے گاڑی چلانا سیکھی۔ وہ دس سال پٹاری کو ساتھ لیے پھرتا رہا۔ اس پٹاری میں سیاہ موت تھی۔ بلیک کوبرا۔ جس کا ڈسا مشکل سے بچتا ہے۔

اس نے پٹاری پر ہاتھ پھیرا تو بلیک کوبرے کی پھنکار سنائی دی۔

یہ پھنکار نہیں موت کا پیغام تھا۔ اب اسے نکالنے کا وقت آگیا تھا۔ اس نے پٹاری ہاتھ میں پکڑی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆

وڈیرا وریام بیڈ پر لیٹا آنے والے پُرکیف لمحات کے بارے سوچنے لگا۔ اب وقت آگیا تھا کہ وہ پارو سے بدلہ لے سکے کیونکہ ایسا پہلی بار ہوا کہ کسی نے اس کے چہرے پر تھپڑ مارا تھا۔ ہاں پہلی بار اس کی بے عزتی ہوئی۔ وہ بھی ایک لڑکی کے ہاتھوں۔

اس کے کارندے پارو کو اٹھانے جا چکے تھے۔ ایک اور لڑکی کی عزت خاک میں ملنے والی تھی جسے بعد میں کہیں ٹھکانے لگا دینا تھا۔

اس نے گہری سانس خارج کی، بڑبڑایا۔ "آج اس کے سارے کس بل نکال دوں گا۔"

لیکن انسان کا ہر ارادہ اور سوچ کہاں پوری ہوتی ہے؟

اسی وقت دروازے کے قریب کوئی آکر رک گیا پھر اس نے آہستگی سے دروازہ اندر دھکیلا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ آنے والا اندر داخل ہوگیا پھر اس دروازے کی کنڈی لگا دی۔ کمرے میں موم شمعدان کی خواب ناک روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وڈیرے نے چونک کر آنے والے ڈھاٹا پوش کی طرف دیکھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ اس نے خود کو سیاہ لبادے میں چھپایا ہوا تھا۔ اپنے گھر میں بلی بھی شیر ہوتی ہے۔ وہ وڈیرا وریام تھا جس کے گوٹھ کے لوگوں پر اک دہشت طاری تھی۔ اس نے رعب دار لہجے میں پوچھا۔ توں کیر آھین؟ (کون ہو تم؟)

"ماں موت جو فرشتو آھیاں۔" (میں موت کا فرشتہ

ہوں) ڈھاٹا پوش نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔

جواب میں وڈیرے نے فحش گالی دی پھر چیخ کر بولا۔ "میں وڈیرا وریام ہوں۔ لوگوں میں موت بانٹتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ تجھے تیری موت ادھر لے آئی ہے۔"

ڈھاٹا پوش نے لبادے سے ہاتھ باہر نکالا پھر سرد لہجے میں کہا۔

"تھنجی ھتھ میں تھنجی موت آ۔" (میرے ہاتھ میں تیری موت ہے۔)

وڈیرا پٹاری دیکھ کر خوفزدہ ہوگیا۔ تاہم سنبھل کر بولا۔ "خنزیر کے بچے! اپنا چہرہ تو دکھا۔"

ڈھاٹا پوش نے پٹاری دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کی اور چلتا ہوا وڈیرے کے قریب آگیا۔

"یہ لو اپنے باپ کو پہچان لو۔" یہ کہہ کر اس نے ڈھاٹا کھول دیا۔

"سچ...... سچل تم!" وڈیرے نے استعجاب آمیز لہجے کہا۔

"ہاں میں سچل ہوں۔ خیرو سپیرے کا بیٹا۔ جس کی بہن یعنی میری پھوپی کو تم نے اغوا کروایا پھر عزت لوٹ کر مار ڈالا تھا۔"

وڈیرے کے ذہن میں ماضی کی فلم چلنے لگی۔ اسے آن واحد میں سب یاد آگیا۔ اتنی دیر میں سچل نے پٹاری پر لپٹی رسی کھول دی پھر وڈیرے کی حالت دیکھ کر استہزائیہ انداز میں ہنس کر اس کی جانب بڑھا۔ وڈیرا چیخنے چلانے اور گالیاں دینے لگا۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ سچل دونوں بار پارو کو اٹھانے کیوں نہیں گیا تھا؟

سچل نے پٹاری کا ڈھکن تھوڑا سا اوپر اٹھا کر نیچے کیا۔ وڈیرا تھر تھر کانپنے لگا۔

سچل بولا۔ "افسوس تجھے بچانے والے پارو کو اٹھانے گئے ہیں۔ میں نے اتنے دن تمھارے ساتھ اس لیے گزارے کہ شاید تم سدھر جاؤ لیکن تم کتے کی دم ہو جو کبھی سیدھی نہیں ہوسکتی۔"

یہ کہہ کر اس نے پٹاری پر ہاتھ مارا اور ڈھکن اٹھا دیا۔ کوبرا پھن پھیلا کر کھڑا ہوگیا۔ سچل نے پٹاری کو زور سے جھٹکا دیا۔ کوبرا پھسل کر وڈیرے پر جا گرا۔ اگلے ہی لمحے اس نے بازو پر ڈس لیا۔ وہ چیخ کر بستر پر گر پڑا۔ یہ بات قابل حیرت تھی کہ وہ بستر سے نیچے نہیں اترا تھا۔ حالانکہ اسے چاہیے تھا کہ تگ و دو کرتا۔ سچل پٹاری ہاتھ میں پکڑے کمرے سے باہر نکل آیا۔ کچھ دیر بعد وہ گوٹھ کی طرف جارہا تھا۔

☆......☆

سچل گوٹھ میں پہنچا تو میدان کارزار گرم ہوچکا تھا۔ دو بندے پارو کو کندھے پر لادے گھر سے نکل رہے تھے۔ اسی وقت بندوق تھامے دوڑتا ہوا قاسو بھی گلی میں داخل ہوا۔ اس نے للکارا تھا کہ ڈھاٹا پوش نے گولی چلا دی۔ گولی قاسو کے کندھے میں پیوست ہوئی تھی کہ اس کے عقب سے کسی نے ڈھاٹا پوش پر فائر کردیا۔ قاسو نے مڑ کر دیکھا۔ وہ سچل تھا۔

کارتوس کے چھروں نے ڈھاٹا پوش کا جسم چھلنی کردیا تھا۔ دونوں ڈھاٹا پوش زمین پر گرے۔ تڑپ رہے تھے پھر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہوگئے۔ سچل کے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی۔ وہ شکاریوں کی لاشوں کے پاس سے گزرتا ہوا قاسو کے پاس آگیا۔ چاند کی روشنی میں اس نے سچل کو پہچان لیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ وڈیرے وریام کے کارندے نے اپنے بندوں پر فائر کھولا تھا۔ اسے دو جمع دو چار کرنے میں چار سیکنڈ بھی نہ لگے۔ وہ سمجھ گیا کہ سچل ہی تھا جس نے دوبار انہیں عین وقت پر جگا کر خبردار کیا ورنہ وڈیرے کے بندے اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہوجاتے۔

وہ آگے بڑھا اور سچل کو سینے سے لگا لیا پھر شدت جذبات سے مغلوب تشکر آمیز لہجے میں بولا۔ "مہربانی سچل ادا۔"

کچھ پل وہ گلے ملے پھر سچل بولا۔ "آؤ ادا گھر چلتے ہیں۔"

پھر انہوں نے دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ وہ گھر میں داخل ہوگئے۔ قاسو کی نظر اپنے باپ پر پڑی تو ٹھٹک کر رک گیا۔ پھر وہ مڑتے ہوئے من پریت کی طرف بڑھے۔ اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ تاہم وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا۔ گامے نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ "یہ کیا ہوگیا پربیتے ویر؟"

"یہ تو ہونا تھا!" من پریت کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اصل میں ہماری نجات صرف قیام پاکستان میں نہیں تھی، ہمارا اصل مسئلہ اقتدار و اختیار کے مالک وہ چوہدری، وڈیرے، ملک، ٹھاکر، برہمن اور دھن وان ہیں جو بلا امتیاز مذہب ہم پر مسلط ہیں۔ ہم اکٹھے تھے تب بھی ہماری عزتوں اور عصمتوں کی بلی دی جاتی رہی ہے اور آج جب ہم علیحدہ ہوگئے ہیں تب بھی ہماری عزتیں اور جان و مال محفوظ

نہیں۔ یہاں تمھاری پارو محفوظ نہیں اور وہاں میری دھی جسی (جسونت) ٹھاکروں کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ جب تک ہم انصاف کے حصول کو اس نہج تک نہیں لے آتے کہ عدالت کا کٹہرا ہر ظالم کے لیے انصاف کا ترازو نہ رہے تب تک دونوں ملکوں میں یہی ہوتا رہے گا۔'' من پریت کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ اس کے منہ سے نکلتے خون کو دیکھ کر گامے کو اس کی موت کا یقین ہو گیا۔ بس وہ کچھ لمحوں کا مہمان تھا۔

''بھرا جی!..... میرا وقت پورا ہو گیا ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ اپنی دھی پارو کو بچ..... جس..... جسی..... کی طرح درندوں......!''

اس کے ساتھ ہی اس کا سر ڈھلک گیا۔ غلام رسول نے آگے بڑھ کر اس کی نبض دیکھی جو چل رہی تھی۔ بچل نے کہا۔

''چاچا یہ غیر ملکی ہے اور اگر اسے کچھ ہو گیا تو بہت بڑا بکھیڑا کھڑا ہو جائے گا۔ اسے لے کر فوراً حیدرآباد چلیں۔ میں وڈیرا کی جیپ لا رہا ہوں۔''

''لیکن اس کے ویزا فارم میں تو میرا نام ہے۔ پولیس پھر بھی ہم سے پوچھے گی۔ پورے گاؤں نے ڈاکوؤں کا حملہ دیکھا ہے۔ بیان میں ہم بتائیں گے کہ اسے بھی ڈاکو کی گولی لگی ہے۔''

آخری وقت میں بھی اس نے اپنے یار گامے کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ غلام رسول دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ دور کھڑی تقدیر مسکرا رہی تھی۔ من پریت سنگھ اور گامے کا یہ ملاپ اور وچھوڑا قسمت اور تقدیر کا کھیل تھا۔

اس خونی رات میں چار قتل ہوئے تھے۔ پولیس تک اطلاع پہنچانا ضروری تھا۔ بچل آنے والے وقت کے بارے سوچنے لگا پھر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

پھر وہ قاسو کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''ادا!..... آپ فکر نہ کریں۔ ان خبیثوں کے قتل کا الزام میرے سر پر ڈال دینا۔ پولیس کے آنے تک میں یہاں رہوں گا۔''

''مگر بیٹا آپ؟'' پارو کے باپ نے روتے روتے کچھ کہنا چاہا لیکن بچل قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

''چچا جان! آپ کے دوست نے بالکل صحیح کہا کہ جب تک ہم ان وڈیروں، چودھریوں، ملکوں اور قانون کو گھر کی باندی سمجھنے والوں کو قانون کے تابع نہیں کر دیتے ہم یوں ہی تباہ و برباد ہوتے رہیں گے۔'' آخر میں اس نے انکشاف آمیز لہجے میں بات مکمل کی۔ ''اسی لیے میں نے وڈیرے کو موت دے دی۔''

''کک..... کیا..... وڈیرے وریام کو تم نے مار ڈالا؟'' قریب کھڑے قاسو نے حیرت آمیز لہجے میں استفسار کیا۔

''ہاں رات اسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

فائرنگ اور اس کے بعد غلام رسول کے رونے کی آواز سن کر گوٹھ کے لوگ بھی آ گئے۔

اسی اثنا میں فجر کی اذان کی صدا بلند ہوئی۔ بچل وہاں سے نکلا۔ اب اس کا رخ مسجد کی طرف تھا۔

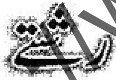
اس نے مسجد میں وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کی اور دیر تک رو رو کر دعا مانگتا رہا پھر جب وہ مسجد سے نکلا تو مشرقی افق پر سورج کا سرخ تھال نمودار ہو رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا جائے وقوعہ پر آ گیا۔ پھر اس نے قاسو کو حویلی میں لے جا کر ساری روداد مختصر کر کے سنا دی۔ اس لمحے بچل نے محسوس کیا کہ پارو کے چہرے پر اطمینان بھری لہر دوڑ گئی تھی۔ اس نے چشم تصور سے اپنی پھوپی کو دیکھا۔ کہیں دور کھڑی وہ بھی مسکرا رہی تھی۔ شاید اس کی روح کو قرار آ گیا تھا۔

سورج کے بلند ہوتے ہی وڈیرے وریام کی موت کی خبر گوٹھ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

آٹھ بجے کے لگ بھگ پولیس چوکی سے تھانیدار اللہ ڈیوایا چار سپاہیوں کے ہمراہ آ گیا۔ وہ پہلے حویلی میں گیا۔ وہاں سے ہو کر ہی ادھر آیا تھا۔ وڈیرے کے کمرے میں کوبرا سانپ کی موجودگی نے موت کی وجہ عیاں کر دی تھی۔ وڈیرے کے کمرے سے ''دونوں سانپوں'' کو مردہ حالت میں باہر نکالا گیا۔ وڈیرا وریام سانپ ہی تو تھا۔ جو گوٹھ کی لڑکیوں کو کافی عرصے سے ڈس رہا تھا۔ تھانے دار اللہ ڈیوایا نے پوری چھان بین کی پھر لاشیں سرکاری اسپتال بھیج دیں۔ تاہم وہ بچل کو اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں جانے سے پہلے بچل نے پارو کی طرف دیکھا تھا۔ وہ کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ پارو کی نگاہوں نے بھی گھر کے دروازے سے نکلنے تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد گاما ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ قیام پاکستان کے وقت بچھڑنے والے مل کر اب ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے تھے۔





جناب معراج رسول
السلام علیکم
اپنا نام مخفی رکھ کر اپنی زندگی کا ایک بڑا راز آشکار کررہا ہوں۔ یہ بچہ جو میرے گھر میں پرورش پا رہا ہے یہ میرا نہیں ہے مگر میری بیوی ہی اس کی ماں ہے اور دنیا والے سمجھتے ہیں کہ وہ میرا بچہ ہے۔ حقیقت کیا ہے یہ آپ خود پڑھ لیں۔

ندیم احسن
(کراچی)

اپنے استاد کرامت کی بات یاد آ گئی تھی۔

استاد نے کہا تھا کہ اگر تم کسی شادی شدہ عورت کو قابو میں رکھنا چاہتے ہو تو اس کے بچے کو خود سے مانوس کر لو۔ اتنا پیار دو اس بچے کو کہ وہ عورت تم پر بھروسا کرنے لگے۔ پھر وہ عورت بچے کی محبت میں تمہارے قریب آ جائے گی۔ مجھے ایسا موقع اس دن مل گیا جب میں نے اس عورت کو اور اس کے بچے کو دیکھا۔

میں کسی کام سے کراچی سے حیدرآباد جا رہا تھا۔ لانگ

روٹ کے بس اسٹاپ پر وہ عورت دکھائی دے گئی تھی۔

اور اس کو دیکھتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔ کیا خوب صورت عورت تھی اور اس کا بچہ بھی بہت خوبصورت تھا۔

ہم ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اور بھی مسافر تھے، لیکن میری دید کا مرکز تو وہ عورت تھی۔ اس کا بچہ اِدھر سے اُدھر پھدکتا پھر رہا تھا۔ ایسے پیارے بچوں کو تو دیکھ کر ویسے ہی پیار آجاتا ہے اور یہاں تو ان کی ماں بھی خوب صورت تھی۔

ایک بار وہ بچہ میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے اس کے گالوں کو تھپک دیا۔

وہ عورت مسکرا کر رہ گئی تھی۔ میری ہمت بڑھی تو میں نے اپنی جیب سے بسکٹ کا چھوٹا پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''لو بیٹا۔''

اس دوران وہ عورت اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آگئی۔ ''ارے یہ آپ کیا کر رہے ہیں رہنے دیں۔ اس کی عادت خراب ہوجائے گی۔''

''بچہ ہے محترمہ۔'' میں نے کہا۔ ''سارے بچے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ بھی بچپن میں ایسی ہی ہوں۔''

اس بار اس کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی اور میں نے دل ہی دل میں استاد کرامت زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ وہ کوئی باقاعدہ استاد نہیں تھے بلکہ اس قسم کے سبجیکٹ کے ماہر تھے۔ ہم سب اپنے عشق کی داستانیں ان کو سنایا کرتے اور وہ مشورے دیا کرتے۔

بہت قیمتی مشورے ہوتے تھے ان کے۔ تو یہ ماں اور بچے والا مشورہ بھی ایک بار انہوں نے دے دیا تھا جو مجھے یاد رہ گیا تھا۔

بچے نے ضد کی تو میں نے پیکٹ سے بسکٹ نکال کر بچے کے حوالے کردیا۔ اس دوران اس خوب صورت بچے کی خوب صورت ماں بھی ایک کرسی چھوڑ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''نام کیا ہے بچے کا۔'' میں نے بچے پر توجہ مرکوز کر رکھی تھی۔

''خرم۔'' اس نے بتایا۔

''بہت خوب صورت نام ہے اور ہے بھی ماشاء اللہ بہت پیارا۔'' جی چاہا کہ اس کا بھی اضافہ کردوں کہ بالکل آپ کی طرح۔

ظاہر ہے میں اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا اس لیے میں نے ایک اور بات کی۔ ''آپ شاید اکیلے سفر کر رہی ہیں؟''

''جی ہاں حیدرآباد جا رہی ہوں۔ وہاں میری بہن اور بہنوئی اسٹاپ پر آجائیں گے۔''

اس دوران بچے نے ایک بسکٹ ختم کرلیا تھا۔ میں نے پیکٹ سے دوسرا بسکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ بچے نے ایک نظر اجازت مانگنے والے انداز میں اپنی ماں کی طرف دیکھا پھر جب اس عورت نے اپنی گردن ہلا دی تو اس نے وہ بسکٹ لے لیا تھا۔

بس آنے میں ابھی دیر تھی۔ میں نے کچھ جھجکتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ ''کیا آپ حیدرآباد میں رہتی ہیں، یا کراچی میں؟''

''کراچی میں۔'' اس نے بتایا۔ ''گلبرگ میں۔''

میرے لیے یہ ایک اشارہ تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں نارتھ ناظم آباد میں رہتا ہوں۔ ایچ بلاک میں۔ پشاوری آئس کریم والی گلی میں۔ آپ نے حیدری مارکیٹ تو دیکھی ہو گی۔''

''کیوں نہیں وہیں سے شاپنگ ہوتی ہے۔'' اس نے بتایا۔

بچہ اب اپنی ماں سے آئس کریم کی ضد کر رہا تھا۔

''اچھا اچھا دلاتی ہوں۔''

میں یہ موقع کیسے ہاتھ سے جانے دے سکتا تھا۔ میں فوراً ایک کر آئس کریم کی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ جو ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے دو کپ آئس کریم لیے اور واپس آکر ایک کپ اس عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ برا نہ مانیں تو یہ آپ کے لیے ہے اور یہ بچے کے لیے ہے۔''

''ارے یہ آپ نے کیا کیا۔''

''کچھ نہیں بچہ ضد کر رہا تھا میں نے سوچا ایک آپ کے لیے بھی لے لوں، پلیز۔''

اس نے جھجکتے ہوئے وہ کپ لے لیا۔ دوسرا کپ میں نے کھول کر بچے کو پچکارا۔ ''آؤ بیٹا میں کھلا دیتا ہوں۔''

بچے نے ایک بار پھر اجازت طلب نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ بچے کو اشارہ مل گیا تھا۔ وہ میری کرسی کے پاس آگیا۔

وہ عورت اپنی آئس کریم کا کپ ختم کرچکی تھی۔ اس

نے مجھ سے کہا۔ ''آپ دو منٹ کے لیے خرم کو سنبھالیں میں واش روم......''

''ہاں ہاں جائیں۔''

وہ واش روم کی طرف چلی گئی۔ میں بچے کو آئس کریم کھلانے کے ساتھ ساتھ اس سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔

''ہاں بھائی تم تو بہت اچھے بہت پیارے بچے ہو یار، تم تو ضد بھی نہیں کرتے۔ روتے بھی نہیں ہو۔ کوئی بدتمیزی بھی نہیں کرتے۔ شاباش۔''

یہ سب کچھ مجھے بہت عجیب اور مضحکہ خیز سا لگ رہا تھا لیکن ضروری بھی تھا۔ اس کی ماں سے بے تکلفی کا سلسلہ تو شروع ہو ہی چکا تھا۔

استاد کرامت پھر یاد آنے لگے تھے۔ کیسے زبردست مشورے ہوتے تھے ان کے۔

اچانک دو تین آدمی میرے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ ان آدمیوں کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ وہ سب غصے میں بپھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

وہ بچہ ان لوگوں کو دیکھ کر ان میں سے ایک شخص کی ٹانگوں سے جا کر لپٹ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس شخص سے مانوس ہے۔

''بدمعاش ہمارے بچے کو کہاں اٹھا کر لے جا رہا تھا۔'' ایک آدمی نے مجھے کالر سے پکڑ لیا۔

اس ناگہانی افتاد پر میں بری طرح گھبرا گیا تھا۔

''ارے نہیں بھائی میں ایک شریف آدمی ہوں۔ کیا میں بچہ اغوا کرنے والا دکھائی دے رہا ہوں۔''

''پھر یہ بچہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟''

''اس کی ماں میرے پاس چھوڑ کر واش روم کی طرف گئی ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''میں اسے آئس کریم کھلا رہا تھا بس اتنا سا قصور ہے میرا۔''

کالر پکڑنے والے نے میرا کالر چھوڑ دیا تھا۔ ''اس عورت سے تیرا کیا تعلق ہے۔'' اس بوڑھے نے پوچھا۔ جس کی ٹانگوں سے وہ بچہ ابھی تک لپٹا ہوا تھا۔

''کوئی تعلق نہیں ہے بھائی، میں تو حیدرآباد جا رہا تھا۔ وہ عورت یہیں ملی ہے مجھے۔ بچہ مجھے پیارا لگا میں اس سے پیار کرنے لگا بس اتنی سی بات ہے۔''

''یہ میرا پوتا ہے خرم۔'' اس بوڑھے نے کہا۔

''ہاں اس عورت نے اس بچے کا یہی نام بتایا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''کہہ رہی تھی حیدرآباد جا رہی ہوں۔''

''ارے وہ کمینی اپنی بہن کے پاس جا رہی ہوگی۔'' ان کے ساتھ آنے والی عورت بول پڑی۔

''لیکن وہ گئی کہاں۔''

''واش روم کی طرف گئی تھی جناب۔'' میں نے بتایا۔

''جائیں اماں ذرا واش روم میں جا کر دیکھیں۔'' میرا کالر پکڑنے والے نے اس عورت سے کہا۔

وہ عورت زنانہ واش روم کی طرف چلی گئی۔

میں وہاں خوانخواہ تماشا بن کر رہ گیا تھا۔ آس پاس کے لوگ بھی شاید مجھے بچہ اٹھانے والا سمجھ رہے تھے۔ کیسی سچویشن تھی۔ اس طرف وہ عورت کم بخت واش روم سے باہر نکل کر ہی نہیں دے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی تلاش میں جانے والی عورت بھی واپس آگئی۔ ''نہیں وہاں کوئی نہیں ہے۔'' اس عورت نے بتایا۔ ''واش روم خالی پڑا ہے۔''

''لگتا ہے اس نے ہمیں کہیں سے دیکھ لیا اور بھاگ گئی۔'' کالر پکڑنے والے نے کہا۔

''چلو اتنا بہت ہے کہ ہمارا خرم ہمیں مل گیا ہے۔'' بوڑھے نے بچے کو گود میں اٹھا لیا تھا۔ ''چلو واپس چلتے ہیں لعنت بھیجو اس پر۔''

''ارے صاحب۔'' میں بوکھلا کر بولا۔ ''بچے کو کہاں لے کر جا رہے ہیں اس کی ماں واپس آئی تو میں کیا جواب دوں گا۔ وہ تو مجھے پولیس کے حوالے کردے گی۔''

''ہم اس بچے کے قانونی وارث ہیں سمجھے۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''اور اپنے بچے کو واپس لے جا رہے ہیں۔''

''لیکن میں کیا کروں گا۔ اس نے تو یہ بچہ امانت کے طور پر میرے پاس رکھوایا تھا۔ آپ لوگ مجھے کس دشواری میں مبتلا کر رہے ہیں۔ اس کو آنے دیں اس کے بعد جو مرضی آئے وہ کریں۔''

''خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کر رہے۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''اور جہاں تک اس کی ماں کا سوال ہے تو اب نہیں آئے گی وہ ہمیں دیکھ کر بھاگ گئی ہے۔''

وہ لوگ بچے کو لے کر چلے گئے اور میں احمقوں کی طرح کھڑا رہ گیا۔ اگر اس کی ماں واپس آکر اپنے بچے کا مطالبہ کرنے لگتی تو میں اس کو کیا جواب دیتا۔

ویسے یہ بات کنفرم تھی کہ وہ بچہ غیروں کے پاس نہیں گیا ہے۔ وہ اس کے اپنے ہی تھے اس لیے وہ اتنے اطمینان کے ساتھ ان کے پاس چلا گیا تھا لیکن میں کیا کرتا۔

اگر وہ عورت واپس آکر واویلا مچا دیتی تو میرا کیا حشر ہوتا۔ لوگ فی سبیل اللہ مجھے مارنے لگتے۔ دنیا بھر کے الزامات لگ جاتے کہ میں بچوں کے اغوا کرنے والے کسی بڑے گروہ کا کارندہ ہوں۔ میں نے بچہ کسی اور پارٹی کے حوالے کر دیا ہے اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے خود اپنی جگہ بیٹھا ہوا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

دنیا بھر کی باتیں ہونے لگتیں۔ اس سے بہتر یہی تھا کہ میں خود وہاں سے کھسک لوں۔ حیدرآباد میں اگلے دن بھی جا سکتا تھا۔ ٹکٹ لے چکا تھا اور یہ کوئی اتنی بڑی رقم نہیں تھی کہ جس کا نقصان برداشت نہ کرسکوں۔ لہٰذا میں نے یہی غنیمت سمجھا کہ خاموشی سے بس اسٹاپ سے باہر نکل آؤں۔

میں گھر واپس آگیا۔ حیدرآباد کا کام یوں ہو گیا تھا کہ میں نے فون پر معاملات طے کر لیے تھے۔ وہاں جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔

اس شام میں استاد کرامت کے پاس پہنچ گیا۔

میں نے جب استاد کو اپنی روئیداد سنائی تو وہ بری طرح ہنسنے لگے۔ میں تپ کر رہ گیا تھا۔ ''کمال کرتے ہو استاد، میں بچہ اٹھانے کے جرم میں جیل جاتے جاتے بچا ہوں اور تم ہنس رہے ہو۔''

''تو کیا کروں! کس نے کہا تھا اس قسم کی حرکت کرنے کو۔''

''استاد تم ہی نے تو مشورہ دیا تھا۔''

''دیکھو میرے مشورے نے کام تو دکھایا نا۔ وہ عورت تم پر مہربان ہونے لگی تھی۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔''

''اب تمہاری قسمت ہی خراب ہے تو میں کیا کروں۔'' استاد نے کہا۔ ''بہرحال آئندہ ذرا دیکھ بھال کر ہاتھ ڈالنا۔''

دو دن کے بعد اچانک وہ عورت میرے سامنے آگئی۔

اس سے میری مڈبھیڑ میری ہی گلی میں ہوئی تھی۔ وہ پشاوری آئس کریم والی گلی میں یعنی جہاں میں رہتا تھا۔

میں اسے دیکھ کر بوکھلا گیا تھا لیکن وہ لپک کر میرے پاس آگئی تھی۔

''میرا بچہ کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میرے تو ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ بچے کا پوچھ رہی تھی۔ میرے خدا میں کن چکروں میں پھنس گیا تھا۔

''آ...... آپ کا بچہ۔'' میری تو آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

''گھبرائیں نہیں، میں جانتی ہوں کہ میرا خرم میرے سسرالیوں کے پاس ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اس کے دادا دادی اور باپ آکر اس کو لے گئے ہیں۔''

''آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہاں وہ لوگ آکر لے گئے تھے لیکن آپ کہاں غائب ہو گئی تھیں۔''

''میں نے واش روم سے نکلتے ہی ان لوگوں کو دیکھ لیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''میں ایک طرف چھپ کر دیکھتی رہی تھی۔ اگر میں ان کے سامنے آجاتی تو وہ اس اسٹاپ پر ہنگامہ کر دیتے۔ بہت ہی کمینے قسم کے لوگ ہیں۔''

''دیکھیں اگر مناسب سمجھیں تو سامنے آئس کریم پارلر چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں اس طرح کھڑے ہو کر باتیں کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔''

''ہاں ہاں میں خود بھی یہی چاہ رہی تھی کہ کسی کو اپنے بارے میں بتاؤں۔ کوئی تو میرا ساتھ دے۔''

ہم پشاوری آئس کریم کی دکان میں آکر بیٹھ گئے۔

میں نے اس کے لیے آئس کریم کا آرڈر دے دیا تھا۔

''سب سے پہلے تو میں اپنا نام بتا دوں۔'' اس نے کہا۔ ''میرا نام فرحین ہے برے حالات میں زندگی گزاری ہے۔ حیدرآباد میں رہائش تھی۔ تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ ہم صرف دو بہنیں ہیں۔ میں اور مجھ سے بڑی نورین۔ وہ بھی شادی شدہ ہے۔ وہ حیدرآباد ہی میں رہتی ہے۔ بہنوئی کا اپنا ایک بڑا سپر اسٹور ہے۔ بہرحال تعلیم سے فارغ ہوئی تو شادی ہو گئی۔ شادی کر کے کراچی آگئی۔ شروع کے دن تو اچھے گزرے۔ سب کا رویہ اچھا تھا لیکن خرم کی پیدائش کے بعد حالات بدلنے لگے۔ انہوں نے مجھ پر سختی شروع کر دی۔''

''لیکن کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ عزیز کی شادی کہیں اور کرنا چاہتے ہیں۔'' فرحین نے بتایا۔ ''کیونکہ وہاں سے بہت کچھ ملنے کی امید ہے اور میں غریب سوائے اپنی سیرت اور سگھڑپن کے اس گھر میں اور کچھ نہیں لاسکی تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ میں اپنی بہن اور بہنوئی پر دباؤ ڈالوں کہ وہ انہیں پیسے دیتے رہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بہنوئی کا سپر اسٹور بہت چلتا ہے۔ وہ پیسے والے ہیں۔''

''کیسے کمینے لوگ ہوتے ہیں۔''

''بہت زیادہ۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''لالچ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ پچھلی بار انہوں نے پانچ لاکھ روپوں کا مطالبہ کیا تھا۔ عزیز کو کاروبار کرانا تھا۔''

''عزیز تمہارے شوہر کا نام ہو گا۔''

''ہاں اس کا نام ہے۔'' اس نے نفرت سے کہا۔ ''ایک نمبر کا لالچی اور خودغرض۔ اس کی فطرت تو اب سامنے آرہی ہے۔ بہرحال میں نے انکار کر دیا۔ میں کس طرح اپنی بہن اور بہنوئی سے اتنے پیسے مانگ سکتی ہوں۔''

''اور تمہارے والدین!''

''بدقسمتی سے میری شادی کے کچھ دنوں بعد ہی دونوں کا انتقال ہو گیا تھا۔'' اس نے بہت دکھ سے بتایا۔

''افسوس ہو رہا ہے یہ سب سن کر۔'' میں نے کہا۔

''بس جناب! اس کے بعد مجھ پر آفتیں نازل ہونی شروع ہو گئیں۔ انہوں نے ایک پلاننگ یہ کی کہ مجھ سے خرم کو چھین لیا جائے تاکہ میں اس کے بغیر بلبلاتی رہوں اور وہ مجھے بلیک میل کرتے رہیں۔ مجھے ان کی یہ گھناؤنی سازش کا علم ہو گیا تھا اس لیے میں اپنے خرم کو لے کر وہاں سے فرار ہو گئی۔ اس کے بعد کی کہانی آپ کے سامنے ہے۔ وہ کس طرح میرے بچے کو چھین کر لے گئے ہیں۔''

اتنا کہہ کر اس نے ہچکیوں سے رونا شروع کر دیا۔ ظاہر ہے ماں تھی اور ماں کے آنسو تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی طاقت۔

میں اس کے آنسوؤں کے ساتھ پگھلتا چلا جا رہا تھا۔

''آپ جانتے ہیں میری زندگی کا صرف ایک ہی مرکز ہے۔ میرا خرم۔ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتی۔''

اور اسی وقت میرے ذہن میں ایک بات آگئی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''فرحین میں تمہارا مجرم ہوں کیونکہ میری وجہ سے تمہارا بچہ تمہارے پاس سے چلا گیا ہے۔''

''نہیں، اس میں آپ کا کیا قصور۔ وہ تو سچویشن ہی ایسی تھی کہ وہ لوگ میرے خرم کو اٹھا کر لے گئے۔ آپ بھی کیا کر سکتے تھے۔''

''سچویشن معلوم ہونے کے بعد تو کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''میں تمہارے خرم کو اس گھر سے واپس لے آؤں گا۔''

''واپس لے آئیں گے، کیسے واپس لائیں گے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم یہاں کراچی میں کہاں اور کس

سچ کی تلاش

حبیب اللہ کلکانی کابل کے نزدیک ''شمالی'' کے رہنے والے تھے۔ وہ تاجک برادری سے تعلق رکھنے والے اور اپنے علاقے کی باا‌ثر شخصیت تھے۔ اس وقت (1929ء) میں افغانستان پر امان اللہ کی بادشاہت تھی۔ امان اللہ مغربی ثقافت سے بہت متاثر تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ترکی میں اتاترک مغربی اصلاحات و ثقافت نافذ کر چکے تھے۔ امان اللہ نے بھی انہیں نافذ کرنا چاہا۔ ترک عوام نے چار و ناچار حکومتی اقدام قبول کر لیے لیکن افغان عوام اپنی اسلامی اقدار کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ کابل میں افغانی ردِعمل کی لہر اٹھی اور آناً فاناً تمام ملک اس کی لپیٹ میں آگیا۔ امان اللہ کی فوج کا ایک بڑا حصہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ جلد ہی یہ طوفان ''شمالی'' تک پہنچ گیا۔ افغانی ہمیشہ سے قبائل اور گروہوں کی صورت میں رہے ہیں اور اپنے سردار یا جرگہ کا فیصلہ مانتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اب تک برقرار ہے۔ شمالی میں حبیب کلکانی اپنے قبیلے کا ایک مضبوط اور بہادر سردار تھا۔ تمام متحارب گروپ اپنے سرداروں کی سرگردی میں بادشاہ امان اللہ کے خلاف متحد ہو گئے۔ جب حالات قابو سے باہر ہونے لگے تو امان اللہ اپنا تخت اپنے بھائی عنایت اللہ کے سپرد کر کے کابل سے فرار ہو گیا۔ کچھ روایات کے مطابق ان متحارب گروہوں کے سرداروں کی طرف سے نئے بادشاہ عنایت اللہ کو خط بھیجا گیا کہ یا تو وہ امان اللہ کی نافذ کردہ نام نہاد اصلاحات واپس لے لے یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ وہ خط کے جواب میں تخت ہی سے دست بردار ہو گیا۔ ان متحارب گروپوں میں سب سے مضبوط سردار حبیب اللہ تھے لہٰذا متفقہ طور پر انہیں حکومت کے لیے منتخب کیا گیا۔ حبیب اللہ بادشاہت کے نظام کے خلاف تھا اس لیے اس نے ''خادم دین رسول اللہ غازی حبیب اللہ'' کہلوانا پسند کیا۔ بعد ازاں نادر شاہ نے طاقت اکٹھی کر کے حبیب اللہ اور ان کے ساتھیوں سے حکومت چھین لی۔ ان پر بغاوت اور لوٹ مار کے الزامات لگا کر پھانسی دے دی اور تمام ساتھیوں سمیت ایک گڑھے میں پھنکوا دیا۔

کے پاس رہ رہی ہو۔“

”میں اپنی ایک دوست کے پاس بفرزون میں رہ رہی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ بے چاری بھی میری وجہ سے بہت پریشان ہے۔ بس ایک بار میرا بچہ میرے پاس آجائے تو میں خلع کا کیس کرکے ان لوگوں سے اپنی جان چھڑالوں گی۔“

”بس تو میرا وعدہ ہے کہ میں کسی طرح بھی ہو اس بچے کو اٹھا کر لے آؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تم بس مجھے اس گھر کا مکمل ایڈریس سمجھا دو۔“

”دیکھیں ایسا نہ ہو کہ آپ خود کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔“

”کچھ بھی ہو یہ تو کرنا ہوگا۔ پہلے تمہارا یہ مسئلہ حل ہو۔ اس کے بعد جو مرضی ہو وہ کرتی رہنا۔“

اس نے بہت بحث کرنے کے بعد اپنی سسرال کا ایڈریس سمجھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی دوست کا موبائل نمبر بھی دے دیا کہ خرم کے ملتے ہی اس نمبر پر خبر کر دوں۔

اب میرا ایک ہی مشن رہ گیا تھا۔ اس بچے کو اٹھا لانا۔ میں جانتا تھا کہ اس میں بے شمار خطرے ہو سکتے ہیں۔ پہلا سوال تو یہی ہوتا تھا کہ میں کون ہوتا ہوں۔ کسی کے گھریلو معاملات میں اس حد تک مداخلت کرنے والا۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ وہ بچہ میری حماقت یا مجبوری کی وجہ سے اس کی ماں کے ہاتھ سے نکلا تھا اور اب اسے واپس لانے کی ذمہ داری بھی میری تھی۔

میں نے اس کی سسرال کی باقاعدہ ریکی شروع کر دی۔

ایڈریس بہت آسان تھا اور سب سے بڑی آسانی یہ تھی کہ گیٹ کے سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ اس میدان میں دن بھر ریڑھی والوں کا آنا جانا لگا رہتا۔

کبھی غبارے بیچنے والے، کبھی آئس کریم والے، کبھی سبزی والے، کبھی کچھ اور۔ ان کی آوازیں سن کر گھر کی عورتیں اور بچے اپنے اپنے گیٹ سے باہر نکل آتے۔

میں یہ سب دیکھ چکا تھا۔

اس گھر کے گیٹ کے سامنے میدان میں ایک بڑا سا درخت تھا۔ میں اس درخت کی آڑ میں کھڑا ہو کر اس مکان کی طرف دیکھتا رہتا۔

تیسری یا چوتھی شام تک مجھے موقع مل گیا۔

میرے سامنے ایک آئس کریم والا آوازیں لگاتا ہوا گزرا تھا۔ اس کے گزر جانے کے بعد گیٹ کھلا اور ایک عورت اس بچے کو لے کر گیٹ سے باہر آگئی۔

وہ شاید اس گھر کی ماسی یا ملازمہ تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ آئس کریم والا کچھ دور جا چکا تھا۔ اس نے بچے کو گیٹ کے پاس کھڑا کیا اور خود آئس کریم والے کے پیچھے لپک پڑی۔

میرے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ میں درخت کی آڑ سے نکلا۔ اس بچے کی طرف جھپٹا اور اسے لے کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔

وہ بچہ کم بخت گلا پھاڑ پھاڑ کر شور کرنے لگا۔ ظاہر ہے اس پر ایک ناگہانی آفت ٹوٹ پڑی تھی۔ اتنی دیر میں شاید اس ماسی نے بھی دیکھ لیا۔ وہ بھی شور مچاتے ہوئے میرے پیچھے دوڑ پڑی۔

میری پچویشن بہت خراب ہوگئی تھی۔ اگر میں پکڑا جاتا تو پورا محلہ مل کر میری دھجیاں اڑا دیتا۔ مجھے پولیس کے حوالے کر دیا جاتا۔

لیکن میری قسمت اچھی تھی کہ میں بچے کو لے کر بڑی والی سڑک پر آگیا۔ ایک رکشا بھی مل گیا تھا۔ اس پر بیٹھ جانے کے بعد بھی یہی خطرہ لگا رہا کہ اب میرا تعاقب ہو رہا ہوگا۔

شکر ہے تعاقب نہیں ہوا۔ میں بچے کو لے کر ایک محفوظ مقام پر پہنچ گیا۔ بچے پر رونے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔

ایک جگہ رکشا رکوا کر میں نے ایک اسٹور سے آئس کریم لی اور سامنے والے ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے وہیں سے فرحین کو فون کر دیا تھا۔

”مبارک ہو میں خرم کو لے آیا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”کیا!“ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ ”آپ میرے خرم کو لے آئے؟ کامیاب ہو گئے آپ!“

”ہاں بھائی میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔“

”کہاں ہیں آپ اس وقت؟ میرا خرم کہاں ہے؟“ اس کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔

”وہ میرے ساتھ ہی ہے۔ تم نے اکبری پارک دیکھا ہے۔ جب ناظم آباد سے نکل کر آگے جاتی ہو۔“

”ہاں ہاں دیکھا ہے میں نے۔“ اس نے بے قرار ہو کر میری بات کاٹ دی۔ ”آپ وہیں ہیں ناں میں آرہی ہوں آپ وہیں رہیے گا پلیز۔“

”ہاں ہاں میں وہیں ہوں۔ تم جلدی سے آجاؤ۔“

اس دوران بچے نے آئس کریم ختم کر لی تھی۔ فرحین کچھ دیر بعد ہی آگئی تھی ایک بے قرار ماں اپنے بچے سے ملنے کے لیے گیٹ سے دوڑتی ہوئی چلی آرہی تھی۔

میں نے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آگئی اور پاس آکر اس طرح رک گئی جیسے گاڑی کو بریک لگ گیا ہو۔

”یہ لو میں تمہاری امانت تمہیں واپس کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میرے خدا! یہ آپ کس کا بچہ لے آئے۔“ وہ پریشان ہو کر بولی۔

”کیا مطلب؟“

”یہ میرا خرم نہیں ہے۔“ اس نے بتایا۔

”تو پھر یہ کون ہے۔“

”یہ فیصل ہے۔ میری نند کا بیٹا۔ دونوں ایک جیسے لگتے ہیں اس لیے آپ خرم کے دھوکے میں اس بے چارے کو اٹھا کر لے آئے ہیں۔ خود سوچیں اس کی ماں کا کیا حال ہوگا۔ وہ کتنی پریشان ہو جائے گی۔ وہ تو اس سے بہت پیار کرتی ہے۔“

یہ سب سن کر میرے تو ہوش ہی ٹھکانے آگئے تھے۔ یہ تو بہت خطرناک پچویشن ہوگئی تھی۔

”خدا کے لیے اس کو واپس کر آئیں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں ایک ماں ہوں اور اولاد کا دکھ سمجھ سکتی ہوں۔ اس کو پہنچا دیں۔“ وہ واویلا کرنے لگی تھی۔

”کیسی بات کر رہی ہو تم کیا چاہتی ہو کہ میں واپس کرنے جاؤں اور وہ سب مل کر مجھے پکڑ لیں۔ اس کو اٹھا کر لاتے ہوئے تو میں بچ کر نکل آیا لیکن واپس کرنے کے چکر میں اندر ہو جاؤں گا۔“

”کچھ بھی کریں لیکن اس کی واپسی ضروری ہے ورنہ میں زندگی بھر خود کو معاف نہیں کروں گی۔“

”اور پولیس مجھے معاف نہیں کرے گی۔“

”پلیز، آپ ماں نہیں ہیں اس لیے کسی ماں کا دکھ نہیں سمجھ سکتے۔ میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ میری نند کا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ لے جائیں اس کو واپس کر آئیں۔“

میں بھی کن چکروں میں پھنس گیا تھا۔ استاد کرامت کے مشوروں نے کس حال کو پہنچا دیا تھا۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا۔ میں اس بچے کو اپنے پاس بھی نہیں رکھ سکتا تھا اور اگر اس کو لے کر اس گھر میں جاتا تو وہ سب مجھے پہچان جاتے کیونکہ وہ سب مجھے اس بچے خرم کے ساتھ

میں ابھی اسلام کو بیس پنس میں بیچنے لگا تھا

لندن کی مسجد کے امام ایک ہی روٹ پر بسوں میں سفر کرتے تھے کئی بار ایسا ہوا کہ بس بھی وہی ہوتی تھی اور بس کا ڈرائیور بھی وہی۔ ایک مرتبہ امام صاحب بس پر سوار ہوئے، ڈرائیور کو کرایہ دیا اور باقی کے پیسے لے کر ایک نشست پر جا کر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور کے دیے ہوئے باقی کے پیسے جیب میں ڈالنے سے قبل دیکھے تو پتا چلا کہ بیس پنس زیادہ آگئے ہیں۔ امام صاحب سوچ میں پڑ گئے، پھر اپنے آپ سے کہا کہ یہ بیس پنس وہ اترتے ہوئے ڈرائیور کو واپس کر دیں گے کیونکہ یہ ان کا حق نہیں ہے۔ پھر ایک سوچ یہ بھی کہ بھول جاؤ ان تھوڑے سے پیسوں کو، اتنے تھوڑے سے پیسوں کی کون پرواہ کرتا ہے!! ٹرانسپورٹ کمپنی ان بسوں کی کمائی سے لاکھوں پاؤنڈ کماتی بھی تو ہے، ان تھوڑے سے پیسوں سے ان کی کمائی میں کیا فرق پڑ جائے گا؟ اور میں ان پیسوں کو اللہ کی طرف سے انعام سمجھ کر جیب میں ڈالتا ہوں اور چپ ہی رہتا ہوں۔ بس امام صاحب کے مطلوبہ اسٹاپ پر رکی تو امام صاحب نے اترنے سے پہلے ڈرائیور کو بیس پنس واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ لیجیے بیس پنس، لگتا ہے آپ نے غلطی سے مجھے زیادہ دے دیے ہیں۔“

ڈرائیور نے بیس پنس واپس لیتے ہوئے مسکرا کر امام صاحب سے پوچھا۔ ”کیا آپ اس علاقے کی مسجد کے نئے امام ہیں؟ میں بہت عرصہ سے آپ کی مسجد میں آ کر اسلام کے بارے میں معلومات لینا چاہ رہا تھا۔ یہ بیس پنس میں نے جان بوجھ کر زیادہ دیے تھے تاکہ اس معمولی رقم کے بارے میں رویہ پرکھ سکوں۔ امام صاحب جیسے ہی بس سے نیچے اترے، انہیں ایسے لگا جیسے ان کی ٹانگوں سے جان نکل گئی ہے، گرنے سے بچنے کے لیے ایک کھمبے کا سہارا لیا، آسمان کی طرف منہ اٹھا کر روتے ہوئے دعا کی یا اللہ مجھے معاف کر دینا، میں ابھی اسلام کو بیس پنس میں بیچنے لگا تھا۔

مرسلہ: اختر احمد۔ ملتان

دیکھ چکے تھے۔ یہی سمجھا جاتا کہ میں بچوں کو اغوا کرنے والے کسی گروہ کا بندہ ہوں۔ یا کوئی اور کہانی میرے گلے پڑ جاتی۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ میں اس بچے کو دوبارہ اس مکان میں لے آیا۔ دور ہی سے نظر آ گیا تھا کہ گیٹ پر پولیس کی موبائل کھڑی ہے اور کچھ لوگ جمع ہیں۔

میں نے ان کے سامنے جانا مناسب نہیں سمجھا۔ بہت بری طرح پھنس جاتا۔

میں اس بچے کو واپس لے آیا۔

ایک جگہ میں نے فرحین کو فون کر کے سچویشن بتاتے ہوئے کہا۔ ”اب تم ایسا کرو، اپنی سسرال میں سے کسی کا فون نمبر دے دو۔ میں فون پر انہیں بتا دوں گا اور کسی جگہ بچے کو پہنچا کر واپس آجاؤں گا اس طرح میں ان کے سامنے ہی نہیں آؤں گا۔“

”ہاں آپ ایسا کریں، میرے سسر کا نمبر لکھ لیں۔“

فرحین نے سسر کا نمبر لکھوا دیا۔ میں نے ایک کال آفس سے اس نمبر پر فون کیا۔ اس دوران میں اس بچے کو اٹھائے پھرتا رہا تھا۔

دوسری طرف سے شاید اس کے سسر نے ہی فون اٹھایا تھا۔ ”ہیلو کون صاحب۔“

”جناب آپ یہ بتائیں کیا آپ کے گھر سے کوئی بچہ......“

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ پھٹ پڑا۔ ”ہاں ہاں میرا نواسا، میرا فیصل کہاں ہے وہ۔“

”پریشان نہ ہوں۔ بچہ بالکل خیریت سے ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ میرے پاس ہے۔“

”خدا کے لیے بتاؤ تمہیں کتنے پیسے چاہئیں۔“

”دیکھیں جناب، میں بچوں کو اغوا کرنے والا نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے ایک روپیا چاہیے۔ اتفاق سے وہ بچہ میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔“

”خدا کے لیے ہمارا بچہ ہمیں واپس کردو۔“

”ہاں ہاں اسی لیے فون کیا ہے۔ آپ نے نارتھ ناظم آباد میں حیدری مارکیٹ تو دیکھی ہوگی؟“

”ہاں ہاں دیکھی ہے۔“

”وہاں ایک فروٹ چاٹ کی دکان ہے۔“

”جی ہاں۔“

”آپ وہاں آجائیں۔ آپ کو اپنا بچہ کسی کرسی پر بیٹھا ہوا مل جائے گا۔“ میں نے بتایا۔ ”اور جہاں تک میرا سوال ہے تو میں سامنے نہیں آسکوں گا۔ آپ مجھے گمنام محسن سمجھ لیں اور میرے لیے دعائے خیر کرتے رہیں۔“

”کتنی دیر میں آجاؤں۔“

”بس چل پڑیں۔ آدھ گھنٹے میں پہنچ جائیں۔“ میں نے کہا۔

میں اس بچے کو چاٹ کی دکان پر لے آیا۔ یہاں اس کے لیے پھر آئس کریم خریدنی پڑی۔ دوپہر کا وقت تھا، یہاں زیادہ رش بھی نہیں تھا۔ میں اس بچے کو کرسی پر بٹھا کر خود ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ سب وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے لپک کر بچے کو اٹھالیا۔ اس کی ماں جنونی کیفیت میں اسے پیار کیے جارہی تھی۔

آپ کا خیال ہوگا کہ یہ کہانی تو ختم ہوگئی ہے۔ بچہ ماما کو واپس مل گیا ہوگا۔ فرحین اپنی سسرال میں یا کہیں اور ہوگی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔

فیصل کی ماں جس انداز سے اپنے بچے کو پیار کررہی تھی جس طرح کی اس کی تڑپ تھی۔ اس کی بے قراری تھی اس نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

مجھے اس وقت فرحین یاد آگئی تھی۔

اس کی تڑپ یاد آرہی تھی۔ وہ بھی تو اپنے خرم کے لیے اتنا ہی بے چین ہوگی۔ جس کو اس کے سسرال والوں نے اس سے الگ کردیا تھا۔

اگر میں اس فیصل بچے کے لیے اس کی ماں کی تڑپ کا مشاہدہ نہیں کرتا تو شاید یہ اندر سے اتنا مضبوط بھی نہیں ہوتا۔

میں نے فرحین سے ملاقات کی اور اسے لے کر اپنے ایک وکیل دوست کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے کیس لڑنے میں فرحین کی ہر طرح سے معاونت کی اور ہم کیس جیت گئے۔ فرحین کو نہ صرف ایسے ظالم اور لالچی لوگوں سے چھٹکارا مل گیا بلکہ عدالت نے خرم کو بھی ماں کی تحویل میں دے دیا۔

اب فرحین میری بیوی ہے۔ خرم ہمارا بچہ ہے اور میں اس کہانی کے ذریعے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے بچے کو ماں سے چھینتے ہوئے ماں کی ممتا کا خیال رکھا جائے۔

آپ کا آئین اور قانون چاہے کچھ بھی کہتا ہو، لیکن ممتا کا اپنا الگ قانون ہوتا ہے کیونکہ ایک باپ بچے کی سماجی ضرورت ہوتا ہے جب کہ ماں اس کی فطری ضرورت ہوتی ہے۔

ویسے استاد کرامت کا ٹوٹکا میرے کام آگیا ہے۔ آپ بھی ٹرائی کرسکتے ہیں۔

اگھوری

جناب معراج رسول

السلام علیکم

زیر نظر سچ بیانی ایک ایسی روداد ہے جسے سچ کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جاسکتا لیکن سنانے والے نے قسمیں کھا کھا کر سنائی ہے۔ اس لیے یقین کرنا پڑا کہ اس اگھوری نے کیسا شراب یعنی بددعا دی تھی۔ ذائقہ بدلنے کے لیے ہی صحیح اسے بھی سرگزشت میں جگہ دے دیں۔

دانیہ صدیقی
(کراچی)



”آکاش، تم نے وہ آواز سنی؟“ پوجا نے خواب خرگوش کے مزے لیتے ہوئے آکاش کو بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ گہری نیند سے آکاش ہڑبڑا کر اٹھ گیا مگر اب ہونقوں کی طرح پوجا کی شکل تک رہا تھا۔ اندھیرے میں پوجا نے جو آکاش کو یوں آنکھیں پھاڑے بیٹھے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے مزید خوفزدہ ہوگئی اور آہستگی سے اس کا شانہ چھو کر بولی۔

”کیا ہوا۔ آکاش؟ تم تو مجھے اور ڈرا رہے ہو۔“

یہ سن کر آکاش کے اوسان بحال ہوئے۔ اس نے

گھڑی کی جانب نگاہ دوڑائی جو سوا تین بجا رہی تھی۔ آکاش نے پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا پھر چادر میں سکڑی سمٹی بیٹھی پوجا کی طرف پلٹا اور نرمی سے بولا۔

’’تم نے پھر کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہوگا، یوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوفزدہ ہو جانا کوئی اچھی بات نہیں۔ تمہاری تسلی کے لیے صبح کو میں نے اسٹور روم بھی اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔‘‘

پوجا روہانسی ہو کر بولی۔ ’’مگر وہ چھپکلی......‘‘

آکاش نے اس کی بات کاٹ دی۔ ’’یہ سب تمہارا وہم ہے۔ وہ چھپکلی جہاں سے گھومتی پھرتی آئی تھی وہیں واپس چلی گئی ہے۔ تم دن بھر آس پڑوس کی عورتوں سے بھوت پریت کے قصے سنتی ہو اور رات کو مجھے پریشان کرتی ہو۔ اب سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔ صبح دکان پر بھی جانا ہوتا ہے۔ تمہاری طرح دن بھر گھر پر فارغ نہیں پڑا رہتا۔‘‘

پوجا یہ سن کر چپکی ہو رہی بلکہ آکاش کا درشت لب و لہجہ اسے یہ بھی بھلا گیا کہ تھوڑی دیر پہلے اس نے آکاش کو کیوں جگایا تھا۔

پچھلے ایک ہفتے سے یہ معمول تھا کہ رات کو ٹھیک تین بجے کے آس پاس کمرے میں تیز بھنبھناہٹ کا شور ہوتا تھا پھر کچھ دیر بعد خاموشی چھا جاتی تھی۔ اس دوران پوجا اپنے کانوں پر تکیہ رکھ لیتی تھی اور دھیرے دھیرے نیند کی وادی میں اتر جاتی تھی لیکن آج اس بھنبھناہٹ میں کسی درندے کی ہلکی سی غراہٹ بھی نمایاں تھی۔ پوجا کوشش کے باوجود اپنے ڈر پر قابو نہ پا سکی اور اس نے قریب سوتے آکاش کو جگا دیا لیکن وہ جیسے ہی جاگا، عجیب و غریب آوازیں بھی تھم گئیں۔ ایسا نہیں تھا کہ پوجا کو کوئی وہم ہوا تھا بلکہ اس نے ایک دو مرتبہ ان آوازوں کا محور جاننے کی کوشش بھی کی تھی، آکاش کے علم میں بھی یہ بات آئی تھی مگر اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ گھر کے اطراف لگے پیڑ پودے شہد کی مکھیوں اور بھونروں کا مسکن ہیں ضرور یہ آوازیں وہیں سے آتی ہوں گی۔

اگلی صبح آکاش اپنے وقت پر اٹھ گیا۔ پوجا نے اس کے لیے ناشتا تیار کیا اور وہ ناشتے کے بعد چپ چاپ اپنی بائیک سنبھالے دکان روانہ ہو گیا۔ پوجا نے شکر منایا کہ وہ گزشتہ رات کے واقعے کو بھول چکا تھا ورنہ صبح صبح پوجا کو اچھا خاصا لیکچر سننے کو مل جاتا۔ آکاش ویسے تو دل کا بہت اچھا تھا۔ پوجا کا بے انتہا خیال بھی رکھتا تھا بس اسے پوجا کی ایک عادت ناپسند تھی کہ وہ بہت جلد کہی سنی باتوں پر یقین کر کے پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ اب یہی بات لے لو، اس گھر میں شفٹ ہوئے مہینا بھی نہیں گزرا تھا کہ پڑوسیوں کی باتوں میں آ کر اسے یہ گھر آسیبی لگنے لگا تھا۔ جب کہ بڑی مشکل سے یہ گھر اسے ملا تھا کیونکہ یہ محلہ شہر میں واحد تھا جہاں تمام کے تمام لوگ ہندو تھے۔

دیکھا جائے تو اس میں پوجا کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ گھر میں شفٹ ہوئے دوسرا ہی دن تھا کہ وہ بڑے اہتمام سے فیرنی پکا، سلیقے سے مٹی کے پیالے میں جما، سرخ خوان پوش سے ڈھک پڑوس میں رہنے والی لکشمی چاچی کے ہاں جا پہنچی۔ لکشمی چاچی کے گھر پر دستک ہوئی تو بے وقت کی مہمانداری کے خیال سے ان کا منہ بن گیا۔ بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے شوخ رنگ کی ساڑی میں ملبوس ایک دھان پان سی لڑکی کو کھڑے پایا۔ ابھی وہ اسے غور سے دیکھ ہی رہی تھیں کہ فیرنی سے لبالب پیالے نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی۔ لکشمی چاچی کی آنکھوں میں تیز تیز روشنی آئی اور انہوں نے ایک لحظہ بھی ضائع کیے بغیر اس کے ہاتھ سے پیالہ اچک لیا کہ کہیں یہ وہ اپنا ارادہ تبدیل کر لے۔ ’’کون گھر سے آئی ہو بٹیا رانی؟ پہلے تو کبھی نہیں دیکھا۔‘‘

پوجا نے ساڑی کا پلو سر پر جماتے ہوئے کہا۔ ’’ہاں چاچی، میں آپ کی نئی پڑوسن ہوں۔ ہم کل صبح کو ہی عمر کوٹ سے یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔‘‘

لکشمی چاچی کچھ کشمکش و پیچ میں پڑ گئیں۔ ’’کس گھر میں؟‘‘ ساتھ ہی انہوں نے پوجا کو اندر آنے کا راستہ بھی دے دیا۔

پوجا اندر آ کر تخت پر بیٹھ گئی اور دلچسپی سے چاچی کے صحن میں لٹکے رنگ برنگے پرندوں سے بھرے پنجرے کو دیکھنے لگی۔ اتنی دیر میں چاچی اس کے لیے شربت بنا کر لے آئیں۔ ’’ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہی ہو۔ اب اس گھر میں بات کرنے والا کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔ صرف یہ پرندے ہیں۔‘‘ لکشمی چاچی آہ بھرتے ہوئے بولیں تو پوجا ان کی جانب متوجہ ہو گئی اور شربت کا گلاس ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئی بولی۔

’’یہ پرندے بہت خوبصورت ہیں چاچی۔ انسانوں سے کہیں زیادہ پُرخلوص اور وفادار۔ ویسے آپ یہاں کب سے رہ رہی ہیں؟‘‘

’’منے تو اب یہ یاد بھی نہیں ہے کہ میں کب سے یہاں رہو ہوں۔ کوئی تیس پہلے رام لال منے اپنی گھر والی بنا کر لایا تھا سرحد پار سے! بس تب سے یہی مارا سنسار ہووے ہے۔ او سسرا تو بیاہ کے چھ سال بعد ہی مر گیو۔ ہمارا ایک بٹوا بھی تھا! ارجن، وہ موا بھی ہمارا ساتھ جیادہ دن نہ رہ سکا۔ دس سال کی عمر میں بخار ہوا اور او بھی اپنے باپو پاس چلا گیو۔ بس اب ان کی یاد ما ہمار جندگی بھی گجر ہی جاوت ہے۔ تم سناؤ بٹیا، کون گھر مار ہنے آئی ہو؟‘‘ چاچی باتوں کی کافی شوقین معلوم ہوتی تھیں۔

پوجا خالی گلاس تپائی پر رکھتی ہوئی بولی۔ ’’چاچی میرا نام پوجا ہے۔ میں اپنے میاں اور سسرال والوں کے ساتھ پہلے عمر کوٹ میں رہتی تھی پھر آکاش یعنی میرے شوہر کے جاننے والے جو یہاں میر پور خاص میں رہتے تھے انہوں نے اپنی چلتی ہوئی کریانے کی دکان بیچنے کا ارادہ کیا تو سوچ بچار کے بعد آکاش نے اسے خرید لیا۔ وہ تو اپنا کاروبار سمیٹ کر کراچی چلے گئے اور ہم یہاں آ گئے۔ آکاش کے ایک دوست نے یہاں کرائے پر مکان بھی دلوا دیا تو آسانی ہو گئی۔ یہی آپ کے سامنے والے مکان میں رہنے آئے ہیں ہم۔ سنا ہے مالک مکان کہیں باہر رہتا ہے پر اس کا بہنوئی یہاں پر ہے۔ اسی سے مل کر آکاش نے یہ مکان دیکھا اور پسند کیا۔ دوستوں کے حساب سے بھی یہ مکان ٹھیک ہے اور پھر کل تو پوجا کا مبارک دن بھی تھا۔ آپ مندر گئی ہوں گی اسی لیے ہمیں نہ دیکھ سکیں۔‘‘ پوجا نے مسکراتے ہوئے بات ختم کی مگر لکشمی چاچی کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ کر گھبرا گئی۔

لکشمی چاچی منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ پوجا نے دیکھا کہ ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے اور ان میں سے کچھ لایعنی سے الفاظ برآمد ہو رہے تھے۔ پوجا نے کان لگائے تو چھل کپٹ، فریبی اور دھوکا جیسے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوجا سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔ ’’ارے ستیاناس ہووے منحوس لکشمن پرساد کا! او دشٹ آتما کا مرن ہووے تو سنسار والے سکھ سے جیویں۔ جانے کونوں گھڑی کھا کر جنم دیا تھا اس کی ماں نے فریبی کو۔‘‘ لکشمی چاچی ڈرامائی انداز میں سینہ پیٹنے لگیں۔ پوجا کو لگا کہ شاید چاچی پر کوئی دورہ پڑ گیا ہے۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے تک بڑے سے چسکیں لڑا رہی تھی اب وہ اسے سٹھیائی ہوئی بڑھیا لگ رہی تھیں اور پوجا کو یہاں سے بھاگ جانے ہی میں اپنی عافیت نظر آ رہی تھی۔ ابھی وہ نظروں سے تخت اور دروازے کا درمیانی فاصلہ ناپ ہی رہی تھی کہ چاچی لپک کر اٹھیں اور باورچی خانے میں لگی گنیش کی تصویر کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے پھر بولیں۔ ’’دیوا رے دیوا! یہ موا لکشمن پرساد تیسری بار پھر یہی حرکت کرت ہے۔ بٹیا، بھگوان تو ہار اور تو ہار پتی کی رکھشا کرے۔ ای پاپی تو نرکھ میں جائی ہی جائی۔ خالی مکان اس سے برداشت نہ ہووے چاہے کونوں اپنی جان سے جاوے۔ اری بٹیا، منے اپنی آنکھوں سے دیکھت ہوں۔ سارا محلہ جانے ہے کہ ای مکان کچھ ٹھیک نا ہے۔ تمری سمجھ میں نہ آئے گا بٹوا! بس، ہمار بات مانو اور ای مکان چھوڑ دیو۔ دیوا کرپا کرے! کئی سال پہلے ای مکان ما کوئی سادھو سنت آ بسا پھر جانے کا ہوا، او کا دماگ پھر گیو۔ کالے کرتوتوں میں تھا موا۔ ارجن کا باپو بتائی کہ کالی ماتا کی سکتی سے او کا بھید بھاؤ ہی اور ہو گیا۔ اب مورکھ رات رات بھر شمشان میں رہت اور دن میں کالا عمل کری۔ محلے والوں کو کھبر ہوئی تو او کا مکان سے نکالنے کا بات کیے۔ بڑے جھگڑے کیو او کا مکان مالک سے، دھمکی بھی دی پر بھلا مانس او کا نکال کے ہی دم لیا۔‘‘

لکشمی چاچی سانس لینے کو رکیں تو پوجا بے اختیار بول پڑی۔ ’’پھر؟‘‘

چاچی نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولیں۔ ’’پھر کا بٹیا، او مورکھ یہاں سے چلا تو گیو ہے پر او کا آتما یہیں پہ ہے۔ لوگ بولت ہیں کہ ای مکان کو شراپ دے گیا او پاپی۔ کوئی ای مکان ما رہ نہ سکت۔ جو آیا او کا بڑا نقصان ہوا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھت ہوں کہ لوگ رات کو چیکھ چلات ہیں اور صبح کو بھاگ جاوے ہیں۔ چھ سال پہلے ای مکان ما کوئی چار عیسائی لونڈے رہن واسطے آئے تھے۔ یہیں کہیں کے باجار ما نوکری کرت تھے۔ پہلے ایک چھت سے گرا اور ٹانگ تڑا لی۔ ایک کی آنکھ ما لکڑی کی بانس چلی گئی، وہ اندھا ہوئی گوا۔ باکی دو کو گھر ما دشٹ آتما نجر آوت تھی۔ گرجے سے پڑھن واسطے کسی کو لے کر بھی آئے پر وہ پاپی بہت سکتی سالی ہے۔ ایک رات منے اپنی آنکھوں سے دیکھوں ہوں کہ وہ لونڈے چیختے چلاتے اپنے لنگڑے اور اندھے دوستوں کو کاندھے ما اٹھائے بھاگے چلے گئے۔ گھر ما سارا سامان بھی چھوڑ گیو۔ منے کچھ اور تو نہ جانوں ہوں، بس اتنا ضرور سمجھوں ہوں کہ مکان ما کچھ تو گڑبڑ ہے۔ سسرا لکشمن پرساد، بھگوان او پاپی کو اٹھا وے! لالچی

بندر، مکان مالک تو جانت بھی نہ ہوگا کی اوکا بہنوئی پیسوں کی کھاطر کا کھیل رچائی ہے۔"

پوجا سن سی بیٹھی لکشمی چاچی کی زبانی یہ قصہ سن رہی تھی۔ اس کے تو وہم و گماں میں بھی نہیں تھا کہ یوں نئے شہر میں آ کر اسے اس نئی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔ پریشانی بھی ایسی کہ جس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ اسے آج بھی اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ چھوٹی سی تھی تو بوا ہمیشہ اسے صحن میں لگے بڑے سے برگد کے نیچے بٹھا کر اس کی کنگھی چوٹی کیا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ بال بنواتے بنواتے دس سالہ پوجا کی نگاہ غیر ارادی طور پر درخت کی ایک گھنی شاخ پر جا کر جم گئی۔ اس نے دیکھا کہ پتوں کے پیچھے سے برف جیسی سفید رنگت اور انگارے جیسی آنکھوں والی کوئی مخلوق اسے گھور رہی ہے۔ پوجا کی تو چیخ ہی ... نکل گئی تھی۔ بوا اچھل پڑی تھیں اور کمرے سے امی اور دادی بھی بھاگی بھاگی آئی تھیں۔

پوجا نے جب لرزتے ہوئے اس شاخ کی طرف اشارہ کیا تو دادی تو بوا پر برس ہی پڑی تھیں۔ "کیوں ری ابھاگن! تجھے کتنی بار سمجھایا ہے کہ یوں بھری دوپہر کو درخت کے نیچے بیٹھ کر کام مت کیا کر۔ اپنے پرکھوں سے سنتے آئے ہیں کہ ان بوڑھے برگدوں اور پیپل کے درختوں پر بسیرا ہوتا ہے مگر تو نجانے کس مٹی کی بنی ہے۔ تجھے شوق ہے تو تو بیٹھی رہا کر اس کے نیچے، پر خبردار جو تو نے آیندہ کبھی پوجا کو اس کے نیچے بٹھایا۔"

پوجا کو یاد تھا کہ اس واقعے کے کافی عرصے بعد تک وہ برگد کی طرف جانا تو درکنار اس کی طرف دیکھنے سے بھی ڈرتی تھی کہ مبادا وہی مخلوق اسے دوبارہ نظر آ جائے۔ کئی بار اس نے امی سے کہا کہ اس درخت کو کٹوا دیتے ہیں پر ہر مرتبہ انہوں نے اسے یہ کہہ کر خاموش کروا دیا۔ "نہ بیٹی! اس درخت پر بسیرا ہے۔ اس کو کٹوانا پاپ ہے اور پھر یہ درخت تو تمہارے لئو کی پرکھوں کی نشانی ہے۔ اسی کے نیچے ہر دیوالی پر لکشمی پوجا ہوتی ہے۔ دادی کے سامنے اسے کٹوانے کی بات بھی مت کرنا ورنہ انھیں بہت دکھ ہوگا۔" پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پوجا اس واقعے کو بھول بھال گئی۔ گریجویشن کی پڑھائی کے دوران ہی آکاش کا رشتہ آ گیا اور اس کے تمام تر احتجاج کے باوجود اس کی شادی کر دی گئی۔

پوجا بچپن کے واقعے کو بھولی ہی رہتی کہ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی کچھ ایسا ہوا کہ خوف کا وہ ناگ جو کنڈلی مارے بیٹھا تھا دوبارہ پھن کاڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہوا کچھ یوں کہ وہ امی اور دادی کے اصرار پر ایک دو دن کے لیے گھر رہنے کے لیے آ گئی۔ وہ لوگ دیر رات تک دادی کے کمرے میں بیٹھیں باتیں کرتی رہیں۔ رات کے کوئی تین، ساڑھے تین کا عمل ہوگا کہ دادی کو پیاس محسوس ہوئی۔ کمرے میں رکھا جگ خالی ہو چکا تھا۔ امی اٹھنے لگیں تو پوجا نے انھیں روک دیا اور خود پانی لینے باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ شدید حبس زدہ رات تھی۔ ہر طرف سکوت طاری تھا صرف دور کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پوجا نے کولر سے پانی بھرا اور جگ تھامے پلٹ ہی رہی تھی کہ اچانک اسے برگد کے قدیم پیڑ کے پتے ہلنے کی آواز آئی۔ پوجا نے تعجب سے درخت کی جانب دیکھا جو کچھ لمحے قبل تک بالکل ساکت تھا مگر اب اس کی شاخیں ہوا سے ایسے جھول رہی تھیں جیسے تیز آندھی آ گئی ہو جبکہ پاس لگی موتیا کی بیل اور دیگر پودوں پر وہ آندھی اثر نہیں کر رہی تھی۔

اچانک اس نے دیکھا کہ درخت کے پتوں سے کوئی انسانی وجود نمودار ہو رہا تھا جو اپنے ہاتھوں پیروں کی مدد سے کسی چوپائے کی طرح تنے سے آہستہ آہستہ نیچے اتر رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر پوجا کو لگا جیسے زمین نے اس کے پیر پکڑ لیے ہوں اور زبان پر کانٹے اگ آئے ہوں۔ کوشش کے باوجود وہ کسی کو مدد کے لیے نہ پکار سکی۔ اترنے والا نیچے اترا اور پھر وہیں پیٹھ موڑے کھڑا ہو گیا۔ دراصل وہ ساڑی میں ملبوس کوئی عورت تھی۔ پوجا کو ایسا لگا جیسے وہ اس عورت کو اچھی طرح پہچانتی ہے۔ بے اختیار وہ غور سے اسے دیکھنے لگی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اتنے میں وہ عورت پلٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی پوجا کو لگا کہ اس کی سانسیں رک گئی ہوں کیونکہ اپنے چہرے پر پُراسراری مسکراہٹ سجائے اس کے سامنے بوا کھڑی تھیں! وہی بوا جن کا تین سال قبل ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔

اسے لگا کہ اس کی ٹانگوں سے جان نکلتی جا رہی ہے اور آنکھیں خود بخود بند ہوتی جا رہی ہیں۔ پہلے اس کے ہاتھ سے جگ چھوٹا اور چھناکے کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔ سناٹے میں اس کی آواز دور تک گئی اور پھر وہ بھی تیورا کر گر پڑی۔

تین دن لگاتار بخار میں پھنکنے کے بعد جب اسے ہوش آیا تو وہ کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ آکاش اسے

گھر واپس لے گیا اور جی جان سے اس کی خدمت کی۔ چند ہی دنوں میں وہ بھلی چنگی ہو گئی مگر وہ واقعہ اسے اب بھی راتوں کو جاگنے پر مجبور کر دیتا۔ اسے بار بار بوا کی آنکھیں یاد آتیں جو کسی مردے کی طرح سفید تھیں۔ اس نے میکے جانا بھی کم کر دیا تھا کیونکہ وہاں جا کر اسے یوں لگتا کہ بوا وہی سفید سفید ڈیلوں والی آنکھوں کے ساتھ کسی بھی کمرے سے اچانک برآمد ہو جائیں گی۔ امی کے اصرار پر اس نے رات والا واقعہ بتا دیا جسے سن کر وہ چپکی ہو رہیں۔ پوجا جانتی تھی کہ وہ بھی مجبور ہیں۔ دادی اور ابو کبھی بھی اس درخت کو کاٹنے کی ہامی نہ بھرتے اسی لیے جب اس واقعے کے چھ ماہ بعد آکاش کے خالو نے ان سے اپنی دکان بیچنے کا ذکر کیا تو پوجا ہی کے زور دینے پر آکاش بادل ناخواستہ وہ دکان خریدنے پر تیار ہو گیا اور وہ ان یادوں سے پیچھا چھڑانے کی خاطر عمرکوٹ سے دور میرپورخاص آ بسی مگر اب لکشمی چاچی کی زبانی یہ قصہ سن کر اسے لگا کہ یادیں کسی اژدہے کی مانند منہ کھولے اسے ہڑپنے کے لیے بے قرار ہیں۔

وہ اتنی خوشی خوشی فیرنی لے کر چاچی کے گھر آئی تھی اور اب افسردہ سی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اپنے گھر کو لوٹی۔ گھر میں سب کچھ نارمل تھا۔ ابھی تو اس کی کافی سیٹنگ بھی باقی تھی۔ شام کو جب آکاش واپس آیا تو کھانا کھاتے ہوئے پوجا نے لکشمی چاچی کی زبانی سنا ہوا قصہ دہرایا۔ یہ سن کر بجائے آکاش فکر مند ہوتا وہ الٹا پوجا پر چڑھ دوڑا۔ "واقعی؟ مطلب تم اتنی پڑھی لکھی ہو کر بھی بھوت پریت اور غیر ماورائی چیزوں کی خرافات پر یقین رکھتی ہو؟ مجھے تو سن کر حیرت ہو رہی ہے کہ اس جاہل، گنوار چاچی نے تمہیں یہ بے تکا سا قصہ سنایا اور تم جھٹ مجھے سنانے بیٹھ گئیں۔ پوجا بی بی یہ اکیسویں صدی ہے! یہاں پر پیسا ہی سب سے بڑا جن ہے۔ تم بھی اپنا دل کاموں میں لگاؤ اور دوبارہ تمہارے منہ سے یہ اوٹ پٹانگ باتیں نہ سنوں اور ہاں! یہ لکشمی چاچی جو بھی ہے اس سے دور ہی رہو تو اچھا ہے۔ اسے مفت کی بیوقوف مل گئی باتوں میں پھنسانے کے لیے!"

اس رات آکاش دیر تک بڑبڑاتا رہا۔ پوجا جانتی تھی کہ آکاش ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا اور اگر وہ اسے عمرکوٹ میں خود پر بیتے ہوئے واقعات بھی سنا دیتی تو وہ کوئی نہ کوئی توجیہہ پیش کر کے جھٹلا دیتا اور مذاق الگ اڑاتا اس لیے پوجا نے اچھی بیویوں کی طرح خاموش ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔

اگلے تین چار دن مصروفیت [illegible] نے گھر کی صفائی ستھرائی کی تھی۔ جا[illegible] گھر کی سیٹنگ کی تھی۔ اسٹور روم میں [illegible] پڑا تھا۔ پوجا نے کباڑیے کو بلا کر سارا [illegible] فروخت کر دیا اور ملنے والے پیسوں [illegible] مائیکرو ویو لے آئی۔ اس مصروفیت میں [illegible] اپنی ملاقات کو بالکل ہی بھول گئی۔ ایک [illegible] بھی تو اسے آکاش کی بات صحیح لگی۔ [illegible] تو لگ ہی رہی تھیں۔ کیا پتا اس نے کوئی [illegible]

چاچی کا سنایا ہوا قصہ اب اس کے [illegible] پر مٹ چکا تھا۔ ایک روز شام کو وہ ہاتھ میں [illegible] تھامے محویت سے ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ [illegible] جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہو۔ یہ دیکھنے [illegible] شدید تھا کہ وہ بے اختیار ٹی وی پر سے نظریں [illegible] بائیں دیکھنے لگی۔ اچانک اس کی نظر کھڑکی پر پڑی جہاں ایک پٹ پر موٹی سی چھپکلی بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔ چھپکلی اتنی موٹی اور بڑی تھی کہ چھوٹے سائز کا گرگٹ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی گول گول آنکھیں پوجا کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ پوجا کو چھپکلی سے اتنا خاص ڈر نہیں لگتا تھا۔ عمرکوٹ میں بھی اس کی پرانی طرز پر بنی حویلی میں اکثر گرگٹ، چھپکلیاں، چوہے، چمگادڑیں اور کبھی کبھار تو بھولے بھٹکے سانپ بھی آ دھمکتے تھے۔ وہ ان کی عادی تھی مگر پوجا نے اس چھپکلی میں ایسی کیا بات تھی کہ پوجا کو اپنے رگ و پے میں ٹھنڈ سی اترتی محسوس ہوئی۔

اس نے اسے مارنے کے لیے چپل اتاری مگر جب سر اٹھایا تو چھپکلی وہاں نہیں تھی۔ "ارے!" بے اختیار پوجا کے منہ سے یہی لفظ نکلا تھا۔ اس نے آس پاس ہر جگہ دیکھ لی مگر چھپکلی وہاں ہوتی تو دکھائی دیتی نا! اسے حیرانی تو ہوئی پر اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اگلے روز آکاش کے دکان پر روانہ ہونے کے بعد وہ باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مصروف تھی کہ اچانک اسے اپنے رگ و پے میں وہی برف جیسی ٹھنڈ اترتی محسوس ہوئی اور لگا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہو۔ پوجا نے چیں ہو کر پلٹی تو یہ دیکھ کر سن رہ گئی کہ وہی گزشتہ روز والی چھپکلی روشندان پر بیٹھی اس کو تک رہی ہے [illegible] گول گول چمکدار آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی [illegible] ہوتا تھا جیسے وہ انسانی آنکھیں ہوں [illegible]

احساسات سے پُر!

خاموشی سے ہاتھ میں جھاڑو تھامتے ہوئے پوجا جیسے ہی اس کی جانب لپکی وہ وہاں سے ہوا ہو گئی۔ پوجا نے اسٹول پر چڑھ کر اچھی طرح دیکھ لیا مگر وہ کہیں نہ تھی۔ رات کو بھی پوجا اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ آکاش نے ایک دو بار اس کی خاموشی کے بارے میں استفسار بھی کیا مگر اس نے سر درد کا بہانہ بنا دیا۔ وہ دل ہی دل میں تہیہ کر چکی تھی کہ اب کی بار وہ چھپکلی اسے نظر آئے گی تو وہ اسے مار کر ہی دم لے گی۔ گو اس کے گھر والے چھپکلی مارنے کے سخت خلاف تھے لیکن پوجا کبھی بھی اس بات سے متفق نہ ہو سکی تھی۔ اب یہ بھی کوئی بات ہے کہ اتنی سی چھپکلی میں کوئی اور مخلوق بھی سمائی ہو۔ وہ تو خود اتنی سی ہوتی ہے، بھلا اتنا وزن سہنے کی اس میں گنجائش ہی کہاں ہے مگر توہمات کی ماری دادی سے کون بحث کرتا۔

اگلے روز پوجا کیل کانٹے سے لیس بالکل تیار تھی۔ جیسے ہی اسے چھپکلی نظر آتی وہ اسے جھاڑو سے مار گراتی۔ کاموں کے دوران وہ چوکنا رہی پر وہ کہیں نظر نہ آئی۔ پوجا کی آنکھیں غیر ارادی طور پر اسے تلاشتی رہیں مگر اس کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔ آکاش جب گھر پہنچا تو پوجا دوچھتی پر چڑھی کچھ تلاش کر رہی تھی۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہو، پوجا؟" آکاش نے حیرت سے پوچھا کیونکہ اس وقت تک پوجا کا وہاں چڑھے ہونے کا کوئی جواز نہ بنتا تھا۔

"کچھ نہیں آکاش، میں بس ذرا وہ چھپکلی......" اس کے آگے وہ خاموش ہو گئی کیونکہ اسے احساس ہوا کہ آکاش کے سامنے اسے چھپکلی کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔

"چھپکلی؟" آکاش ہنس پڑا۔ "یار تم بھی کمال کرتی ہو۔ اچھا، چلو پہلے کھانا کھا لیں پھر میں چھپکلی ڈھونڈنے میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔ میں بھی تو دیکھوں کون ہے وہ بدمعاش جس نے میری معصوم سی بیوی کو پریشان کیا ہوا ہے۔"

یہ سن کر پوجا مسکراتی ہوئی نیچے اتر آئی اور کسی ہندو دیوی کی طرح مذاقاً ایک ہاتھ کھڑا کرتی ہوئی بولی۔ "جی جی سرتاج، پہلے آپ نہا دھو لیں پھر کھانا بھی اوش مل جائے گا۔"

اتوار کو آکاش دکان دیر سے کھولتا تھا اور کل اتفاق سے اتوار ہی تھا اسی لیے پہلے دونوں نے کھانا کھایا پھر مزے سے کیبل پر آنے والی فلم دیکھی۔ جب فلم ختم ہو گئی تو پوجا نے آکاش کو یاد دلایا۔ "وہ آکاش آپ نے چھپکلی بھی تلاش کرنی تھی۔"

یہ سن کر آکاش کسلمندی سے بولا۔ "یار، کیا یہ اتنا اہم کام ہے کہ آدھی رات کو انجام دیا جائے۔ کل صبح دیکھیں گے۔"

ٹھیک اسی رات سے پوجا کو کمرے میں بھنبھناہٹ کی آوازیں سنائی دینی شروع ہوئی تھیں۔ اگلے روز ناشتے کے بعد، آکاش نے سارا گھر کھنگال ڈالا مگر کوشش کے باوجود وہ چھپکلی کہیں نہ مل سکی۔ پوجا اب ایک انجانا سا خوف محسوس کر رہی تھی لیکن آکاش کے ناراض ہو جانے کے ڈر سے کہہ نہیں پا رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر آکاش دکان پر چلا گیا تو وہ سونے کے لیے کمرے میں آ گئی۔ رات بھر اس مسلسل بھنبھناہٹ نے اسے ٹھیک سے سونے نہیں دیا تھا۔ وہ آرام کے خیال سے آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر گزری پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے سرہانے کھڑا ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا تو مختصر سی لنگوٹ میں ملبوس اور جسم پر بھبوت ملے، لمبا تڑنگا سیاہ فام آدمی جس کے گلے میں جھنکو لٹک رہی تھی اس کے بستر کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے شدید غصہ ہویدا تھا اور وہ اپنی انگاروں جیسی سرخ آنکھوں سے پوجا کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوجا کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اپنی انگلی کھڑی کی جیسے اسے تنبیہ کر رہا ہو۔ پوجا اسے دیکھ کر اتنی خوفزدہ ہو گئی تھی کہ بے اختیار چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ ساتھ ہی خواب بھی ٹوٹ گیا۔

وہ پسینے میں شرابور تھی اور اس کی سانس بری طرح پھول رہی تھی جیسے وہ میلوں دوڑتی ہوئی آئی ہو۔ ایک عجیب سی چراند پوجا کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یہ گوشت اور لکڑیاں جلنے جیسی بو تھی۔ پوجا جانتی تھی کہ یہ مانوس بو تو شمشان گھاٹ سے اٹھتی تھی جب وہاں لاشوں کو نذر آتش کیا جاتا تھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ تیزی سے چپل پہننے کے لیے کھڑی ہوئی تو سامنے اسی چھپکلی کو بیٹھا پایا جو ویسے ہی کینہ توز نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ پوجا کو اچھی طرح یاد تھا کہ ابھی چند لمحے قبل خواب میں اس نے سیاہ فام شخص کو بھی ٹھیک اسی جگہ پر کھڑے دیکھا تھا اور یہ سو فیصد وہی آنکھیں تھیں جو اس نے خواب میں بھی دیکھی تھیں۔

پوجا کے منہ سے بے اختیار ہنومان چالیسہ کے

الفاظ برآمد ہونے لگے جو اس کی دادی نے بچپن میں اسے سکھائے تھے۔ وہ زور زور سے منتر کا جاپ کرتی دیوانہ وار بھاگتی ہوئی گھر کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی اور لکشمی چاچی کا دروازہ دھڑ دھڑانے لگی۔ یہ جھٹپٹے کا وقت تھا۔ گو یہ چہل پہل اور رونق کا وقت ہوتا ہے لیکن اس روز اطراف میں موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ نہ کوئی آدم نہ آدم زاد! وہ اور زور زور سے دروازہ بجانے اور چاچی کو چیخ چیخ کر پکارنے لگی۔ اس کا دل مانو کانوں میں دھڑک رہا تھا اور دہشت سے رواں رواں کھڑا تھا۔ اتنے میں ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا اور چاچی کو آواز دیتی اندر داخل ہو گئی۔ گھر میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی، یہاں تک کہ چاچی کے پالتو پرندے بھی سر نیہوڑائے بیٹھے تھے۔ پوجا کا دل کسی انہونی کے خیال سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے چاچی کو دوبارہ آواز دی مگر کوئی جواب نہ آیا۔

پوجا باورچی خانے کے نزدیک پہنچی تو اسے وہی جلے ہوئے انسانی گوشت کی چراند آئی۔ اس نے ناک پر ہاتھ رکھ کر اندر جھانکا تو سامنے کا منظر اسے بیہوش کر دینے کے لیے کافی تھا۔ سامنے چھوٹے سے باورچی خانے میں لکشمی چاچی پیڑھی پر بیٹھی تھیں مگر وہ زندہ نہیں تھیں بلکہ ان کی جلی ہوئی، سوختہ لاش سامنے رکھی ہوئی تھی۔ سینے پر عین دل کے مقام پر ایک بڑا سا سوراخ تھا اور وہی سیاہ فام خون سے سنے ہوئے چہرے اور ہاتھوں کے ساتھ وحشیوں کی طرح ان کا دل چبا رہا تھا۔ پوجا کو دیکھ کر وہ ہلکے سے غرایا اور لاش کو چھوڑ کر اس پر جست لگا دی۔ پوجا نے ایک دلدوز چیخ ماری اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ اپنے کمرے میں، اپنے بستر پر ہی لیٹی تھی۔ پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا اور کھڑکی سے لوگوں کی باتوں اور گاڑیوں کے ہارن اور گزرنے کا شور اندر آ رہا تھا۔ گویا سب کچھ ویسا ہی تھا جو اس کے سونے سے قبل تھا۔ اس نے بھیانک خواب دیکھا تھا۔ اتنا بھیانک کہ اس نے پوجا کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چند لمحوں کے لیے سلب کر لی تھی۔ پوجا نے دیوار کی جانب دیکھا تو وہاں کوئی چھپکلی نہیں تھی۔ کمرے میں کسی قسم کی بو بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ یقیناً حقیقت سے قریب تر ایک بھیانک خواب ہی تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک ایسے ہی لیٹی اپنے حواس درست کرتی رہی۔ اس کا تکیہ پسینے سے تر تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس خواب نے اس کے جسم کی ساری توانائی نچوڑ لی ہو۔ خواب بھی کیسا! اس نے خواب میں خواب دیکھا تھا۔ عجب گورکھ دھندا تھا!

رات کو سونے سے قبل پوجا نے آکاش کو اپنا عجیب و غریب خواب سنایا تو آکاش نے حسب توقع لکشمی چاچی کے سنائے گئے فرضی قصے کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر الٹا پوجا کا ہی مذاق اڑایا۔ ساتھ ہی اس نے دوبارہ تنبیہ کی کہ لکشمی چاچی سے ملنے کا سوچے بھی نہیں۔ آس پاس اور بھی لوگ تھے۔ ان میں سے ایک دو سے میل ملاقات کا پوجا نے سوچا بھی مگر انہوں نے کوئی خاص رسپانس نہ دیا تو پوجا خود پیچھے ہٹ گئی بلکہ پتا نہیں کیوں پوجا کو یوں لگتا تھا جیسے وہ اس سے خوفزدہ ہوں۔ یہ اس کا وہم بھی ہو سکتا تھا لیکن پوجا نے بھی دوبارہ ان سے ملنے کی کوشش نہ کی۔ لکشمی چاچی ہی اس سے اچھی طرح ملی تھیں اور وہ پوجا کو اچھی بھی لگیں تھیں مگر آکاش کی وجہ سے وہ ان سے دوبارہ نہ مل سکی۔ ایک دو بار سبزی خریدتے ملاقات ہو گئی تو کھڑے کھڑے خیر خیریت پوچھ لی تھی پھر پوجا کا سرد رویہ دیکھ کر وہ بھی خاموش ہو گئیں۔

گزشتہ رات بھی پوجا نے جاگتے ہوئے گزاری تھی۔ بھنبھناہٹ کے شور میں چھپی غراہٹ کی آواز اسے بار بار پریشان کر رہی تھی۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ چند دنوں پہلے خواب میں اس نے اس سیاہ فام کے منہ سے ایسی ہی غراہٹ سنی تھی جیسے کوئی درندہ اپنے شکار کو سامنے دیکھ کر غراتا ہے۔

آکاش دکان روانہ ہوا تو وہ اپنا سامان کھولنے لگیں۔ ابھی کچھ سامان ایسا بھی تھا جو پوجا نے آکاش کی ناراضگی کے ڈر سے نہیں کھولا تھا۔ اس میں ایک چھوٹا صندوق شامل تھا۔ آکاش کو ناستک تھا یعنی وہ بھگوان کے وجود پر یقین نہ رکھتا تھا لیکن اس نے پوجا کو کبھی بھی پوجا پاٹ سے نہ روکا تھا۔ سسرال میں آکاش کے علاوہ اس کے ماں باپ، بہن بھائی اور بھابیاں سب مندر جاتے اور پوجا کرتے صرف آکاش ہی ایسا تھا جو ان سے اختلاف رکھتا تھا۔ شادی کے بعد جب پوجا کو آکاش کی عادت کا علم ہوا تو اس نے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن جب آکاش نے سختی سے اسے اپنے معاملات میں دخل اندازی سے منع کر دیا تو وہ خاموش ہو گئی۔

پوجا نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر اس صندوق میں محفوظ کرش بھگوان کی مورتی نکال کر اپنے کمرے میں رکھے گی چاہے آکاش کتنا ہی ناراض کیوں نہ ہو جائے۔ اس نے عقیدت سے صندوق کو جھاڑا اور اٹھا کر کمرے میں لے آئی۔ کمرے میں لاکر اس نے صندوق کو بستر پر رکھ کر کھولا تو حیرت کے مارے اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ صندوق میں بقیہ سامان تو اپنی جگہ پر تھا لیکن مورتی کہیں نہیں تھیں۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ پیکنگ کرتے ہوئے اس نے خود اپنے ہاتھ سے اس صندوق میں دیگر چیزوں کے علاوہ جہیز میں ملنے والی کرشنا کی نازک سی مورتی بھی رکھی تھی جواب غائب تھی۔ پوجا کا دل چاہا کہ وہ اپنا سر پیٹ لے۔ یقیناً آکاش ہی نے وہ مورتی کہیں چھپا دی تھیں۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ آج وہ آکاش سے دوٹوک بات کرے گی۔ بھلا اب وہ اس کے معاملات میں دخل اندازی کیوں کررہا تھا جبکہ پوجا نے اسے سمجھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں غصے سے پیچ وتاب کھاتی معمول کے کام انجام دینے لگی۔

شام سے ذرا دیر پہلے جب پوجا صحن میں لگے پودوں کو پانی دے رہی تھی تو اسے گھر کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ آکاش آج دکان سے جلدی لوٹ آیا تھا۔ پوجا نے کوئی خاص توجہ نہ دی اور ویسے ہی پیٹھ موڑے اپنے کام میں مصروف رہی۔ کمرے میں سے کھٹر پٹر کی آوازیں آئیں پھر باتھ روم کا دروازہ بند ہوا۔ پوجا سمجھ گئی کہ آکاش عادت کے مطابق نہانے چلا گیا ہے۔ اس نے کچن میں جاکر چائے بنائی پھر کپ لے کر کمرے میں لوٹی تو باتھ روم بدستور بند تھا اور اندر سے آکاش کے گنگنانے اور شاور سے پانی گرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس پر اپنی ناراضگی جتانے کی خاطر پوجا نے چائے کا کپ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا اور خود جاکر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئی۔ بوریت سے بچنے کے لیے اس نے ٹی وی کھول لیا۔ ساتھ ساتھ اس کے کان کمرے پر بھی لگے تھے کہ آکاش باہر نکل کر چائے کا کپ دیکھے گا اور اسے موجود نہ پاکر آواز لگائے گا اور ہوا بھی یہی! پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ آکاش کی آواز آئی۔ وہ اسے بلا رہا تھا۔ پوجا سنی ان سنی کیے بیٹھی رہی۔ آج اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ فیصلہ کر کے رہے گی۔ آکاش نے اسے مزید دو تین بار آوازیں دیں پھر خاموشی چھا گئی۔ پوجا بھی ڈھیٹ بنی ٹی وی دیکھنے میں محو رہی۔

چند لمحے اور گزرے۔ پوجا ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔ یہ تو روز کا معمول تھا! اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر ریموٹ پٹخا اور موم بتی لینے کمرے میں گئی۔ شام کے سائے گہرے ہورہے تھے اس لیے کمرے میں تو کافی اندھیرا ہوگیا تھا۔ پوجا بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں گئی تو دیکھا کہ آکاش کمرے میں نہیں تھا۔ اس نے موم بتی جلائی تو کمرے میں گزارے لائق روشنی پھیل گئی۔ یہ دیکھ کر اسے حیرت کا جھٹکا سا لگا کہ چائے کا کپ ویسے کا ویسا ہی رکھا تھا بلکہ اب تو اس پر ملائی کی پپڑیاں سی جمنے لگی تھیں۔ اس نے دوڑ کر باتھ روم میں جھانکا تو وہ سوکھا پڑا تھا۔ یہاں تک کہ آکاش کا تولیہ اور اس کے کپڑے بھی صبح والی پوزیشن میں ٹنگے تھے۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے! ابھی آدھ گھنٹا قبل ہی اس نے آکاش کی مخصوص چاپ سنی تھی۔ وہ گھر کا دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔ باتھ روم کا دروازہ بند ہوا تھا پھر گنگنانے اور پانی گرنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ یہاں تک کہ باتھ روم سے نکل کر آکاش نے اسے دو تین بار آوازیں بھی دی تھیں۔ چھوٹا سا تو گھر تھا اور پوجا کی سماعت اور دیگر حسیات اس حد تک دھوکا بھی نہیں کھا سکتی تھیں۔

پوجا نے بے اختیار آکاش کو آواز دے ڈالی مگر خالی گھر میں گونجنے والی اپنی آواز سے خود ہی خوفزدہ ہوگئی۔ من من بھر کے قدم اٹھاتی وہ کوشش کر کے کسی طرح باورچی خانے تک پہنچ گئی مگر آکاش وہاں بھی نہیں تھا۔ پوجا کے کان سائیں سائیں کررہے تھے اور جسم کا ہر مسام پسینا اگل رہا تھا۔ وہ اپنی خوف سے بکھرتی ہوئی حالت پر قابو پاتی پلٹی تو اسے کمرے کے دروازے پر کوئی کھڑا نظر آیا۔ اندھیرے کے باوجود پوجا کو اس شخص کی لال لال چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آرہی تھیں جیسے کسی گھپ اندھیرے غار میں دو انگارے روشن ہوں۔ یہ وہی سیاہ فام تھا جس کو پوجا نے خواب میں دیکھا تھا۔ پوجا اسے یوں سامنے کھڑا دیکھ کر پتھرا گئی، یہ شیطانی کھیل اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ سیاہ فام کے منہ سے ویسی ہی حیوانی غراہٹیں بلند ہورہی تھیں جو پوجا ہزاروں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سیاہ فام پوجا کو کوئی نقصان پہنچاتا اچانک لائٹ آگئی اور روشنی ہوتے ہی وہ سیاہ فام بھی غائب ہوگیا۔ پوجا نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے کی جانب دیکھا۔ وہاں اب کوئی نہ تھا۔ اسے لگا کہ اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑتے جارہے ہیں اور پھر وہ چکرا کر وہیں گر پڑی۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے بستر پر تھی اور پریشان حال آکاش اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ پوجا نے آنکھیں کھولیں تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ ”کیا ہوا تھا پوجا؟ اکیلے گھر میں ڈر گئی تھیں کیا؟ میں دکان سے لوٹا تو تمہیں باورچی خانے کے باہر بیہوش پایا۔ جانے کب سے ایسے ہی پڑی تھیں تم۔ دیکھو، تمہارے سر پر گومڑ بھی ابھر آیا ہے۔“

پوجا کچھ دیر تک تو ایسے ہی خالی خالی نظروں سے آکاش کی صورت دیکھتی رہی پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ پوجا کے اس طرح رونے سے آکاش کے ہاتھ پاؤں مزید پھول گئے۔ ”کیا ہوا ہے، پوجا؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔ کیا چیز تمہیں پریشان کررہی ہے؟ راتوں کو بھی تم بے چین رہتی ہو، کھانا ٹھیک سے نہیں کھاتی ہو۔ آخر تم مجھ سے اپنی پریشانی کب شیئر کرو گی؟ کیا مسئلہ ہے؟“

آکاش کے بے انتہا اصرار پر پوجا نے آکاش کو پُراسرار چھپکلی سے لے کر مورتیوں کے غیاب اور آج والا واقعہ بھی تفصیل سے سنا دیا جسے سن کر آکاش کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ”پوجا تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو۔ شادی کے بعد تمہیں میں نے کبھی بھی پوجا پاٹ سے نہیں روکا اور نہ کبھی مندر جانے سے منع کیا ہے۔ ان مورتیوں کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں! نہ میں نے وہ صندوق دیکھا ہے اور نہ ہی میں نے تمہاری مورتیوں کو کہیں چھپایا ہے۔ رہا وہ سیاہ فام والا قصہ تو یہ محض اتفاق ہے کہ وہ خواب والا چہرہ تمہیں آج جاگتے میں بھی نظر آگیا۔ تم گھر پر اکیلی تھیں، ڈری ہوئی تھیں پھر اندھیرا بھی ہوگیا تھا اس لیے تمہارے دماغ نے اسے سامنے لاکر کھڑا کردیا۔ اسے ایلوژن کہتے ہیں، یعنی دماغ کے پچھلے خانے سے کوئی منظر نظروں کے سامنے آجانا۔ ہاں مگر یہ واقعی پریشان کن بات ہے کہ وہ کون ہے جو ہمارے گھر میں گھس کر یوں دھڑلے سے یہ کارروائیاں کرتا پھر رہا ہے اور اس کی یہ ہمت کہ آج وہ ہمارے کمرے تک آگیا۔ میں ابھی لڑکے سے کہہ دیتا ہوں کہ ایک ہفتے تک دکان وہ سنبھالے اور میں خود گھر پر رکوں گا۔ دیکھوں وہ سیاہ فام ایسا کون سا تیس مار خان ہے تو میرے سامنے بھی آئے۔“

پوجا جانتی تھی کہ آکاش کبھی اس کی بات کا یقین نہیں

دنیا میں 196ء خود مختار ملک ہیں اور اس کا مطلب ہے کہ اتنی ہی تعداد میں ان کے قومی پرچم بھی ہیں، جن میں تمام رنگوں کو دیکھا جاسکتا ہے مگر ایک رنگ ایسا بھی ہے، جس کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے جی ہاں یہ رنگ کافی لوگوں کو پسند بھی ہوتا ہے مگر پھر بھی کسی بھی ملک کے جھنڈے پر نظر نہیں آتا۔ یہ ہے ارغوانی رنگ، جسے عرف عام میں جامنی کہتے ہیں۔

☆☆☆

سائنسی ماہرین نے سرجری کے دوران اعضاء کو جوڑنے کا نیا طریقہ دریافت کرلیا۔ امریکی یونیورسٹی میں کی گئی تحقیق کے مطابق نمی کے قریب پائے جانے والے پودوں میں موجود کیڑے کا خارج کردہ مواد انسانی اعضاء کو مستقل طور پر جوڑ سکتا ہے۔ اس مواد کو جانور کے دل کی تحقیق سرجری کے دوران گوند کے طور پر استعمال کیا گیا جسے بلیوپچ کا نام دیا گیا ہے۔ پروفیسر اینڈریو اسمتھ کا کہنا ہے کہ یہ ایک بہترین دریافت ہے جس سے سرجری کے دوران اعضاء جوڑنے میں مدد ملے گی۔

☆☆☆

ورلڈ اکنامک فورم کی رپورٹ کے مطابق بھارت میں ضائع شدہ پلاسٹک کی چیزوں کو ری سائیکل کر کے سڑکوں کی تعمیر کے لیے قابل استعمال بنایا گیا ہے۔ یہ ٹیکنالوجی بھارت ہی میں ایجاد کی گئی ہے اور اس تیکنیک کے ذریعے باریک پلاسٹک کو تارکول کی طرح گرم ٹھوس مادے میں شامل کیا جاتا ہے اور پھر اسے پتھروں پر ڈال دیا جاتا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بھارت میں لگ بھگ 33 ہزار 500 کلومیٹر طویل سڑکیں پلاسٹک کے استعمال سے بنائی گئی ہیں جب کہ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایک لاکھ کلومیٹر سڑکیں پلاسٹک کے استعمال سے بنائی گئی ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ٹافیوں کے ریپر سے لے کر پلاسٹک کی بوتلوں تک کے استعمال شدہ پلاسٹک کو 170 ڈگری تک گرم کر کے پگھلایا جاتا ہے اور اسے تارکول کے طور پر روڈ کی تعمیر میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پلاسٹک کے استعمال سے تیار شدہ سڑکیں پائیدار اور دیرپا ہوتی ہیں جو شدید گرم موسم اور سیلابی صورت حال میں بھی خراب نہیں ہوتیں۔ دوسری جانب سڑکوں پر تارکول کی نسبت پلاسٹک سے گڑھے پڑنے کی شرح بھی بہت کم ہے۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز مئے۔ لندن

کرے گا لیکن اس کے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ ابھی کچھ دنوں تک اس کے ساتھ گھر پر ہی رک رہا تھا۔ پوجا کمزور دل کی ہرگز نہیں تھی لیکن اس واقعے نے تو اس کے ہوش اڑا کر رکھ دیئے تھے۔ اکیلے باتھ روم جاتے ہوئے بھی اس کی جان نکلتی تھی، جب تک آکاش دروازے پر باہر نہیں کھڑا ہوتا تھا وہ باتھ روم تک نہیں جاتی تھی۔ کھانا پینا برائے نام ہو کر رہ گیا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے آکاش اسے نیند کی گولی دیتا تھا جسے کھا کر وہ سکون سے سو پاتی تھی۔ آکاش اس کی خستہ حالت دیکھ کر کڑھتا اور دل ہی دل میں عہد کرتا کہ اس کے ذمہ دار کو کیفر کردار تک پہنچا کر رہے گا۔ وہ اب یہ سوچنے پر بھی مجبور تھا کہ پوجا کو کچھ دنوں کے لیے اس کے گھر والوں کے پاس سکھر بھیج دے تاکہ اس کی حالت سنبھل سکے۔

آج آکاش کو گھر میں رکے چوتھا روز تھا۔ اب تک کوئی بھی ایسی صورتِ حال سامنے نہیں آئی تھی کہ اس کے کان کھڑے ہوتے۔ معمول کے مطابق دونوں رات کا کھانا کھا کر ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ اچانک صحن میں کسی چیز کے گرنے کی زوردار آواز آئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا کسی نے بڑی سی دیگ لڑھکائی ہو۔ پوجا نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے آکاش کا شانہ مضبوطی سے دبوچ لیا اور آنکھیں میچ لیں۔ آکاش اس کی حالت پتلی ہوتی دیکھ کر مسکرایا اور آہستگی سے شانہ چھڑاتے ہوئے بولا۔ ”ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے پوجا، ضرور کوئی بلی ہوگی۔ تم بیٹھو، میں اسے بھگا کر آتا ہوں۔“ لیکن پوجا اس کے ساتھ ہولی۔

صحن میں کوئی نہ تھا۔ آکاش باورچی خانے تک جھانک آیا مگر سب چیزیں اپنی جگہ پر تھیں پھر پوجا کو تسلی دینے کی خاطر ہنس کر کہنے لگا۔ ”ضرور بلی ہی کودی ہوگی اور پھر بھاگ گئی۔“

پوجا مطمئن تو نہیں ہوئی مگر کچھ بولی بھی نہیں۔ وہ دونوں دوبارہ ٹی وی دیکھنے بیٹھ گئے۔ پندرہ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ وہی آواز دوبارہ آئی۔ اس مرتبہ یہ پہلے سے بھی زوردار تھی۔ آکاش تیزی سے اٹھ کر صحن کی طرف دوڑا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس بار آکاش سرسری طور پر نظر ڈال کر واپس نہیں پلٹا بلکہ اس نے کیاریوں کے پیچھے تک جا کر جائزہ لیا مگر وہاں واقعی کوئی نہ تھا! آکاش کچھ سوچتا ہوا واپس پلٹا مگر ابھی وہ دو قدم بھی نہ چل پایا تھا کہ کسی نے اسے زور سے دھکا دیا۔ آکاش اگر خود کو بروقت سنبھال نہ لیتا تو منہ کے بل جا گرتا۔ پوجا دوڑ کر اسے سنبھالنے کو آگے بڑھی مگر اس نے اشارے سے منع کر دیا پھر وہ بڑی دیر تک وہیں کھڑا باریکی سے جائزہ لیتا رہا مگر کوئی ہوتا تو دکھائی دیتا۔

اس دوران پوجا آنکھوں میں آنسو لیے چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کا دل کسی انہونی کے خیال سے لرز رہا تھا۔ اس کے کانوں میں رہ رہ کر لکشمی چاچی کی آواز گونج رہی تھی۔ ”لوگ بولت ہیں کہ ای مکان کو شراپ دے گیا او پاپی۔ کوئی ای مکان مارہ نہ سکے۔ جو آیا او کا بڑا نقصان ہوا۔“ پر وہ یہ بات آکاش کو کیسے سمجھائے۔ وہ تو اس کالے علم والے سے دو دو ہاتھ کرنے کے چکر میں تھا۔

کچھ دیر بعد جب وہ کمرے میں آئے تو دونوں بالکل خاموش تھے۔ لیمپ بجھا کر جب وہ سونے لیٹے تو پوجا آہستہ سے بولی۔ ”آکاش، ہم کل صبح ہوتے ہی یہ مکان خالی کر دیں گے۔ ان کالی طاقتوں والوں سے بھڑنا عام انسان کے بس کی بات نہیں۔“

لیکن آکاش نے خاموش رہنے پر ہی اکتفا کیا اور اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ آج کی اس پریشانی میں وہ پوجا کو نیند کی گولی کھلانا بھی بھول گیا تھا اس لیے پوجا ابھی تک جاگ رہی تھی۔ کھڑکی سے اندر آتی پورے چاند کی روشنی کمرے کے کافی حصے کو منور کر رہی تھی۔ ہر طرف پُرسکون سی خاموشی کا راج تھا۔ پنکھے کی ہوا سے کمرے میں لٹکا کیلینڈر بھی ہلکے ہلکے جھول رہا تھا۔ پوجا اسی کیلینڈر کو دیکھتے ہوئے سوچوں کے جنگل میں بھٹک رہی تھی اور اب آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے بند ہوتی جا رہی تھیں کہ دفعتاً کیلینڈر ہوا میں بلند ہوا اور دور جا گرا۔ بالکل ایسے جیسے نادیدہ ہاتھوں نے اسے کیل پر سے اتار کر فرش پر پھینک دیا ہو۔ پوجا کی چیخ نکل گئی لیکن اس سے پہلے کہ آکاش صورتِ حال کو سمجھتا، ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا گلدان چھناکے کے ساتھ زمین بوس ہو گیا، شیشے کا ریک زوردار دھماکے سے فرش سے ٹکرا کر کرچی کرچی ہو گیا اور کمرے کے ایک کونے پر رکھا ہوا لکڑی کا بھاری بھرکم اسٹول خود بخود ہوا میں پرواز کرتا ہوا دوسرے کونے پر جا گرا۔

پوجا کی لرزہ خیز چیخوں نے آکاش کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے۔ اس نے جلدی سے لیمپ جلایا تو

دیکھا پوجا کے سرہانے کوئی لمبا تڑنگا سیاہ فام آدمی کھڑا تھا جو روشنی کے ہوتے ہی غائب ہو گیا۔ پوجا سر سے پیر تک لرز رہی تھی اور اس پر غشی کا عالم طاری تھا۔ آکاش بستر پر سے کودا اور لائٹ جلا دی۔ روشنی میں اس نے دیکھا کہ کمرے کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی جیسے یہاں کچھ لمحے قبل زلزلہ آیا ہو۔ وہ بھاگ کر پوجا کے پاس آیا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر ہوش میں لانے لگا۔ پوجا تو کیا ہوش میں آتی البتہ خود اس کے اپنے ہوش اڑ گئے جب اسے کمرے میں آہٹ سی محسوس ہوئی۔ آکاش نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

دروازے کی چوکھٹ پر وہی انگارہ آنکھوں والا، بھبوت میں لتھڑا سیاہ فام کھڑا تھا جسے ابھی چند لمحوں قبل اس نے پوجا کے سرہانے کھڑا دیکھا تھا۔ جس چیز نے آکاش کے ہوش اڑائے وہ یہ تھی کہ سیاہ فام فرش سے دو انچ بلند تھا یعنی اس کے پیر زمین کی سطح کو نہیں چھو رہے تھے۔ اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر پاس رکھا ٹائم پیس اٹھا کر سیاہ فام کو کھینچ مارا مگر وہ غچہ دے گیا۔ اس سے پہلے کہ آکاش کوئی اور طریقہ سوچتا وہ سیاہ فام اس کی آنکھوں کے سامنے ہی دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

وہ حواس باختہ سا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا کہ شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے مگر نیم بیہوش پوجا اور کمرے کی حالت اسے حقیقت کی دنیا میں لانے کے لیے کافی تھی۔ اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر بے سدھ پڑی پوجا کو گود میں اٹھایا اور گھر سے باہر بھاگا۔

لکشمی چاچی بے خبر سو رہی تھیں مگر دروازے پر ہونے والی بلا تعطل دستک نے انہیں ہڑ بڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ دروازے پر آکاش کی مخدوش حالت اور اس کی گود میں بیہوش پوجا کو دیکھ کر چاچی نے اپنا کلیجہ تھام کر اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی اندر آنے کی اجازت دے دی پھر دونوں نے جلدی جلدی پوجا کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں۔ کچھ دیر بعد پوجا کو ہوش تو آ گیا مگر خوف کی زیادتی کے سبب وہ رات بھر پاگلوں کی طرح چیختی چلاتی رہی۔ ان کی یہ رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

صبح ہوتے ہی چاچی کے مشورے اور بے پناہ اصرار پر آکاش قریبی مسجد سے مولوی کو بلا کر لے آیا۔ اس نے مولوی صاحب کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور پوجا کی حالت کے بارے میں بھی بتایا۔ مولوی صاحب نے آکاش سے اس سیاہ فام کے بارے میں استفسار کیا اور حلیے کے بارے میں جان کر گہری سوچ میں پڑ گئے۔ چند لمحے بعد وہ بولے۔ ”تمہارے بیان کیے گئے حلیے اور اس کی طاقت سے تو وہ کوئی اگھوری لگتا ہے اور اگھوریوں سے ٹکر لینا مجھ جیسے سیدھے سادے مولوی کا کام نہیں۔ اس سے مقابلے کے لیے تو کوئی طاقتور علم کا ماہر چاہیے۔ عامل چاہیے۔“

یہ سن کر آکاش نے مولوی کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”مولوی جی، مجھے اس سے ٹکر لینی بھی نہیں ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ پوجا ٹھیک ہو جائے اور میں خیریت سے گھر کا سارا سامان سمیٹ لوں لیکن اس بیچ وہ

اقبال صفی پوری (1914-1999)

22 مئی 1999 کو اقبال صفی پوری کا انتقال کراچی میں ہوا تھا۔ ان کا اصلی نام اقبال احمد خلیلی تھا۔ ضلع اناؤ اتر پردیش کے قصبے صفی پور میں 1916 میں پیدا ہونے والے شاعر کا شعری سفر صوفیانہ و ادبیانہ ماحول کی دین ہے۔ ان کے والد شاہ خلیل احمد ولد شاہ جمیل خلیلی خدا رسیدہ بزرگ صوفی منش انسان تھے۔ اقبال صفی پوری کے نانا عزیز صفی پوری فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے جنہیں ان کے ہم عصروں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ 1947 میں اکتیس برس کی عمر میں پاکستان آئے۔ بلدیہ کراچی میں افسر رابطہ و تعلقات عامہ رہے۔ کراچی میں نعتیہ محفلوں اور مذہبی تقریبات کا ذوق و شوق سے اہتمام کیا۔ بہزاد لکھنوی، ماہر القادری، اسعد شاہجہاں پوری اور نیر مدنی کے بعد اقبال صفی پوری کو کراچی کے نعت نگار شاعر کا درجہ ملا۔ آپ جگر مراد آبادی کے تلامذہ میں شامل رہے۔ آپ کا ایک شعری مجموعہ ”رحمت لقب“ نعت کے جملہ لوازمات سے مزین ہے اور ایک طالب صادق کی سحر انگیز فکر کا آئینہ دار بھی۔ جب کہ ”رنگ و نور“ اور ”شاخ گل“ نامی دو غزلوں اور نظموں کے مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ کراچی کے مرحوم شعراء میں ان کو اہم مقام دیا گیا ہے۔ اقبال صفی پوری پاپوش نگر کے قبرستان میں دفن ہیں۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم
مرسلہ: قرۃ العین۔ اقراء سٹی، کراچی



کوئی شرارت نہ کرے جس سے مجھے یا پوجا کو کوئی نقصان پہنچے۔"

کافی بحث مباحثے کے بعد مولوی صاحب بالآخر اس بات پر راضی ہوگئے کہ وہ آکاش اور اس کے دوستوں کے ہمراہ گھر کے اندر چلیں گے اور جتنی دیر وہ سامان سمیٹیں گے، وہ آیتیں پڑھتے رہیں گے تاکہ کالی طاقتوں کو ان پر حاوی ہونے سے روکا جاسکے۔ مولوی نے صحن میں نشست جمالی جبکہ آکاش اور اس کے دوست تیزی سے سامان باندھنے میں جٹ گئے۔ سامان سمیٹ کر ٹرک میں لوڈ کرنے تک تین چار گھنٹے لگ گئے۔ اس بیچ کئی مرتبہ آکاش اور اس کے ساتھیوں کو اپنے کندھے بھاری ہوتے تو کبھی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا محسوس ہوا۔ ایک مرتبہ تو گھر کے درودیوار یوں لرزنے لگے جیسے ابھی مکان ٹوٹ کر ان کے سروں پر گر پڑے گا مگر ان لوگوں نے ہمت سے کام لے کر اپنا کام جاری رکھا۔

جب سارا سامان چلا گیا تو آکاش گھر کا دروازہ بند کرنے رک گیا۔ اس نے ایک حسرت بھری نگاہ گھر پر ڈالی اور کواڑ بند ہی کرنے والا تھا کہ اچانک اس سرسری سی نگاہ میں صحن میں وہی اگھوری کھڑا نظر آیا جو اس ہی کی جانب دیکھتا ہوا فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ آکاش نے چونک کر دوبارہ دیکھا مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ آکاش نے روی سے پوچھا جو اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا مگر اسے وہاں کوئی نظر نہیں آیا تھا لیکن آکاش کو یقین تھا کہ اس نے چند لمحوں قبل اگھوری کو دیکھا تھا۔

وہ لکشمی چاچی کا بہت احسان مند تھا کہ اس کے سرد رویے اور نظر انداز کرنے کے باوجود انہوں نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ آس پڑوس والوں نے تو اس معاملے سے بے رخی ہی برتی اور کوئی اس کی مدد کو نہ آیا۔ ایسے میں پوجا کی بگڑی ہوئی حالت اور نیا شہر اس کے لیے آزمائش بن جاتا مگر چاچی ان کے لیے فرشتہ ثابت ہوئیں۔ نیا گھر تلاش کرنے تک وہ ان کے اصرار پر ان کے گھر میں ہی ٹھہرے۔ تب تک پوجا بھی اس شاک سے باہر آچکی تھی اور اس حادثے کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چاچی نے انھیں بتایا کہ اگھوری دراصل کالی ماتا اور کالی طاقتوں کے پجاری ہوتے ہیں۔ یہ آبادی سے دور سنسان جگہوں جیسے شمشان گھاٹ اور ویران جنگلوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ اس قدر پلید ہوتے ہیں کہ جلی ہوئی انسانی لاشوں، جانوروں کا فضلہ اور سڑی گلی غذا کو کھا کر گزارہ کرتے ہیں۔ یہ اپنے جسم پر شمشان سے انسانی راکھ اکٹھی کر کے ملتے ہیں اور نہانے دھونے سے قطعی اجتناب کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ جو چیز انسانوں کے لیے کراہیت آمیز اور نجس ہے وہ ہمارے لیے پاک ہے۔ کہنے تو یہ اپنے آپ کو ہندو ہی ہیں مگر ان کے غلیظ عقائد، رسوم ورواج اور رہن سہن کے باعث ہندو انھیں اپنا دھرم والا تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ کالے جادو پر انھیں ملکہ حاصل ہوتا ہے اس لیے لوگ ان سے دور دور رہنا ہی پسند کرتے ہیں اور اگر کسی اگھوری سے سامنا ہو بھی جائے تو اسے کچھ دے دلا کر جان چھڑاتے ہیں۔

کوئی چالیس، پچاس برس قبل اس گھر میں ایک برہمچاری سادھو رہتا تھا۔ نجانے کیسے وہ ان گندے کاموں میں پڑ گیا اور اپنا دین دھرم سب بدل ڈالا۔ اس کے کالے کرتوتوں کی شکایت جب لوگوں نے مکان مالک سے کی تو اس نے فوراً مکان خالی کرانے کا تہیہ کرلیا مگر وہ سادھو مکان چھوڑ کر جانے کو تیار نہ تھا۔ جب اس سے زبردستی کی گئی تو جاتے جاتے وہ کہہ گیا کہ 'مکان تو میرا ہی رہے گا چاہے اس میں، میں رہوں یا میری آتما!'

اس دن کے بعد مکان مالک نے سر توڑ کوشش کرلی پر یہ مکان دوبارہ آباد نہ ہوسکا۔ کئی پنڈت آئے پر سب نے اس اگھوری کی کالی طاقت کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ آج بھی میرپور خاص کا وہ مکان 'آسیبی مکان' کے نام سے مشہور ہے اور لوگ رات تو کیا دن میں بھی اندر جانے کے خیال سے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔

شمارہ اپریل 2018ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش......آپ کا انتخاب

☆اول: زندان......ملک رحمت (میانوالی)

☆دوم: انناس کے پھول......محمد ظفر حسین (کراچی)

☆سوم: ہیروئن......ناصر (کراچی)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے